آجکل

دہلی

ایڈیٹر

مہدی عباس حسینی

سب ایڈیٹر

کشور وکرم

جلد ۳۰ — شمارہ ۱۲
جولائی ۱۹۷۲ء
اساڑھ شراون شک ۱۸۹۴

سالانہ چندہ

ایک سال : ۵ روپے
۲ سال : ۹ روپے
۳ سال : ۱۲ روپے

سرورق : ...

ملاحظات

دو دورے

ان دنوں دو دوروں کا بڑا چرچا ہے ایک تو صدر نکسن کی روس یاترا، اور دوسرے صدر بھٹو کا مسلم ممالک کا دورہ۔ ان دوروں سے نہ صرف ملکی بلکہ ذاتی مقاصد بھی وابستہ ہیں کیونکہ ان کی کامیابی یا ناکامی امریکہ اور پاکستان کے سربراہوں کے سیاسی مستقبل پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے۔ پہلا دورہ عام طور پر اقوام عالم کے لئے اہم ہے کیونکہ اس کے تحت دو بڑے ملکوں نے اپنی طاقت کے توازن کے بارے میں کچھ سمجھوتے کرلئے ہیں۔ صدر بھٹو کا دورہ بالخصوص ہندو پاکستان کے لئے اہم ہے کیونکہ وہ اس دورے کے بعد نئی دلی میں مذاکرات کے لئے تشریف لانے والے ہیں۔

صدر پاکستان نے اعلان جنگ بندی کے بعد ہی یہ کہنا شروع کردیا تھا کہ وہ نئی دلی جاکر بات چیت کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن کسی نہ کسی وجہ کے باعث وہ اپنی آمد کی تاریخ کا تعین کرنے سے محترز رہے۔ مبصرین کا اندازہ ہے کہ ؏

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔

یعنی اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اُس وقت پاکستان اور اس کے صدر دونوں کی حیثیت بہت کمزور تھی۔ بعد ازیں پاکستان میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ نظم و نسق بدل گیا۔ سیاسی ڈھانچہ تبدیل ہوگیا۔ زرعی اصلاحات کا اعلان ہوا۔ فوجی ساز و سامان کی کمی پوری کرلی گئی چنانچہ صدر پاکستان کے مسلم ممالک کے دورے کو بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ قیاس کیا جاتا ہے کہ صدر پاکستان ان دولت مند مسلم ممالک سے نہ صرف مالی اور فوجی امداد حاصل کرنا چاہتے ہیں بلکہ اس کے بھی کوشاں ہیں کہ یہ ممالک بنگلہ دیش کو اس وقت تک تسلیم نہ کریں جب تک کہ خود پاکستان اس سلسلے میں پہل نہ کرے — ادھر اقتصادی میدان میں بھی ایک اہم قدم اٹھایا گیا ہے۔ یعنی پاکستانی روپے کی قیمت میں ۵۰ فی صد تخفیف۔ اس کا سبب تو ظاہر ہے کہ اب پاکستان کے پاس وہ پٹ سن اور چائے نہیں جس سے وہ اپنا بیشتر زرمبادلہ حاصل کرتا تھا۔ لہٰذا پاکستانی اشیاء کو بدیشی منڈی میں سستا بیچ کر زرمبادلہ حاصل کرنے کے علاوہ چارہ کار نہ تھا لیکن اس اقدام سے ہندوستان کو نقصان پہنچنے کا احتمال بھی ہے، کیونکہ پاکستان سوتی کپڑا اور ایسی دوسری مصنوعات جو ہندو پاکستان دونوں میں تیار ہوتی ہیں بدیسی منڈیوں میں زیادہ سستے داموں مہیا کرے؟ جو برآمدات پر ضرب لگا سکتا ہے۔ بہرحال آج کل نئی دہلی۔

اس اقدام کا دوسرا رُخ یہ بھی ہے کہ اب پاکستان جو کچھ بھی دوسرے ملکوں سے خریدے گا اس کی قیمت اُسے پہلے کے مقابلے تقریباً ڈیوڑھی دینی ہوگی۔

صدر پاکستان اپنے ملک کو مضبوط بنانے کے لئے جو بھی کریں ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں بلکہ اگر وہ خلوص نیت سے ہند و پاکستان کے مسائل کو حل کرنا چاہیں تو ہم اُن کی مدد بھی کرسکتے ہیں کیونکہ یہ مسائل ہند پاکستان کے [illegible] کے مستقبل سے متعلق ہیں اگر پاکستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے [illegible] کو سمجھ لیں اور حقائق سے روگردانی نہ کریں تو ہند پاکستان مذاکرات [illegible] کامیاب ہوں گے۔

پرتھوی راج کپور

ابھی ہم مارچ میں مینا کماری کی موت پر مغموم ہی تھے کہ ۲۹ مئی کو ہماری فلمی دُنیا کی ایک نہایت قابلِ احترام ہستی پرتھوی راج کپور بھی ہم سے جدا ہو گئے۔ پرتھوی راج پر قدرت نے اپنی بخششیں ارزاں کر دی تھیں۔ انہیں حُسن و صحت۔ کمالِ فن، فارغ البالی، عالمگیر شہرت، ہمہ گیر عزت اور ہونہار اولاد، غرض کہ وہ سب کچھ نصیب تھا جس کی لوگ دعائیں مانگتے ہیں۔ لیکن جمال و کمال و مال کی اس فراوانی کے باوجود وہ ایک دردمند دل اور صالح اقدار و اطوار کے حامل تھے۔ انہوں نے نہ کبھی غرور کیا اور نہ وہ ان دوسری نفس پرستیوں کا شکار رہے جو فلمی دنیا میں عام ہیں۔ اس کے برعکس وہ ایک کھرے اور پُرخلوص فن کار تھے جس نے پرتھوی تھیٹرز کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کا سبق پڑھایا اور برس ہا برس تک ہندوستانی پارلیمنٹ میں علم و فن کی نمایندگی کی۔ اُن کی بڑائی اور کسر نفسی کی تازہ ترین مثال یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف اپنے پوتے کے ڈائرکشن کے تحت کام کیا بلکہ اس سے اسی ادب سے پیش آئے جیسے کہ وہ اپنے دوسرے ڈائرکٹروں کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ایسی باعمل اور با اصول شخصیتیں جنہیں اپنے فن سے اس درجہ لگن ہو کم پیدا ہوتی ہیں۔

؎ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

خاندانی منصوبہ بندی اور مسلمان

انسان سُنی سنائی باتوں پر بہت جلد بھروسہ کرلیتا ہے اور بعد میں انہی باتوں کو خود اپنے علم و عقیدے کے طور پر دہراتا رہتا ہے۔ چنانچہ اسی قبیل کے یہ تصورات عام ہیں کہ ہند کے مسلمان ایک سے زائد بیویاں رکھتے ہیں (حال کے ایک جائزے سے ظاہر ہوا ہے کہ ایک سے زائد بیویاں رکھنے والوں کا تناسب ہندوؤں میں سب سے زیادہ ہے) اور کثیر الاولاد ہوتے ہیں کیونکہ اُن کا مذہب انہیں خاندانی منصوبہ بندی یا فیملی پلاننگ کی اجازت نہیں دیتا۔ اس شمارے کے دو خصوصی مضامین اور ایک سروے سے واضح ہوگا کہ حقیقت اس کے برعکس ہے بلکہ سروے کا تو اندازہ ہے کہ کم از کم دلی میں تقریباً نوے فی صدی مسلمان فیملی پلاننگ کے نہ صرف قایل ہیں بلکہ اس پر کاربند بھی ہیں۔

فیملی پلاننگ کے بارے میں
مسلمانوں کا رویّہ

یر اللہ شاہین



میں جس علاقہ میں رہتا ہوں اس کے قریب ہی ایک طرف مسجد شاہجہانی سامنے لال قلعہ اور ان کے درمیان سبھاش پارک اور پریڈ گراؤنڈ۔ سبھاش پارک کے سامنے عورتوں کا شفاخانہ جواب کستوربا ہسپتال ہے اس کے اوپر جھکتے ہوئے ایک تکون اور سائن بورڈ نے اپنی طرف توجہ منعطف کر لی جن پر دیوناگری میں لکھا ہے۔ "دو یا تین بچے بس"

لیجئے بات کا سرا ہاتھ آیا۔ مسلمانوں سے فیملی پلاننگ کے بارے میں ان کے نظریات معلوم کرنے کی ٹھانی۔ اس کارِ خیر کو ایک صاحب خیر سے شروع کیا۔ شاہی امام صاحب سے ملاقات کی۔ موصوف تنومند سرخ و سفید بہت ہی وجیہہ شخص ہیں۔ مصلحتوں کو گفتار کی راہ میں اکثر حائل نہیں ہونے دیتے۔ حاضر ہوا تو بڑے تپاک سے ملے۔ روایتی سلام کلام کے بعد گفتگو شروع ہوئی۔

"کہئے": امام صاحب فیملی پلاننگ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔"

"میرے خیالات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔ میں بار بار ان کا اعادہ بلکہ اعلان کر چکا ہوں۔ ان کے جواب میں جو مختلف حلقوں سے لے دے ہوئی ہے اس سے آپ یقیناً واقف ہوں گے۔ (آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے امام صاحب کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔)

"کیا اب بھی آپ اپنی رائے پر قائم ہیں؟"

"جی قطعاً بلا کسی پس و پیش اور خوف اور لالچ کے میں پوری ایمانداری سے اسی بات کو صحیح اور جائز سمجھتا ہوں۔"

"جائز ہے کس بنیاد پر؟"

"میری مراد عزل والی حدیث سے ہے۔"

"اس کے علاوہ بھی کوئی اور قول و عمل وجہ جواز ہو سکتا ہے؟"

"اس واضح ہدایت کے بعد کسی مراجعت مزید کی چنداں ضرورت نہیں۔ اسی بنیاد پر آج سے کم و بیش پچیس تیس برس قبل علماء ازہر (مصر) نے فتویٰ دیا اب اور کیا چاہیئے۔ اللہ، رسول اور اولی الامر کے فیصلے کے بعد کس چیز کی ضرورت رہ جاتی ہے؟"

"مگر جناب: اپنے یہاں تو علماء اس سے متفق نہیں۔ نہ دیوبند، نہ ندوہ، نہ مظاہر العلوم اور نہ امیر شریعت بہار۔"

"اب اس کو کیا کیجئے۔ یہ ہمارے بچوں کی بدقسمتی ہے جن کی نگہداشت کا کوئی مناسب انتظام نہیں۔ اس کے باوجود ہم مصر ہیں کہ انہیں جاہل رہنے دیں اس لئے کہ ایک بچے کو پڑھانا دشوار ہے۔ دس بچے کیوں کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔"

(۲)

علاقہ جامع مسجد جن افراد پر مشتمل ہے اس میں مسلم کارخانے دار ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک کرخندار سے جن کا نام محمد حیات خاں ہے ملاقات کی۔ موصوف کے کارخانے میں سیونگ مشین کے لکڑی کے ڈھکن (کور) تلے (بیس) اور میز پر ٹیبل بنتے ہیں۔ کم و بیش ایک درجن بڑھئی اور پالش والے کام کرتے ہیں۔ پوچھنے پر بتایا۔

"صاحب میں تو زیادہ جانتا نہیں بس اتنا جانتا ہوں کہ یہ جو ایک درجن کاریگر میرے ہاں آپ کام کرتا دیکھ رہے ہیں ان میں وہ مزے میں ہیں جن کے ہاتھ کے نیچے دو دو تین تین لڑکے کام کر رہے ہیں۔ ان

بچے لڑکے ان پر بوجھ نہیں ہیں۔ وہ دیکھئے۔ (ایک طرف اشارہ کیا) وہ چھمن ہے اس کے تین لڑکے ہیں، تینوں باپ کا ہاتھ ہی نہیں بٹاتے بلکہ دو بڑے کاریگروں کے برابر کام کرتے ہیں۔ چھمن اکیلے ہاتھ سے ایک درجن بیس بنا سکتا ہے مگر ان لڑکوں کو لے کر بڑی آسانی سے دو درجن تیار ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف وہ مقصود ہے ..... کے نہ جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا۔ دن بھر میں بارہ بیس بناتا ہے۔ اس کی سارے دن کی مزدوری اٹھارہ روپے ہوتی ہے وہ بھی بڑے پاپڑ بیل کے، جبکہ چھمن کی چھتیس روپے بنتے کیلئے اب ذرا سوچو اس کے تین لڑکوں نے کتنا آٹا کھایا، سسرے کتنے ہی پیٹ کو کوٹ بنالیں۔ سارے دن میں تین روپے سے زیادہ کا نہیں کھا سکتے۔ تین روپے اور خرچوں پر لگا لو، پانچ لگالو، کتنے ہوئے آٹھ، کمائے اٹھارہ، بچے نا دس۔ اب بتاؤ کون نفع میں رہا؟"

"ایک اور بات سنو کر خندار کو جو اطمینان چھمن سے ہے مقصود سے نہیں، اس لئے کہ اس کو اپنے بچوں کا پیٹ پالنا ہے۔ وہ ضرور آئے گا۔ پھر چار پیسہ کم دو تو آئیں گے۔ رہا یہ چھڑا اس کو کوئی فکر نہیں جب جی چاہا غوطہ لگا گیا اب سوچو ۱۸ پر اگر چھ بچے ہیں تو ۳۶ پر ہوئے نہ بارہ۔ بتاؤ ہم کس کی آس تکیں گے۔"

"اور سنتے جاؤ (مجھے پکڑ کر بولے) میرے پاس ان درجن بھر کاریگروں میں ۶ بچے کاریگر ہیں۔ جو ہمارے پاس الگ سے ہیں انہیں ہم دیتے ہیں تین روپے روزینہ۔ اور کماتے ہیں (دکان کے قریب منہ لاکر) کم سے کم ۹ روپے ہوا نا چھ کا نفع۔"

اس کے علاوہ ہر روز کارخانے کی جھاڑو بہارو کون دے گا؟"

"اس کے لئے الگ ملازم نہیں۔"

"اجی واہ تب تو ہم نے کما لیا۔ آپ جلدی ہمارا بوریا بسترا لپٹوا دیں گے۔

دیکھو جی! اس کام میں ان بچوں کی شان میں بٹا نہیں لگتا اور بڑے کاریگر تو ..... مرے جاتے ہیں۔ دس بجے سے پہلے آئیں گے نہیں۔ بیڑی اور چائے کے بغیر ہل نہیں سکتے۔ ہمیں ان سے کیا کمانا ہے۔ یہ ہم سے کماتے ہیں اس پر ہر وقت کے نخرے، بلا وجہ کے نکنوڑے۔ رات کو بھری ہوئی (چرس کی) سگریٹ اور سڑک پر اوائی توائی پھرتے دیکھ لو۔ ایمان کی قسم یہ کارخانہ تو ان بچوں کے دم سے اور ان (آباد) ہے مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ فیملی پلاننگ ولاننگ کچھ نہیں سب ڈھونگ ہے، ڈھکوسلہ ہے چھوٹے دھندے والوں کے خلاف چال ہے تاکہ نہ بچے زیادہ ہوں گے نہ ان کے ماں باپ انہیں دھندوں میں ڈالیں گے۔ اس عمر میں کام سکھانے کے بجائے پڑھانے بٹھائیں گے۔ پیچھے کارخانے چوپٹ۔"

(۳)

ایک صاحب جن کا نام جلال الدین ہے [illegible] علوہ اور گرمیوں میں جامع مسجد کی سیڑھیوں پر قلفی بیچتے ہیں [illegible] بڑی گرج دار آواز میں کہا۔

"میرے چھ جوان لڑکے ہیں۔ چھے جوان [illegible] ہر کوئی رعب کھاتا ہے۔ آپ کو نہیں معلوم میں [illegible] میں رہتا ہوں۔ جدی مکان ہے۔ آپ اگر دیکھیں تو [illegible] سامنے قلفی بناتا ہوں، کڑھائی چڑھاتا ہوں، [illegible] سب گلی میں ہوتا ہے۔ بنانے کے سارے اوزار باہر [illegible] کڑھائی، توا، پرات بھٹی باہر رکھتا ہوں۔ رات کو سوتا بھی باہر ہوں۔ [illegible] میں اپنا راج ہے۔ کوئی ہے مائی کا لال جو ترچھی نظر سے دیکھ تو [illegible] بتاؤ یہ نفع ہے یا نقصان کہ میرے اولاد زیادہ ہے۔"

"ابھی آپ نے بتایا آپ اپنی تمام چیزیں باہر رکھتے ہیں، آپ سوتے بھی باہر ہیں، کیوں؟"

"واہ اچھے پڑھے لکھے ہو۔ یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ لڑکوں اور بہوؤں نے پورے گھر پر قبضہ جما لیا ہے۔ مکان میں تین ہی کمرے ہیں ابھی تین کی شادی ہوئی ہے۔ ۳ کنوارے ہیں، لڑکیوں کو اٹھا [illegible] آتی بھی رہتی ہیں۔ تم جانو سات پانچ کا کنبہ کوئی یوں ہی گلی میں تھوڑی [illegible] لے گا۔ پھر بچے بدمعاش، فل غپاڑہ۔ کان پڑی آواز نہیں آتی۔ پھر لڑکیاں بالیاں ننگی کھلی بیٹھی ہیں۔ رات برات ہے۔ اندھیرا اجالا ہے۔ آپ جانو لونڈے جوان ہیں۔ بہوئیں جوان ہیں۔ نہانا دھونا بھی ہے یا ایسا پالی آنکھ کا تو مرا نہیں کہ میں بھی اس چیچڑوں میں وہیں اڑا رہوں۔"

"لڑکے بھی گھر میں سونے کو نہیں کہتے۔"

"اجی آج کل کے لونڈے ..... جوروؤں کے غلام، آگے پیچھے لگے پھرتے ہیں۔ آخر دم گھونٹ کے باہر پڑا رہتا ہوں۔"

(۴)

علاقہ میں شہر کی معروف ہستی حضرت مفتی ..... صاحب ہیں ملکی سیاست میں تقسیم سے پہلے اور بعد بھی ایک سرگرم قومی کارکن رہے ہیں ہر چند کہ آپ کے یہاں نہ کوئی "دارالافتاء" ہے نہ "دارالاقامت" اور نہ کوئی "دائرۃ المعارف" اس کے باوجود اہل طلب کی بھیڑ جمع رہتی ہے۔ مختلف مسائل زیر بحث آتے ہیں اور بڑی خدو مد سے گفتگو ہوتی ہے۔ بات چھڑی تو کچھ لوگوں نے از خود بحث میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ایک آواز ابھری جو تمام آوازوں پر غالب تھی۔

" میاں حکومت کو کیا پڑی کہ ہم کو معاملت کے طریقے سکھائے۔ یہ کیا ہے کہ ایک شور قیامت بپا ہے جس دیوار و در پر نظر کیجئے جس کاغذ پرزے کو اٹھائیے، ریڈیو کے کان امیٹھئے وہی بے وقت کی راگنی۔ ہم سب سنتے ہیں۔ بچے ان کی تکرار کرتے ہیں۔ کچھ سیانے بچے بچیاں استفسار کرتی ہیں۔"

بات کو طویل ہوتا دیکھ کر آخرش قبلہ مفتی صاحب نے مداخلت کی۔

" دیکھئے جناب موضوع کے دو پہلو ہیں۔ ایک اجتماعی دوسرا انفرادی معاملے کو میں قطعاً انفرادی سمجھتا ہوں۔ ہر شخص کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ ایک خاص تعداد پر رک جائے یا ایک خاص تعداد تک ضرور ہی پہونچے۔ ان کو اپنے حالات پر نگاہ رکھنی چاہئے۔ دراصل تعداد کا تعین حکومت نہیں صاحب معاملہ افراد کرتے ہیں ان کے ساتھ زیادتی ہوگی کہ انھیں دو تین بچوں میں محصور کر دیا جائے۔ یہ ملک کی بھی کوئی اچھی خدمت نہیں ہو سکتی اس لئے کہ جن کے پاس وسائل ہیں وہ کام میں آنے سے رہ جائیں گے۔ اس طرح توانائیاں استعمال میں آئے بغیر ضائع ہو جائیں گی۔ رہی مسلمانوں کی اپنی حالت تو وہ یقیناً من حیث المجموع اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ زیادہ بچوں کا بار اٹھائیں اس لئے انہیں خود مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا چاہئے کسی جذباتیت کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے چاہئیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ چادر بڑی کی جائے تاہم چادر بڑی ہو نہ کہ پاؤں کا پھیلاؤ۔ تاہم اتنا بتا دوں یہ مسئلہ کسی دارالافتاء کے طے کرنے کا نہیں ہے۔ فرد کو اپنے برے بھلے پر غور کرنے کے لئے چھوڑ دینا چاہئے۔ انسانی شعور اس تیزی سے ترقی کر رہا ہے کہ جلد ہی آئے کسی خارجی اشتہار بازی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

ایک اور مذہبی شخصیت سے ملاقات کی۔ موصوف کو قوم کا بڑا غم ہے اور اس کی بہبودی ان کا تکیہ کلام ہے۔ التماس کیا

" مولانا یہ مسلمان کی حیات و زیست کا سوال ہے اس لئے براہ کرم ذرا دل سوزی سے غور کیجئے۔"

" یہ جمہوری ملک ہے جناب۔ اس میں عددی حیثیت ہی ملک کا بنانا اور بدل سکتی ہے۔ ایسی صورت میں عامۃ المسلمین کی تعداد بڑھانا ہی اس کے بقا، باہم اور جہد مسلسل کا دائمی اور مستقل حل اور یہی فطرت کی اصل منشا بھی ہے۔"

" مگر مولانا جہل کی موجودگی اور جہلاء کی قیادت بہت خطرناک ہے۔"

" آپ کی تمام حالات پر نظر نہیں۔ یہ قوم جاہل ضرور ہے مگر اس کے پاس ایمان و یقین کی زبردست قوت بھی ہے۔ یہ بدعمل ہے بے عمل نہیں۔"

" فیملی پلاننگ کے بارے میں عقیدہ و عمل کی بات ....."

" جی ہاں! بات صاف ہے۔ آپ بتائیے کون قوت ہے جو کسی نطفے کو برباد کر سکے۔ یہ وہ علیم و بصیر ہی جانتا ہے کہ کس قطرے میں قوت نمو ہے اور کس میں محض شوریدگی۔ انسان جانور تو نہیں ہے کہ بس وقتی لطف و لذت کے لئے سارے پاپڑ بیلتا ہے۔ اس کا اعلیٰ و ارفع مقصد ہے تخلیق کائنات کی طرح بلند و ارجمند۔ عورت مٹی کا کھلونا تو نہیں ہے کہ جب تک چاہا اس سے کھیلا کئے اور جب چاہا اس سے منہ موڑ لیا۔ اس سے ایک خاندانی نظام وجود میں آتا ہے۔ اس سے جنسی اختلاط کے نتائج و عواقب ظہور میں آتے ہیں۔ ان ذمہ داریوں سے کیوں دور بھاگتے ہو۔ اس کی ذمہ داریوں میں تم بھی برابر کے شریک ہو۔ اس سے کچھ لیتے ہو تو اسے کچھ دو بھی ....."

" اگر وہ خود لینے کو تیار نہ ہو۔"

" ہاں تب مسئلہ غور طلب ہو سکتا ہے۔"

" آپ کے مطابق فریقین کی رضامندی ہو تو اجازت ہے؟"

" بے شک"

(۶)

مقامی ڈگری کالج کے ایک لیکچرر جو اپنے شعبے کے صدر بھی ہیں اسی محلے میں رہتے ہیں، ملے۔ مسائل کے ہجوم پر گفتگو آئی تو صاحب موصوف نے بڑی صفائی سے کہا۔

" جناب اصل مسئلہ یہ ہے کہ آبادی بڑھ گئی ہے۔ آج سے ۳۰ سال پہلے جب میں ابھی بچہ تھا، اس کے بعد بھی جب میں لڑکا تھا۔ مجھے جامع مسجد سے باڑہ ہندو راؤ تک ہر شخص آسانی سے پہچان لیتا تھا اور بتا دیتا تھا کہ یہ فلاں فلاں کا لڑکا ہے، بڑی شفقت سے پیش آتا تھا مگر آج سر ہی سر ہیں جس طرف نظر کیجئے ان سروں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ اس لئے آدمی نے ایک دوسرے کو پہچاننا چھوڑ دیا ہے۔ کس کس کو یاد رکھے۔ مجھے جانے تو میرے ساتھ میرے ایک درجن (فرض کر لیجئے) بھائی بہنوں کو بھی جانے جو مجھ سے کسی نہ کسی پہلو مشابہت رکھتے ہیں۔ وہ کس کس کے ساتھ شفقت دکھائے۔ وہ خود بھی تو بہت گھرا ہوا ہے۔ پیٹ کی مار نے اس کا حافظہ کمزور کر دیا ہے۔ اس کی یادداشت اس سے چھنتی جاتی ہے اس لئے اب وہ امتیازی نشان لگانے کی مہلت بھی نہیں پاتا۔ پلاننگ کیجئے پھر دیکھئے رشتے کس طرح

ستوار ہوتے ہیں۔"

(۷)

دلی یونیورسٹی کے ایک معروف محقق علاقے کی طرف آنکلے ان سے گفتگو چھڑی تو بولے:

"آج حالات بہت سخت ہیں۔ ان میں زندگی کی تعمیر اور ایک اعلیٰ معیارِ زندگی کو نباہنا مشکل ہوگیا ہے۔ بیچارے متوسط خاندان کے خاندان ایک فاقے خطرے سے دوچار کر دیئے جاتے ہیں۔ دیہات کی زندگی میں بڑے خاندانوں کی پھر گنجائش ہے۔ جس کی شہری زندگی میں کوئی گنجائش نہیں ہے آج یہاں آئے ہوئے دس بارہ سال ہوا چاہتے ہیں۔ ایک گزٹیڈ آفیسر سے زیادہ تنخواہ پاتا ہوں مگر یقین مانیئے میں بیوی بچوں کے رکھنے کی ہمت اپنے میں نہیں پاتا۔ مکان کا مسئلہ، آمدورفت کی دقت، پڑھانا یہاں تو ہے کے چنے چبانا ہے۔ میری برداشت سے باہر ہے ظاہر ہے ایسی صورت میں اگر کوئی پابندی عائد کرسکتا تھا اپنے خاندان کو مختصر رکھنے کی تو وہ میرے نزدیک اس سے زیادہ بہتر نہیں ہوسکتی کہ میں نے اپنے اہل وعیال کو یہاں منتقل نہیں کیا۔"

(۸)

ضیاء الرشید صاحب جو چوڑی والان میں رہتے اور جوتوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ سوال سنتے ہی کہنے لگے۔

"ہماری آبادی کا بڑا حصہ بغیر کسی سے کہے سنے آج فیملی پلاننگ پر عامل ہے۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ لوگ تشہیر کرنا نہیں چاہتے۔ ان کی غیرت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ ہر کسی کو بتائیں کہ ان کی بیوی نے لوپ لگوایا اور خود انہوں نے نس بندی کرائی ہے یا نرودھ سے کام لیتے ہیں۔ نس بندی کا آپریشن تو ناکام بھی ہوسکتا ہے ایسی صورت میں پہلے سے تشہیر گویا دوسروں کو زبانِ طعن دراز کرنے کا موقع اور خود بدولت کو متذبذب کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ لہٰذا وہ خاموشی سے سب کچھ کرتے ہیں۔ اسی طرح جیسے دنیا کی بیشتر قومیں کرتی ہیں جہاں شرحِ اموات کے مقابلے میں شرحِ پیدائش بہت کم ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کی عورتوں میں قوتِ نمو کی کمی ہے یا ان کے مرد تخلیقی صلاحیتوں سے عاری ہیں۔"

(۹)

ایک صاحب جامعہ میں پڑھاتے ہیں۔ اچھے اہلِ قلم ہیں۔ نظر میں وسعت اور فکر میں بلندی ہے۔ مسلمانوں کے مسائل سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں قلم کے غازی اور باتوں کے رسیا ہیں۔ علاقے میں آتے رہتے ہیں۔

ایک شام کو دکھائی پڑے۔ ہاتھ میں پورٹ فولیو تھا۔ جھومتے جھامتے چلے آرہے تھے تپاک سے ملے اور گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔

"آیئے پہلے ایک کپ چائے ہوجائے۔"

"چلیئے۔"

چائے خانے میں جاکر بیٹھے ہی تھے کہ موصوف کو پورٹ فولیو کھولنے کی نہ جانے کون سی ضرورت پیش آئی۔ اس میں جو یک بیک نظر پڑی تو کچھ پیکیٹ نظر آئے ان پر جلی حرفوں میں لکھا تھا "نرودھ"

"ان کی موجودگی اور اس زنبیل میں" میں نے کہا

"یہ وہی ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں" چہرہ کسی بھی قسم کے تاثر سے خالی تھا۔

"تو کیا آپ اس کے قائل ہیں۔"

"عمل کی حد تک۔"

"آپ کی تحریریں، آپ کی گفتگوئیں آپ کے دلائل تو سر تا سر اس کے خلاف صرف ہوتے ہیں۔"

"جی ہاں! وہ قال ہے یہ حال۔"

"تعجب ہے۔"

"تعجب یا کسی قسم کے تاسف کی ضرورت نہیں طنز و تعریض کا بھی محل نہیں۔ سچی اور کھری بات سُن لیجئے۔ میرے آٹھ بچے ہیں جن سے میں اور میری بیوی گراں بار ہیں۔ آپ کو معلوم ہے یہ بچے بچے نہیں ہیں، ان میں چھ جوان ہیں۔ بڑی لڑکی ہے جس کی شادی کی دن رات فکر ہے اس کے بعد چار جوان لڑکے ہیں۔ ایک دم کڑیل ماشاءاللہ۔ ان سب کو پڑھانے کے اخراجات، ان کا لباس، ان کا کھانا پینا، جوتے اگر لیتا ہوں تو برابر کے خریدنے ہوتے ہیں۔ اب وہ ہوائی چپل ہی کیوں نہ ہوں کسو سے کم نہیں آسکتے ہیں، پھر کبھی کسی کے پاس کچھ نہیں ہے کبھی کسی کے پاس۔ مجھے تقریباً ڈیڑھ ہزار پڑتے ہیں۔ مگر بجٹ خسارے کا رہتا ہے جب آخری بچی ہوئی تو مجھے اپنی بیوی سے نفرت ہوگئی۔ اُسی بیوی سے جس کا میں ہر دم دیوانہ تھا۔ مجھے اپنے گھربار سے وحشت ہونے لگی۔ گھربار کھانے کو آتا تھا۔ بعض اوقات جی چاہتا تھا کہ کہیں اِدھر اُدھر نکل جاؤں ایک وقت یہ آیا کہ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر میرے یہاں نواں بچہ ہوا تو بیوی کو طلاق دیدوں گا۔ یہ سب کچھ تھا مگر بیوی سے ارتباط تھا۔"

"تو آپ ضبط کرتے رہے۔"

"بالکل نہیں۔ یہ کم از کم میرے لئے ناممکن تھا۔"

"آخر آپ نے اُس چیز کا سہارا لیا۔ جو بیگ میں بند ہے۔"

"آپ ہی بتائیے بڑی بُرائی کے مقابلے میں چھوٹی برائی قبول کرنے میں حرج بھی کیا ہے۔"

"آپ ایسے بھائی اب بھی کہتے ہیں۔"

(۱۰)

ایک صاحب ایک انگریزی اخبار میں کام کرتے ہیں۔ اسی علاقے میں فرد کنبہ ہیں۔ پتہ چلا ۱۲ بچے ہیں۔ بے تکلف آدمی ہیں۔ بے جھجک بات کرتے ہیں کہنے لگے۔

"آپ بتائیے جب بیوی جوان ہو اور خوبصورت ہو تو نفس پر کیسے قابو رہے گا"۔ (تھوڑے توقف سے بولے)

"مگر اس کے نتیجے بہت دل دوز تھے بعض دفعہ سر چکرا جاتا تھا۔ رات کو گھر جا کر جب بچوں کی پاس پاس لیٹی ہوئی اس چھوٹی سی فوج کو دیکھتا تو دل لرز جاتا کیا یہ میں ہوں جو ان کو کھلا پلا رہا ہوں قطعاً ناممکن ضرور ایک بالا دست ہستی ہے جس پر ایمان تازہ ہو جاتا۔ مگر دل میں پچھتاوے ضرور آتے تھے۔ ہم اپنے بچوں کو وہ آسائش نہ دے سکے جو ان کو ملنی چاہئے تھی، راتوں کو اُٹھ کر میں اور میری بیوی دعائیں کرتے تھے۔"

"پھر ــــ ؟"

"پھر کیا یہ اس وقت کی بات ہے جب ہم دہلی نہیں آئے تھے ـ یہاں آئے تو مفید مشورے ملے اور مفت کی دوائیں"۔ یہ کہتے ہوئے ایک زور دار قہقہہ لگایا۔

(۱۱)

. . . صاحب سوشل ورکر ہیں بڑے سرگرم کارکن ہیں۔ علاقے کے حالات سے پوری طرح واقف ہیں۔ لوگوں کے دکھ درد میں شریک رہتے ہیں اس نئے دور کے جلوے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ جو کچھ کہتے ہیں ذاتی تجربے اور نجی مشاہدے کی بنا پر۔ ایک موقع پر گفتگو آئی تو مخاطبین کو بے تکان جواب دیتے ہوئے جو کبھی لڑنے لگے: بچوں کا پالنا محض جنم دینا اور لشٹم پشٹم زندگی گزار دینا نہیں ہوتا دو سال سے کم مدت میں دوسرے بچے کا آجانا پہلے بچے کے ساتھ پہلی ناانصافی کرنا ہے اس کے بعد یہ ناانصافی متواتر ہوتی رہتی ہے۔ رضاعت کی مدت دو سال تو اللہ میاں نے رکھ دی۔ ہر سال نوزائیدہ بچے کے آنے سے پہلے بچے کو پورے ایک سال کم دودھ ملا اپنی ماں سے۔ دودھ کے بعد ہر چیز میں دوسرا بچہ حصہ دار بنا۔ اس طرح بچوں میں ایک احساس محرومی جڑ پکڑ جاتا ہے۔ کبھی کبھی مجرمانہ ذہنیت بھی پروان چڑھ سکتی ہے۔ ایک اور رُخ لیجئے۔ زیادہ بچوں کی موجودگی میں ماں باپ نہ انہیں لکھا پڑھا سکتے ہیں۔ نہ ڈھنگ کا کھلا پلا سکتے ہیں۔ بلکہ جوں ہی دس بارہ سال کا بچہ ہوا ان کو فکر ہوتی ہے خیراد کی مشینوں یا چھوٹی صنعتوں میں بھیج کر تیس تیس چالیس چالیس روپے کمائے جائیں اس طرح یہ بچہ معاشی طور پر کفیل تو ہو جاتا ہے مگر صحت خراب رہتی ہے۔ تربیت ذہنی اور جسمانی دونوں نہیں ہو پاتی، غلط سوسائٹی ملتی ہے اس طرح بُری عادتیں پڑ جاتی ہیں گویا ایک پورا معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے جو ہو رہا ہے صرف والدین کی غفلت اور وقتی لذات اندوزی کے سبب۔

"محترم سرکار نے ابتدائی تعلیم کے لئے مفت انتظام کیا ہے۔" کسی نے ٹوکا۔

"(زیرِ خند مسکراہٹ کے ساتھ) آپ کی معصومیت پر مجھے رشک آتا ہے۔ بڑے بھائی آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے فیس کے علاوہ کتنی نت نئی فرمائشیں ہیں، جن سے ماں باپ کا ناک میں دم ہے۔ کاپی کتاب ڈرائنگ بکس، سلیٹ، قلم دوات یہ کوئی حکومت دیتی ہے۔ لباس کہاں سے آتا ہے اب اُن سے غریب والدین کا۔ جی چھوٹ نہ جائے تو کیا غلط ہے بچوں کی بے بسی بھی دیکھی نہیں جاتی عمر سے پہلے اپنی مجبوری کا احساس ان بچوں کی نفسیات کو کچل کے رکھ دیتا ہے۔ ان کی چونچال طبیعت دب جاتی ہے یا بگڑ جاتی ہے۔"

آخری تجزیے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سروے کے دوران آبادی کے جس حصے سے تحقیقِ حال کی گئی ہے۔ اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ایک وہ لوگ ہیں جو منصوبہ بندی کے سخت مخالف ہیں۔ ایمان داری سے یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے درست نہ ہوگی بلکہ انہیں کسی خلفشار میں مبتلا کر دے گی اور یہ کہ یہ کوئی حل نہیں ہے مسلمانوں کی الجھنوں کا۔ ایسے مخالفین تعداد میں بہت کم ہیں، زیادہ سے زیادہ چھوٹ دی جائے تو دس فیصد سے کسی طرح بھی زیادہ نہیں ہیں۔ ان کے اس انداز میں سوچنے کی بھی ایک سے زیادہ وجوہات ہیں یا یہ کہ وہ ایسے مذہبی افراد کے زیرِ اثر ہیں جو اس بیسویں صدی میں بھی اجتہاد کے قائل نہیں اور جن کے کچھ مفاد اور مصالح ہیں ان کے علاوہ کچھ لوگ بھی ہیں جو بدک گئے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی متبادل حل نہیں ہے اس کے باوجود وہ اس مسئلے کی اہمیت کو ماننے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہیں۔ وہ حکومت کے طرزِ عمل کے اس حد تک شاکی ہیں کہ کسی

لیت کو سننے کو بھی تیار نہیں ہوتے ۔ دوسری طرف یہ بھی صحیح ہے کہ سرکار ں ان کو اپنی بات سمجھانے کی مناسب کوشش نہیں کی ہے ۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جو نہ موافق ہیں نہ مخالف بلکہ بین بین ہیں ۔ ان کی نیں ان کی مجبوریاں کچھ کرنے پر انہیں آمادہ تو کرتی ہیں تاہم یا تو تسلسل سمجھا جاتا ہے یا نوبت نہیں آتی ۔ وہ کبھی یہ سمجھتے ہیں کہ فیملی پلاننگ کے ذریعہ یک گناہ کر بیٹھے تاہم کثرتِ اولاد کے بعد جب آزمائش شروع ہوتی تو اسے مستقل آزاری نہیں عذاب ، سمجھتے ہیں ۔ ایسا عذاب جیسے نہ عتاب زندگی کہلاتے ہیں نہ سلجھا اید ۔ اس میں ان کے حالات کو بھی بڑا دخل ہے دہلی میں جگہوں کی قلت ہے ۔ چھوٹے چھوٹے ڈربے نما مکانوں میں سے پورے خاندان رہتے ہیں ۔ ایک ۱۰ × ۱۰ یا ۵ × ۵ کی کوٹھری میں ں کے ساتھ بہن ، بھائی اور کبھی کبھی والدین بھی رہتے ہیں ۔ اس صورت ، اس غریب کو پلاننگ کے "التزام" کی فرصت ، مہلت اور موقع کہاں . اس کا بیوی سے منکوحہ کی جگہ "مغویہ" کا سا تعلق ہو جاتا ہے ۔ جگہ ت کے علاوہ تعلیم کی کمی بھی اس کا سبب بنتی ہے ۔ انتشارِ ذہنی گی میں بے قاعدگی کا موجب ہوتی ہے ۔ ظاہر ہے یہ تمام اہتمام تو وقت میں ہوتے ہیں جب زندگی باضابطہ اور باقاعدہ ہو ، ہر کام ت پر اور ہر وقت لگا بندھا مرتب و منظم ! یہاں تو عالم یہ ہے کہ کبھی ت ہیں تو چنے نہیں ، اور جب چنے ہوئے تو دانت غائب !

تیسری قسم کے وہ افراد ہیں جو منصوبہ بندی پر کاربند ہیں ۔ ان کی د ۹۰ فی صدی ہے ۔ ان میں تعلیم یافتہ بھی ہیں نیم اور غیر تعلیم یافتہ . ان کے اس شعور کا سبب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ کھل کر ارتکابِ گناہ ہے ہیں یا یہ کہ پورے غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں ۔ دراصل ت کے دباؤ نے انہیں اس پر آمادہ کیا ہے کہ وہ ایک حل خود ہی ڈھونڈ نکالیں ۔ یہی سبب ہے کہ ان کے تجربوں کی تلخی ان کی زندگیوں موجود ہے ۔ چنانچہ ان میں سے چند کے یہاں ۶ سے زیادہ بچے ہوئے ، وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں ۔ کسی کے یہاں ۶ سے کم مگر تین سے زیادہ ہوئے تب اس نے اس پر عمل کیا ہے ۔ گویا حالات کی سختی نے انہیں راہ سجھائی ہے ۔ اس میں کوئی بے باک ہے کوئی بہت شرمیلا ۔

م ہیں سب ایک ہی کشتی میں سوار ۔ کچھ لوگ لڑکیوں کی پیدائش ، ں کے بعد ان کی شادی ، شادی کے لیے رشتے کی تلاش ، شادی ے بعد بے جا رسموں کی پابندی سے تنگ آ کر اس راستے تک آئے ۔

اس سروے کے دوران چند عورتوں سے بھی ملاقات ہوئی ۔ ان سے ملاقات کے نتیجے مختلف میں چند کا تاثر اتنا شدید تھا کہ وہ "کثرتِ اولاد" کو مرد کی زیادتی ہی نہیں درندگی سے تعبیر کرتی تھیں ۔

●●

غزل

بسمل سعیدی

ہمیشہ سے یہ دنیا قتل گاہِ عام ہے شاید
زمانہ خنجرِ خوں ریز و خوں آشام ہے شاید

محبت، فطرۃً قدرت کا اک انعام ہے شاید
مگر سینوں میں جن کے دل ہیں اُن کے نام ہے شاید

جہانِ عشق، بے آغاز و بے انجام ہے شاید
نہ کوئی صبح اس میں ہے نہ کوئی شام ہے شاید

نہ رکھو بے نیازِ عشق، نازِ حسن کو اتنا
ہمارے عشق ہی کا حسن بھی اک نام ہے شاید

طبیعت پر جو طاری اک نشاطِ حزن آگیں ہے
مآلِ نغمۂ سازِ طرب، کہرام ہے شاید

مرا ایک اک نفس ہے جب تمہاری جنبشِ ابرو
تو میری زندگی تو مجھ پہ اک الزام ہے شاید

مری آنکھوں کی قسمت ہیں اگر بے خوابیاں اے عشق
تو پھر خوابِ عدم بھی اک خیالِ خام ہے شاید

نہ جانے کیوں تمہارا نام لے کر لوگ روتے ہیں
ہماری لوحِ تربت پر تمہارا نام ہے شاید

خدا کے باب میں بھی مبتلائے وہم ہے دنیا
حقیقت بھی یہاں منجملۂ اوہام ہے شاید

جنہیں عرفان و علم و آگہی کہتے ہیں ان سب کا
خرد آغاز ہے شاید، جنوں انجام ہے شاید

ہوئی ہے دوستی اپنی تو دشمن اتنے خوش کیوں ہیں
تمہاری دوستی کا دشمنی بھی نام ہے شاید

اگر ہیں پھول پیمانے تو شبنم ہے شراب ان میں
چمن کی صبح کیا ہے میکدے کی شام ہے شاید

تمہارے نام کیوں آتا عدو کا خط بجے دیدہ
تمہاری معرفت ہوگا، یہ میرے نام ہے شاید

مرے اُمڈے ہوئے دل کی طرح چھلکا ہی پڑتا ہے
مرا ساغر کسی کی زندگی کا جام ہے شاید

تو میری شاعری میں جو بھی کچھ ہے وہ تمہارا ہے
یہ میرا نام بسمل بھی تمہارا نام ہے شاید

محمد مصلح الدین

مسلمان اور خاندانی منصوبہ بندی



یہ واقعی بہت ہی بدقسمتی اور نہایت ہی افسوسناک بات ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق ہر ایک چیز کو فرقہ پرستی کا رنگ دیا جاتا ہے۔ بمثال کے طور پر یہ ہمیشہ الزام لگایا جاتا ہے کہ مسلمان خاندانی منصوبہ بندی کی مخالفت کرتے ہیں اور محض اپنی آبادی بڑھانے کے لئے ایک سے زیادہ بیوی رکھنے پر زور دیتے ہیں۔

لیکن حال کے کچھ جائزوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلمانوں نے خاندانی منصوبہ بندی کو وقت کی شدید ضرورت کے تحت بہ خوشی قبول کیا ہے۔

گو کھلے انسٹی ٹیوٹ آف پالیٹکس اینڈ اکنامکس کے علاوہ ڈاکٹر ادلسی اور ڈاکٹر ڈوگ نے دہلی میں، ڈاکٹر رفیق ذکریا نے مہاراشٹر میں اور ڈاکٹر افتخار علی خاں نے علی گڑھ میں جو سروے کئے ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کی طرف مسلمانوں کا رجحان دوسرے مذاہب کے لوگوں سے کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہے۔ اسی طرح کے بیانات مختلف ریاستوں سے ملے ہیں جن میں مدھیہ پردیش اور رجھوں و کشمیر کے نام قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر چندر شیکھر، سابق مرکزی وزیر برائے صحت و خاندانی منصوبہ بندی نے اپنے ایک بیان میں بتلایا کہ مسلمانوں میں ایک سے زیادہ بیوی ہونے کے باوجود دونوں مذاہب یعنی ہندو اور مسلمان میں تولید کا نقشہ Pattern of Fertility یکساں پایا گیا۔ کثرت ازدواج کے بارے میں انہوں نے بتلایا کہ صرف دو فیصد مسلمانوں کے پاس ایک سے زیادہ بیویاں ہیں، وزیر موصوف کا ہی ایک بڑا طویل انٹرویو پچھلے سال انڈین ایکسپریس، میں چھپا تھا جس میں انہوں نے بتایا کہ " یہ ایک مستقل شکایت ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام مسلمانوں تک پر اثر طریقہ سے نہیں پہونچ پایا ہے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے سچ تو یہ ہے کہ ان کی توجہ و رجحان اس اہم مسئلہ کی طرف ویسا ہی ہے جیسے ہمارا۔ مسلمان تقریباً ہندوؤں کے برابر تناسب میں اس مقصد کے تحت ہسپتال آتے ہیں"

مرکزی منسٹر کے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان دوسرے کسی بھی مذہب کے ماننے والوں سے خاندانی منصوبہ بندی کو اپنانے میں قطعی پیچھے نہیں ہیں اس لئے کہ یہ ایک قومی پروگرام ہونے کے ساتھ ساتھ قومی ذمہ داری بھی ہے۔ یہاں اس کام میں ناکامیابی قومی بربادی ثابت ہوگی۔

کچھ تقلید پسند مسلمانوں کا خیال ہے کہ برتھ کنٹرول اور فیملی پلاننگ اسلام کے مزاج و اصول کے خلاف ہے لیکن اسلامی قول و مذہبی واعظ کے نظریے اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اسلام ان دونوں میں کسی ایک کو بھی منع نہیں کرتا ہے۔

بقول شیخ نایم صبر، ممبر اسلامک ریسرچ کمیٹی، جامعہ ازہر مصر "اسلام نے خاندانی منصوبہ بندی اور ضبطِ تولید کی مکمل اجازت دی ہے بشرطیکہ شوہر اور بیوی دونوں اس پر راضی ہوں"

عزل جو کہ حاملہ نہ ہونے کا ایک طریقہ ہے اسے کچھ اسلامی علماء نے نامناسب سمجھا ہے۔ جبکہ دوسرے علماء اور ان کے پیروؤں نے جائز قرار دیا ہے۔ مدینہ منورہ اسلامی یونیورسٹی کے وائس چانسلر، شیخ عبدالعزیز ابن باز لکھتے ہیں "مادہ منویہ کو عورت کی شرمگاہ سے باہر گرانے کو عزل کہتے ہیں تاکہ استقرارِ حمل نہ ہو سکے۔ اگر عورت مریض ہو اور استقرارِ حمل اس کے لئے یا بچے کے لئے مضر ہو سکتا ہے تو اس مقصد اور دیگر معقول شرعی مقاصد کے تحت عزل کیا جا سکتا ہے لیکن ضرورت ختم ہونے پر اس عمل کو بھی ترک کر دینا چاہئے۔ ایسا کرنے سے حمل یا بچے کا ضیاع نہیں ہوتا بلکہ اس طرح ایک شرعی مقصد کے لئے ایسے ذرائع کا استعمال کیا جاتا ہے جس سے کچھ مدت کے لئے استقرارِ حمل ملتوی ہو جاتا ہے اور علماء کے صحیح قول کے بموجب اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور عزل سے متعلق حدیثیں اس کے جواز کی تائید کرتی ہیں"

جارڈن کے مفتی نے ۱۹۶۴ء میں فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بہت سے لوگ عزل کیا کرتے تھے۔ حضور کو اس کے بارے میں علم تھا

تھی لیکن انھوں نے کبھی کسی کو منع نہیں کیا بلکہ مختلف موقعوں پر لوگوں ـــــ کے پوچھے جانے پر آپ نے عزل کرنے کی اجازت بھی دی۔ حضور اقدس نے یہ بھی فرمایا کہ عزل فطرت کا مخالف نہیں ہے اور اسے عمل رہ گئے یا جب بھی ضرورت محسوس کی جائے، عمل میں لا سکتے ہیں۔

حضرت علیؓ نے عزل کے بارے میں فرمایا کہ اسے کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ایک شخص کے پوچھنے پر کہ کیا عزل ایک قسم کی طفل کشی ہے حضرتؓ نے جواب دیا کہ سات مرحلوں سے گزرے بغیر اسے طفل کشی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ پہلے مٹی کا جوہر بنتا ہے۔ پھر نطفہ، پھر منجمد خون کے لوتھڑے پھر گوشت کے لوتھڑے، پھر ہڈیاں، پھر گوشت اور تب جاکر کہیں ایک مخلوق تیار ہوتی ہے۔ اسے سنکر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم نے بالکل سچ کہا۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے۔

اسلامی شریعت میں بھی اجازت ہے کہ اگر معتبر ذرائع سے یہ معلوم ہو کہ عورت کے حمل سے اس کی موت ہو سکتی ہے تو حمل ختم کر دینا چاہیئے کیونکہ ماں قیمتی ہوتی ہے، اس کی زندگی قیمتی ہوتی ہے اور اسے گھر کے کام کے علاوہ اور بھی بہت سی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داریاں پوری کرنی پڑتی ہیں، اس لئے اس کی زندگی کو قربان نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی فقہ نے بھی اس بات کو عیاں کر دیا ہے کہ اگر ماں کی صحت خراب ہو یا وہ ایسی بیماری میں مبتلا ہو جس سے یہ اندیشہ ہو کہ بیماری بچے تک پھیل جائے یا اگر شوہر کی مالی حالت اتنی اچھی نہ ہو کہ بچوں کے اخراجات کا بوجھ برداشت کر سکے تو ان حالتوں میں حمل کو بلا شک وشبہ روکا جا سکتا ہے۔

جہاں تک قرآن کے قول کا تعلق ہے "ہم تمہاری اولاد کو اسی طرح روزی دیتے ہیں جیسے تم کو اس سے کبھی بھی یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ انسان اپنی کوششوں سے سبک دوش ہو جائے۔ قرآن کریم میں یہ بھی ارسال ہے کہ خدا تم کو زندگی عطا کرتا ہے اور وہی تم کو موت دیتا ہے۔

دراصل خدا ہمیں زندگی بسر کرنے کا راستہ دکھلاتا اور صرف سہارا دیتا ہے جسے ہم اپنی پوری محنت و جانفشانی کے بعد پاتے ہیں، جو لوگ محنت سے ڈرتے ہیں یا اسے کرنے میں ناکام رہتے ہیں انھیں ان چیزوں سے بھی محروم ہونا پڑتا ہے۔ بنی نوع کے اولاد کے لئے قرآن اقرار کرتا ہے لیکن اس میں کہیں بھی یہ تذکرہ نہیں کیا گیا ہے کہ ہر انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ ساری عمر بچے پیدا کرتا رہے اور اگر اس میں کوئی شخص ڈھیلا پن دکھلاتا ہے تو اس کو سزا بھگتنی پڑے گی۔ قرآن پاک میں یہ بھی ارشاد ہے کہ "خدا تمہارے لئے آرام چاہتا ہے۔ نہ مشکل" ۲/۱۲۵ اور خدا تقاضا کرتا ہے کہ تم اولاد مانگو جو تمہیں خوش اور رضا مند کرے۔" ۲۵/۴۵۔ ظاہر ہے قرآن مسلمان پر یہ فرض بالکل نہیں عائد کرتا ہے کہ وہ اولاد پیدا کرتا رہے۔ حالانکہ خاندان غربت میں پھنسا ہو، زندگی مصیبتوں اور پریشانیوں میں گھری ہو، اور جہاں ایک نئی آنے والی زندگی کو بھوکا مرنا پڑے۔

شادی ایک متبرک اور اہم ضرورت ہے لیکن انسان کی اہلیت اور طاقت کا صحیح اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ وہ کس حد تک اس حالت میں ہے کہ صحت مند اور نیک اولاد پیدا کر سکے۔ مسلمانوں میں ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ وہ زیادہ بچے پیدا کرنا خدا کی رحمت کی علامت سمجھتے ہیں اور سوچتے ہیں ــــــ کہ جن سے خدا تعالیٰ خوش ہوتا ہے ان کو زیادہ بچوں سے نوازتا ہے، لیکن قرآن شریف میں یہ بات واضح ہے کہ اولاد ہمیشہ رحمت نہیں ہوتی بلکہ مختلف موقعوں پر لعنت بھی ثابت ہوگی۔

حضرت علیؓ نے ایک موقع پر عرض کیا "بچہ پیدا کرو اور زیادہ بڑھاؤ کہ میں فخر کروں گا۔ اسلامی جسم (Islamic Corpus) پر"

اوپر کے حوالے میں تعداد پر زور نہیں دیا گیا ہے بلکہ اسلامی جسم کی صفت پر جو کہ قابل فخر ہے۔ دوسری روایت ہے جہیں حضور فرماتے ہیں،، اے نوجوان لوگو! تم میں سے جو آمدنی کے لحاظ سے شادی کرنے کے لائق ہو، انھیں شادی کر لینی چاہیے، اور جو لوگ شادی کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں، انھیں فاقہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ فاقہ بیماری کو دور رکھتا ہے "

یہ خیالی اعتراض کہ خاندانی منصوبہ بندی انسانی زندگی کے شان و مرتبے کے لئے ایک آفت ہے بالکل دو دھاری تلوار کی طرح ہے۔ اس کے برخلاف خاندانی منصوبہ بندی یہ ثابت کرتی ہے کہ انسانی زندگی کی قیمت و قدر ہوتی ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی نے انسانی زندگی کو سستا کر دیا۔ بنی آدم کے اس گروہ کو جو دھکے کھاتا ہے گلی کوچوں میں لاٹھی لیکر بھیک مانگنے کے لئے ہتھیلی بڑھاتا ہے اور ناکافی غذا پاتا ہے خود پچھتاوا ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا میں کیوں آیا۔

آج جب کہ ہم لوگ اپنے ملک میں سنجیدگی سے ـــــ شہری جائیداد آمدنی کے لئے حد بندی کی تجویز کر رہے ہیں اور جب کہ خوراک، پوشاک تعلیم، گھر، قصبہ و شہر میں پلاننگ کی جاتی ہے تو ہم اپنے خاندان کی پلاننگ سے کیوں انکار کریں، کہ ایک آدمی کے پاس کتنے بچے ہونے چاہئیں اور وہ کب ہوں، بے شک یہ ہر شہری کا بنیادی حق ہے اور وہ آزاد ہے حد کو پسند کرنے کا اور بچوں کی تعداد میں کمی کرنے کا جس پر ہماری ساری آنے والی نسلوں کی قسمت کا مستقبل منحصر ہے۔

ہر بڑے اور اچھے مذہب کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ عملی مسائل کے لئے اخلاقی حل تجویز کرے۔ اسلام بلاشبہ ایک بہت ہی شاندار اور جاندار

(بقیہ صفحہ ۱۸ پر)

ظہورالحق

دین اسلام اور فیملی پلاننگ

عوام کی زندگی باقاعدہ بنانے میں دین بلاشبہ ایک اہم اور نمایاں حصّہ ادا کرتا ہے۔ فیملی پلاننگ کے متعلق مذہبی عقیدہ کسی بھی قوم میں اس پروگرام کو روبہ عمل لانے کا زبردست باعث بن سکتا ہے۔ رومن کیتھولک فرقے میں مذہبی قیود کے باعث یہ پروگرام زیادہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ اگرچہ حال ہی میں پوپ نے تقلیل عیال کے حق میں فتویٰ دیا ہے۔ مسلمانوں کا سماجی اور ثقافتی پس منظر عیالِ کثیر رکھنے کے حق میں ہے۔ مسلمانوں میں یہ عام خیال ہے کہ دینِ اسلام عیال کثیر رکھنے کی حوصلا افزائی کرتا ہے اور بچّوں کی پیدائش پر کوئی پابندی عاید کرنا مذہب کے سراسر خلاف ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی شرح پیدائش دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ ہے، قطع نظر اس کے کہ ان کی اقتصادی حالت اور دوسرے وسائل کیسے ہیں ۱۵-۱۸

مسلمانوں میں مستند علماء زیادہ تر فیملی پلاننگ پروگرام کے حق میں ہیں۔ اردن اور مصر کے مفتی اعظم، ڈائرکٹوریٹ آف رلیجس آفیرز ترکی اور جامع مسجد دہلی کے مشہور امام اور مسلمانوں کے دوسرے بہت سے علمائے بھی ضبط تولید کے حق میں فتاویٰ شائع کئے ہیں، اور اسلامی نظریے کی تشریح قرآن پاک، سنت، اور احادیث نبوی سے کی ہے۔

دینِ اسلام کی بنیاد اولاً قرآن پاک پر، ثانیاً احادیث پر اور ثالثاً مسلمانوں کے علماء کی آراء پر ہے۔ (قرآن ۴، ۵۹) ۱۲ ان امور کی روشنی میں آیئے ہم اس امر کا جائزہ لیں کہ اسلام فیملی پلاننگ کے بارے میں کیا فرماتا ہے۔

شادی اور سلسلۂ تناسل

شادی اور سلسلہ نسب ازدواجی زندگی کے بنیادی ضابطے ہیں، اسلام میں شادی ایک مقدس معاہدہ ہے جس سے عام حالات میں ہر مسلمان کو گزرنا ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے۔

"اور جو تم میں مجرد ہیں، ان کے نکاح کر دو۔ اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے بھی جو صلاحیت رکھتے ہوں۔ اگر وہ محتاج ہوں گے۔ تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا اور اللہ فراخی والا اور علم والا ہے۔ (۲۴-۳۲)

حضور رسول مقبول صلعم نے فرمایا ہے۔

"تم میں سے جو نکاح کی توفیق رکھتا ہے تو نکاح کرے۔ وہ نظر کو نیچے رکھتا ہے۔ اور پاکدامنی کا موجب ہے اور جسے توفیق نہیں تو وہ رکھی بھی، روزہ رکھے۔ یہی اس کے لئے انقطاعِ شہوت کا موجب ہے۔

(صحیح البخاری ۳۰، ۱۰)

نیز فرمایا۔

"جب خدا کا بندہ شادی کرتا ہے تو وہ اپنے نصف دین کی تکمیل کرتا ہے۔ باقی نصف کے لئے اسے خوفِ خدا کرنے کی ضرورت ہے (مشکوٰۃ ۱۱۱۳)

پس دینِ اسلام مجرد حالت میں رہنے کے خلاف ہے اور شادی کرنے اور اس کی ذمہ داریاں برداشت کرنے کو ہر شخص کا فرض قرار دیتا ہے ۹

اگرچہ شادی کی اولین غرض و غایت افزائش نسل ہے تاہم ازدواجی زندگی کے اور بھی اہم فرائض ہیں کیونکہ نسل انسانی کا پھیلاؤ شادی کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ شادی اور ازدواجی زندگی سماج میں تحفظ و تقویت بخشتی ہے۔ اخلاق اور نیکی کو قائم رکھتی ہے۔ اور خاندان کے مختلف افراد میں امن و محبت اور اتحاد و صلح پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔ قرآن پاک فرماتا ہے:

"وہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا (مرد اور عورت دونوں ایک ہی جوہر سے بنائے گئے - ۱۶، ۷۲) اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اپنے (عام طور پر مرد اپنے رفیقِ حیات عورت) جوڑے سے آرام حاصل کرے" (۷، ۱۸۹)

پھر فرمایا۔

"اور وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں اپنی بیویوں سے اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما (۲۵:۷۴)

پھر فرمایا۔

"اور اس کے نشانوں میں سے ہے کہ تمہارے لئے تمہارے نفسوں سے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم ان سے تسکین پاؤ۔ اور تمہارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا۔" (۳۰:۲۱)

اگرچہ شادی کرنا اسلام کا ضروری رکن ہے۔ اور حضور آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ:

"محبت کرنے والی بچہ خیز عورت کیساتھ شادی کرو، تاکہ میں اقوام میں تم پر فخر کروں" ۲۲ اس کے باوجود شادی کرنے پر ایک شرط عائد ہے چنانچہ قرآن فرماتا ہے کہ:۔

"اور شادی سے قبل رہنے کو مکان حاصل کرو، جو شادی نہیں کر پاتے محدود وسائل کے باعث، وہ اپنے تئیں بچائے رکھیں۔ یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے انہیں غنی کر دے۔ (۲۴ - ۳۳) ۱۹

حضور پیغمبر صلعم نے فرمایا۔

"اے نوجوانوں کے گروہ! جو تم میں سے نکاح کر سکتا ہے تو اسے نکاح کرنا چاہئے۔ کیونکہ وہ نظر کو بچائے رکھتا ہے۔ اور شرمگاہ کے لئے حفاظت کا کام دیتا ہے اور جو استعداد نہیں رکھتا تو وہ روزہ رکھے۔ کیونکہ اس سے وہ بچ کر رہیگا۔"

(بخاری ۶۷:۲) ۱۰-۹

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام اقتصادی حالت کی بنا پر عیال کو محدود رکھنے کی سفارش کرتا ہے اور اقتصادی سختی فیملی پلاننگ کو جائز قرار دینے میں خاص وجہ ہے۔

بچوں کی رکھوالی کا تاکیدی حکم

شادی کا مقصد جیسا کہ بتایا گیا ہے محض بچے پیدا کرنا ہی نہیں ہے۔ تمام والدین کا فرض ہے کہ اہل و عیال کی رکھوالی کریں۔ بچوں کو کافی غذا لباس، اور تعلیم بہم پہنچائیں۔ ان کی حفاظت کریں۔ ماں پر قرآن پاک میں لازم کیا گیا ہے وہ برابر دو سال تک بچے کو دودھ پلائے۔

"اور مائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال دودھ پلائیں" (۲:۲۳۳) ۱۹

پس یہ ضروری ہے کہ جو حالات اس حکم میں خلل پیدا کریں انہیں دور کیا جائے۔

"اور ہم نے انسان کو تاکیدی حکم دیا ہے۔ نیکی کرنے کی (۲۳:۲۰۲) ماں باپ کے حق میں (کیونکہ، اس کی ماں ضعف پر ضعف کی حالت میں اسے (پیٹ میں) اٹھاتی ہے۔ اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہوتا ہے۔ ماں باپ دونوں کو بچے کے لئے بہت جسمانی، ذہنی اور مالی سختیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں، ۲:۲۳۳) کہ میرا شکر کر اور اپنے ماں باپ کا بھی (کیوں کہ ہم نے تمہاری پرورش کے لئے ضروری محبت اور توجہ سے کام کیا)، میری طرف انجام کار آنا ہے (اپنے اعمال کی جوابدہی کے لئے)

(القرآن ۳۱ - ۱۴)

پھر فرمایا۔

"اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ نیکی کا حکم دیا ہے" (۲۳۱۱-۲۴) اس کی ماں نے اسے تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور اسے تکلیف سے جنا۔ اور اس کا حمل میں رکھنا اور اس کا دودھ چھڑانا تیس مہینے تک ہے۔ کیونکہ اس مدت کے بعد عورت کو صحت بنانے کا وقفہ ملنا ضروری ہے (۴۶:۱۵) ۲۰

والدین کو ہدایت ہے کہ بچے کی پرورش کے دوران وہ بلاوجہ زحمت نہ اٹھائیں (قرآن ۲: ۲۳۳) مردوں کو بھی آیات ۸: ۲۸ اور ۶۴:۱۵ میں بچوں کو غلط راہ پر لگانے سے متنبہ کیا گیا ہے حصول تعلیم پر خاص زور دیا گیا ہے پیغمبر صلعم نے مسلمانوں کو ہدایت کی ہے۔ کہ حصول تعلیم کے لئے وہ چین جیسے دور دراز ملک میں بھی جائیں۔ قرآن پاک کی جو پہلی آیت حضور محمد مصطفےٰ صلعم پر نازل ہوئی۔ اس میں حکم ہے کہ "پڑھو" (قرآن ۹۶:۱)

لہٰذا یہ ضروری ہے کہ جب بچے پیدا ہوں تو ان کی مناسب پرورش اور تربیت کی جائے۔ محبت اور کامل توجہ سے کافی تعلیم دیکر ان کی جسمانی و روحانی فلاح و بہتری کا سامان کیا جائے۔ تاکہ ان کا مستقبل روشن اور تابناک بنے۔ وہ اتنے زیادہ نہیں ہونے چاہئیں کہ ذلت اور بے عزتی کی زندگی گذاریں، فیملی پلاننگ کا مقصد خاندان کی باقاعدگی ہے نہ کہ محدودیت۔ ایک بچہ مرضی سے وجود میں آجاتا ہے۔ نہ کہ اتفاقیہ طور پر۔ ایسا جب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب ضبط تولید کے تعمیری پروگرام پر عمل کیا جائے۔

فیملی پلاننگ کا مطلب بچوں کا قتل نہیں

بچوں کے قتل کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب فی الواقع انسانی بچے قتل کئے جاتے۔ یہاں جن طریقوں کی سفارش کی جاتی ہے ان سب کا مقصد مرد و عورت کے اختلاط کو روکنا اور حمل کو وقوع میں آنے نہ دینا ہے۔ جب حمل ہی وقوع میں نہ آئے تو بچوں کے قتل کئے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے نہ کسی شخص کو کسی ایسے شخص کے قتل کا ذمہ دار گردانا جا سکتا ہے۔ جو کبھی پیدا ہی

نہیں ہوا ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس طریقہ سے مادہ تولید (جو انسانی جان نہیں کہلاتا) کو ضائع کیا جاتا ہے تو یاد رہے کہ مادہ تولید کو تباہ کرنے کا مطلب انسانی قتل نہیں ہے۔ افزائش نسل کے لئے ۔ ہم کروڑوں میں سے صرف ایک جاندار کیڑا بوقت جماع رحم کو ہمکنار ہوتا ہے۔ اور باقی سب ضائع ہوجاتے ہیں۔ اگرچہ سارے جاندار کیڑے انسانی جانوں کو وجود و فروغ دے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے دنوں کی مباشرت میں کوئی بار آوری نہیں ہوتی ہے اور کروڑوں انسانی جاندار کیڑے ضائع ہو جاتے ہیں۔ شادیاں تاخیر کیساتھ بڑی عمروں میں انجام پانے سے بھی کافی حد تک بچوں کی زیادہ پیدائش کو روکا جا سکتا ہے۔ اس طرح اگر لوگ افزائش نسل کے سارے مواقع سے استفادہ کرتے تو بچوں کی پیداوار بیشمار ہوتی۔ کیا کوئی اپنے کو محض اس لئے مجرم گردان سکتا ہے۔ کہ اس نے ان سب انسانی جانوں کو پیدا کیوں نہیں کیا جنہیں وہ وجود میں لا سکتا تھا۔

چاہے جو بھی دلائل پیش کئے جائیں۔ ثابت یہی ہوگا کہ مادہ تولید کو جاندار انسانی وجود قرار نہیں دیا جا سکتا اور ضبط تولید کے طریقے کو کسی طرح بھی انسانی جانوں کا قتل قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ صلا (۴)

قرآن پاک نے کسی وجود انسانی کے مارنے کے متعلق صاف طور پر فرمایا ہے کہ

" آؤ میں پڑھکر سناؤں جو تمہارے رب نے حرام کیا ہے۔ تم پر واجب ہے کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔ اور اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو۔ (جسمانی یا ذہنی طور پر تعلیم سے محروم رکھکر۔ کیونکہ حصول تعلیم کے بغیر انسان مُردے کے مانند ہے) ہم تم کو رزق دیتے ہیں۔ اور ان کو بھی" دلیں پیدا ہونے کے بعد تم بچوں کو نہیں مار سکتے ہو"۔ (القرآن ۶: ۱۳۱) صلا

عرب اپنے بچوں کو تین وجوہ کی بناء پر ہلاک کیا کرتے تھے۔

۱۔ اقتصادی بدحالی کی وجہ سے ۔ اسی لئے خدا نے فرمایا ہے۔
" اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو"

۲۔ لڑکیاں پیدا ہونے کی وجہ سے شرمساری ہونے پر (القرآن ۱۶: ۵۸، ۵۹)

۳۔ اور دیوتاؤں کے جوش غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لئے (القرآن ۶: ۱۳۸)

یہ سب وجوہ ان بچوں سے متعلق ہیں جو زندہ پیدا ہو جاتے تھے لیکن جس طریقے پر بھوکے اور نادار لوگ عصر حاضر میں بے سہارا بچوں کو پیدا کرتے ہیں، اور عمر بھر کے لئے انہیں موت کے منہ میں دھکیل دیتے ہیں، وہ زیادہ جرم و خطا ہے بہ نسبت اس کے کہ انہیں ایک ہی بار ہلاک کر دیا جائے جس طرح کہ پرانے زمانے میں غیر مہذب قوموں میں رواج تھا۔ قرآن مجید بھی یہی فرماتا ہے۔

" فتنہ قتل سے بڑھکر سخت ہے۔" (۲: ۱۹۱، ۲۱۷)

ایسے والدین اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو اس جہنم میں جھونک دیتے ہیں جہاں نہ زندگی ہے اور نہ موت۔ جیسا کہ قرآن پاک کی ان آیات میں فرمایا گیا ہے۔

۱۱۷۱ ار ۲۰: ۷۴، ۳۶۱۳۵ و ۳۴: ۷۷ اور ۸۷: ۱۳

خلفائے اسلام حضرت علیؓ حضرت عمرؓ وغیرہ کی رائے میں " بچوں کا قتل جس کا ذکر آیات ۶: ۱۵۲ اور ۱۷: ۳۱ میں آیا ہے۔ خارج از بحث ہے۔ جب تک کہ بچہ سات مراحل پورے نہ کرے کیونکہ قرآن پاک ان سات مرحلوں کا ذکر آیات ۲۳: ۱۲-۱۴ میں سائنٹیفک طریقے پر کرتا ہے۔ یعنی:

(۱) منی کا خلاصہ نکلنا (۲)، رحم کے اندر نطفہ (۳) لوتھڑا بننا (۴)، گوشت کا ٹکڑا (۵)، ہڈیاں بننا (۶)، ہڈیوں پر گوشت چڑھنا۔ اور آخرکار (۷)، روح پھونک کے نئی ہستی کا وجود میں آجانا۔

فقہائے اس سے یہ مراد لیا ہے کہ جب تک حمل انسانی بچہ کی شکل اختیار نہ کرے اسے گرانا جائز ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قرار حمل کے ۱۲۰ دن بعد بھی لوتھڑا انسانی وجود نہیں ہوتا۔ حنفی اور مالکی جیسے کٹر فریق اور دوسرے فقہا بھی بچہ میں روح کے نفوذ سے پہلے ضیاع حمل کو جائز قرار دیتے ہیں۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ بھی قرار حمل کے بعد ۱۲۰ دنوں میں حمل گرانے کو بچوں کا قتل قرار نہیں دیتے ۲۲ اس لئے قرار حمل سے پہلے مادہ تولید کو ضائع کرنا انسانی وجود کے قتل کرنے کے مترادف نہیں ہے۔

بچے ۔ خدا کے تحائف ہیں

بچے خدا کا عطیہ سمجھے جاتے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ان کی اچھی دیکھ بھال کریں، تاکہ یہ مناسب تربیت پاکر بڑے ہو جائیں۔ اچھی تعلیم حاصل کریں۔ اور ملک کے اہم فرزند ثابت ہوں۔ بجائے اس کے کہ یہ نامناسب و ناکافی غذا پائیں، چیتھڑے پہنیں، ناخواندہ ہوں۔ احتیاج، جرائم اور غیر سماجی ماحول میں ڈالے جائیں اور مجرم بنیں

پانی خدا کی بہت بڑی نعمت ہے جس کے بغیر ہماری زندگی قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کی اہمیت کا احساس ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب کنواں خشک ہو، اور جب انسان اور حیوان ہزاروں کی تعداد میں مرنے لگیں۔ لیکن اگر خدا زیادہ پانی برسائے جس سے تباہ کن سیلاب آجائیں تو اس سے ہماری جائیداد، فصل اور زندگی بھی غارت ہو جاتی ہے۔ اگر خدا ایک لمحہ کے لئے ہوا کو واپس لے لے۔ تو اس سے تباہی اور ہلاکت رونما ہوگی۔ دوسری طرف آندھی، طوفان اور جھکڑ چلنے سے تباہی اور ہلاکت رونما ہوتی ہے۔ اگر موسم گرم ہو جائے تو لو چلنے سے آدمی مر جاتے ہیں، اور جب موسم زیادہ سرد ہو جائے تو اس سے بھی منجمد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پانی، ہوا، دھوپ اور ہر چیز جو خدا کی طرف سے ہمیں میسر ہے، بلا کسی شک و شبہ کے رحمت کے مترادف ہے جب تک کہ یہ ہماری مناسب ضروریات و اعتدال کے مطابق ہیں۔ لیکن اگر یہ چیزیں ہم سے چھن جائیں، یا ضرورت سے زیادہ ملیں تو ان سے پریشانی، مصیبت اور تباہی لاحق ہوگی۔ اس افراط کی حالت یا نعمت سے محرومی یعنی اعتدال سے بڑھنے کی حالت کو قرآن میں "جہنم" اور اعتدال کی حالت

کو جنت کہا گیا ہے۔

"نہ اس (جہنم) میں ٹھنڈک پائیں گے نہ پینے کی چیز، سوائے ابلتے ہوئے اور سخت ٹھنڈے پانی کے بدلہ (موافق) (اعمال ہے) (۷۸ : ۲۴-۲۵) بالکل اسی طرح بچے بغیر کسی شک کے بیش قیمت تحائف اور خدا کی رحمت ہیں، جب تک وہ ہماری مرضی اور انتظام کے مطابق پیدا ہو جائیں۔ کیونکہ تعداد کے بجائے معیار پر انحصار ہوتا ہے۔ غیر ضروری اور لامحدود آبادی کے پھیلنے سے دکھوں، پریشانیوں اور تباہیوں کا سامنا ہوگا۔ اور یہ رحمتِ خداوندی کے بجائے ایک جہنم ثابت ہوں گے۔

قرآن پاک خاندان میں بیوی بچوں کے ساتھ خوشگوار ماحول میں رہنے کی دعا کرنا سکھاتا ہے،

"اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں سے اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما (ان کی شاندار زندگی دیکھ کر) ۲۵ : ۷۴"

یہ اس لئے ہے تاکہ ایک خاندان فرحت، خوشی اور رحمت کا باعث بنے۔ اس لئے نہیں کہ کسی شخص کے وسائل حد سے بڑھ کر اس کے لئے مصائب و آلام، پریشانی اور لعنت کا موجب بن جائیں۔ قرآن کریم آیات ۲۳ : ۵۵-۵۶ میں یہی فرماتا ہے

"کیا یہ خیال کرتے ہیں، یہ جو ہم ان کو (دنیاوی) مال اور بیٹوں سے مدد دے رہے ہیں، تو ہم ان کو بھلائی پہنچانے میں جلدی کر رہے ہیں نہیں، یہ آزمائشیں ہیں بلکہ وہ محسوس نہیں کرتے (کہ نیکی کئے بغیر ان سے انہیں خوشی حاصل نہیں ہوتی) (۲۳ : ۵۵، ۵۶) مال اور اولاد سے انسان کو پریشانیاں ہوتی ہیں، آزمائشوں اور جذبات میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ قرآن کریم میں مرقوم ہے:

"اور جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد آزمائش ہے" (۸ : ۲۸) ۶۴

"تمہارے مال اور تمہاری اولاد صرف ایک آزمائش ہے (کیونکہ اگر تم باقاعدگی سے ان کی دیکھ بھال نہ کر سکو یا ناجائز طور پر استعمال کرو تو وہ تم کو زوال کی طرف لیجائیں گے۔ یا تمہارا ان سے لاڈ، پیار تمہیں خدا کی راہ سے دور کر دیگا) (۶۴ : ۱۵)۔ لہٰذا والدین کے لئے ضروری ہے کہ دانشمندی سے بچوں کو ضرورت کے مطابق ہی حاصل کریں۔

فیملی پلاننگ خدا کی منشا کے خلاف نہیں

تقدیر کا مسئلہ بہت ساری اقوام بالخصوص مسلمانوں میں اب بھی مانا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے تقدیر کا لکھا مٹایا نہیں جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر بچوں کو پیدا ہونا ہے تو ہماری روک تھام کی کوششوں کے باوجود بھی وہ پیدا ہو جائیں گے۔ اس لئے ضبطِ تولید کے ذرائع اختیار کرنا منشاءِ الٰہی کے خلاف ہے اور ان سے قہر نازل ہوگا۔ بچوں کی پیدائش سے متعلق ایسا عقیدہ رکھنے والوں سے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا روزمرہ کے دوسرے معاملوں کے متعلق بھی ان کا ایسا نظریہ ہے۔ کیا وہ کاشتکاری کے بغیر بھی فصل اگا سکتے ہیں، یا کھانا تیار کئے بغیر ہی اسے کھا سکتے ہیں؟ خدا نے کھانے کے لئے منہ دیا ہے لیکن اس کے لئے ہمیں کام کرنا ہے۔ اگر دشمن ہمارے ملک پر حملہ کرے گا تو ہم تقدیر پر بھروسہ کر کے گھروں میں نہیں بیٹھ سکتے۔ اگر گھر میں آگ لگے گی، تو ہم تماشائی بن کر نہیں رہیں گے۔ تاکہ تقدیر پوری ہو، اگر ہمارے بچے خطرے اور مصیبت میں ہوں تو ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں رہیں گے۔ اگر ہم بیمار پڑیں تو علاج کے بغیر تقدیر کا دامن نہیں تھامیں گے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اور زمین پر خدا کا خلیفہ یا نائب ہے۔ (قرآن ۲ : ۳۰) اسے خدا نے کام کرنے کے لئے ہاتھ دیتے ہیں، کھڑا ہونے کے لئے پاؤں، دیکھنے کے لئے آنکھیں، سننے کے لئے کان اور سمجھنے کے لئے دماغ دیا ہے۔ انسان کو شعور عطا کیا، اور وہ بہت حد تک اپنی تقدیر کا آپ بنانے والا ہے۔ قرآن فرماتا ہے

"انسان کے لئے کچھ نہیں مگر وہی جو وہ کوشش کرتا ہے۔ (۵۳ : ۳۹)

اس لئے وہ بغیر سعی و جہد کئے تقدیر پر اپنے کو نہیں چھوڑیگا۔ ترقی کر کے پھلنا اور پھولنا چاہئے تو عمل کئے بغیر نہیں رہے گا۔ پسینہ بہائے بغیر میٹھا نہیں کھایا جا سکتا ہے۔ تکلیف کے بغیر فائدے اور مشکلات کا سامنا کئے بغیر بلند مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ:

"یقیناً ہم نے انسان کو مشقت کے لئے پیدا کیا ہے (۹۰ : ۴)

جنت میں بھی ڈولی یا پالکی میں بیٹھ کر نہیں جانا ہوتا ہے۔

"اے انسان تو سخت کوشش کر کے تو اپنے رب کی طرف پہنچنے والا، پھر اسے ملنے والا ہے" (۸۴ : ۶) انسان عمل نہ کرنے کے باعث خداداد نعمتوں سے محروم رہ جائیں گے۔ اور عمل کے بغیر تقدیر کی کورانہ تقلید کرنے سے خدا کے عذاب کے طالب بنیں گے۔

آباؤ اجداد کے طریقوں کی اندھی تقلید کرنے کی مذمت قرآن پاک نے ان آیات میں کی ہے۔ ۲ : ۱۷۰، ۵ : ۱۰۴، ۳۱ : ۲۱، ۴۳ : ۲۲-۲۳ وغیرہ

قرآن پاک ہمیں عقل و فہم اور شعور سے کام لینے کا تاکیدی حکم دیتا ہے تاکہ تمام سوالات کے جوابات ملیں۔

"اللہ کے نزدیک سب جانداروں سے بدتر وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ (۸ : ۲۲) انسانیت کی ترقی کے لئے بہترین سمجھ اور قواعد کا صحیح اور منصفانہ استعمال ضروری ہے۔ جو خدا کی منشا کے عین مطابق ہے۔ انسان اگر اولاد کا خواہشمند ہے تو اس کے لئے وہ آسمان پر نظر نہیں رکھتا ہے کہ وہاں سے نازل ہوں، بلکہ اسے چند شرائط یا احکام قدرت پورے کرنے پڑتے ہیں۔ اسی طرح اگر بچے نہیں چاہتا ہے تو اس کے لئے بھی کچھ طریقے اختیار کرنے اور قواعد کی متابعت کرنی پڑتی ہے۔

فیملی پلاننگ اسلام کے خلاف نہیں

بہت سے دلوں میں شکوک و شبہات ہیں کہ آیا قرآن و سنت

کی رُو سے ضبطِ تولید جائز یا ناجائز ہے ہم نے دیکھا ہے کہ اسلام ضبط تولید کی تلاش کا قائل ہے اب ہم مزید اس امر کا جائزہ لیں گے کہ اس آئے دن کے اہم مسئلہ پر اسلام کیا کہتا ہے۔

قرآن یک چودہ سو سال پہلے نازل ہوا جب کہ کثرت آبادی کا سوال نہ تھا اور نہ ضبط تولید کا پروگرام دنیا کے کسی حصے میں نافذ عمل تھا اس لئے قرآن میں اس کے بارے میں صاف اور صریح الفاظ میں ذکر نہیں کیا گیا۔ لیکن قرآن کی آیت ۲۵ - ۲۳ میں درج ہے کہ اس میں کسی بھی سوال کا جواب یا حل مل سکتا ہے جو دنیا میں کسی بھی وقت درپیش ہو۔ لیکن ہمیں غور و خوض کے ساتھ اس غرض کے لئے ہمیں اس کا مطالعہ کرنا ہے (قرآن ۳۸ : ۲۹) صلا۱

قرآن مجید عام حالات میں تفصیلی قواعد پیش کرنے سے عمداً گریز کرتا ہے۔ مثال کے طور پر آیت ۵ : ۱۰۱ میں بیان ہے:

"اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، بہت چیزوں کے متعلق سوال نہ کرو یہودیوں کی طرح ۲ : ۶۷ - ۷۱، کہ اگر تمہارے لئے ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں تکلیف دیں اور اگر تم ایسے وقت میں ان کے متعلق سوال کرو جب قرآن نازل کیا جا رہا ہے تو تمہارے لئے ظاہر کر دی جائیں گی۔ (۵ : ۱۰۱)

آبادی کا سوال بلا شبہ دنیا بھر میں اہم اور پیچیدہ سوال ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

"آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو کامل کر دیا۔ اور تمہارا دین اسلام ہونے پر راضی ہوا۔" (۵ : ۳)

اس لئے تمثیلی طور پر قرآن میں آبادی کے مسئلہ کے متعلق مکمل رہنمائی ہونی چاہئے۔ اگرچہ اس میں صراحت کے ساتھ یہ ذکر نہیں کہ کتنے سال تک کوئی شخص بچے پیدا کرتا رہے یا کتنے بچے حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے کو سٹرالائیز کرے باایں ہمہ جیسا کہ مذکورہ بالا بحث سے ظاہر ہے قرآن پاک اور احادیث نبوی فیملی پلاننگ کے فلسفہ کی حمایت کرتے ہیں۔ اسلام فرد کی آزادی کی بہت قدر کرتا ہے۔ اس لئے تفصیلات کو افراد پر چھوڑا گیا ہے۔ تاکہ وہ حسب خواہش حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کام کریں۔

قرآن اور مانعِ حمل طریقے

اب ہم اس امر کا جائزہ لیں گے کہ کیا مانع حمل طریقے استعمال کرنا قرآن کی رو سے جائز ہیں، قرآن پاک نے ایک خاوند کو آزادی دی ہے کہ وہ کسی بھی وقت اور کسی بھی حالت میں بیوی کے پاس جا سکتا ہے۔

"یہاں تک کہ وہ صاف ہو جائیں (حیض کے بعد) پھر جب غسل کریں تو ان کے پاس جاؤ جس طرح تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے۔"

(۲ : ۲۲۲) (۳۰ : ۲۱) صہ۲

"تمہاری عورتیں تمہارے لئے کھیتی ہیں۔ تاکہ بچے پیدا کریں اور عورت ہی کی تربیت پر بہترین اور صالح سوسائٹی کا دار و مدار ہوتا ہے) ۲ : ۲۲۳ پس جب چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ اور اپنے لئے رکھو اچھے عمل، آگے بھیجو تسکین محبت اور نیک اولاد کی صورت میں۔ ۲۵ : ۷۴ ۳۰ : ۲۱ (۲ : ۲۲۳) ۳۰

لہذا قرآن پاک میں بیوی کے پاس جاتے وقت مانع حمل طریقے اور حمل روک آلات استعمال کرنے کی کوئی پابندی یا ممانعت نہیں ہے صلا۱. ۱۵)

مانعِ حمل کے متعلق احادیث

بہت سی مستند احادیث میں جو عزل (انزال سے پہلے اخراج) کو جائز قرار دیتے ہیں ایک صحابہ ابو سعد رض سے روایت ہے کہ حضور آنحضرت صلعم نے جنگ کے دوران مقبوضہ لونڈیوں کے ساتھ عزل کرنے کی اجازت دی ہے صلا ۔ ۲۲۔

دوسری روایت میں مرقوم ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلعم سے پوچھا۔

"میری ایک جوان بیوی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے حمل رہے اور میری وہی خواہش ہے جو سب مردوں کی ہوا کرتی ہے لیکن یہودی کہتے ہیں کہ عزل کرنا خفیف انداز میں بچوں کے قتل کرنے کے مترادف ہے۔" رسول اللہ نے جواب میں فرمایا۔

"یہودی جھوٹ کہتے ہیں۔ اگر خدا چاہے کہ بچہ پیدا ہو تو تم اسے ایسا کرنے سے نہیں روک سکتے۔" صلا۲

یہاں عزل کے طریقہ کو روا رکھنا خاوند کی مرضی پر منحصر قرار دیا ہے۔

ابو سعد رض سے دوسری روایت ہے کہ۔

"ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ۔ میری ایک غلام لونڈی ہے اور اس کے ساتھ عزل روا رکھتا ہوں۔ اور میں نہیں چاہتا کہ اسے حمل رہے۔ لیکن میری وہی خواہش ہے جو سب مردوں کی ہوا کرتی ہے۔ لیکن یہودی کہتے ہیں کہ عزل کرنا چھوٹے پیمانے پر بچوں کے قتل کے مترادف ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا۔ یہودی غلط کہتے ہیں، اگر خدا کسی بچے کو پیدا کرنا چاہے تو تم اسے ایسا کرنے سے روک نہیں سکتے۔ ۱۱ صلا۱

اقتصادی مشکلات کا بیان بھی احمد بن حنبل رح کے ذریعہ آیا ہے۔ جہاں ایک شخص عزل کو روا رکھتا ہے۔ اس ڈر سے کہ کہیں بچہ پیدا نہ ہو جائے پیغمبر صلعم نے اس کی اجازت دی، اور فرمایا کہ اگر یہ نقصان دہ ہوتا تو فارس اور روم کے لئے بھی ہوتا ہے عزل کے حق میں اجازت کی تصدیق صحیح بخاری میں بھی ہے جہاں ایک صحابہ سے مروی ہے:

"ہم رسول اللہ کے زمانے میں عزل سے کام لیا کرتے تھے۔ جبکہ قرآن

نازل ہو رہا تھا۔ ۲۲ اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر اس کی ممانعت ہوتی تو قرآن نے اس پر عمل کرنے سے منع کا حکم دیا ہوتا۔ بہت سے احادیث صحیح مسلم مسند احمد، اور سنن ابن ماجہ میں آئے ہیں جن میں عزل کرنے کی اجازت ہے ۱۸ عزل کرنے کے لئے اجازت چاروں مسلم فقہا کے طریقوں میں رہی ہے ۲۲ البتہ آزاد عورت کے ساتھ عزل کا طریقہ روا رکھنے سے متعلق اس کی اجازت ضروری ہے جب کہ غلام لونڈیوں سے اجازت ضروری نہیں ۱۸ البتہ ایک حدیث نبوی یہ بھی ہے کہ ایک شخص جو نکاح نہیں کرتا اور عیال سے ڈرتا ہے۔ وہ ہم میں سے نہیں"

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسا شخص امت محمدیہ کا فرد نہیں رہتا ہے بلکہ یہ کہ وہ سنت نبوی پر عمل نہیں کرتا۔ اور پیغمبر کا عمل بہترین عمل ہے ۱۸ مذاہب اسلام کی رو سے ایک شخص اقتصادی وسائل نکاح کرنے کی رکھتا ہے تو یہ غیر اسلامی طریقہ قرار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ بچوں کی پیدائش کو اپنے وسائل کے مطابق محدود رکھے۔ ۱۹ یہ امر واضح رہے کہ ضبط تولید شادی کرنے سے نہیں روکتا ہے۔ بلکہ عیال کو محدود رکھنا چاہتا ہے۔ دوسری حدیث میں رسول اللہ فرماتے ہیں۔

"تا لعدار بچہ خیز عورت کے ساتھ نکاح کرو۔ تاکہ میں اقوام میں تم پر فخر کروں"

یہ وسائل وذرائع کے ساتھ مشروط ہے تاکہ انسان ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو سکے جیسا کہ قرآن و حدیث سے واضح کیا جا چکا ہے۔

قرآن و سنت نبوی مسلمانوں پر زور دیتے ہیں کہ وہ مضبوط، توانا، صحت مند، اور خوشحال ہوں، تاکہ وہ زمین پر حکومت الہیہ قائم کر سکیں ۲۳ لیکن آج ان کی حالت کیا ہے۔؟

عصر حاضرہ کے مسلمان خوراک اور لباس کی کمی کا شکار، جان و جسم میں بیمار، ناکافی تعلیم خیالات و افکار میں پسماندہ، مستقبل کو دیکھے بغیر عظمت رفتہ پر نازاں، اپنی سماجی، ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی حالت کو سدھارنے اور بہتر بنانے کا ذرہ بھر بھی خیال نہیں رکھتے ہیں اور نہ کوشش کرتے ہیں۔ اگرچہ تعداد کے لحاظ سے بہت کافی ہیں مگر معیار کے لحاظ سے ذلیل مخلوق بنے ہیں کس کی نظر میں ؟ ۔ مجھے ڈر ہے کہ رسول مقبول ایسی امت پر ہرگز فخر نہیں کریں گے۔

ابو سعدؓ سے مروی حدیث میں عزل کو جائز قرار دیتے ہوئے پیغمبر صلعم نے فرمایا۔

"کوئی بھی کسی کو جننے سے روک نہیں سکتا ہے جس کے لئے ایسا مقدر کیا گیا ہے۔ ۱۷

یہ ایسا کہنے کے مترادف ہے کہ جس کے لئے مرنا مقدر ہے۔ وہ مر جائیگا

اور جس طرح اس بیان سے یہ اخذ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ بیماری کو مرض کے لئے علاج نہیں کرنا چاہئے۔ اسی طرح سے یہ مطلب بھی نہیں لیا جا سکتا ہے کہ بچوں کی پیدائش کو روکنے کے لئے مانع حمل ذرائع اختیار نہیں کرنے چاہئیں

مسلمان فقہا اور مانع حمل

الغزالیؒ (وفات ۱۱۰۱ء) مجدد اور امام نے عزل کرنے کی اجازت ان حالات میں دی ہے۔

(i) غلام لونڈی ہونے کی صورت میں تاکہ حقوق ملکیت محفوظ رہیں کیونکہ غلام لونڈی آقا کا بچہ جننے سے آزاد ہو جاتی ہے۔

(ii) بیوی کی خوبصورتی و توانائی دائم و قائم رکھنے کے لئے تاکہ وہ ہمیشہ مسرت کا سرچشمہ بنی رہی اور بچہ جننے کے خطرات سے محفوظ رہے۔

(iii) کئی اقسام کی اولاد ہونے کی وجہ سے مختلف اندیشوں کے خوف سے بچاؤ کی خاطر، اُن کی خوراک کے لئے، شدت محنت سے اور گناہوں سے بچنے کیلئے ۲۷۔

امام ابن القیوم بھی عزل کے متعلق ایسا ہی نظریہ رکھتے ہیں۔

عہد نبوی میں ضبط تولید کے متعلق ایک ہی عام طریقہ عزل لوگوں کو معلوم تھا۔ فی زمانہ بھی عزل یا انزال سے قبل اخراج کا طریقہ عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ غیر یقینی، نامحفوظ، نامسنون اور اعصابی انتشار پیدا کرنے کا موجب سمجھا جاتا ہے۔ اب جبکہ کئی نئے مصدقہ، محفوظ، سائنٹیفک اور کیمیاوی طریقے ایجاد کئے گئے ہیں یہ بعینہٖ کسی مرض کے علاج کے طور پر ہے جس کے لئے اب کے بہت سے تیر بہدف اور موثر ادویات موجود ہیں جبکہ عہد نبوی میں صرف چند ایک غیر موثر ادویات ہی حاصل تھیں۔ اگر جدید طریقہ علاج بشمول سرجری سے امراض پر قابو پانا سنت نبوی کے خلاف نہیں ہے تو جدید مانع حمل طریقے بشمول سٹرلائزیشن بھی مذہب کے خلاف نہیں ہوگا۔

قرآن سے مزید ثبوت

قرآن پاک نے انسانوں پر مذہب کے معاملہ میں کوئی کمر توڑ بوجھ نہیں ڈالا ہے (قرآن ۲۲: ۷۸)، اس نے والدین کو متنبہ کیا ہے کہ وہ اولاد کی خاطر بیجا طور پر پریشان نہ ہو جائیں۔

"کسی شخص پر بوجھ نہیں ڈالا جاتا مگر جہاں تک اس کی طاقت ہے۔ نہ ماں کو بچہ کی وجہ سے تکلیف (جسمانی یا ذہنی یا مالی) دی جائے اور نہ باپ کو اپنے بچہ کی وجہ سے پوری ذمہ داری سے پرورش کرنے کی خاطر (۲: ۲۳۳) (۱۵: ۱۶۴) بچے اپنے ساتھ بہت سی ذمہ داریوں کو بھی جنم دیتے ہیں۔ والدین بالخصوص ماں نماز پنجگانہ ادا نہیں کر سکتی ہے۔ ماہ صیام میں روزے

نہیں رکھ سکتی ہے۔ اور صاف اور اعتدال کی زندگی بسر نہیں کر سکتی۔

مومنوں کو اس بارے میں آیت ۶۳ : ۹ میں اس طرح پر خبردار کیا گیا ہے:

" اے لوگو ! جو ایمان لائے ہو۔ نہ تمہارے مال اور نہ ہی تمہاری اولاد تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل کریں اور جو کوئی ایسا کرے تو وہ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ " ۲۱

اور تنبیہ کی گئی ہے کہ بے قابو اولاد کے بارے میں تمام احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں :

" اے لوگو ! جو ایمان لائے ہو۔ تمہاری بیویوں میں سے اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن بھی ہیں، سو ان سے بچتے رہو۔ (اور انہیں قابو سے باہر نہ ہونے دو) (۶۴ : ۱۴) ۲۰ آیت ۴ : ۳ میں عورتوں کی تعداد پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ اگلی آیت میں عیال کو قابو میں رکھنے کی وارننگ دی گئی ہے۔ بچے کو ۲ سال تک دودھ پلانے کے تاکیدی احکام آیات ۲ : ۲۳۳، ۳۱ : ۱۴، ۴۶ : ۱۵ وغیرہ میں آئے ہیں، اس سے بچوں کی پیدائش کا وقفہ ۳۰ مہینہ سے زیادہ معین ہوتا ہے۔ ایسے سب قرآن کی واضح اور صاف سفارش کم عیال رکھنے کے حق میں ہے۔

فتاویٰ اور بیانات کی حمایت

مفتی اعظم اردن نے اپنے فتویٰ میں اسلام کے اصول و مقاصد پر بحث کرنے کے بعد لکھا ہے "کہ ہم پورے یقین کے ساتھ فیملی پلاننگ کے حق میں اپنا فیصلہ دیتے ہیں" ۲۲

مصر کے مفتی اپنے فتویٰ میں اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ :

" حمل کو روکنے کے لئے ہر خاوند اور بیوی آزاد ہے کہ وہ باہمی مرضی سے مانع حمل طریقوں پر عمل کریں۔ " ۲۳

فتاویٰ کمیٹی ازہر یونیورسٹی قاہرہ نے فتویٰ صادر فرمایا جس میں مانع حمل طریقے استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔ ۲۳ ایسا ہی امام صاحب جامع مسجد دہلی نے فتویٰ دیا ہے، اسی طرح فیملی پلاننگ کے حق میں دنیا بھر کے تمام ممالک میں مذہبی سربراہوں نے فتاوی دیدیئے ہیں ۲۵

حال ہی میں ایک شاندار تفسیر "دی رننگ کمنٹری آف ہولی قرآن" مصنفہ علامہ ڈاکٹر خادم رحمانی نوری، آف صوفی ہمسایہ لتیم کردہ مسجد کمپاؤنڈ، شیلانگ (انڈیا) شائع ہوئی ہے جس میں ۱۵۰۱-۱۵۰۰ وضاحتی اور تفسیری نوٹ قوسین میں درج ہیں۔ اس میں بھی فیملی پلاننگ کے حق میں تشریحات درج ہیں۔

ادارۂ اقوام متحدہ کی طرف سے ایک بیان ۱۰ دسمبر ۱۹۶۶ء کو شائع ہوا ہے جس میں بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کے لئے زور دیا گیا ہے۔ اس بیان پر دنیا کے ۱۹ بڑے بڑے لیڈروں بشمول ۶ مسلم ممالک کے سربراہوں کے دستخط ہیں، جن کے نام یہ ہیں، شاہ محمد رضا پہلوی والئے ایران، شاہ حسین والئے اردن، تنکو عبدالرحمان وزیراعظم ملائیشیا، شاہ حسین ثانی والئے مراکو، حبیب بورغیبہ صدر ٹیونس، اور جمال عبدالناصر صدر متحدہ عرب جمہوریہ ۲۸

بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقدہ اپریل ۱۹۶۹ء بمقام کوالالمپور نے فیملی پلاننگ کو دنیائے اسلام کے لئے منظور کیا۔ بہت سے مسلم ممالک بشمول پاکستان (۱۹۶۰)، ترکی (۱۹۶۵)، متحدہ عرب جمہوریہ (۱۹۶۶)، مراکو (۱۹۶۶)، ملیشیا (۱۹۶۶)، تیونس (۱۹۶۶) اور ایران (۱۹۶۷) نے ضبط تولید کی مہم کو مقابل میں دکھائے گئے سال میں قومی پروگرام کے طور پر اختیار کیا۔ اور دیگر مسلم ممالک بھی تقلید کر رہے ہیں۔

اسلام ایک عقلیت پسند مذہب ہے۔ تمام مسائل میں یہ درمیانی اور اعتدال کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ جسے سنہری راستہ کہا جا سکتا ہے ایک مسلمان دن کی پانچ نمازوں میں خدا سے اسی وسطی راہ یا صراط مستقیم پر قائم رہنے کے لئے دعا کرتا ہے۔ (۱ : ۵) ایسے میں پیدائش کے متعلق بھی یہی درمیانی اعتدال کی راہ اختیار کی جانی چاہئیے۔ بجائے اس کے کہ افراط و تفریط میں مبتلا ہو جائیں ۹، ۱۰، ۱۱

فیملی پلاننگ پروگرام کا مقصد صحت اور خوشحالی پیدا کرنا ہے جو اسلامی روح کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ یہ بچوں کی تعداد اور وقفہ کے متعلق صحیح رائے دیتا ہے اور کسی بھی مرحلے پر انسانی جان کو ہلاک کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ایسے میں مسلمانوں کو مذہبی بنیادوں پر فیملی پلاننگ کا مکمل اور بھرپور تعاون اور ساتھ دینے میں کوئی بھی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

فہرست حوالہ جات

۱۔ ایڈوائزری کونسل آن ریلیجس افیئرز ان ترکی "فتویٰ آن برتھ کنٹرول" ڈگری ۱۸ دسمبر ۱۹۶۰ء مسلم ایٹیچیوڈس ٹوارڈس فیملی پلاننگ۔ دی پاپولیشن کونسل نیویارک اگست ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۰

۲۔ بیک ڈوروتھی فہاز۔ دی چینجنگ مسلم فیملی آف دی مڈل ایسٹ۔ میرج اینڈ فیملی لونگ جلد ۱۹ نمبر ۴ برائے نومبر ۱۹۵۷ء صفحہ ۳۵-۳۴

۳۔ اینانی ایم عبدالفتح۔ فتویٰ کمیٹی ازہر یونیورسٹی جواب و سوال نمبر ۴۷، ۱۰ مارچ ۱۹۵۳ء در مسلم ایٹیچیوڈ ٹوارڈس فیملی پلاننگ۔ دی پاپولیشن کونسل نیویارک اگست ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۳

۴۔ فاگلے رچرڈ ایم۔ " ڈاکٹرائنز اینڈ ایٹیچیوڈز آف میجر ریلیجنز ان ریگارڈ ٹو فرٹیلیٹی" مسودہ برائے اقوام متحدہ عالمی آبادی کانفرنس بلگراڈ اگست ستمبر ۱۹۶۵ء صفحہ ۱۴-۲۰

۵۔ گورنمنٹ آف انڈیا۔ نائب امام دہلی کا فتویٰ۔ سنٹر کالنگ نیو دہلی جلد ۲ نمبر ۹ ستمبر ۱۹۶۷ء صفحہ ۸

۶۔ "پوپ محدود عیال کے حق میں" سنٹر کالنگ نئی دہلی جلد ۲ نمبر ۴ اپریل ۱۹۶۷ء صفحہ ۱

۷۔ حکیم خلیفہ عبدل " اسلام اینڈ برتھ کنٹرول۔ " برتھ کنٹرول لاہور جون ۱۹۵۹ء

بحوالہ مسلم اینجیوڈ ٹواردس فیملی پلاننگ اگست ۱۹۶۹ء صفحہ ۵۰ - ۴۶
۸ - حق ظہور ال - اسٹیپ اِن ٹو فیملی پلاننگ موفی ہمسایہ شیلانگ ۱۹۶۹ء
۹ - فیملی پلاننگ اینڈ اسلام - اسلامک ریویو لندن - جولائی اگست ۱۹۵۸ء
۱۰ - فیملی پلاننگ ان دی لائٹ آف اسلام سلائیٹ لاہور جلد ۸ ۳ نمبر ۲ ۳ دسمبر ۱۹۵۹ء صفحہ ۹ - ۴
۱۱ - فیملی پلاننگ ناٹ اگینسٹ اسلامک فقہ فیملی پلاننگ نیوز نئی دہلی جلد ۷ نمبر ۱۲ دسمبر ۱۹۶۶ء
۱۲ - نو ڈاوٹ اباوٹ اٹ "ینگ انڈیا شیلانگ - ۱۲ دسمبر ۱۹۶۸ء
۱۳ - جیلانی ڈوسس گونگس اباوٹ فیملی پلاننگ ' دی آسام ٹریبیون گوہاٹی ۲۷ دسمبر ۱۹۶۷ء
۱۴ - دی ہولی قرآن کیمونسٹری سپورٹس فیملی پلاننگ : فیملی پلاننگ نیوز - نئی دہلی
جلد ۹ نمبر ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۸ء
۱۵ - آسام ٹری بیون گوہاٹی ۱۸ اگست ۱۹۶۸ء
۱۶ - وائی فیملی پلاننگ دی انڈین شیلانگ ۲۴ اپریل ۱۹۶۹ء
۱۷ - خان اختر حمید - اسلامک اوپی نین آن کنٹراسیپشن جرنل آف دی ایسٹ
پاکستان اکیڈمی فار ویلیج ڈویلپمنٹ جلد نمبر ۴ - ۳ اگست اکتوبر ۱۹۶۰ء
۱۸ - کرک ڈیوڈ - فیکٹرس افیکٹنگ مسلم نیٹلٹی. مسلم ایٹی چیوڈ نیویارک ۱۹۶۷ء
۱۹ - نوری - علامہ خادم - دی رننگ کیمونسٹری آف دی ہولی قرآن.
۲۱ - پاپولیشن کونسل - سٹڈیز ان فیملی پلاننگ نمبر ۱۶ جنوری ۱۹۶۷ء
۲۲ - قلقلی - دی شیخ عبداللہ - مفتی اعظم اردن - مسلم ایٹی چیوڈ نیویارک
۲۳ - رحمان فضل - ریلجن اینڈ پاپولیشن ڈسپرٹ ہوڈ ان پاکستان
۲۴ - سالیم شیخ عبدالمجید مفتی مصر - دارالفتوی جلد ۸۱ رجسٹر ۸۱ جرنل
آف دی ایجپشن میڈیکل ایسوسیشن جلد ۲۰، ۹۰، ۷ جولائی ۱۹۳۷ء
۲۵ - سٹیٹمنٹ بائی ریلجس لیڈرز

(ترجمہ عزیز کاشمیری)

بقیہ: مسلمان اور خاندانی منصوبہ بندی

مذہب ہونے کے علاوہ ایک صالح معاشرہ بھی ہے۔ اس کا اصول ترقی پسند انسان کی خواہش کے مطابق ہیں، اس لئے اب یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ بلکہ اسلام ہمیشہ اس کی اجازت دیتا ہے۔

خاندان کو محدود کرنے کا تقاضا اتنا ہی پرانا ہے جتنی کہ نوع انسان۔ بے قابو بڑھتی ہوئی آبادی دنیا کے لئے ایک خوفناک مسئلہ بنا ہوا ہے جو کہ سارے ملکوں کو پریشان کر رہا ہے۔ آج کرہ زمین کے تقریباً ہر کونہ اور گوشہ میں اس اہم مسئلہ کو پراثر طریقہ سے حل کرنے کی ایک بھرپور کوشش کی جا رہی ہے۔ جس میں مسلم ممالک مثلاً متحدہ عرب جمہوریہ، ترکی، ایران، پاکستان، الجیریا، موراکو، ٹونیشیا، لبنان وغیرہ بھی شامل ہیں، اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی چاہیئے کہ اس نازک اور ضروری قومی فرض سے غافل نہ ہوں

غزل

علیم اختر مظفر نگری (مرحوم)

شعورِ بندگی و آگہی کا راز کیا جانیں
یہ فرزانے، مری دیوانگی کا راز کیا جانیں

وہ خود اپنی خوشی میں ناخوشی کی بات کیا سمجھیں
مرے رنج و ملال بے کسی کا راز کیا جانیں

نہ اِن کے پاؤں میں چھالے نہ کوئی خار تلوؤں میں
یہ اہلِ کارواں منزل رسی کا راز کیا جانیں

خود اُن نظروں نے میرے دل سے کوئی التجا کی تھی
وہ کیا سمجھیں مری وارفتگی کا راز کیا جانیں

بُتِ پندار کے ٹکڑوں سے خود بُت ساز بنتا ہے
یہ عصرِ نو کے آذر بُت گری کا راز کیا جانیں

نظر ہمراز اندازِ جمالِ ناز ہوتی ہے
مگر جلوے نظر کی خیرگی کا راز کیا جانیں

یہ سادہ لوح دیوانے خلوص و شوق کے بندے
فریبِ دوستی میں دشمنی کا راز کیا جانیں

وہ جن کو شام ہی سے چاندنی راتیں میسر ہیں
مری ظلمت، مری شب تیرگی کا راز کیا جانیں

نہ کچھ عکسِ مجسم ہی بتاتا ہے نہ آئینہ
وہ خود اپنی ادائے دلبری کا راز کیا جانیں

یہ قیدِ خطِ پیمانہ ہے دورِ ساغر و مینا
یہ دریا دل مری تشنہ لبی کا راز کیا جانیں

ہم اہلِ درد، اسرارِ خودی کی بات کرتے ہیں
مگر اختر، جنونِ بے خودی کا راز کیا جانیں

ایک نظم

صادق

آؤ، ہم سب مل کر روئیں
بڑھتی نسلیں، کٹتی فصلیں
پہچان کی تشنگی کھو بیٹھیں
پر بننے یا مٹ جانے کا
اتہاس ابھی تک زندہ ہے
آؤ، ہم سب مل کر سوچیں
ورثے میں ہم نے پائی تھی
جو پرمپرا، وہ کہاں گئی

... اور وہ
جو سائے جنگل میں
درشن کے شنکھ بجاتے تھے،
اپنی گہری قبروں میں پڑے
کیڑوں کی غذائیں بنتے ہیں،
کتنے سچ تھے؟
یہ ثابت کرنا مشکل ہے
کیا ملا ہمیں کیا نہیں ملا
لیکن دیکھو
وشواس ابھی تک زندہ ہے۔

غزلیں

محمود خاور

دل کے آنگن میں ستارے سے اتر جاتے ہیں
یوں شبِ تار کے گیسو بھی نکھر جاتے ہیں
وہ تری یاد کا عالم ہو کہ دُنیا کا ستم
دن گزرتے ہیں، بہر حال، گزر جاتے ہیں
ہم نے دیکھا ہے کہ اس دور میں جینے والے
ایک اک سانس پہ بے موت ہی مرجاتے ہیں
کیا قیامت ہے کہ ہم رات کے بازاروں میں
کس سلیقے سے لئے خوابِ سحر جاتے ہیں
کون سا شہر ہے، یہ کیسی فضا ہے خاور
لوگ چلتے ہیں تو سائے سے بھی ڈر جاتے ہیں

آفتاب شمسی

دامن بھی تار تار ہیں سینے بھی شق ملے
ہے شہر میں کہاں جو وفا کی رمق ملے
تھی میری ہی صدا جو بلاتی رہی مجھے
میرے ہی سائے تھے جو اُفق تا اُفق ملے
ہر رات لکھ کے ختم کیا، صبح کو مگر
افسانۂ حیات کے بکھرے ورق ملے
کاندھوں پہ بار بنتا چلا جا رہا ہے سر
اب اک وفا شعار کو کچھ اُس کا حق ملے
مبہوت ہیں کھڑے ہوئے تاریکیوں کے بیچ
جاگے تھے آرزو میں کہ رنگِ شفق ملے

متین سروش

مجھ کو مرے ساقی وہ مئے ہوش فزا دے
رخسارِ یقیں کو جو نئی تاب و ضیا دے
ہو جس کے لبوں پر غمِ دنیا کی شکایت
اس رند کو میخانۂ الفت سے اُٹھا دے
ہر راہ میں میں نغمہ بہ لب ساتھ چلا ہوں
اے جوشِ طلب تو مری ہمت کو دعا دے
شب بھر ہو انجم سے کبھی دل کی حکایت
اے بادِ سحر اب تو مجھے تھک کے سُلا دے
ہر ساز سے ٹپکے تری آواز کا شُعلہ
اے جانِ سروش آج وہ جادو بھی جگا دے

غلام مرتضیٰ راہی

وہ شب کی تیرگی میں نظروں سے چھوٹ جانا
وہ دن کی روشنی میں میرا شمار ہونا
وہ آگ آگ چل کر آنا مرا یہاں تک
وہ میری ٹھوکروں سے پیدا شرار ہونا
وہ دشت دشت رہنا ہوش و حواس قائم
وہ شہر شہر مجھ پہ وحشت سوار ہونا
وہ رفتہ رفتہ ہونا ساری فضا مکدر
وہ دھیرے دھیرے میرا مشتِ غبار ہونا
وہ مدتوں اٹھا کر رکھنا پہاڑ سر پر
وہ ایک روز میرا بے اعتبار ہونا

اقبال مجید

اندر کا ڈر

ٹرین ابھی تھوڑی سی دیر میں رک جائے گی
وقت اگر سارے بھولے بسرے درد سمیٹ کر ایک جگہ رکھ دے اور اختیار دے دے کہ ان میں سے کوئی ایک بھولا بسرا درد آدمی واپس لے لے تو میں کیا کروں گا۔ کیا کوئی درد آگیا ہے، ماضی کی دور دراز یادوں میں کیا کوئی کسک ہے جس کا اعادہ اگر ہو جائے تو میں جی اٹھوں؟

ٹرین اب دھیمی ہو چکی ہے۔ سامنے یادوں میں وہ آنکھیں کچھ پوچھتی ہوئی کچھ کہتی ہوئی بے زبان موہنی سی دو آنکھیں ابھرتی ہیں اور ڈوب جاتی ہیں —

"آپ چائے کے ساتھ کچھ لیں گے۔؟"

"نہیں شکریہ۔"

"یہ جگہ بہت چھوٹی ہے وقت کاٹنے کے لئے میرے پاس کچھ کتابیں ہیں اگر آپ کہیں تو لادوں۔"

"جی شکریہ میں کتابیں نہیں پڑھتا۔"

"آپ کو شکار سے شوق ہے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر یہ بندوق —؟"

"صرف حفاظت کے لئے اپنے ساتھ لایا ہوں۔"

"یہاں سے واپسی پر آپ اپنے ساتھ کون سی چیز لے جانا پسند کریں گے۔"

"گڑ سنا ہے اچھا بنتا ہے۔"

وہ میری اس بات پر ہنس دی شام کو وہ میری اور بھی باتوں پر ہنسی۔ رات کے کھانے پر اس کی ہنسی کھل کر قہقہوں میں تبدیل ہو چکی تھی۔ دوسرے دن سویرے اس نے میری بندوق کے ساتھ کارتوسوں کی پیٹی کہیں چھپا کر رکھ دی تھی۔

"کیا آپ اپنی حفاظت کے لئے بندوق کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟"

"جی ہاں —"

"کیا آپ کے دشمن بہت ہیں۔؟"

"شاید یہ صحیح ہے۔"

"آپ دشمن کیوں بناتے ہیں؟"

سوال بڑا سیدھا سا تھا، ہم دشمن کیوں بناتے ہیں؟ ٹرین اب رک چکی ہے میں اپنا سوٹ کیس ہاتھ میں لئے سرجو پور کے پلیٹ فارم پر پیر رکھ چکا ہوں۔ سامنے پلیٹ فارم کے اس پار لوہے کے پھاٹک سے لگا ہوا ٹکٹ کلکٹر کھڑا ہے اور پھاٹک کے اس پار رام بھروسے کی پگڑی چمک رہی ہے اس کے ہاتھ میں بیلوں کو ہانکنے کی چابک ہے۔

"بھیا آپ آگئے، لاؤ بکس ہم کو دو —"

رام بھروسے نے میرے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا ہے۔ بیل گاڑی میں پیال بچھا ہے۔ دو چار گدے رکھے ہیں۔ بیل دھیرے دھیرے لیک پر چل رہے ہیں۔ میری کائنات میری زندگی کا یہ لمحہ ایسا ہے جس کی تشریح اگر میں کر سکتا تو فن بیان میری غلامی کرتا۔

"رام بھروسے۔"

"ہاں مالک۔"

"زینت بٹیا کہاں ہیں؟"

"حویلی میں۔"

"لکھنؤ نہیں گئیں؟"

"نہیں، ان کا تو جی بہت دنوں سے خراب ہے۔"

"اچھا کیا ہوا انہیں؟"

"دل کا دورہ پڑا تھا اُدھر۔"

"کس کو۔ زینت بٹیا کو؟" رام بھروسے جواب میں گردن ہلاتا ہے، اور سامنے نارنجی رنگ کا سورج اور نیچے کو ڈھلنے لگتا ہے۔ بیل کان اٹھا اٹھا کر چونکتے ہیں۔ راستہ اونچا نیچا ہونے لگتا ہے۔ آس پاس گنے کی ہل کے بیلے پانی کی بو آنے لگتی ہے جب گاڑی کچھ چڑھائی پر پہنچتی ہے تو حویلی کے کنگورے دو پلوں کے لئے چمک کر چھپ جاتے ہیں۔ میرا من ڈوبتا ہے پھر ہمکتا ہے، پھر ڈوبتا ہے پھر ہمکتا ہے۔ میرے پاس انتخاب کرنے کو کچھ نہیں۔ میں نے سب پا کر سب گنوا دیا ہے۔

"آپ کے دل میں خوف رہتا ہے۔" زینت نے مجھ سے پوچھا تھا۔

"جی میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"آپ ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں۔"

"نہیں تو ــــ"

"ڈر ہمیشہ اندر ہوتا ہے باہر کسی خوف کا وجود نہیں۔ آپ اپنے بارے میں بہت سوچتے ہیں۔ اپنی ذات سے محبت اچھی بات ہے لیکن اتنی محبت اچھی نہیں کہ اس کے لئے بندوق رکھنی پڑے۔"

یہ اس دن کی بات ہے جب حویلی میں میرے قیام کا دوسرا اور آخری دن تھا۔ تب سے دو سال گزر گئے ہیں۔ اس حویلی میں نہیں آیا۔ میر شجاعت علی کی دو چٹھیاں ان دو برسوں میں میرے پاس آئی ہیں۔ دونوں میرے لئے بے معرف اور بے معنی تھیں۔

"سنئے۔؟"

"جی۔"

"آپ نے کہا تھا خوف ہمیشہ آدمی کے اندر رہتا ہے۔"

"کیوں ٹھیک کہا ہے نا میں نے؟" وہ اُداسی کے ساتھ بولی تھی۔

"ایک بات پوچھوں؟" میں نے سوال کیا تھا۔

"پوچھئے۔"

"آپ اس قدر رنجیدہ اور کھوئی کھوئی سی کیوں رہتی ہیں۔ کیا آپ کے اندر بھی کوئی خوف ہے۔"

"ہے۔"

"جی!" میں نے مبہوت ہو کر اس کی طرف دیکھا "کیا آپ سب سے اسی طرح بے تکلف ہو جاتی ہیں؟"

"کس طرح۔"

"میرا مطلب ہے جس طرح آپ مجھ سے ہو رہی ہیں۔ ہم صرف دو روز پہلے ملے ہیں آپ میرے بارے میں صرف اتنا ہی جانتی ہیں کہ میں آپ کے والد صاحب کے دوست کا لڑکا ہوں۔ سرکاری کام سے آیا ہوں اور بس۔"

"اچھا تو بے تکلفی سے آپ پریشان ہو جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ مسکرائی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ حویلی کو چھوڑنے کے چند گھنٹوں پہلے تک میں اسے نہیں دیکھ سکا پھر لیکا یک وہ مجھے حویلی کے برآمدے میں ملی۔

"سنئے۔" اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"فرمائیے۔"

"آپ لکھنؤ جب پہونچیں تو میرا سلام کہہ دیجئے گا۔"

"کس سے۔؟"

"لکھنؤ سے۔" مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے پہلی بار غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ جوانی کی بجھی ہوئی چمک، متین اور غیور پیشانی، زندگی کی آنچ میں تپا ہوا چہرہ۔

"میں نے آپ کو لکھنؤ میں کبھی نہیں دیکھا۔" میں نے یونہی کہہ دیا۔

"میری ساری تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ سن باسٹھ میں یونی ورسٹی چھوڑی ہے میں نے۔"

"ارے میں آپ سے چار سال سینئر ہوں" میں نے کہا "آپ نے کس مضمون میں ایم اے کیا ہے۔"

"سوشیالوجی میں۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟"

"پتہ نہیں" یہ کہہ کر وہ ہنس دی۔

اور جب شام کو میں حویلی سے اسٹیشن کے لئے چلنے لگا تو میں نے دیکھا حویلی کے دروازے پر ایک جیپ آکر رکی جیپ سے ایک نوجوان اترا اس کے کندھے پر ایک بندوق تھی اور ہاتھ میں کچھ بنڈل، بالوں پر گرد اٹی ہوئی۔ مجھے رام بھروسے نے بتایا کہ وہ وجو بھیا ہیں سویرے لکھنؤ گئے تھے سرجوپور میں ایک بڑا سا فارم ہے ان کا۔ اپنے ہاتھ سے ٹریکٹر چلاتے ہیں۔ ان کے اپنے محبوب دو ہی ہیں، جیپ اور بندوق ہے، اور زینت بٹیا سے ان کا بیاہ لگا ہے۔ سویرے کا ناشتہ وجو بھیا حویلی میں کرتے ہیں۔

وہ خط مجھے یاد ہے جو زینت کو میں نے لکھا تھا۔ میں نے خط میں اس سے پوچھا تھا۔

"زینت صاحبہ آپ نے میری کار توس کی پیٹی کیوں چھپائی تھی؟"

زینت نے جواب میں مجھے لکھا تھا "مجھے بندوق سے ڈر لگتا ہے۔ باہر کا ڈر ہے جو میرے اندر آگیا ہے۔ بس اس سے زیادہ میں اور کچھ نہ

لکھ سکوں گی۔ اس کے جواب سے مجھے جانے کیوں جیپ سے اُترنے والا وہ نوجوان یاد آگیا تھا جو سرجو پور سے چلتے وقت شام کے جھٹپٹے میں مجھے حویلی کے دروازے پر ملا تھا جس کے کندھے سے ایک بندوق لٹک رہی تھی، اور جس کے بال جیپ کے سفر میں گرد سے اٹے ہوئے تھے۔

اور اب اس بات کو گزرے دو سال ہو چکے ہیں۔ اس بیچ سرجو پور میں کیا ہوا میں نہیں جانتا۔ میں نے رام بھروسے کی طرف آنکھ بھر کر دیکھا۔ وہ مزے مزے میں بیل ہانک رہا تھا۔

"رام بھروسے!" میں چپکے سے بولا۔

"ہاں مالک۔"

"زینت بٹیا کا بیاہ تو ہو چکا ہوگا۔"

"نہیں تو مالک"، یہ کہہ کر رام بھروسے چپ ہوگیا۔

"کیوں؟" میں نے اُسے کُریدا۔ "وہ تمہارے دتو بھیا وہ جیپ والے کہاں ہیں آج کل۔"

"اُن کا تو پچھلے ساون میں قتل ہوگیا۔ آپ کو نہیں معلوم؟"

"کیا۔ یہ کیسے ہوا؟" رام بھروسے جواب میں مجھے بہت کچھ بتاتا رہا۔ اس بار جب میں حویلی کے پھاٹک میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا حویلی کے برآمدے میں ایک میز پڑی تھی جس پر نئے نئے چمکیلے چمکیلے بندوق کے کارتوس بکھرے پڑے تھے اور ایک بڑے گٹھیلے بدن کا نوجوان بڑے انہماک سے اپنی قیمتی رائفل کی نال صاف کر رہا تھا۔

"رام بھروسے، یہ کون صاحب ہیں؟"

"کمال بھیا، دتو بھیا کے بھانجے۔ اُن کا بہت بڑا فارم ہے۔ دو ٹریکٹر، خوب پیسہ ہے۔"

اس بار زینت سے میری ملاقات نہ ہو پائی۔ صرف ایک بار میں نے اس کی آواز سُنی تھی۔

"تم ناراض ہو" کمزور سی آواز میں اس نے ایک سوال کیا تھا۔ مجھ سے نہیں کمال سے، جس کے پاس ایک قیمتی رائفل تھی۔

تصحیح

مئی کے شمارے میں سہواً یہ درج ہوگیا تھا کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کو ساہتیہ اکیڈمی کا انعام دوبارہ ملا ہے۔ یہ صحیح نہیں، ادارہ اس غلطی کے لیے معذرت خواہ ہے۔ (اگلے شمارے میں ساہتیہ اکیڈمی سے متعلق مضمون ملاحظہ فرمایئے۔)

سمندر کا نوحہ سنو!

محمود سعیدی

سمندر کا نوحہ سنو — اور سوچو
سمندر کو یوں کس نے نالہ بہ لب کر دیا ہے
سمندر کے پُرشور سنگیت میں کس نے غم بھر دیا ہے
خروشاں سمندر کی موجوں کو کیا دکھ ہے،
یہ کس لئے اس المناک انداز میں چیختی ہیں
سسکتی سی آواز میں چیختی ہیں

سمندر کا نوحہ سنو — اور سوچو
سمندر کا پانی لہو رنگ کیوں ہے
سمندر کا سینہ
چمکتی ہوئی خوش نما سیپیوں، بے بہا موتیوں کا خزینہ
سمندر کے سینے پہ کس نے یہ خونیں شکنجے اتارے
سمندر کی دولت
سمندر کی گہرائیوں سے نکالی
کنارے کے دامن میں لا لا کے ڈالی
لیٹرے جہاں صف بہ صف ہاتھ اپنے پسارے کھڑے تھے
سمندر کی شہ رگ میں جن کی ہوسناک نظروں کے خنجر گڑے تھے

سمندر کا نوحہ سنو — اور سوچو
سمندر کی شہ رگ سے بہتا لہو قطرہ قطرہ
نہیں —
قطرہ قطرہ نہیں، شعلہ شعلہ
سمندر میں پھیلا
کناروں کی جانب بڑھا آگ اور خون کا ریلا
تو کس سے رُکے گا
کوئی ہے جو طوفاں کے بڑھتے قدم روک لے گا؟

سمندر کا نوحہ سنو — اور سوچو
یہ پھولوں بھری بستیاں —
جو تمہارے لئے نغمہ زارِ ارم ہیں
یہ آتش بہ جاں نوحہ بر لب سمندر کی سیال سرحد سے اب کے قدم ہیں؟

بشیر بدر

مقدمۂ شعر و شاعری — ایک جائزہ

اُردو تنقید میں حالی کی اولیت اور مقدمۂ شعر و شاعری کی اہمیت کا اندازہ اُسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب ہمارے پیش نگاہ یہ بات ہو کہ مقدمۂ شعر و شاعری سے قبل اُردو کا تنقیدی سرمایہ کیا تھا۔ اُس وقت کے حالات کیا تھے اور اُن کا مطالعہ کیا تھا، اس تنقیدی کتاب نے اپنے عصری ادب کو کیسے کیسے متاثر کیا اور موجودہ دور میں اس کی کیا اہمیت ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں لکھے گئے بلکہ ترجمہ کئے گئے تذکرۂ گلشن ہند (۱۸۰۱ء) سے پہلے اُردو کے تمام قابل ذکر تذکرے فارسی میں ہیں۔ اس لئے اگر ہم نکات الشعرائے میر یا مجموعۂ نغز (قدرت اللہ قادری) کو اُردو شاعری کی اچھی تنقید مانیں تو بھی انہیں اُردو تنقید کے تحت نہیں شمار کر سکتے۔ اس لئے کہ یہ سب فارسی میں ہیں۔

"مقدمۂ شعر و شاعری، مولانا حالی نے ۱۸۹۳ء میں اپنے دیوان میں شامل کرنے کے لئے لکھا" اور "۱۸۹۵ء میں جب پہلی بار دیوان حالی مطبع نامی کانپور میں چھپا تو یہ مقدمہ دیوان کے شروع میں اضافہ کیا گیا تھا"[1] اس وقت اُردو ادب، جدید ادب اور جدید تحریکات سے خاصی حد تک مانوس ہو چکا تھا۔ سرسید کی مساعی جمیل سے تہذیب الاخلاق (۱۸۷۰ء) کا اجرا ہوا جس میں سرسید، آزاد، حالی، شبلی، محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی وغیرہ کے مضامین میں نئی زندگی اور اس کی برکتوں کا احترام، فعالی رویہ اور قومی تنظیم کا احساس قدر مشترک تھا۔ علمی، تہذیبی، اور ادبی سطح پر یہ تحریک اپنا کام کر رہی تھی۔

اس سے بھی قبل خالص ادبی سطح پر ۱۵ راگست ۱۸۶۷ء کو انجمن پنجاب کے پہلے اجلاس میں محمد حسین آزاد نے اپنا لکچر "نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات" پڑھ کر سنایا تھا جس کا ایک فقرہ دو باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

(۱) شعر کے لئے جذبات اور سنجیدگی دونوں ضروری

(۲) اس میں طہارت اور پاکیزگی ہونی چاہئے۔

اب میں سرسید کی ایک تحریر پیش کرنا چاہتا ہوں یہ سرسید کی لکھی ہوئی تحریر غیر مطبوعہ[2] ہے۔ یوپی ریجنل آرکائیوز کی فائل میں بغیر کسی کیٹلاگ کے، دفتری کاغذات کے درمیان یہ تحریر ملی جو اُردو نظم کے ایک مقابلے کے بارے میں ہے:۔

"قطب الدین احمد نے جو نظم لکھی ہے نہایت سلیس اور بے تکلف ہے گو کہیں کہیں اس میں کچھ نقص ہے جو بندی کی نظم لازمی ہے مگر اس کو نظم کہنے میں قدرت معلوم ہوتی ہے اور اس نے نہایت بے تکلفی سے بہت واقعات متعلق کالج کے بیان کئے ہیں مضامین کی بندش کی بہ نسبت واقعات کی صفائی سے نظم کرنے کرتے ہیں، اس لئے ہماری یہ رائے ہے کہ انعام معینہ قطب الدین کو دیا جائے۔"

سرسید کی یہ تحریر اس عملی تنقید کا نمونہ ہے جو شعر میں بخشش روش، محاورہ بندی سے زیادہ ایک واقعاتی، سلیس، صاف بہتر اور قابل انعام سمجھتی ہے اگرچہ اس میں کچھ نقص بھی ہیں۔

میں ان چند مثالوں مثلاً محمد حسین آزاد کی تحریر ۱۸۶۷ء سرسید کا فیصلہ ۱۸۹۱ء سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جدید شعر و شاعری کو مقصدی، سادہ، صاف زندگی کے مطابق، اور منفعت دیکھنا چاہتا ہے، نظریاتی اور عملی طور پر مقدمۂ شعر و شاعری سے قبل مگر اس کے باوجود حالی اُردو کے پہلے باقاعدہ نقاد ہیں اور مقدمہ شاعری تنقید کا پہلا صحیفہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سارے نظریات آوازوں کی طرح مختلف مضامین میں نظر آتے ہیں، حالی ان کو یکجا کرتے ہیں، ایک سلسلے میں پروتے ہیں اور ایک نظام کی طرح منظم

---

[1] داستان تاریخ اُردو (تیسرا ایڈیشن) صفحہ ۵۶۲، مصنفہ حامد حسن قادری

[2] علی گڑھ گزٹ (یکم نومبر ۱۸۹۱ء) بعنوان عرض ناشر

اس نظریہ کی تشکیل صرف تخیلی اور نظریاتی نہیں ہے بلکہ اس میں مسلسل ارتقاء ہے۔ یہ ارتقاء بہت واضح اور صاف حالی کی تحریروں میں (نظم ونثر) ۱۸۷۰ سے جھلکتا رہتا ہے اور بالآخر غور وفکر، تجربہ و تجزیہ کے بعد ایک مربوط نظریۂ شعر وادب پیش کرتے ہیں جس کی توضیحات وہ ادبی و تاریخی حقائق سے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ مجموعی طور پر ان کے تشکیلی نظریہ ادب اور ان کے تخلیقی ادب میں تقریباً ہم آہنگی ہے اگرچہ غالب کی سوانح نگاری لکھنے کے لیے دیباچہ میں انہیں مزید وضاحت کرنی پڑی اس لیے کہ ان کے نظریہ ادب کے تحت غالب کی رندانہ اور شاعرانہ زندگی، سوسائٹی کے لیے مفید نہیں ہو سکتی ہے۔ اس لیے ان کی سوانح لکھنا بظاہر مناسب نہ تھا۔ جس کی انہیں توجیہہ کرنی پڑی۔ لیکن مجموعی طور پر ان کے یہاں اس طرح کا نظریاتی اور عملی بعد نہ ہونے کے برابر ہے جیسا محمد حسین آزاد کے یہاں بیشتر اور شبلی کے یہاں کسی حد تک پایا جاتا ہے۔

مقدمہ شعر وشاعری کی اہمیت یوں اور بڑھ جاتی ہے کہ اس نو تشکیلی نظریہ کو معیار بنا کر اردو شاعری کے قدیم سرمائے کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مقدمہ شعر وشاعری کے جائزہ کے بعد آج ہم اس سے کہیں کہیں اختلاف کرنے پر مجبور ہوتے ہوئے بھی اس کی ادبی افضلیت اور اہمیت کے معترف ہوتے ہیں اس لیے کہ اس میں شعر وادب کے بنیادی سوالوں کو مرتب طریقے سے سوچا اور سمجھا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سو فیصدی کسی کو بھی اس کے تمام خیالات کی صحت پر اصرار نہیں ہوگا۔

حالی شعر کی موافقت میں اس کی ضرورت (Utility) ثابت کرتے ہیں۔ انہیں یہ ثابت کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ شاعری کا ملکہ بیکار نہیں ہے۔ یہاں تقریباً حالی اور سڈنی ایک ہی ماحول میں رہ کر، شعر کی وکالت کر رہے ہیں، سڈنی کا معاشرہ غیر معمولی جوش، جذبہ، (بدمستی بھی) سے ایک سرشاری کی کیفیت پیدا کر رہا تھا، نرمی فکر اپنے رجحانات کا سخت احتساب کرنا چاہتی تھی شعر میں بھی بے محل کی بدمستی، بدکرداری آگئی تھی تو سڈنی کو کہنا پڑا کہ یہ شعر کا نہیں بلکہ شاعر کا قصور ہے۔ حالی بھی یہی بات کہتے ہیں اور شعر کو "بے کار نہیں" کہہ کر اس کی مقصدیت ثابت کرتے ہیں اور مختلف مثالوں سے اسے واضح کرتے ہیں۔

حالی کا یہ کہنا کہ "شاعری ناشائستگی کے زمانے میں ترقی پاتی ہے" اور "شاعری شائستگی میں قائم رہ سکتی ہے"! اس مفروضے کی بنیاد دیکھا ہے کہ وہ خیالات ہیں جس میں وہ علمیت، سائنس اور عقلیت کی افضلیت ثابت کرتا ہے اور جذبہ اور تخیل کی طلسماتی فضا بندی کو روایتی ذہن کی فرسودگی کہتا ہے لیکن آج جدید سائنس اور نفسیات کی روشنی میں اس مفروضے کو صحیح نہیں مانا جا سکتا۔

یونگ کا کہنا ہے کہ ہر انسان میں ایک اجتماعی لاشعور ہوتا ہے جس میں ہزاروں سال کے تخلیقی مراحل کا شعور محفوظ رہتا ہے اسی لیے الفاظ محاورات میں جو قدیم حسن ہے، تخیلی کہانیوں اور لوک گیتوں میں جو ہمارے ذہنوں کی آسودگی ہے وہ آج کے انسان کا اپنے ماضی سے "فطری" رشتہ ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمیں اپنی دیو مالائیں (Myth) عزیز ہیں۔ ذہنی سلامتی اور آسودگی کے لیے تخیل کی طلسماتی اور مافوق الفطرت فضا بھی کبھی کبھی صحت کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔ ان علامتوں میں جدید مفہوم پیدا کیے جاتے ہیں

" شاعری کا تعلق اخلاق کے ساتھ" کی ضمن میں لکھتے ہیں" شعر اگرچہ براہ راست علم اخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا، لیکن ازروئے

انصاف اس کو علم اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں"۔

حالی نے پوری حقیقت کو محدود طریقے سے پیش کیا ہے۔ اس میں صاحب اقتدار قدر اخلاق کی ہوئی اور ادب کی ماتحتانہ اور ثانوی، پھر مجرد اخلاق اور اضافی اخلاق کے تصور میں جو فرق ہے اس کی وضاحت نہیں ہے مثلاً نیکی، سچائی، مساوات یقیناً مجرد صفات ہیں لیکن ایک دور کی نیکی دوسرے دور میں بدی بھی ہو جاتی ہے۔ شاعر کس دور کی نیکی کا ساتھ دے گا۔

حالی، دراصل اس طرح نہیں سوچ پائے کہ شاعری خود اپنی قدر ہے، بڑی شاعری بعض اخلاقی جبر کی نفی کر کے ایک دوسرے اخلاق کی تخلیق و تشکیل کر سکتی ہے۔ یہ تخلیق کرنے والی شاعری، اپنی مخلوق (نئے اخلاق نیا نظام وغیرہ) کی نائب مناب یا قائم مقام کیوں کر کہلائے گی۔ اس لیے بقول پروفیسر آل احمد سرور "فن اخلاق کا نائب نہیں ہے، فن خود اخلاق ہے، فن کسی خاص زمانے کا صحیفہ اخلاق نہیں ہوتا"۔

اسی طرح حالی کا یہ کہنا ہے کہ شاعر سوسائٹی کے تابع ہے، ایک اہم اشارہ ہے۔ کچھ لوگ حالی کے اس نظریہ کی تائید اور کچھ تردید کرتے ہیں۔ لیکن ہر دو طریقے سے حالی کا کلیہ اپنی جگہ درست رہتا ہے یعنی

(۱) ایسا شاعر ہو سکتا ہے جو اس سوسائٹی کو جس میں وہ ہے اچھا سمجھتا ہو اور اُسے قائم رکھنا چاہتا ہو۔ اس کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ سوسائٹی کے تابع ہے۔

(۲) ایسا شاعر ہو سکتا ہے کہ جو اس سوسائٹی کو جس میں وہ ہے خراب سمجھتا ہو اور ایک نئی اور بہتر سوسائٹی کی تعمیر کرنا چاہتا ہو اس طرح یہ ایک نئی سوسائٹی کے تابع ہوگا۔

اس طرح حالی کا یہ کلیہ درست معلوم ہوتا ہے۔

آگے چل کر حالی کہتے ہیں کہ "خود مختار بادشاہوں کی بے دریغ بخشش شعراء کے حق میں سم قاتل ہوتی ہے" اور تفصیل کے ساتھ شخصی حکومت کی خرابیاں بیان کرتے ہیں۔ یہ اپنی جگہ صحیح ہے۔

"بری شاعری سے سوسائٹی کو کیا کیا نقصان پہنچتے ہیں" اور "بری شاعری سے لٹریچر اور زبان کو کیا کیا صدمہ پہنچتا ہے"، اس سلسلے میں حالی کا خیال ہے کہ اگر سماج میں بُرے میلانات ترقی پا جاتے ہیں تو شاعری ان کا عکس ہو جاتی ہے۔ اس لئے حالی نے یہ نتیجہ نکالا کہ جب سوسائٹی سے شاعری کا اتنا گہرا رابطہ ہے اور سوسائٹی کی اصلاح ضروری ہے تو شاعری کی اصلاح بھی ضروری ہے۔ حالی کا خیال ہے کہ شاعری کو اصلاحی ہونا چاہیئے۔ حالی کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ مروجہ مزاج کی پیروی آسان ہے، لیکن وہ مشورہ دیتے ہیں کہ نئے مقصدی شعری نمونوں کو روشناس کرانا چاہیئے بمکن ہے ہم عصر شعراء اور سامعین زیادہ داد نہ دیں لیکن "اگر تم کی زمین میں کچھ آل باقی ہے تو تخم اکارت نہ جائے گا"۔

شاعری کے لئے عام طور پر لوگ موزوں طبعی کو کلیہ سمجھتے ہیں، مروجہ مضامین مروجہ تشبیہ و استعارے کو منظوم کر دینا ہی لوگ شاعری جانتے ہیں۔ لیکن حالی اس سلسلے میں خاصا انقلابی رویہ اپناتے ہیں اور بڑا عہد آفریں نظریہ پیش کرتے ہیں کہ "شعر کے لیے وزن ضروری نہیں"۔ اس کی وضاحت جب نظم اور شعر یا Verse اور Poetry سے کرتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ کلام منظوم Versfication اور اصل شعر poetry کے فرق کو بخوبی سمجھتے ہیں۔

دراصل نظم و نثر کا جو بنیادی فرق ہے کہ اول الذکر جذبے کا تخلیقی ہے اور دوسرا معلوماتی یا تعمیری اظہار ہے حالی ضمنی اختلافات کے باوجود اس نکتہ کے قریب پہنچ گئے۔ اور نظریہ سازی میں کوئی بنیادی غلطی نہیں کی۔ اگرچہ انہوں نے خود کبھی وزن کی قید سے آزاد ہو کر شعر نہیں کہا اور اس نظریہ میں بھی وزن کی "زیوریت" سے انکار نہیں کرتے بس یہ کہتے ہیں کہ صرف وزن ہی شعر کا اصلی حسن نہیں ہے۔ اس سلسلے میں عربی شعراء کے یہاں سے مثالیں دیتے ہیں۔

اسی طرح قافیے کو "نظم" کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ "شعر" کے لئے نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ قافیے کی قید ادائے مطالب میں مخل انداز ہوتی ہے۔ اور اپنی دلیل کی تائید میں مغربی شاعری کا حوالہ دیتے ہیں۔ اور اپنے دور کی اردو شاعری پر یہی اعتراض ہے کہ وزن اور قافیہ کے التزام کے باوجود "شعر" کی اصلی روح اپنے اندر نہیں رکھتی۔ ان کا یہ فیصلہ کہ "یہ دونوں (وزن اور قافیہ) شعر کی ماہیت سے خارج ہیں" ایک جرأت مندانہ فیصلہ ہے جو اس اصلیت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شعر کے بنیادی عناصر میں یہ عناصر خارجی ہیں۔

حالی کو شعر کے منصب سے واقفیت تھی، یہ واقفیت، شاعری اور نثر یا حکمت و منطق کے طریقہ کار کے فرق کو واضح کرتی ہے جب وہ "زمانہ حال کے محقق" کے حوالے سے کہتے ہیں کہ حکمت کا براہ راست کام یہ ہے کہ "ہدایت کرے تحقیقات میں مدد دے اور حقائق کو روشن کرے"۔ اور "شعر کا کام براہ راست یہ ہے کہ فی الفور لذت یا تعجب یا اثر پیدا کرے"۔ لیکن اس نکتہ کی وہ وضاحت نہیں کرتے اس لئے کہ شعریت کا حظ دینا ان کے افادی و مقصدی نظریہ ادب کا حریف بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

حالی، شاعری کے لئے "تخیل" Imagination کو بنیادی صفت قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ صفت وہبی ہے، اکتسابی نہیں، صرف کمی کا تدارک ہو سکتا ہے، اگر یہ ملکہ فطری کسی میں نہیں ہے

آورد دیگر لوازمات فن حاصل کرنے کے باوجود حقیقی شاعر نہیں ہو سکتا۔ ان کا خیال ہے "یہی وہ ملکہ ہے جس سے بعض اوقات شاعر کا ایک لفظ جادو کی فوج سامنے کھڑی کر دیتا ہے اور کبھی وہ ایک ایسے خیال کو جو کئی جلدوں میں بیان ہو سکے ایک شعر میں ادا کر دیتا ہے۔"

اس سے قبل حالیؔ میکالے کے حوالے سے افلاطون کے اس نظریہ کی تائید کر چکے ہیں کہ شاعری نقالی ہے لیکن تخیل کی تعریف میں وہ ارسطو کی تائید کرتے ہیں کہ شاعری نقالی نہیں ہے بلکہ یہ "ترتیب نو" ہے اور "یہ قوت (تخیل) اس کو مکرر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے"۔ مثال میں غالب کے دو شعر پیش کرتے ہیں۔ کولرج نے تخیل کو "قوت ایجاد" کہا ہے اور حالیؔ اسے مکرر ترتیب دینے والا کہتے ہیں۔ اس طرح حالیؔ کی تعریف اس قول کے قریب ہو جاتی ہے۔

" Poetry makes new things familiar, and familiar things new"

تخیل کی یہ کارفرمائی کہ جب کسی چیز کی کیفیت بیان کی جائے اس میں بیان کرنے والا یکسر کھو جائے۔ Keats کی زبان میں Negative capability ہے۔

کولرج نے تخیل کے مختلف پہلو بتائے ہیں مثلاً بصری تصویریں پیش کرنا، آرائشی زبان کی تشکیل کرنا۔ دوسروں کی جذباتی کیفیات کی ترسیل و ابلاغ عام جذبہ سے کچھ زیادہ شدید جذبہ بیدار کرنا اور اس کی تنظیم قوت فیصلہ کا بیدار کرنا، ان تمام چیزوں کے اجتماع میں موسیقی کا انبساط (the sense of musical delight) اور بالآخر تمام تضادات کی اکائی پیش کرنا۔ ان تضادات کی وحدت کی تشکیل کی جو تشریح کولرج نے کی ہے اسے بغیر کوئی لفظ تبدیل کئے Literary criticism کے مصنفین نے Tabular form میں اس طرح پیش کر دیا ہے۔

Imagination reconciles (balances, or harmonizes)

A		B	حالیؔ کے اقوال
Sameness	with	difference	"اب امیجینیشن
general	"	concrete	نے تمام معلومات
Idea	"	Image	میں اپنا تصرف
Representative	"	Individual	کرکے ایک نئی
Familiarity	"	Novelty	ترتیب پیدا
Order	"	Emotion	کر دی"
dgment	with	Enthusiasm	شاعری کے لیے
rtificial	"	Natural	"دوسری شرط
magination subordinates:			کائنات کا مطالعہ" ہے
rt to nature			قوت متخیلہ کوئی
anner to Matter			شے بغیر مادے کے پیدا نہیں کر سکتی
dmiration of the poet	to	Sympathy for the poetry	

کولرج کے تخیل کے تجزیہ کی اس لئے ضرورت پیش آئی کہ حالیؔ واضح طور پر اس تعریف کے مختلف حصوں سے متاثر ہیں گو کہ ان کی تعریف میں اتنی گہرائی اور جامعیت نہیں ہے لیکن حالیؔ اس نظریہ کی بنیادی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ حالیؔ کا خیال ہے کہ تخیل اکتسابی نہیں ہے لیکن اس میں تدریجی اور نشو و نما فطرت کے گہرے مطالعے اور فطرت انسانی کے مطالعے سے ہو سکتی ہے سر والٹر اسکاٹ کی مثال دیتے ہیں کہ وہ چھوٹے چھوٹے پودوں کی تفصیلات جمع کرتا تھا۔ یہاں حالیؔ نے علوم کے مطالعے سے جو تخیل میں وسعت پیدا ہوتی ہے اس کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔

حالیؔ نے شاعری کی پہلی شرط تخیل رکھی ہے جو وہبی ہے اور دوسری "مطالعۂ کائنات" مانی ہے۔ حالیؔ کی یہ وضاحت حقیقت پر مبنی ہے۔ اکثر بڑے فن کار حیات و کائنات کا غائر مشاہدہ اور مطالعہ کرتے ہیں۔ مشہور روسی ناول نگار ترگنیف، ایام سرما میں جب برف باری ہوتی تھی، تو بھی اپنے کمرے کی کھڑکی کھلی رکھتا تھا اور لکھتے وقت اپنے پاؤں کے نیچے گرم پانی کی بوتل رکھتا تھا۔ یہ ثابت کرتا ہے کہ بڑے فن کار داخلی (گرمی جس کی علامت گرم بوتل ہے) اور خارجی وسعت (جس کی علامت کھڑکی کا کھلا ہونا ہے) میں ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔

انگریزی کا بھی یہ مشہور قول ہے " We must never separate ourselves from nature"

"شاعری کی تیسری شرط تفحص الفاظ ہے"۔ متناسب الفاظ کا انتخاب اور موزوں ترتیب اچھی اور خوبصورت شاعری کے لئے ضروری ہیں۔ مغرب میں بھی اچھے فن کاروں نے لفظ کے برتنے میں سلیقہ اور کاوش صرف کی ہے۔ فلابیر کے مسودے ثابت کرتے ہیں کہ بعض لفظ پر چھ، سات چیپیاں تک چپکی ہوئی ہیں، اس کا قاعدہ تھا کہ وہ کسی لفظ کو بدلنے کے لئے اس پر دوسرا لفظ لکھ کر چپکا دیتا تھا۔ فرانسیسیوں کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ لفظوں کے عاشق ہیں۔

انگریزی میں شاعری کی یہ تعریفیں، شاعری میں لفظ کے مناسب اور موزوں استعمال کی اہمیت کا ثبوت ہیں۔

" Beautiful words are the very and peculiar light of mind"

"The best words in the best order"

اُردو میں لفظ کے استعمال پر بڑا ہنگامہ رہا ہے۔ بڑے شاعروں کے یہاں لفظ کا استعمال ایسی تخلیقی وسعت کے ساتھ ہوتا ہے کہ بقول غالب سے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

لفظ بنیادی طور پر اچھے، بُرے نہیں ہوتے، ان کا مناسب استعمال ان میں جان ڈال دیتا ہے۔ مثال کے طور پر دو لفظ ہیں "اوس" اور "شبنم"۔ انیس کے یہاں دو مصرعوں میں ان کا برمحل استعمال حسن ہے۔

سے "کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا" اور
سے "شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے"

اب ذرا سی کاریگری سے ان دونوں خوبصورت لفظوں کو دو نئے خوبصورت مصرعوں میں بدل دیا جائے مثلاً

سے شبنم کو پی کے اور بھی سبزہ ہرا ہوا
اور سے کیا اوس بھر گئی تھی کٹورے گلاب کے

جو کان لفظ کی موسیقی کے سلسلے میں بہت حساس ہے اسے ان دونوں مصرعوں کو پڑھ کر اب بہت اذیت ہوگی اس لئے حالی کا لفظ کا یہ احترام اُردو روایت کا احترام اور تصدیق ہے۔

اس بحث میں وہ آمد اور آورد کا مسئلہ بھی اٹھاتے ہیں اور آخر میں یہ کہتے ہیں کہ "انشاء پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ پر ہے نہ معانی پر"۔ حالی کا یہ کہنا کہ تخلیقِ شعر میں شعور کو دخل ہے۔ درست ہے جدید نفسیات بھی تخلیقی کیفیات کے جو چار مراحل بتاتی ہے اس میں (۱) آغازِ فکر (Preparation) (۲) غیر شعوری نشو ونمائے فکر (Incubation) (۳) تجلی فکر (Inspiration) (۴) تصدیقِ فکر (Verification) سب نہ تو یکسر شعوری ہیں اور نہ بالکل غیر شعوری۔ زیادہ سے زیادہ نمبر ۲، ۳ کو ہم غیر شعوری یا وجدانی کہہ سکتے ہیں اور پہلا اور آخری تو شعوری اور فکری ہیں، اس لئے حالی کا آمد کی ترتیب و تہذیب دینے کا مشورہ بہت اہم ہے۔ یہاں یہ بات بھی حالی نے اپنے طریقے سے واضح کر دی کہ یہ شعوری کوشش "Artless art" یا "Careless care" ہو۔

آخر میں حالی با دلِ ناخواستہ پرانے نظریہ کو قبول کر گئے "جو لفظ کی اہمیت کو بہت آجاگر کرتا ہے" انہیں صاف صاف یہ کہنا چاہئے تھا کہ مضمون کی اسلوب سے اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ نئے خیال کو نئی زبان چاہئے۔ یہ مقصدی انشاء پردازی، روایتی انشاء پردازی سے الگ ہوگی۔

"تخیل کو قوتِ ممیزہ کا محکوم ہونا چاہئے۔" وہ تخیل جو وہبی اور شاعری کے لئے بنیادی ہے اُسے قوتِ انتخاب کے تابع ہونا چاہئے ورنہ کلام رطب و یابس سے پُر ہو جائے گا۔ حالی کا یہ مشورہ قابلِ قبول ہے۔

اب حالی سب سے اہم مسئلہ پر آتے ہیں اور وہ ہے شاعری کی تعریف۔ اس کی اہمیت یوں اور بڑھ جاتی ہے کہ اُردو شاعری کے سرسری جائزے (غزل، قصیدہ، مثنوی وغیرہ) پر اُن کا یہی نظریہ حاوی رہتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ملٹن کے ایک فقرے کو اپنے نظریہ کا ماخذ بتاتے ہیں لیکن ملٹن تقریباً بے گناہ ہے۔ ملٹن کا وہ فقرہ جس میں اس نے شاعری کے لئے (Simple, passionate and sensuous) ہونا ضروری قرار دیا تھا نہ اس کی شاعری کا نظریہ تھا اور نہ ہی کوئی ایسا معیارِ شعر تھا جس پر وہ انگریزی شاعری کو پرکھنا چاہتا ہو۔ ملٹن نے "نصابی شاعری" جو طلباء کے لئے موزوں ہوگی۔ اس کے لئے اپنے دور میں یہ مشورہ دیا تھا کہ نصاب کا انتخاب کرنے والے شاعری کو اس معیار سے منتخب کریں۔ یہ تقریباً وہی بات ہوئی کہ سکولی طلباء و طالبات کے لئے آسان نظمیں مثلاً پن چکی، گائے وغیرہ بھی شامل ہوتی ہیں اور جن کی اہمیت ہے، لیکن اس سادگی کا غالب کی پرپیچ فکری مشکل پسندی سے کوئی مقابلہ مضحکہ خیز ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ حالی نے اس فقرے کا ترجمہ "سادگی، اصلیت اور جوش" کیا اور ان کی تشریح اور وضاحت تقریباً اپنے طور پر بہت لچکدار طریقے سے کی، جس میں مقصدی ادب کی محدودیت کے باوجود ایسی وسعت ہے جو غزل اور مثنوی کے سرمائے کے کافی حصے کو سمیٹ لیتی ہے۔

ملٹن کے حوالے سے وہ کہتے ہیں "وہ کہتا ہے کہ شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو، جوش سے بھرا ہوا اور اصلیت پر مبنی ہو" اور یورپین محقق کے حوالے سے تشریح کرنے کے بعد کہتے ہیں "کہ ہمارے نزدیک ابھی اس میں کسی قدر اور تشریح کی ضرورت ہے۔"

"سادگی"

"سادگی ایک اضافی امر ہے . . . . ہمارے نزدیک سادگی کا معیار یہ ہونا چاہئے کہ خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہو مگر پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو اور الفاظ جہاں تک ممکن ہو تحاوُر اور روزمرّہ کی بول چال کے قریب قریب ہوں۔"

اس نکتہ کو پا کر بھی حالی پوری طرح نہیں پاتے اس لئے کہ وہ تمام ذہنوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ یہ بات سچ ہے کہ سادگی اضافی امر ہے، غزل کی زبان تعمیم (Generalization) کی زبان

ہے یہاں بادہ و ساغر کے استعارے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو ہوتی ہے غزل میں حقیقی نفسیات یا (Precised Psychology) ہوتی ہے۔ سادگی اس لئے پوری حقیقت نہیں۔ غالب کے اکثر اشعار اس لئے پیچیدہ ہیں کہ بقول پروفیسر آل احمد سرور "زندگی کا سفر سادگی سے پیچیدگی کی طرف ہے، یا معنی پیچیدگی بے تہہ سادگی سے زیادہ وقیع ہے اس لئے مسئلہ موزوں اظہار کا ہے، گیت اور جذبوں سے بھرے غنائیہ اشعار کے لئے سادگی وصف ہو سکتی ہے لیکن فکری اشعار کے لئے، اقبال کی نظموں کے لئے یہ سادگی ناموزوں ہوگی۔

اسی طرح اصلیت کی تعریف وہ لچک دار کرتے ہیں۔

حالی اس مسئلے میں خود بھی الجھتے ہیں وہ پانچ اشعار اور ان کی تشریح سے نتائج اخذ کرتے ہیں —— حقائق نفس الامر، عقیدہ، جذبۂ شاعر، شاعرانہ احساس برتری اور شاعرانہ اصلیت کو اصلیت مانتے ہیں۔

شاعری میں جوش پر ان کا یہ خیال ہے "جوش سے مراد ہے کہ مضمون ایسے بے ساختہ الفاظ اور موثر پیرائے میں بیان کیا جائے جس سے معلوم ہو کہ شاعر نے اپنے ارادے سے یہ مضمون نہیں باندھا، بلکہ خود مضمون نے شاعر کو مجبور کر کے اپنے تئیں اس سے بندھوایا ہے۔"

ابتدائی عربی شاعری کے پرجوش ہونے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ وہ واردات دلی کا نقشہ ہوتی تھی۔ اس تمام بحث میں وہ تقلیدی موضوعات کی مذمت کرتے ہیں اور شاعری کے لئے احساس کی اصلیت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ گویا اصلیت کے بغیر جوش ممکن نہیں ہے۔ یہ بحث یہیں تمام نہیں ہوتی بلکہ مختلف مثالوں کی تفصیل و تشریح، نیچرل شاعری اور زبان کے درستی کے ساتھ استعمال کرنے کے مسائل بیان ہونے لگتے ہیں اور دوبارہ بحث اس عنوان کے ساتھ آتی ہے کہ فکر شعر کی طرف کس حالت میں متوجہ ہونا چاہئے۔

حالی، خالص شعوری سعی کو تخلیق شعر کے موافق قرار نہیں دیتے مختلف مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مختلف شعراء کے شعر کہنے اور متاثر (Inspired) ہونے کا طریقہ کار جدا تھا۔ ان سے کلیہ نہیں بنایا جا سکتا لیکن اس بات کا مشورہ دیتے ہیں کہ فرمائشی طور پر شعر نہ کہنا چاہئے۔ ان کا کہنا ہے۔

> " جہاں تک ممکن ہو کسی مضمون کے لکھنے پر اس وقت تک قلم اٹھانی نہیں چاہئے جب تک اس کی چٹک دل کو نہ لگی ہو۔ کسی کی ریس سے کسی کی فرمائش، کسی کے دباؤ یا کسی اور مجبوری کے سبب بغیر اقتضائے طبعی اور ولولہ باطنی کے جو شعر کہا جائے گا یا جو نظم سر انجام کی جائے گی۔ اس میں اثر اور زور پیدا کرنا نہایت دشوار ہے "

جہاں تک اس تعریف کا سوال ہے کسی حد تک اس سے متفق ہوا جا سکتا ہے لیکن ایک سوال تو بہت اہم ہے کہ کیا اگر کسی کے دل میں حب الوطنی نہیں ہے دیگر ہر طبقہ کے نقطۂ نگاہ سے حب الوطنی کا تصور جدا ہو سکتا ہے، اسی طرح اس کا اخلاقی نقطۂ نگاہ نہیں ہے تو وہ کس طرح افادی یا مقصدی شاعری کر سکتا ہے۔

حالی کی یہ دونوں باتیں اگر ایک ساتھ سوچی جائیں تو الجھنیں ہوتی ہیں یعنی (۱) شاعری کو سوسائٹی کے تابع اور اخلاقی ہونا چاہئے۔

(۲) شاعری دل سے نکلنا چاہئے۔

بہت سے لوگوں کے لئے، جو واقعی شاعر بھی ہوں، ان کے لئے ان دونوں شرطوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سخت الجھن پیدا ہو سکتی ہے۔

حالی شاعری کو نیچرل چاہتے ہیں لیکن نیچرل شاعری کا تصور حالی کے یہاں سرسید کے "نیچرل" سے محدود ہے۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق میں لکھا تھا کہ ہماری شاعری کی ابھی ابتداء ہے اور یہ ترقی کر کے ملٹن اور شیکسپیئر کی شاعری کی طرح نیچرل ہو جائے گی۔

حالی کا خیال ہے کہ ادب اور شاعری کا تعلق سماج سے ہے۔ اس لئے شاعری کے ذریعے سے ہم سماج کی بہبودی اور اصلاح کا بھی کام لے سکتے ہیں اور وہی شاعری اچھی اور عظیم ہوگی جو سماج کے لئے مفید ہو، اخلاقی تدریس کر سکے۔ اس شاعری کا معیار اصلیت، سادگی اور جوش ہے۔ اس کی روشنی میں وہ شعری اصناف سخن کا جائزہ لیتے ہیں۔

غزل پر وہ قدرے تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔

غزل کے وجود کا جواز اس طرح پیش کرتے ہیں۔ "چوں کہ شاعر کو مبسوط اور طولانی مسلسل نظمیں لکھنے کا ہمیشہ موقع نہیں مل سکتا اور اس کی قوت متخیلہ بے کار بھی نہیں رہ سکتی اس لئے بسیط خیالات جو وقتاً بعد وقت شاعر کے ذہن میں فی الواقع گزرتے ہیں ... ان کے اظہار کا کوئی آلہ غزل یا رباعی یا قطعہ سے بہتر نہیں ہو سکتا۔"

غزل کے وجود کی محض یہ وجہ کہ "شاعر کو طولانی مسلسل نظمیں لکھنے کا موقع نہیں مل سکتا۔" ناکافی ہے۔ کامیاب تخلیقی عمل، کسی تجربہ کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک تجربہ کی سعی تخلیق امتحان کے سوالات نہیں ہیں کہ نیچے دیئے ہوئے سوالوں میں کوئی تین کرو بلکہ ہر تخلیق، تجربہ اور اظہار کی اکائی ہوتی ہے۔ تجربہ کا وہ حاصل جسے نچوڑ کہیں بعض وقت ایک شعر تو کیا صرف ایک مصرعہ میں ادا اور مکمل ہو جاتا ہے۔ بڑے فن کار کی فن کاری بھی دوسرا مصرعہ نہیں لگا پاتی غزل کی کامیابی کا راز اس کا یہی اختصار بھی ہے جس میں طویل تجربہ ایک نتیجہ، قول، اور حاصل کی صورت ظاہر ہوتا ہے۔

غزل کی اصلاح کے سلسلے میں ان کا خیال ہے "کہ کوئی لفظ ایسا نہ آنے

پلسے جس سے کھلم کھلا مطلوب کا مرد یا عورت ہونا پایا جائے ٭ واضح ہو کہ یہ مشورہ اس لئے نہیں دیا جا رہا ہے کہ شاعری میں رمزیت یا ایمائیت ضروری ہے بلکہ نقطۂ نظر خالص اخلاقی ہے۔ اور یہ مشورہ کہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہو اور اس میں عورت اور مرد کی شبیہ نہ ابھر سکے، ایسا تضاد ہے جس پر کسی سنجیدہ تنقید کی ضرورت نہیں ہے۔

حالی اپنی بات کو منوانے کے لئے کبھی کبھی غیر استدلالی طریقہ بھی اپنا جاتے ہیں مثلاً "چاک گریباں" کے مضامین کی مذمت میں ۲۳ مثالیں نثر میں انہوں نے دیں۔ یہ نثری ترجمہ اختصار کی وجہ سے نہیں کیا گیا۔ ان میں الفاظ اس سے زیادہ ہی آئے ہوں گے جتنا کہ ۲۳ اشعار میں ہوتے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ اشعار لکھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی "کہ چاک گریباں کے صرف وہی انداز معنی نہیں ہیں۔ جو حالی کی نثر بتاتی ہے۔ اشعار کا نہ لکھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ حالی اپنی بات منوانے کے لئے کبھی کبھی (اکثر نہیں) ایسا طریقہ کار اپنا لیتے ہیں جو منصفانہ نہیں کہا جا سکتا۔

غزل (صنف) کے بیان میں وہ پھر روزمرہ، اور محاورے کی موزونیت کے مسئلے کو لے آتے ہیں جو غیر ضروری ہے، یہ بحث شاعری کے ضمن میں مناسب تھی۔ ہاں سنگلاخ زمینوں، اور لمبی ردیفوں میں شعری وجدان کو مقید کرنا ایک غیر شاعرانہ فعل ہے، اس کی وہ مناسب طور پر مذمت کرتے ہیں۔

قصیدہ اور مرثیہ پر بھی ان کا نظریہ وہی اخلاقی بلکہ قومی ہے۔ ان کا نظریہ اخلاق اُردو اور فارسی کے مبالغے کے صرف عیوب دیکھ سکتا ہے۔ قصیدے کے مبالغے میں حسن اور بادشاہ کی مدحت میں مثالی بادشاہ ہونے کا جو مہذب مشورہ بھی ہوتا ہے اس پر ان کی نگاہ نہیں جاتی۔ قصائد انہیں اس لئے جھوٹ کا دفتر معلوم ہوتے ہیں کہ اگر ممدوح کو عدالت میں حاضر ہونا پڑے تو یہ اشعار اس کا حلیہ بیان نہیں کر سکتے، اس لئے بے کار ہیں۔

شاعری سے عدالتی بیان یا پولیس کی سراپا نگاری کا مطالبہ کرنا بنیادی طور پر غلط ہے، اُدب کا بنیادی مقصد ادبی حظ و مسرت دینا ہے، واقعات کا بیان نہیں۔

مرثیہ کے باب میں انیس کی فصاحت و بلاغت کی تعریف کے بعد اُن کا مشورہ ہے کہ قومی ہیروز کا مرثیہ زیادہ لکھا جائے تاکہ اُدب اور زندگی کا عصری رشتہ زیادہ مضبوط ہو۔ مثنوی کے فارم کی وسعت کا انہیں اندازہ ہے، اس لئے کہ اس فارم میں قصہ گوئی کے بہتر مواقع ہیں۔ ان کا مطالبہ ہے کہ کلام "مقتضائے حال" کے برخلاف نہ ہو اور قلق کی مثنوی سے چند شعر نقل کر کے وضاحت کرتے ہیں کہ ایک بوڑھے بادشاہ اور ملکہ میں ذرا رنجیدہ گفتگو ہو رہی ہے۔ ملکہ کہتی ہے کہ "میں پایہ رکاب ہوں" ـــ طاقت جسم دے چکی ہے جواب ـــ" اور اپنی لڑکیوں کی شادی کی بات کرتی ہے۔ بادشاہ اپنی رنجیدہ ملکہ کو صرف "ماہ" کہہ دیتا ہے۔ یہاں کوئی اچونچلا نہیں اور وہ خود اسی فکر میں ہے۔ مثلاً

سے وہ خدا خود خیال ہے مجھ کو ؛ جستجو بھی کمال ہے مجھ کو

حالی کو بوڑھے بادشاہ کا بوڑھی ملکہ کو "ماہ" کہنا خلاف فطرت محسوس ہوا اور فرماتے ہیں کہ" بادشاہ کا اپنی بڑھیا ملکہ کو کہیں اے ماہ اور کہیں اے حور کہنا مقتضائے حال کے خلاف ہیں"۔

اسی طرح وہ "لذت عشق" میں بادشاہ زادی کی بے حجابانہ گفتگو کو بھی خلاف فطرت قرار دیتے ہیں

یہاں انتہائی ادب کے ساتھ عرض کرنا ہے کہ مولانا حالی، اپنی جملہ صفات اور دردمندیوں کے ساتھ کسی بڑے تخلیقی ذہن کے مالک نہ ہیں۔ حالی غریب آدمی تھے، یہ کوئی بری بات نہیں لیکن اگر کوئی صرف غربت کو معیار شرافت مان کر چلے تو اس پر دوسرے حلقے کی فطرت نہیں کھل سکتی۔

حالی عین جوانی میں اپنی بیوی کو چھوڑ کر گئے تھے تاکہ تعلیم حاصل کر سکیں۔ اب کوئی شخص سچے طالب علم کی صرف یہی شرط رکھے تو غلط ہوگا۔ اسی طرح بوڑھے بادشاہ کا اپنی ملکہ کو "ماہ" کہہ دینا نہ خلاف فطرت انسانی ہے اور نہ خلاف عمر۔ یہ الگ بات ہے کہ قلق کی مثنوی کمزور ہے لیکن حالی کے اعتراض کی نوعیت بھی کمزور ہے۔ اسی طرح بادشاہ زادی کا بہت شرمیلی ہونا بھی ضروری نہیں، تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ امیر، غریب، بادشاہ، فقیر میں کسی دور میں کوئی آئیڈیل اور جامد صفات معین نہیں رہی ہیں۔ عاشقانہ مثنویوں کے ہیرو یا ہیروئن پر یہ اعتراض اس بات کا ثبوت ہے کہ تنقید نگار کے ذہن پر اخلاقی بندشوں کا احتساب شدید ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری کی اہمیت بھی یہی ہے کہ اس کا نہ ماننے والا بھی اس سے ابتدا کرتا ہے۔ اس کا شدید مخالف بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ایک متوازن ذہن رکھنے والے ادب کے طالب کے لئے مقدمہ شعر و شاعری اُردو تنقید کا پہلا صحیفہ ہے۔ اس میں نظریہ سازی کی گئی ہے۔ اس نظریہ سازی میں حالات حاضرہ کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن فارسی، عربی اور اُردو کی ادبی روایتوں کا بھی احترام ہے۔ انگریزی اقوال سے اپنے نظریہ کو مزید تقویت دینے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ جدید ذہن کا اعتبار بھی حاصل ہو سکے۔ اور قدیم اور روایتی ذہن کو قائل کیا جا سکے۔

پھر اس تشکیل شدہ نظریہ کی روشنی میں اُردو کے نمائندہ شعری اصناف کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اس جائزے میں اپنے نظریئے سے خلوص ہے، اظہار میں جرأت ہے اور زندگی سے رابطہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقدمہ شعر و شاعری اُردو تنقید کی پہلی باقاعدہ تصنیف ہے۔

••

غزلیں

ضیا فتح آبادی

پہلے خود چہرے سے وہ پردہ اٹھا دیتے ہیں
پھر ہمیں جرمِ تماشا کی سزا دیتے ہیں

سچ کوئی جھوٹ نہیں، لاتے ہی لب پر ہم کو
لوگ کیسے ہیں کہ سولی پہ چڑھا دیتے ہیں

اُن کی یادوں سے جِلا پاتا ہے آئینۂ دل
وہ جفا جُو، جو ہمیں درسِ وفا دیتے ہیں

نام کا جام ہمارا بھی تو کوئی ہوگا
یہ گدائے درِ میخانہ صدا دیتے ہیں

فطرتِ اہلِ زمانہ بھی معمہ ہے ضیا
چھوٹی سی بات کو افسانہ بنا دیتے ہیں

محسن نظامی

غموں کا دور بھی لازم ہے زندگی کے لیے
مسرتیں بھی ہیں دنیا میں ہر کسی کے لیے

ہرا بھرا ہے ہمیں سے یہ گلشنِ ہستی
ہمیں نے خون دیا ہے کلی کلی کے لیے

ہزار حیف اندھیرے کسی سے کم نہ ہوئے
چراغ جتنے جلائے تھے روشنی کے لیے

میں تیری بزم میں آیا ہوں تشنہ لب ساقی
وہ جام دے جو ضروری ہو مے کشی کے لیے

کچھ اس طرح سے گزاری ہے زندگی محسن
تمام عمر تڑپتے رہے کسی کے لیے

خضر برنی

مدت سے کر رہے تھے بہاروں کی آرزو
نکلی نہ دن سے پھر بھی نظاروں کی آرزو

یوں آشیاں چمن سے اُجاڑا گیا کہ بس
غنچوں کی آرزو ہے نہ خاروں کی آرزو

ساقی تو آج اپنے ہی عالم میں مست ہے
پوچھی گئی نہ بادہ گساروں کی آرزو

ویران راستے ہیں ہر اک موڑ ہے اُداس
پوچھے گا کون راہگذاروں کی آرزو

طوفاں کی گود میں ہمیں ڈالا گیا خضر
اُبھرے گی دل میں کیسے کناروں کی آرزو؟

پیام فتحپوری

روشنی غم کے اندھیرے میں نظر آئی ہے
پھر نئے دور کی تاریخ سنور آئی ہے

ہے عجب دَورِ سلامت ہیں سبھی اہلِ ہوس
جو بھی آئی ہے بلا عشق کے سر آئی ہے۔

خونِ دل سے ہوئے تابندہ نگاہوں کے چراغ
تب کہیں روشنیٔ فکر و نظر آئی ہے

کیا خبر ہم کو خدا ہے کہ صنم ہے کوئی
دل میں اکثر کوئی تصویر نظر آئی ہے

کوچۂ عشق ہے یا زیست کا مقتل ہے پیام
آرزو خاک بہ سر، چاک جگر آئی ہے

ناظر جلگانوی

بہار ختم ہوئی اُس کی یادگار تو ہے
کہ خار زار بھی پروردۂ بہار تو ہے

کرن یقین کی کہتی ہے ظلمتِ شب سے
ہوئی نہ صبح مگر اُس کا انتظار تو ہے

صعوبتیں رہِ منزل کی آشکار سہی
بہ فیضِ شوق مرا عزم اُستوار تو ہے

ہوس کو عشق کہوں عشق کو ہوس کیونکر
مری نگاہ میں کچھ فرقِ نور و نار تو ہے

غزل کو پیاس تھی خونِ جگر کی اے ناظر
ہر ایک شعر اب آسودۂ بہار تو ہے

مانی ناگپوری

شہر پہ چھائی ہوئی خطرۂ یلغار کی رات
موت کے سائے میں جیسے کسی بیمار کی رات

دھوپ میں کوچہ نوردی نہیں جن کا مسلک
ان پہ نازل نہ ہوئی گیسوئے خمدار کی رات

میں وہاں دیکھ چکا کتنے نظامِ شمسی
دن کو کس طرح کہوں انجمنِ یار کی رات

شرط ہے دُوسرے عالم میں رسائی ورنہ
رات زاہد کی وہی ہے جو قدح خوار کی رات

قابلِ رشک ہے اے دوست حیاتِ مانی
تیری یادوں کا شبینہ کبھی انکار کی رات

لزلی فلیمنگ

منٹو کے مضامین

مسز لزلی فلیمنگ مقیم حال دہلی ایک امریکن خاتون ہیں جو وِسکانسن یونیورسٹی سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی زیرِ نگرانی سعادت حسن منٹو پر پی ایچ ڈی کر رہی ہیں

سعادت حسن منٹو اُردو کے چوٹی کے افسانہ نگار تھے عام طور پر وہ اپنے افسانوں اور ڈراموں کے لئے یاد کئے جاتے ہیں لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ منٹو نے تقریباً چالیس مضامین بھی لکھے جو دو مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ "منٹو کے مضامین" کے عنوان سے ۱۹۴۲ء میں اور دوسرا مجموعہ "تلخ، ترش اور شیریں" کے عنوان سے لاہور سے سنہ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ یہ دونوں مجموعے ایک دوسرے سے خاصے مختلف ہیں خیالات کے اعتبار سے بھی اور طرزِ تحریر کے اعتبار سے بھی۔ یہاں ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم ان دونوں مجموعوں کے فرق پر غور کریں اور جہاں تک ہو سکے اس فرق کی وجوہات پر بھی روشنی ڈالیں۔

"منٹو کے مضامین" میں جو آزادی سے پہلے کا چھپا ہوا مجموعہ ہے کُل بیس مضامین شامل ہیں جن میں سے نو دس صفحے سے کم کے ہیں اور باقی گیارہ سے تریسٹھ صفحے تک کے ہیں۔ ان مضامین کا اسلوب اور موضوعات بھی باہم دگر مختلف ہیں۔ دو مضامین "پھر تو یہاں سے چلی جائے اسد" اور "کچھ نہیں تو عداوت ہی سہی" مردوں اور عورتوں کے تعلقات کے بارے میں ہیں۔ اول الذکر مضمون میں منٹو اس سوال پر روشنی ڈالتے ہیں کہ مرد عورتوں کو کسی وجہ سے چھیڑتے ہیں اور وہ عورتوں کو چھیڑنے سے کس قسم کا مزہ لیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں دوسرے مضمون میں منٹو عورتوں کے ردِ عمل کو پیش کرتے ہیں۔ سات مضامین میں جن کے عنوان ہیں "باتیں" "تجدیدِ اسلحہ" "دیہاتی بولیاں (۱)" "دیہاتی بولیاں (۲)" "ہندی اور اُردو" "اگر" اور "ترقی یافتہ قبرستان" ان میں منٹو جدید دور کا مذاق اڑاتے ہیں۔ باقی گیارہ مضامین میں منٹو بڑی سنجیدگی سے سیاسی اور سماجی مسائل سے بحث کرتے ہیں۔ ان میں دو "ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ" اور "ایک اشک آلودہ اپیل" میں سیاست دانوں کے خلاف شکایات ہیں۔ اول الذکر مضمون میں منٹو سیاسی لیڈروں کی بے ایمانی کی وجہ سے ان سے اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ دوسرے مضمون میں وہ بمبئی میں ہندو مسلم فسادات میں سیاست دانوں کی ریاکاری کا پردہ چاک کرتے ہیں۔

مزید دو مضامین "شریف عورتیں اور فلمی دنیا" اور "ہندوستانی صنعتِ فلم سازی پر ایک نظر" میں منٹو صنعتِ فلم سازی میں موجودہ بُرے حالات اور مسائل کو بیان کرتے ہیں۔ اس مجموعے میں دو لمبے مضامین بھی شامل ہیں جو سوویت روس کے بارے میں ہیں "سرخ انقلاب" میں منٹو بالشویک انقلاب کی تعریف کرتے ہیں اور دوسرے مضمون میں مکسیم گورکی کا مفصّل تذکرہ ہے۔ باقی پانچ مضامین میں "کسان مزدور سرمایہ دار زمیندار" "مجھے ایک شکایت ہے" "لوگ اپنے آپ کو مدہوش کیوں کرتے ہیں" "مجھے بھی کچھ کہنا ہے" اور "عصمت فروشی" میں منٹو بڑی سنجیدگی سے کسانوں اور مزدوروں کے بُرے حالات پر، جدید ادیبوں کی مالی مشکلات پر، لوگوں کے سگریٹ، شراب بھنگ وغیرہ پینے کی بری عادتوں اور عصمت فروشی پر لوگوں کی غلط فہمیوں پر اپنے خیالات پیش کرتے ہیں۔

"منٹو کے مضامین" کے بعد "تلخ، ترش اور شیریں" لاہور سے آزادی کے بعد شائع ہوئی تھی۔ اگرچہ یہ کتاب ۱۹۵۴ء میں سامنے آئی لیکن ان مضامین کی بنیاد تقسیم کے بعد منٹو کے مشکل حالات اور ان کی بے چینی پر ہے۔ "ٹھنڈا گوشت" کے مقدمہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ ان دنوں کے بارے میں لکھتے ہیں

"سوچ سوچ کر میں عاجز آگیا تھا چنانچہ آوارہ گردی شروع کر دی۔ بے مطلب سارا دن گھومتا رہتا تھا، خود خاموش رہتا لیکن دوسروں کی سنتا رہتا تھا، بے ہنگم باتیں، بے جوڑ دلیلیں، خام سیاسی مباحثے، اس آوارہ گردی سے یہ فائدہ ہوا کہ میرے دماغ میں جو گرد و غبار اُڑ رہا تھا، آہستہ آہستہ بیٹھ گیا اور میں نے سوچا کہ ہلکے پھلکے مضامین چاہئیں چنانچہ میں نے "ناک کی قسمیں" "دیواروں پر لکھنا" جیسے مضامین "امروز" کے لئے لکھے جو پسند کئے گئے۔ آہستہ آہستہ مزاح خود بخود طنزیہ رنگ

اختیار کر گیا۔" جو ہلکے پھلکے مضامین "امروز" میں شائع ہوئے ان میں سے انیس اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ یہ سب کے سب ایک دوسرے سے خاصے مختلف ہیں حالانکہ ان سب میں شوخی اور ہلکا طنزیہ رنگ اکثر موجود ہے۔ گیارہ مزاحیہ مضامین میں سے چار "دیواروں پر لکھنا" "ناک کی قسمیں" "کھانسی" اور "کچھ ناموں کے بارے میں" روزانہ زندگی کو بیان کرتے ہیں۔ سات مضامین چھوٹے چھوٹے ڈراموں کے ذریعے سے ("مفت نوشوں کی تیرہ قسمیں" "پانچ پرندہ کی باتیں" "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" "انصاف" "یوم اقبال پر" اور "ایمان وایقان") موجودہ سماجی اور عالمی مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ان ہلکے پھلکے مضامین کے مقابلے میں اس مجموعے کی باقی پانچ مضامین کسی حد تک سنجیدہ ہیں "مختصر ڈرامے کے ذریعے کارل مارکس" میں منٹو مارکس کی اور "جون آف آرک کا مقدمہ" میں جون آف آرک کی سوانح عمری پیش کرتے ہیں۔ تین چار الگ الگ واقعات کے ذریعے سے "میں فلم کیوں نہیں دیکھتا" میں منٹو صنعت فلم سازی کے برے حالات کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور "سوال پیدا ہوتا ہے" اور "منحوس عورتیں" میں منٹو پاکستان کے سماجی مسائل پر جواب دیئے بغیر کئی سوال پوچھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ دونوں مجموعوں میں سنجیدہ مضامین بھی ہیں اور ہلکے پھلکے مضامین بھی، مگر پہلے مجموعہ کے زیادہ تر مضامین کے موضوعات خاصے سنجیدہ ہیں۔ یعنی ان مضامین میں منٹو زیادہ تر اہم سماجی اور سیاسی مسائل پر بڑے غور سے اپنے خیالات پیش کرتے ہیں۔ سوویت روس سے لوگوں کی دلچسپی بڑھانے کے لئے وہ بولشویک انقلاب کی وجوہات اور گورکی کی تصنیفات کی خوبیاں بیان کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ عصمت فروشی پر عام لوگوں کی غلط فہمیوں کے خلاف دلائل پیش کرتے ہوئے منٹو ہمیں یہ سمجھاتے ہیں کہ عصمت فروشی کی بنیاد عورتوں کی اخلاقی کمزوریوں پر نہیں بلکہ مردوں کی جنسی رغبت پر ہے۔ منٹو صنعت فلم سازی کے حالات کو بیان کرتے ہوئے ان حالات کی اصلاح کا مشورہ دیتے ہیں۔

بعض ہلکے پھلکے مضامین بھی اہم سیاسی اور سماجی مسائل کے بارے میں ہیں، مثلاً "ہندی اور اردو" میں قومی زبان کا مسئلہ اور "تحدید اسلحہ" میں بین الاقوامی جنگ کا مسئلہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے مجموعہ کے بیشتر مضامین ہلکے پھلکے ہیں اور ان کے موضوعات اتنے اہم نہیں۔ چھوٹے ڈرامے، مکالمے، اخباروں کے مضامین، غالب کا تذکرہ، یا دبلے پتلے ناکوں، ناموں اور پٹاخوں کے بارے میں منٹو کے خیالات محض ہنسنے ہنسانے کے لئے ہیں۔ اس مجموعہ کے پانچ سنجیدہ مضامین میں سے بھی "سوال پیدا ہوتا ہے" میں در اصل کسی خاص مسئلہ سے بحث نہیں کی گئی بلکہ محض اشاروں سے کام لیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے حالانکہ دونوں مجموعوں میں سنجیدہ مضامین بھی شامل ہیں اور طنزیہ مضامین بھی، پھر بھی ان دونوں مجموعوں کا طرز تحریر خاصا مختلف ہے۔ پہلے مجموعہ کے بیشتر مضامین میں طنزیہ تیکھاپن بالکل نہیں بلکہ ان سب مضامین میں سنجیدگی اور متانت سے براہ راست طور پر بحث کی گئی ہے اور دلیلیں پیش کر گئی ہیں۔ مثال کے طور پر "ہندوستانی صنعت فلم سازی پر ایک نظر" میں صنعت فلم سازی پر بوڑھوں کے قبضہ کا ذکر کرتے ہوئے منٹو جوان لوگوں کے نئے خیالات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ "ہمیں اچھے فلم چاہئیں، ہمیں ایسے بلند فلم چاہئیں جو ہم غیر ممالک سے فلموں کے مقابلے میں پیش کر سکیں۔ ہم لوگوں کو یہ خبط ہے۔ اس بات کی دیوانگی ہے کہ ہمارے وطن کی ہر شے دوسروں کے مقابلے میں اچھی ہو۔ یہ خبط ہماری زندگی کی اصلی گرمی ہے، اور ہم اس گرمی کو علیحدہ نہیں کر سکتے۔"

یا طوائف کے بارے میں لکھنے کی وجوہات کو "مجھے بھی کچھ کہنا ہے" میں بیان کرتے ہوئے منٹو یہ کہتے ہیں: "ویشیا کا وجود خود ایک جنازہ ہے جو سماج اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔ وہ اسے جب تک کہیں دفن نہیں کرے گا، اس کے متعلق باتیں ہوتی رہیں گی۔" اس مجموعہ کے ہلکے پھلکے مضامین میں بھی طرز تحریر سنجیدہ ہے مثلاً "کچھ نہیں تو صدا ہی سہی" میں ایک عورت مردوں کے عورتوں کو چھیڑنے کے بارے میں کہتی ہے "ہم اس چھیڑ چھاڑ کو صرف ناپسند ہی نہیں کرتیں بلکہ اسے انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اس لئے کہ ہماری آزادی میں یہ بے شمار رکاوٹیں پیدا کرنے کا موجب بنی ہوئی ہے۔" اس سے ظاہر ہے کہ منٹو عورتوں کے جذبات سمجھتے تھے اور ان کے ہمدرد تھے۔

اسی طرح "باتیں" کے ہلکے پن کی تہ میں ہندوؤں، مسلمانوں کے اختلافات کا دردناک احساس ہے، مثلاً "میرا خیال تھا کہ یہ جو فساد ہو رہا ہے اس میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے مصروف پیکار رہ جائیں گے اور دونوں کے خون کا ملاپ جو مندروں اور مسجدوں میں نہیں ہو سکا اور مدینوں میں ہوگا مگر مجھے بہت تعجب ہوا جب میرا خیال غلط ثابت ہوا۔"

اس کے مقابلے میں دوسرے مجموعہ کے [illegible]

بیانات اور سیدھا راست اندازِ بیان نہیں پایا جاتا، بلکہ ان میں گہرا طنز اور ایک قسم کا سنکی انداز ملتا ہے۔ سنجیدہ بحث کی جگہ ہم کو چھوٹے چھوٹے مسائل اور سطحی خیالات ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر "سوال پیدا ہوتا ہے" میں سنجیدہ سوال پیش کئے گئے ہیں (بغیر جواب دیئے) ان میں سے ایک یہ ہے "ایک بچہ چند روز گزرے اپنے باپ سے پوچھ رہا تھا کہ "ابا جی محمود وٹ اور اخروٹ میں کیا فرق ہوتا ہے؟ سوال پیدا ہوتا ہے کیا ایسے بدتمیز بچوں کا گلا نہیں گھونٹ دینا چاہئے لیکن مصیبت یہ ہے کہ ایسا کرنے پر کوئی اور سوال پیدا ہو جائے گا۔" یا "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" میں مندرجہ ذیل واقعہ منٹو کے سنکی انداز کی اچھی مثال ہے۔" ایک حلوائی کی دکان کھلی تھی۔ میں نے کہا چلو لسی ہی پیتے ہیں۔ دکان کی طرف بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں بجلی کا پنکھا چل رہا ہے لیکن اس کا منہ دوسری طرف ہے۔ میں نے حلوائی سے کہا "یہ اُلٹے رخ پنکھا چلانے کا کیا مطلب ہے؟" اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا "دیکھتے نہیں ہو" میں نے دیکھا۔ پنکھے کا رخ قائداعظم محمد علی جناح کی رنگین تصویر کی طرف تھا جو دیوار کے ساتھ آویزاں تھی۔ میں نے زور کا نعرہ لگایا "پاکستان زندہ باد" اور لسی پیئے بغیر آگے چل دیا۔"

ان مجموعوں کو پڑھتے ہوئے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مجموعے کس وجہ سے ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں۔ ابھی اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے اس لئے کہ منٹو کی ذاتی زندگی کے بارے میں ابھی زیادہ نہیں لکھا گیا۔ جواب کی تلاش میں یہ بات ضرور قابلِ ذکر ہے کہ پہلے اور دوسرے مجموعے کے درمیان کم از کم دس سال کا وقفہ ہے۔ جب پہلا مجموعہ شائع ہوا تھا تو اس وقت منٹو کی عمر تیس سال کی تھی، لیکن دوسرے مجموعے کے مضامین لکھتے وقت ان کی عمر تقریباً چالیس سال تھی۔ اس کے علاوہ ان دس برسوں میں منٹو کو بہت سی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا۔ [illegible] انہوں نے کئی بار ملازمت بھی تبدیل کی۔ اپریل [illegible] انتقال ہو گیا اور ان کی مالی مشکلات میں ہمیشہ [illegible] منٹو کو خاص طور پر بہت صدمہ پہنچایا [illegible] میں کیا سوچیں گے

تقسیم کی وجہ سے ان کو سیاسی لیڈروں پر بھروسہ نہیں تھا۔ غرض اتنی واضح ہے کہ اپنی جسمانی، مالی اور ذہنی مشکلات سے منٹو بہت پریشان دل آزردہ ہو گئے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ انہی تکالیف نے منٹو کو سکھایا کہ زندگی میں کسی چیز پر یقین نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ انسان کو بھی دوسرے انسان پر یا کسی بھی عقیدے پر بھروسہ نہیں کرنا چا[illegible] خاص طور پر تقسیم کے بعد انہوں نے انسان کی اتنی برائیاں دیکھیں ک[illegible] ان کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس سے منٹو اس نتیجے پر پہنچے کہ کوئی چیز یا [illegible] اہم اور سنجیدہ نہیں اور کسی بھی موضوع پر سنجیدگی سے لکھنے کی ضرو[illegible] [illegible] ان باتوں سے منٹو کی ساری نفسیات سامنے نہیں آ[illegible] [illegible] منٹو کی ذاتی زندگی کے بارے میں [illegible] [illegible] ان دو باتوں کو پوری تفصیل سے بیان کیا جا سکے گا

قاسم شبیر نقوی

نذرِ غالب

جب نہ چھینٹا آس کا دنیا سے پایا جل گیا
اپنی محرومی پہ میرے غم کا شعلہ جل گیا
کچھ چمن کی بدنصیبی، کچھ قفس والوں کی آہ
ہر کلی مرجھا گئی، ہر گل کا چہرہ جل گیا
اب مری ویران آنکھوں میں کوئی آنسو نہیں
دل میں تھا جو موجزن، دریا کا دریا جل گیا
سوزِ دل ہم کہہ بھی لیتے ہیں مگر بے چین ہیں
اُف وہ غیرت مند پروانہ جو زندہ جل گیا
زندگی کے اب کسی رخ میں نہیں تابانیاں
ہو گئی ہر شام اندھی، ہر سویرا جل گیا
رو لیے رونے کو لیکن درد کی لذت گئی
آنسوؤں کی لَو سے دامانِ تمنا جل گیا
جس سے جتنا فائدہ ہو اس سے اتنا ربط ہو
دیکھ کر قاسم یہ اندازِ زمانہ جل گیا

صالحہ بیگم

ہندوستانی سماج میں عورت کی اہمیت

فرانسیسی فوجی رہنما اور مدبر نپولین کا ایک قول ہے۔
"مجھے اچھی مائیں دو اور میں تمہیں اچھی قوم دونگا"

(Give us good mothers and I shall give you a good nation)

بلاشبہ انسانی زندگی میں عورت کا سب سے اہم کردار ماں کا ہے۔ قوموں کی ترقی اور تنزلی کا راز بظاہر کچھ بھی ہو لیکن تہہ میں ہمیشہ وہ ہستی نظر آئیگی جس کی گود میں قوم پروان چڑھی۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ اکثر محسوس کیا جانے لگا ہے کہ انھیں قوموں کا ستارہ درخشاں ہوتا ہے جنکی عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق حاصل ہوں۔

ہندوستانی خواتین کے متعلق عام طور پر دو نظریے ہیں۔ اوّل تو وہ روایتی نظریہ ہے جس کے تحت ہندوستانی عورت پاکدامنی سلیقہ شعاری۔ وفاداری اور شوہر پرستی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ سیتا اور ساوتری جیسی ہستیاں آج بھی ہمارے لئے فخر کا باعث ہیں۔ دوسرا نظریہ، جو کسی قدر مغربی تہذیب سے متاثر ہے، ہندوستانی عورت کو دقیانوسی گنوار اور پچھڑی ہوئی تصور کرتا ہے اور ان کی حیثیت گائے بھینس سے زیادہ قرار نہیں دیتا۔ مگر یہ دونوں نظرے حقیقت سے کوسوں دور ہیں۔ جواہر لال نہرو نے ان دونوں خیالوں کو رد کرتے ہوئے ٹھیک ہی کہا کہ ہندوستان جیسے عظیم ملک میں یہ بہت آسان ہے کہ ایک مثال ایک حصہ سے لی جائے اور دوسری مثال دوسرے حصہ سے اور ان پر اپنا نظریہ مرتب کر لیا جائے، اگر ہندستانی عورت کی تعریف کے پل باندھے جائیں تو ملک میں ایسی بہت سی عورتیں ملیں گی جو اس کی مستحق ہوں گی اسی طرح اگر تم انہیں پست اور جاہل قرار دیں تو بھی مثالوں کی کمی نہ ہوگی۔

ویدوں کے زمانہ میں (۱۰۰۰ ق م سے ۲۰۰۰ قبل مسیح) ہندوستانی عورت کی سماجی حیثیت اچھی تھی اور اس کی زندگی ماں اور بیوی کی حیثیت سے بدرجہا بلند تھی۔ آریہ قبائل جو جنگ اور فتوحات میں مشغول تھے عورتوں کو سماج کا کارآمد رکن سمجھتے تھے۔ رگ وید سے (جو ہندو مذہب کا سنگ بنیاد ہے) معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں تھیں اور تعلیم یافتہ عورتیں مذہبی اداروں میں پیش پیش رہتی تھیں۔ شادی کا رواج تو موجود تھا لیکن عورتوں کے لئے شادی زندگی کا ماحصل نہیں تھا یہ صرف ایک سماجی اور مذہبی فریضہ تھا جس کی ادائیگی جوانی ڈھلنے پر بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن اگر وہ چاہتیں تو کنواری رہ کر بھی اپنی زندگی حصول تعلیم میں گزار سکتی تھیں۔ اپالا۔ اترئی۔ اور گھوشا ایسی ہی عالم کنواریاں تھیں جنکے منتر رگ وید میں شامل کئے گئے ہیں۔ اس زمانہ میں عورتیں نہ صرف شاعرہ اور معلمہ ہوتی تھیں بلکہ محلوں میں باڈی گارڈ کا بھی کام انجام دیتی تھیں۔ بیوہ کو دوسری شادی کی اجازت تھی اور اتھروید نے ان کو پنر بھو (یعنی دوبارہ پیدا ہوئی) قرار دیا ہے۔

بعد کے دور (۱۰۰۰ ق م سے ۲۰۰ قبل عیسی) میں عورتوں کی سماجی حیثیت میں تبدیلی آئی۔ ان کے حقوق سمٹ گئے۔ مذہبی رسومات اور تعلیم میں ان کی ثانوی حیثیت ہو گئی۔ یہ زمانہ منو کا تھا جس کے قانون کے مطابق عورتوں کے لئے وید پڑھنا جرم تھا۔ دھیرے دھیرے تعلیم یافتہ عورتیں سماج کی نظروں میں گر گئیں اور یہ وہم پیدا ہو گیا کہ اگر کسی عورت نے کتاب چھولی یا قلم پکڑ لیا تو اس کے خاندان پر مصیبت نازل ہوگی منو نے لڑکیوں کو جنیو پہننے کی بھی ممانعت کر دی، اب صرف یہ لڑکوں ہی کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ مہابھارت میں عورتوں کو گنہگاروں، غلاموں اور نیچی ذات والوں کے ساتھ گردانا گیا۔ یہ محض وقتی رویہ نہیں تھا اور اس کے اثرات بہت دیر پا رہے۔

بنجامن والکر نے اپنی تصنیف "ہندو ورلڈ" میں رامائن اور مہابھارت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں یہ عقیدہ عام تھا کہ عورتیں ناپاک اور مکروہ ہیں اور مرد کی روحانی نجات میں ایک بڑی رکاوٹ۔ یہی نہیں بلکہ ان میں ساری برائیاں بھری پڑی ہیں۔ جھوٹ۔ فریب، دھوکہ، ہوس پرستی، مکر اور عقل کی کمی غرض دنیا کی ساری برائیوں کا وہ مجموعہ ہیں۔ اس لئے انکو گھر کی چار دیواری کے اندر بند رکھنے اور ان کی کڑی نگرانی کرنے کی تلقین ہے۔ مصنف موصوف نے تاثریا سمہتیا اور مترایانی سمہتیا

جیسی مذہبی کتابوں سے بھی ایسی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ انہوں نے مہابھارت کے اس جملہ کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں لکھا ہے کہ "عورت ایک تباہ کن چیز ہے۔ مرد کو اُن سے اس طرح دور رہنا چاہیئے جس طرح وہ خطرناک جانور سے بھاگتے ہیں"

مقدس پوراناؔ کے مطابق شراب کی تین قسمیں ہیں لیکن سب سے زیادہ نشہ اور عورت ہے۔ اسی طرح زہر کی سات قسمیں ہیں لیکن سب سے زیادہ مہلک عورت ہے۔ . . . . . . مہابھارت کا یہ بیان بھی قابل غور ہے جس میں لکھا ہے کہ اگر کسی کی سَو زبانیں ہوں اور وہ ایک سو برس تک مسلسل بیان کرتا رہے جب بھی عورتوں کی برائیوں اور عیبوں کو مکمل طور پر بیان نہیں کرسکتا۔

الغرض ویدوں کے زمانہ کے بعد صدیوں تک عورت کی حیثیت گھٹتی ہی چلی گئی۔ سماج کی منجمد اور تاریک فضا نے اس کمزور ہستی کی زندگی دو بھر کردی، لڑکی پیدا ہونا ایک جرم تھا۔ اور پچھلے جنم کے گناہوں کی سزا اگرچہ نسل کی بقاء کے لئے عورتوں کی [illegible] سے انکار نہیں ہوسکتا تھا۔ تاہم وہ مکروہ اور منحوس تصور کی جاتی تھیں۔

سماج کے لئے اُن سے نجات پانے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ لڑکیوں کو مار ڈالا جائے یا اگر شادی کے بعد کوئی عورت بیوہ ہوجائے تو اُسے خاوند کی چتا کے ساتھ جلا دیا جائے۔ رامائن میں بتن اور مہابھارت میں ایک ستی ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی اُمید کی کرن نظر آتی ہے۔ عورتوں کی اس بیچارگی میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کی عزت و حرمت بھی ہوتی تھی۔ سیتا اور انوسویہ ساوتری اور دمینتی جیسی شاندار ہستیاں بھی اُسی زمانہ کی پیداوار ہیں۔

جس زمانہ میں "پوران" مرتب ہوئے۔ وہ عورتوں کے لئے اور زیادہ کٹھن تھا۔ اُن کی حیثیت اور بھی گر گئی۔ بیوہ کی شادی کو ممنوع قرار دیا گیا۔ مشہور چینی سیاح ہوان چوانگ نے مشاہدہ کے بنا پر لکھا ہے کہ اس نے کسی عورت کو دوسری شادی کرتے نہیں دیکھا ستی کا رواج نہ صرف زور پکڑ گیا تھا۔ بلکہ اس کی قصیدہ خوانی بھی ہونے لگی تھی، صرف جائداد کے معاملہ میں اُن کو کچھ حقوق حاصل تھے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد نے ملک کی معاشیات میں نئے نظام کی آمیزش کی۔ اسلام نے مرد کو عورت سے ممتاز گردانا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ عورتوں کے حقوق کی وضاحت کردی تاکہ مرد کو مطلق العنانی نہ حاصل ہو ان حقوق میں (۱) اپنی جائداد پر کامل اختیار (۲) مخصوص وجوہ کی بنا پر شوہر سے خلع لینا (۳) جنگ و جدل میں اپنی مرضی کے خلاف شریک نہ ہونا (۴) حکومت کے ہر شعبہ میں اور ہر منصب پر فائز ہونے کا حق رکھنا (۵) خلع کے بعد دوسری شادی کرنا (۶) اور تعلیم حاصل کرنے کے مکمل مواقع خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بانیٔ اسلامؐ کے زمانہ میں اور بعد میں بھی عورتیں اپنی مرضی سے جنگ میں مردوں کے دوش بدوش لڑیں۔ حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ مقررہ اور جج ہوئیں۔ اور موسیقی و شاعری میں بھی نام پیدا کیا۔ پیغمبر خدا نے ازدواجی معاہدہ کو "مضبوط باہمی معاہدہ" قرار دیا اور عورتوں کی عزت و حرمت کی تلقین کی۔

لیکن جو پٹھان، مغل اور ترک ہندوستان آئے وہ عرب کی تہذیب کے علمبردار نہیں تھے بلکہ اپنے اپنے ملک کی تہذیب اور تمدن کے پیرو تھے۔ . . . ہندوستانی ماحول میں اُن کا جو تمدنی کردار ہوا وہ نہ تو اسلامی تھا نہ پٹھان نہ مغل، بلکہ ان سبھوں کا مجموعہ تھا جو ہندوستانی فضا کا گہرا رنگ لئے تھا۔ پردہ کا رواج بھی اسی وقت قائم ہوا۔

سترہویں صدی کے ایک غیر ملکی سیاح کا بیان ہے کہ پردہ کا مسلمان رؤسا تک ہی محدود تھا۔ اوسط درجہ کی عورتیں کھلی فضا میں باضابطہ گھوم سکتی تھیں۔ لیکن دھیرے دھیرے پردہ کا رواج عام [illegible] اُسی زمانہ میں کچھ ممتاز عورتیں ہوئیں جنہوں نے اکثر حکومت کی باگ ڈور سنبھالی، ان میں کاکاتیا خاندان کی ملکہ رودرمبا۔ دلی کی رضیہ بیگم [illegible] کی چاند بی بی اور تارا بائی اور اہلیا بائی قابل ذکر ہیں ان کے علاوہ [illegible] کی بیٹی زیب النساء شاہجہاں کی دو لڑکیاں جہاں آراء اور روشن آرا اور جیجا بائی شیواجی کی ماں نے ملک کی تواریخ میں اہم کردار ادا کئے۔ لیکن یہ صرف چند مثالیں ہیں کیونکہ اس وقت عورتوں کی سماجی حیثیت متواتر گرتی ہی جارہی تھی۔ البتہ تعلیمی اعتبار سے مغلوں کے زمانہ میں عورتوں کی حیثیت خاصی سنور گئی۔ کچھ عورتیں تو اپنا نام بہت روشن کر گئیں بابر کی لڑکی گلبدن بانو نے "ہمایوں نامہ" تصنیف کیا۔ اور ہمایوں کی بھتیجی سلمہ سلطانہ نے بہت سے فارسی اشعار قلم بند کئے۔ نور جہاں، ممتاز محل، جہاں آراء اور زیب النساء نے علم و ادب کی دنیا میں ایک خاص مقام پایا۔ زیب النساء ایک ماہر کاتب تھی۔

چودھویں صدی کے وسط میں بھگتی عقیدے کو فروغ ملا۔ [illegible] کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ اس عقیدہ نے سماجی تنظیم کی طرف بھی [illegible] کیا۔ مساوات اس کا اہم جزو تھا اور اس کے مبلغوں نے عورتوں کی سماجی حیثیت کو اٹھانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ گو اس عقیدہ کے زیر اثر ہندو عورتوں کے حالات کچھ سنبھلے لیکن اس میں کوئی بنیادی [illegible] نہیں ہوا۔

اٹھارویں صدی ملک کے لئے ہر اعتبار سے انتہائی تاریک

زمانہ تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سماجی تنزلی بڑھتی گئی۔ عورتوں کی حیثیت ناقابلِ اعتبار طور پر پست ہوگئی۔ سر ولیم جونس نے لکھا ہے کہ اس وقت عورتیں اور بچے خریدے اور بیچے جاتے تھے۔ نومولود لڑکی کا گلا گھونٹ کر مارنے کا رواج زور پکڑتا جا رہا تھا۔ خصوصاً راجپوتوں میں یہ رواج عام تھا۔ ایک سال میں تقریباً بیس ہزار لڑکیاں موت کے گھاٹ اتاری جاتی تھیں۔ جس وقت انگریزوں کا تسلط ہوا، ہندوستانی عورتوں کی سماجی حالت شاید سب سے زیادہ افسوسناک تھی۔ مشترکہ خاندان کا مالک مرد تھا اور عورت کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ مرد ایک سے زیادہ شادی کرتے تھے۔ پردہ کا رواج عروج پر تھا۔ لڑکیوں کی شادی کم عمری میں کر دی جاتی تھی، جائداد میں اُن کا کوئی حق نہیں تھا اور بیوہ کے لئے چتا پر جلنے یا بیوگی کی حالت میں ساری عمر گزارنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

انگریز حکمراں ترقی پسند تو ضرور تھے لیکن مذہبی اور معاشیاتی امور میں انھوں نے غیر جانبداری کی پالیسی برتی۔ معاشیاتی سدھار کی طرف انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ البتہ نومولود بچوں کے مار ڈالنے کی روک تھام کے لئے کئی اقدام کئے۔ ان میں ایک قانون تھا جو ۱۷۹۵ء میں بنگال میں نافذ ہوا۔ اور ۱۸۰۲ء میں دیگر علاقوں پر لاگو کیا گیا۔ اسی طرح ستی ہونے کے رواج کو ختم کرنے کے لئے ۱۸۱۲ء – ۱۸۱۵ء اور ۱۸۱۷ء میں قانون جاری کئے گئے۔ لیکن ستی کے رواج میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اور اسی لئے سترھواں قانون نافذ کیا گیا۔ اس کے ذریعہ نہ صرف ستی کی خواہش مند عورتوں کے لئے سخت سزائیں مقرر کی گئیں بلکہ ان لوگوں کو بھی سزا کا مستحق سمجھا گیا جو ستی کی رسم میں شریک ہوں، یا اس کی ترغیب دیں۔ اس قانون کے خلاف کچھ لوگوں نے سخت احتجاج کیا لیکن راجہ رام موہن رائے اور دوسرے ہندو رہنماؤں نے اس کی پر زور حمایت کی۔ دھیرے دھیرے یہ رواج ختم ہو گیا۔

سماج بدلنے کی تحریک کے محرک انگریز حکمراں نہیں تھے بلکہ وہ آزاد مغربی تعلیم تھی جس نے ہندوستان کے خوابیدہ لوگوں کو جگا دیا۔ اور ان میں انقلاب کا جذبہ پیدا کیا۔ عورتوں کے سماجی ارتقاء میں برہمو سماج نے نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ جن عورتوں نے سماجی سدھار کی کاوشیں کی ان میں تورودت، رامابائی، سورن کماری دیوی اور سروجنی نائیڈو قابلِ ذکر ہیں، لیکن ان کی کوششوں سے سماج میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہوا۔ عورتوں کی ترقی میں بدستور رکاوٹیں رہیں، تاہم ۱۸۷۰ء سے ان کا رجحان یونیورسٹی کی تعلیم اور خصوصاً ڈاکٹری کی طرف مبذول ہوا۔ کچھ عورتیں حصولِ تعلیم کے لئے غیر ممالک بھی گئیں ایک ہندوستانی عورت نے ۱۸۹۲ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ اور انگلستان کی عدالتوں میں وکالت شروع کی۔

وہ زنجیریں جو سماج کو جکڑے ہوئے تھیں بیسویں صدی کے آغاز میں ٹوٹنے لگیں، پرانی روایتوں کی گھٹا آہستہ آہستہ چھٹنے لگی، اور عورتیں ترقی کی راہ پر گامزن ہو گئیں۔ مسز اینی بیسنٹ نے ۱۹۱۷ء میں ہندو خواتین کی انجمن قائم کی جس کا مقصد عورتوں کی تعلیم و تربیت کے وسیلے ڈھونڈنا تھا۔

۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کی عورتوں کی مجلس قائم کی گئی تاکہ عورتوں کا دھیان اعلیٰ تعلیم کی طرف راغب کیا جا سکے۔ اس کے بعد عورتوں کی قومی مجلس ۱۹۲۵ء میں قائم ہوئی اور دوسرے سال عورتوں کی تعلیمی اصلاحات کی کل ہند کانگریس کا پہلا جلسہ منعقد ہوا۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی صرف مردوں نے نہیں لڑی بلکہ عورتیں بھی اس میں پیش پیش تھیں، مہاتما گاندھی کے دوش بدوش وہ ہر محاذ پر لڑیں پہلی بار ۱۹۱۷ء میں عورتوں نے قانون ساز اسمبلیوں میں شمولیت کا مطالبہ کیا۔ اِن کی تعلیمی فروغ کے لئے لیڈی ڈفرن فنڈ قائم ہوا، اور اُن کی ڈاکٹری تعلیم کے لئے لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج جاری ہوا۔ عورتوں میں سماجی سدھار کے لئے کلکتہ کی چترنجن سیوا سدن اور پونا کی سیوا سدن نے نمایاں کام انجام دیئے۔ ۱۹۲۶ء میں پہلی بار ایک ہندوستانی خاتون متو لکشمی ریڈی مدراس لیجسلیٹو کاؤنسل کی ممبر منتخب ہوئیں اور پھر اس ادارے کی صدر مقرر کی گئیں۔ ۱۹۳۵ء میں آئین نے عورتوں کی سماجی بندشوں کو توڑنے میں بہت مدد کی، اِن کے لئے کسی پیشہ میں داخل ہونے کی پابندی نہیں رہی، اور وہ ہر طرح کی تعلیم حاصل کرنے لگیں، پردہ دھیرے دھیرے ختم ہونے لگا۔ اور لڑکیاں اپنی پسند کی شادی کو ترجیح دینے لگیں، انہوں نے رقص، موسیقی اور اسٹیج پر بھی دھیان دیا۔ کچھ فنکاروں نے تو عالمی شہرت پائی۔ اِن میں اندرانی رحمان، سبالکشمی اور یامنی کرشنا مورتی، قابلِ ذکر ہیں۔

جنگِ آزادی کے اولین وقتوں میں مسلمانوں کی کثیر تعداد انگریزی تعلیم اور ترقی کے دھارے سے الگ رہی۔ غدر میں پسپا ہونے کے بعد ان کی کیفیت انتہائی افسوسناک تھی ناامیدی اور ہراس نے ان میں روایت نوازی، توہم پرستی اور تنگ نظری پیدا کردی، وہ مغربی تہذیب اور ترقی کے نام سے بھی بھڑکتے تھے۔ اور سختی سے ماضی کی طرف راغب ہوگئے تھے اس نظام میں عورتوں کی حیثیت ثانوی ہوگئی تھی۔ ان کو گھر کی چہار دیواری میں بند کردیا گیا تھا اور پردہ سختی سے قائم کیا گیا تھا۔ تعلیم نسواں صرف دینیات اور مذہبی کتابوں پر مشتمل رہی، لیکن رفتارِ زمانہ کے ساتھ مسلمان عورتیں بھی چار دیواری سے باہر آئیں اور زندگی کے مختلف

شعبوں میں ترقی کرنے لگیں۔ اُن کی حالت کو سنوارنے اور ان کی حیثیت کو فروغ دینے کے لئے کل ہند مسلم خواتین کانفرنس ۱۹۱۴ء میں بمبئی ۱۹۲۴ء میں منعقد ہوئی، اس میں کئی اہم تجویزوں پر غور کیا گیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد ملک میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ آزاد ہندوستان کے آئین نے ساری جنسی تفریق کو ختم کر دیا اور دفعہ ۱۵ کے ذریعہ عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے حکومت کو خاص اختیارات دیئے گئے عورت اب حکومت کے کسی منصب کو حاصل کر سکتی ہے۔ مسز اندرا گاندھی پہلی عورت ہیں جو ہندوستان کی وزیر اعظم بنیں۔ لنکا کی مسز بندرا نائیکا کے بعد وہ دنیا میں دوسری خاتون ہیں جو اس مقام کو پہنچیں۔ مسز سروجنی نائیڈو، اتر پردیش کی گورنر تھیں اور اُن کی لڑکی پدمجا نائیڈو، مغربی بنگال کی گورنر تھیں۔ مسز وجے لکشمی پنڈت نہ صرف ایک صوبہ کی وزیر رہیں، بلکہ امریکہ اور روس میں ہندوستان کی سفیر اور انگلستان میں ہائی کمشنر بھی رہیں، اس کے بعد وہ اقوام متحدہ جنرل اسمبلی کی صدارت کے اونچے عہدہ پر بھی سرفراز رہیں۔ مسز سوچیتا کرپلانی اتر پردیش کی وزیر اعلیٰ رہیں اور راجکماری امرت کور ہندوستان کی وزیر صحت اور عالمی طبی ارگنائزیشن کی صدر رہیں۔

یہ اِکا دکا مثالیں نہیں۔ ہندی عورتوں کی تعلیم و ترقی میں متواتر اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اِن اسکولوں اور کالجوں کے علاوہ جو لڑکیوں اور عورتوں کے لئے مخصوص ہیں، دوسرے اداروں میں بھی اِن کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری سے پتہ چلتا ہے کہ تعلیم یافتہ عورتوں کی تعداد ۲،۷۵،۰۹،۰۲۳ تھی، جو پوری تعلیم یافتہ آبادی کی ۱۳ فیصدی ہے۔ بظاہر یہ تشفی بخش نہیں لیکن ماضی کے پیش نظر یہ حوصلہ افزا ضرور ہے۔

آزاد ملک کے پہلے عام انتخاب میں عورتوں نے جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا۔ اور لوک سبھا کے انتخاب میں ۲۳ عورتیں کامیاب ہوئیں، ۱۵ عورتیں راجیہ سبھا کے لئے نامزد کی گئیں۔ چوتھے عام انتخاب میں ۳۰ عورتیں لوک سبھا کے لئے چنی گئیں۔ صوبہ کی اسمبلیوں میں بھی اِن کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ پہلے عام انتخاب میں ۸۴ عورتوں نے صوبائی اسمبلیوں میں سیٹیں لیں دوسرے عام انتخاب میں ۱۹۲ اور تیسرے عام انتخاب میں ۱۶۴ عورتیں کامیاب ہوئیں، چوتھے عام انتخاب میں اُن کی تعداد گھٹ کر ۹۸ ہو گئی لیکن یہ صرف جمہوری نظام کا ایک اتفاق تھا، ورنہ اس انتخاب میں ووٹروں میں عورتوں کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہوا تھا۔

جائدادوں کی ملکیت کے لئے مختلف فرقوں کے لئے الگ الگ قانون اور الگ الگ رواج ہے۔ ہندو وراثتی ایکٹ ۱۹۵۶ء کے تحت ہندو عورتوں کو جائداد کا مالک ہونے کا اختیار ہے۔ جائداد سے متعلق مرد و عورت میں اب کوئی فرق نہیں اور ملکیت دونوں صورتوں میں واجب ہے۔ اس کے علاوہ مشترکہ خاندان کا رواج ختم کر دیا گیا مسلمانوں کی جائداد کا قانون مسلم پرسنل لا پر مبنی ہے۔

مسلم پرسنل لا میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی ہے۔ موجودہ صورت حال میں اس موضوع پر اظہار رائے کی گنجائش نہیں لیکن اس سے متعلق کیرالا ہائی کورٹ کے چیف جسٹس وی، آر۔ کرشنا آئر کا ایک اہم فیصلہ (حوالے، آئی، آر ۱۹۷۱ کیرالہ، ۲۶۱ یوسف بنام سورتا میں شامل ہے۔) قابل ذکر ہے۔

جسٹس آئر نے اپنے فیصلے کی بنیاد اس بات پر رکھی کہ "اسلام میں نکاح کی حیثیت ایک باہمی معاہدہ ہے۔ یہ کوئی ایسا مقدس معاہدہ نہیں ہے جس کے شرکا کبھی الگ ہو ہی نہ سکیں بلکہ یہ ایک ایسا مشروط معاہدہ ہے جسے خاص حالات میں شرکاء معاہدہ کی مرضی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں معاہدے کے خاتمے کا عام اعلان صرف مستحسن ہے۔ لازمی نہیں ہے، نہ ہی کسی مذہبی رسم کی بجا آوری کی ضرورت ہے" بیوی کے حق مطالبہ طلاق پر بحث کرتے ہوئے جسٹس کرشنا آئر قرآن کی ایک آیت کا حوالہ دیتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح شوہروں کو اپنی بیویوں پر اختیارات حاصل ہیں، اسی طرح بیویوں کو بھی اپنے شوہروں پر اختیارات حاصل ہیں۔ جسٹس کرشنا آئر کی نظر میں یہ انقلابی حکم ہے کیونکہ اس کی رو سے عورتیں مردوں کے مساوی ہو جاتی ہیں، اس اقدام کو مؤثر بنانے کے لئے، عدالتیں اپنے فیصلوں میں اور قانون اسلام کے مصنفین اپنی تصنیفات میں آنحضرت صلعم کے قول و عمل کو اکثر و بیشتر مثال کے طور پر پیش کرتے رہتے ہیں، مثلاً آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ جس شادی سے کسی عورت پر ظلم ہو رہا ہو، اس شادی کو ختم ہو جانا چاہیئے

پچھلے پچیس سالوں میں عورتوں کی اقتصادی حالت میں بھی بہت تبدیلی ہوئی ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق دفتروں، فیکٹریوں اور کھیتوں میں کام کرنے والی عورتوں کی تعداد تقریباً ۵ کروڑ ۹۰ لاکھ تھی، یعنی ہر ۱۰۰ عورتوں میں ۲۸ اقتصادی پیشوں میں گامزن تھیں، تقریباً ڈیڑھ کروڑ عورتیں کھیتوں میں کام کرتی تھیں، اسی طرح ایک کروڑ کانوں اور چائے کے باغات میں مزدوری کرتی تھیں، تقریباً ۸ لاکھ فیکٹریوں میں کام کرتی ہیں، رسل و رسائل میں تقریباً ۶۵۰۰۰ عورتیں کام کرتی تھیں اور دفتروں میں ان کی تعداد تقریباً ۴۲ لاکھ تھی۔

ویدوں کے زمانے سے ہم بہت دور آ چکے ہیں، عورتیں صدیوں کی بیچارگی اور پستی سے بالا ہو چکی ہیں، لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ ان کی ترقی ہر شعبہ میں یا ملک کے ہر حصہ میں یکساں طور پر ہوئی ہے۔ اب تک ملک کے مختلف حصوں میں ہزاروں عورتیں ایسی ہیں جن کے حقوق محض کاغذی ہیں۔ اِن امور کی چھان بین کرنے کے لئے حکومت ہند نے ایک نیشنل کمیشن قائم کیا ہے۔ امید ہے کہ کمیشن کے رپورٹ سے ترقی کی نئی راہیں کھل جائیں گی

شبنم مسیح الزماں

آنسو

باہر زور سے بجلی چمکی، بادل گرجے اور پانی ٹوٹ ٹوٹ کر برسنے لگا۔

"آہ! اے میرے بھگوان" منجو کی گھٹی گھٹی چیخ بلند ہوئی۔

"یا اللہ تو ہی مدد کر" رضیہ اس کے پیٹ پر گرم پانی کی بوتل رکھتے ہوئے دھیرے سے بولی "اب درد کیسا ہے؟ کچھ کم ہوا؟"

"نہیں دیدی اب تو سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ ہے بھگوان کہاں سے یہ روگ لگ گیا اور پھر آج کی رات . . . " اس کی آواز کراہ میں ڈوب گئی۔

"یا اللہ" رضیہ ایک دم کانپ کر پیچھے مڑی۔ آنے والے جھونکے کی ٹھنڈک سیدھی ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی تھی۔ دیکھا تو گڈو کھڑکی کھولے پانی، ہوا اور سردی سے بے نیاز باہر جھانک رہا ہے۔

"ارے کم بخت یہ وقت باہر کا نظارہ کرنے کا ہے۔ تو نے تو جینا حرام کر دیا ہے۔" اس نے ایک ہاتھ سے اپنے بارہ سالہ بچے کو گھسیٹ کر دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ وہ تو خود ہی اختلاجی تھی۔ پھر گڈو کے باپ اور پڑوسن منجو کے شوہر ونود کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد اس طوفانی بارش نے اسے اور بوکھلا دیا تھا وہ تو دونوں کو منع کر رہی تھی لیکن کسی کام کی وجہ سے وہ رک نہیں سکتے تھے۔ رات کی ڈیوٹی بھی قیامت ہوتی ہے: اور اب منجو کے پیٹ میں شدید درد۔ اس کے رہے سہے حواس بھی اڑا دیئے۔ اب تک اسے جتنے گھریلو علاج یاد آئے وہ سب ہی تو کر چکی تھی لیکن کسی سے فائدہ نہیں ہوا تھا باہر طوفان ایسا تھا کہ نکل کر کسی ڈاکٹر کو لانا بھی ممکن نہیں تھا اور پھر جاتا بھی کون؛ وہ منجو کو اکیلا چھوڑ کر جا نہیں سکتی تھی اور گڈو — اس کو خدا نے اس قابل ہی کہاں بنایا تھا کہ وہ کوئی کام کر سکے۔ بارہ سال کا ہو جانے کے باوجود اس کا ذہن اب بھی پانچ سالہ بچے کی طرح تھا کتنا ہی علاج ہوا خالد نے بھی اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے کہاں کہاں کی دوڑ نہیں لگائی۔ ذرا ذرا سی امید پر دور دور کے ڈاکٹروں کے پاس گیا لیکن بے سود۔

"امی" گڈو نے اچانک آکر اسے جھنجھوڑ دیا۔ "میری مرغیاں اور خرگوش سب بھیگ رہے ہوں گے۔ میں جا کر دیکھ آؤں؟"

"نہیں میرے لال میں نے سب کو ٹھیک سے بند کر دیا تھا۔"

"میری امی میں تو جاؤں گا۔ باہر انہیں سردی بھی تو لگ رہی ہوگی۔"

"تم گھبراؤ نہیں بیٹا تمہارے ابو نے اوپر کپڑا ڈال دیا تھا۔"

"لیکن امی . . . . . "

"میرا راجا بیٹا ہے نا۔ دیکھو چاچی کی طبیعت خراب ہے چپ چاپ سو جاؤ نہیں تو وہ اور بیمار ہو جائیں گی۔"

گڈو کو اگر کسی چیز سے محبت تھی تو وہ تھے جانور۔ دن بھر وہ مرغیوں اور خرگوشوں کے ساتھ لگا رہتا۔ کھیلتا بھی کس کے ساتھ؟ گھر میں کوئی اور بچہ تو تھا نہیں۔ ان کا مکان بھی ایسے ویرانے میں تھا کہ منجو کے علاوہ کوئی گھر بہت قریب نہیں تھا۔ یوں بھی رضیہ خاموش طبع تھی اس لئے کسی سے جان پہچان ہونے میں دیر لگتی تھی۔ وہ تو شکر ہے خالد اور ونود ایک ہی دفتر میں تھے ورنہ شاید اُن کے یہاں بھی آنا جانا نہ ہوتا اور پھر گڈو کی ذہنی حالت ہی ایسی کہاں تھی کہ کسی سے دوستی کر سکے۔

"ہائے دیدی" منجو کراہ کر بولی "کب جائے گا درد یہ . . . معلوم نہیں یہ لوگ کب واپس آئیں گے . . . کیا بجا ہے؟"

"ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔ ارے گڈو بیٹے! اب سو بھی جاؤ۔ بہت رات ہو گئی ہے— اس طوفان میں نیند بھی کیسے آ سکتی ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"امی میرے خرگوش سو گئے ہے؟"

"ہاں بیٹا سب خرگوش اور مرغیاں سو گئی ہیں۔ اب تم بھی جلدی سے لیٹ جاؤ۔" رضیہ نے پاس والے پلنگ پر اسے لٹا کر اڑھا دیا۔

"امی گھر چلئے نا۔"

"ابھی چلتے ہیں بس ابو کو آ جانے دو۔"

بمشکل گڈو کو سلا کر وہ منجو کی طرف مڑی جو اوندھی دم سادھے

پڑی تھی۔ رضیہ اس کا چہرہ دیکھ کر چونک پڑی۔ تکلیف کی شدت سے منہ سفید ہو رہا تھا۔ ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے

"منجو" رضیہ نے اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔

"دیدی" منجو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "اب نہیں برداشت ہوتا۔ ارے دیدی لگتا ہے دم نکل رہا ہے۔"

"بھگوان پر بھروسہ رکھو منجو" رضیہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "یا اللہ میں کیا کروں" ابھی ایک ہی بجا تھا اور پانچ بجے سے پہلے کسی کے آنے کا امکان نہیں تھا قریب ہی ایک ڈاکٹر صاحب رہتے تھے لیکن سوال یہ تھا کہ بلانے جائے کون۔ ادھر منجو کا درد بھی اب دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ ہاتھ پیر برف اور پیشانی پسینے میں تر ہو رہی تھی۔ باہر پانی دھیما ہو چکا تھا۔ کوئی ہوتا تو لپک کر ڈاکٹر کو بلا لاتا۔ لیکن گھر میں تھا ہی کون — صرف گڈو — تو کیا وہ گڈو ہی کو بھیج دے؟ نہیں اتنی رات میں وہ کیسے جائے گا؟ وہ پھر منجو کی جانب مڑی۔ جو ہونٹوں کو دانتوں سے دبائے کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس کے چہرے کا اڑا رنگ دیکھ کر وہ ایک بار پھر دہل گئی۔ ڈاکٹر کا آنا ضروری تھا — خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو — نہیں ڈاکٹر کو آنا ہی ہے — گڈو ہی کو بھیجنا ہوگا — لیکن اتنی رات گئے . . . ذرا سا انتظار اور کر لیں۔ شاید درد کم ہو جائے۔ وہ پھر منجو کے سرہانے جا بیٹھی۔ منجو نے ایک بار آنکھیں کھولیں۔ اسے دیکھا اور بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"ہے بھگوان" منجو کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ دبی دبی کراہیں اب چیخ میں بدل گئی تھیں۔ رضیہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور سیدھی گڈو کے پاس پہنچی۔

"گڈو بیٹے" اس نے سوئے ہوئے بچے کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"امی! کیا ہے امی؟" وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا

"وہ جو پاس والے موڑ پر پہلا مکان ہے، جہاں ابو تمہیں لے گئے تھے۔ وہ یاد ہے؟"

"کون؟" اچانک جاگنے کی وجہ سے وہ بوکھلایا ہوا تھا۔

"جہاں سے تم میٹھی میٹھی گولیاں لائے تھے!"

"جہاں سفید بلی تھی؟"

"ہاں ہاں۔ میرا بیٹا دوڑ کر وہاں چلے جاؤ۔ میں پرچہ دے رہی ہوں۔ کنڈی کھٹکھٹانا اور جو بھی نکلے اسے دے دینا۔ سمجھے بیٹا!" اس نے جلدی جلدی پرچہ گھسیٹ کر اسے ٹارچ کے ساتھ پکڑا دیا اور روانہ کر دیا۔ خدا کا فضل تھا کہ طوفانی بارش کے باوجود سڑک کے ٹمٹماتے بلب روشن تھے ورنہ شاید وہ اسے بھیجنے کی ہمت نہ کرتی۔ دروازہ بند کر کے وہ دوڑ کر منجو کے پاس آئی جس کی چیخیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

"سینکنے سے بھی کچھ کم نہیں ہوا؟"

"ہوا تو تھا دیدی لیکن مجھے الجھن ہو رہی تھی۔ میں نے دیر ہوئی بوتل ہٹا دی —"

"اسی لئے تو درد بڑھ رہا ہے۔ اچھا لاؤ اب میں خود ہی پکڑ کر بیٹھی جاتی ہوں۔ اس سے ضرور فائدہ ہوگا۔ پھر اب تو ڈاکٹر آتا ہی ہوگا۔ اس کی دوا سے انشاء اللہ منٹوں میں درد غائب ہو جائے گا۔" رضیہ نے بوتل اٹھائی تو ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ منجو کو ٹھیک سے اڑھا کر تسلیاں دیتی ہوئی وہ اسٹوو جلانے لگی

"اچھا بھائی ونود — خدا حافظ۔"

"ارے خالد بھیا اب یہیں چائے پیتے جائیے۔ کہاں اس وقت بھابھی کو جگائیے گا"

"پیتا تو ضرور لیکن دیر ہو گئی ہے۔ گھر پر رضیہ پریشان ہوگی!"

"میں یہیں ہوں۔" رضیہ کی بھرائی ہوئی آواز سن کر وہ دونوں چونک پڑے۔

"کیوں بھئی سب خیریت؟"

"منجو کی طبیعت رات کو بہت خراب ہو گئی تھی اس لئے میں یہیں آ گئی تھی۔"

"ارے کیا ہوا؟ کیسی ہو منجو؟" وہ گھبرا کر منجو کی طرف بڑھے جو تکیوں کے سہارے بیٹھی تھی۔

"میں تو ٹھیک ہوں۔ لیکن دیدی نے رات کو میرے درد سے پریشان ہو کر گڈو کو پاس والے ڈاکٹر کو بلانے بھیج دیا تھا وہ اب تک نہیں لوٹا . . .

"کتنی دیر ہو گئی؟" ونود اور خالد رضیہ کی طرف گھوم پڑے

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

غزلیں

شوق سہسرامی

حسن کی دھوپ تو زلفوں کی گھٹا مانگے ہے
آئینہ مجھ سے تری شوخ ادا مانگے ہے
اور بڑھنے کو ہے اب اپنے لہو کی قیمت
دستِ محبوب ابھی رنگِ حنا مانگے ہے
جس نے لوٹا ہے بہاروں کو سرِ بزمِ چمن
ہر کلی تجھ سے وہ اندازِ حیا مانگے ہے
شام ہوتی ہے تری زلفوں کے سائے میں جواں
صبح رنگین ترے رُخ سے ضیا مانگے ہے
تو کہ بس ترکِ تعلق پہ ہے نازاں لیکن
شوق اب بھی ترے ملنے کی دعا مانگے ہے

رونق نعیم

برف کی آنچ سے ہم لوگ پگھل جائیں گے
اپنے سائے کو جو چھوئیں گے تو جل جائیں گے
بھاگتے لمحوں کو ہاتھوں سے پکڑنا چاہا
کیا خبر تھی کہ وہ کترا کے نکل جائیں گے
جتنے چہرے ہیں یہاں اتنی ہی دیواریں ہیں
اب ارادہ ہے کہیں دور نکل جائیں گے
اک اسی آس پہ جاری رہا سانسوں کا سفر
راہ کے جتنے مناظر ہیں بدل جائیں گے
خود فریبی کی جہاں کائی جمی ہے رونق
اُس پہاڑی پہ چڑھیں گے تو پھسل جائیں گے

افتخار احمد فخر

اُنہیں ہمارے صبر و وفا کے آزمانے کا
وفا کے نام پہ اک ظلم ہے ہم پر زمانے کا
چمن میں جانے کیا گزری ہے اپنے ہم صفیروں پر
قفس تک آج تو یارب دھواں ہے آشیانے کا
دغا کا ہے جہاں پر تذکرہ رودادِ الفت میں
کھٹکتا ہے وہی ٹکڑا انہیں میرے فسانے کا
یہ کیا کم ہے کہ طوفانوں سے ٹکرا کر نکل آئی
نہ کر غم ناخدا ساحل پہ کشتی ڈوب جانے کا
قفس کی زندگی تھی یاد! اک جبرِ مشیت تھی
وگرنہ طائرِ چالاک ہو محتاج دانے کا؟
نکالا اس نے محفل سے مجھے اے فخر یہ کہہ کر
خرد کی بزم میں کیا کام ہے ایسے دوانے کا

مخدوم اشرف

کم کسی طور تیرگی نہ ہوئی
دل جلا بھی تو روشنی نہ ہوئی
کیا کروں اُن سے التجائے کرم
کچھ تو جب "ہوئی" "ہوئی" نہ ہوئی
جیتے رہتے ہیں روز مر مر کر
زندگی یہ تو زندگی نہ ہوئی
دو قدم پر تھی منزلِ ہستی
چلنے والوں کو آگہی نہ ہوئی
اُن کے غم کے بغیر اے اشرف
عمر بھر ہم سے شاعری نہ ہوئی

سیف سہسرامی

تیرے کوچہ کی طرف ہو کے جو ہم آتے ہیں
وادیٔ دل میں مرادوں کے قدم آتے ہیں
تھک کے بیٹھے ہیں ذرا دیر تو دم لینے دو
قافلے والو ٹھہر جاؤ کہ ہم آتے ہیں
غور سے دیکھنا چہروں کے پگھلتے شیشے
جانے کس بھیس میں کب اہلِ کرم آتے ہیں
فکر و احساس کے بازار سجائے رکھنا
لے کے ہم فن کے تراشیدہ صنم آتے ہیں
اب کہاں تیر و سناں چنگ و رباب و طاؤس
سیف میداں کی طرف اہلِ قلم آتے ہیں

بسنت کمار بسنت

افق سے پھوٹ پڑی ہے جو مہرِ نو کی کرن
مٹائے گی یہی دم بھر میں تیرگیٔ چمن
جنوں ہے وحشتِ ادراک و وہمِ ذہنِ بشر
خرد ہے فطرتِ افکار کا انوکھا پن
ہمیں نے بڑھ کے حوادث کے منہ کو موڑا ہے
ہمیں سے پھر بھی زمانہ ہے اس قدر بدظن
نہ جانے کس گلِ سیمیں بدن کی یاد آئی
نہ جانے کیوں بڑھی جاتی ہے قلب کی دھڑکن
یہ اس فروغ و ترقیٔ فن جہاں میں منزہ
ہے ذہن و حسنِ بشر حامیٔ نظامِ کہن
بسنت اہلِ سخن، اہلِ فن نہیں نہ سہی
غزل سے اس کی نمایاں تو ہے مذاقِ سخن

نظام صدیقی

مغربی تنقید کے نئے زاویئے

موجودہ دور میں سب سے زیادہ مقبولیت اس تنقیدی زاویۂ نظر کو نصیب ہوئی ہے جس کے مطابق یہ دیکھنا لابدی ہے کہ فنکار کے احساس جمال میں شدت، گہرائی اور وسعت ہے یا نہیں۔ وہ خود اس سے بہرہ ور ہے یا نہیں۔ تجربہ کو اپنے قارئین تک کامیابی سے ترسیل کر سکتا ہے یا نہیں۔ اگر احساس جمال میں بالیدگی اور تونگری نہیں ہے اگر جس موضوع یا جس کیفیت کو فنکار پیش کرتا ہے وہ کافی حد تک جمالیاتی احساس سے منور نہیں ہے تو وہاں اعلیٰ فن یا ادب کا ارتقا ممکن ہی نہیں۔ کچھ ناقدین روی سکیتس کر دچے، وڈ کساں اور مرزنسکی کے مطابق فن کی کامیابی یا ناکامیابی کا اندازہ اتنے سے ہی ہو جاتا ہے۔ اس رو سے خیالی اظہاریت ہی عرفان و آگہی کی ہم معنی ہے۔ وہ آگہی کے دو منازل بتاتے ہیں۔ ایک تو وجدان اور دوسری اظہار۔ جب فنکار نے کسی چیز کو جان لیا تو گویا اس نے نیز اوپر اس کا اظہار کر لیا لہٰذا اظہار وہ خود مکتفی عمل ہے جو اشیاء کو وجدانی طریقے جان لینے کے بعد شاعر کے ذہن میں رونما ہوتا ہے۔ در حقیقت کروچے نے اظہار اور فنون لطیفہ دونوں ہی کو مترادف قرار دیا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے وجدان اور اظہار ساتھ ساتھ روبہ کار ہوتے ہیں لیکن جمالیاتی بصیرت کے حامل اس روپ اور رنگ کی جادوئی دنیا کا اظہار علی الخصوص ذہنی اور روحانی ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کا حرف و صوت کے وسیلے سے ترسیل و ابلاغ ہو۔ اظہار کیا جا سکتا ہے صرف اپنے لئے۔ ناقد کیلئے نہیں۔ تاہم یا موئے قلم یا کسی دوسرے فنی وسائل کے سہارے کے قبل بھی فن کا وجود فنکار کے ذہن میں ہوتا ہے۔ ان ذرائع کی عدم موجودگی میں بھی وہ نقش مکمل ہوتا ہے اس تجرید کی تفہیم ہو۔ یہ ضروری نہیں۔ اس پر بہت سے اعتراض ہوتے۔ لیکن کچھ حد تک کروچے کے نظریہ کی یہ تنقید اسے مکمل طور پر سمجھ نہ سکنے کے باعث بھی ہے۔ کیونکہ اس نے اس خالص موضوعی فن کے معروضی روپ کو زیادہ تو نہیں، تھوڑی سی اہمیت ضرور دی ہے۔ اور اس تھوڑی سی اہمیت کی رو سے نقادوں اور اخلاقیات کے مداحوں کا کچھ نہ کچھ مقام تو ہے ہی

فن کار کا یہ انتخاب اس کے چاروں طرف کی، مادی اور اخلاقی زندگی کی ضروریات کے مطابق ہوتا ہے۔ یہاں کروچے فنکار کی مطلق العنانیت کی طرف اشارہ نہیں کرتا وہ یہاں فن کی سماجی اہمیت کو قبول کرتا ہے۔ خواہ وہ اس کی فنی بوطیقا میں نہایت ہی ادنیٰ مقام کی حامل ہو۔ حسب منشا بصیرت حاصل کرنے کے زاویۂ نگاہ سے فنکار قطعاً آزاد ہے۔ لیکن جب وہ اظہار کرنے لگتا ہے تو اس کی مطلق العنانیت پر قدغن لگ جاتا ہے۔ علاوہ ازیں کروچے اور اس کے ہم خیالوں کے یہاں ترسیل اور تفہیم کا فقدان بھی قابل گرفت ہے۔ حالانکہ خلاقی اسی میں پوشیدہ رہتی ہے۔ لیکن کروچے نے جہاں وجدان کی رہین منت علم و آگہی کے اظہار کی تھوڑی سی آزادی دی ہے وہاں اسے چھوڑ کر وہ فن کی ترسیل و ابلاغ کو تہہ تسلیم کیا۔ اس کے اور اس کے مقلدوں کے لئے تو فن کیدم خاموش، البتہ خود کلامی کے مانند ہے نہ کہ فنکاروں کے ذریعہ زندگی کی تنقید یا تفہیم کے لئے کروچے نے کسی بھی کیسے بھی پہلو کا اثر قبول کرنے کی بات کہا جس کی اور نہ بدی انشاط کی اہمیت بھی کم کی۔ اس نظریہ سے وہ ارسطو، لونجائنس، دانتے، کولرج گیٹے اور ماتھیو آرنلڈ وغیرہ کی صف میں نہیں رکھا جا سکتا اور نہ اس کے نظریات ہی من و عن قابل قبول ہیں۔ اس طرز فکر کو اب کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ کامیاب فن یا ادب کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ فنکار فنی وسائل سے اس احساس جمال کو اپنے طبقۂ قارئین تک پہونچا سکے۔ اسے اس طرح ترسیل کرنے میں کامیاب ہو کہ قاری کا ذہن فنکار کے احساس جمال سے معطر ہو اٹھے۔ اور اس کے تصور و تخلیق کی راحت میں شرکت کر سکے۔ ایسی ہی حالت میں فنی کاوش کامیاب کہی جا سکتی ہے۔ قاری یا ناقد فنی کاوش کے حسن کے اسباب اور اس کے منبع کو نہ بتا سکیں تو خاص نقصان نہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے

کہ وہ فنکار کے تجربہ کا کچھ تو احساس کرسکیں۔ اِس احساس کرانے میں فنکار فنی چابکدستی اور صناعی کے ذریعہ کتنا معاون ہوتا ہے اسکو جاننے کی بڑی ضرورت ہوتی ہے ۔ اسی سبب سے بالآخر شعری کاوش کی فنی چابکدستی، لفظی تجزیہ، اس کے مخفی اور صوتی اشاروں کی اہمیت، اسلوب، بنیادی شارح اور کلیدی الفاظ کی دروبست، اِن کے باہمی تفاعل، اور ردعمل بھی درخور اعتنا اور ادبی تنقید کے اہم قابل توجہ عناصر بن جاتے ہیں جو مسئلہ کو پیچیدہ راہوں سے گزارنے کے ساتھ اس کے درجہ بہ درجہ ارتقاء اور توضیح میں مدد کرتے ہیں ۔ یہ جمالیاتی معیار "نئی تنقید" کی سب سے بڑی کسوٹی ہے جو مارکسی تنقید کی جدلیاتی مادیت اور اس کے مؤیدین مائیخل لیف شتیس جوزف ریوائی داتو، ٹراٹسکی اور کچھ حد تک لیخانوف کی افادیت زندگی کے شور و شر کے ردعمل میں خود بھی اپنے وسیع المعنی، دور رس اور وسیع الامکان سطح سے گر کر انتہا پسندی اور تنگ نظری کا شکار ہو جاتی ہے اور استحصال کا آلہ کار بن جاتی ہے ۔ تاہم یہ "ایستھیٹکس" یا میٹا فزکس آف ایستھیٹکس" جیسا میں نے کہیں اور عرض کیا ہے، جدید تنقید کی بڑی ہی اہم اور معنی آگیں آواز ہے۔ اس کی نظر سترھویں صدی کی "میٹافزکس" (مابعد الطبعیات) کی جانب مرکوز ہوئی ہے اس کا مطمح نظر بہت حد تک ذوق سلیم اور حسن آشنا مزاج کی پرورش اور افزائش ہی ہے ۔ اس نے اپنی چند کوتاہیوں کے باوجود بیسویں صدی میں لوگوں کو ادب پڑھنا سکھایا اور قدیم و جدید ادب کے جو مطالعے اس نے شائع کئے وہ بہت ہی جامع اور بہت دن زندہ رہنے والے ہیں ۔ اس ضمن میں ذرا مختلف کردار اور سیاق کے ساتھ آئی، اے، رچرڈس ایمپسن پروفیسر ڈیوی، سی کے آگڈن، لیوس، ٹرلنگ، ہربرٹ ریڈ، ایبر کرومبی، ایلین ٹیٹ، بلیک مور اور لافارگ بھی شامل کئے جاسکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ارنسٹ کیسرر، سوزین کے لینگر موڈ لوڈکن اور رچرڈ چیس نے بھی نمایاں کام کیا۔

بعد ازاں اسی کی ایک شاخ زیادہ واضح طور پر ہیئتی تنقید کے روپ میں پروان چڑھی جو ادبی کارناموں کے تجزیہ کو صرف ہیئت کے اصول' کی روشنی میں کئے جانے پر زور دیتی ہے۔ اس میں صرف ادب و شعر کے خارجی مطالعے یا تخلیق فن میں جن فنی ذرائع یا تکنیک کی جن چابکدستیوں کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اور "ادبی مسائل" کی بجائے "ادبی اظہار" کے مخصوص پیمانوں کی نفسیاتی تحلیل و تجزیہ کرکے یہ دیکھنے کی سعی کی جاتی ہے کہ ان کی رو سے شعور اور لاشعور پر کون سے اثرات مرتب ہوتے ہیں جو معنوی حسن اور فنی تاثیر کے ضامن ہوتے ہیں اس مکتب فکر کے عصری تصور کو آئی۔ اے رچرڈس اور اس کے بعد کچھ دوسرے امریکی نقادوں رینسم، کینیتھ برک، کرگیدا ابرٹ پن وارن، جون کرو رینسم، کلینتھ بروکس اور ونٹرسن نے واضح کیا اور شعر کی اصل ہیئت کی طرف توجہ کو خصوصی طور پر مرکوز کیا گو رچرڈس کے بیشتر تصورات کو بعد میں ہیئتی تنقید کے

انتہا پسند علمبرداروں نے یک لخت مسترد کر دیا۔ ان کے نقطۂ نظر کی [illegible] کاوش کے معنی کی تہہ تک یا اس کی اندرونی تہ داری کی گہرائی تک رسائی [illegible] فنکار اور معاشرہ کے باہم عمل اور ردعمل کا جائزہ ضروری نہیں جو مارکسی اور [illegible] تنقید کا اقتضا ہے یعنی اس کا کام سوانح عمری اور تاریخ اور [illegible] سے ہٹ کر فنی تخلیق کی ساخت اور عبارت کا ایک [illegible] کرنا ہے ۔ انہوں نے شعر کے صرف لفظی تجزیہ اور اس کے مختلف معانی [illegible] ہی کے ردعمل اور باہمی تناؤ کے ذریعہ سمجھنے کے اصول کی اشاعت کی اور [illegible] کی واضح طور پر ہدایت کی کہ ادبی مواد کی تنظیم، امیجری، تشبیہ و استعارہ [illegible] کی نشست اور اس کے مفہوم کے علاوہ ناقد ہر نوعیت کے غیر ضروری تعصبات خارجی معلومات، حافظہ میں پڑی بے محل یادداشتوں، جذباتی اعتراضات، مذہبی عقائد اور ہر نوعیت کے مظاہر پرستانہ (Animistic) رجحانات سے اجتناب کرکے شعر کو محض شعر سمجھ کر پڑھے ۔ یہ تنقید شعر کو الفاظ پرستی سمجھتی ہے اسکے لئے الفاظ ہی سب کچھ ہیں۔ وہی موضوع ہیں اور وہی ہیئت ۔ نظم ایک [illegible] کے سوا کچھ نہیں اور الفاظ ہی اس کی کلید ہیں ۔ نظم اپنے مافی الضمیر کو آپ واضح کرتی ہے۔ نظم فی نفسہٖ ایک خود مختار وجود ہے جس کے مطالعہ کے لئے کسی خارجی معلومات کی ضرورت نہیں جو کچھ اس سے حاصل ہو سکتا ہے وہ خود اس میں موجود ہے ۔ اسی کو تنقید کا مرکز ہونا چاہئے ۔ شاعری سوانح عمری نہیں معاشرتی یا تصوراتی تاریخ نہیں بلکہ وہ معنی کا ایک دائمی نقش ہے جس کا مطالعہ اس طرح کرنا چاہئے جیسے وہ ہم عصر اور گمنام ہو، اگر اس مفروضے کے یہ معنی اخذ کئے جائیں جیسا بیشتر اس مکتب فکر کے اکابرین کا خیال ہے کہ ہمکو قدما کا بھی اسی طرح مطالعہ کرنا چاہئے جیسے وہ ہم عصر اور گمنام ہوں تو اس سے بہت گمراہ کن نتائج نکل سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ ادب میں بہت سی خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو زمانہ کی قید و بند سے آزاد ہیں، لیکن ان کے مفہوم کے صحیح ادراک کے لئے ضروری ہے کہ ایسے ادب کو ہم انکا زمانے کے سیاق میں رکھ کر مطالعہ کریں جس میں اس کی تخلیق ہوئی ۔ ادبی مورخین اور ادبی تاریخ پر جس نوعیت کے اعتراضات اس دبستان کے نمائندے کرتے ہیں وہ ادبی تنقید کے حق میں سم قاتل ہے۔ اس طریقۂ تنقید کا دائرہ کار یوں بھی محدود ہے کہ وہ صرف شاعری کی تنقید ہے اور ادبی تاریخ سے کنارہ کش ہو کر یہ اور بھی زیادہ محدود ہو گئی ہے ۔ علی الخصوص مارکسی تنقید کی انتہا پسندی کے ردعمل میں صرف اسی بات پر اصرار کہ فن کی جو مثالی عبارت، ساخت یا متن ہے پیش نظر ہے وہی فنکار کی شخصیت کا تعین کرتا ہے لیکن وہ فن کی نہایت محدود شکل کو تو متعین کر سکتا ہے مگر فن اور فنکار کے رشتوں اور فن کے وسیع عمل کو واضح نہیں کرتا جو بہرحال زمانہ، سماج اور تہذیب کے مضبوط دھاگوں سے ترتیب پاکر اپنے دائرہ کا تعین اور اپنے امکانات کی تشکیل کو واضح کرتا ہے فنی

کا ذریعہ ہیں خیال کی ترسیل، الفاظ کی کار فرمائی، اصوات کی جادوگری، ان کا فنی تحت لفظی تخیلات سے ذہن اور ذہن سے شخصیت اور پھر شخصیت سے ماحول اور زمانہ تک جانا ایک ادبی تعبیر کا سلسلہ دراز ہے جب تک ان اعماق پر نظر نہ ہو صحیح معنوں میں فن پارے کی اندرونی زندگی کی گہرائی تک رسائی مشکل ہے۔ ادبی جمال تقدیر یقیناً ادب کی بنیادی شرط ہیں، مگر اور بھی اقدار ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ صحیح تنقیدی فکر تو وہ ہے جو تمام نظریات تنقید میں سے مفید عناصر منتخب کرے۔ غیر ضروری عناصر کو خارج کر کے ادب کے ہر پہلو اور ہر قدر کو سامنے رکھ کر اس پر حکم لگائے۔ اعلیٰ درجہ کی تنقید مختلف اقدار کے متوازن شعور کی متقاضی ہے۔ محض کسی ایک پہلو پر زور دینے سے فن پارہ نقاد کے زاویۂ نگاہ کے استبداد کا ہدف بن سکتا ہے۔ مگر اس کی روح کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ اس طریقۂ تنقید کا سب سے بڑا عیب جدت طرازی اور دور از کار تجزیہ ہے۔ اس میں بالعموم ایسی زبان کا استعمال ہوتا ہے جو ٹیکنیکل جارگن اور پیچیدہ اصطلاحات کا مرہون منت ہے۔ تنقید میں ایسے جارگن کا استعمال ادب اور تنقید کے خلاف جرم ہے جس کا مطمح نظر اول و آخر فکر و ذوق کی تہذیب و تنویر اور زندگی کے بکھرے ہوئے شیرازہ کی تنظیم ہے۔ نتیجتاً تنقید جو کبھی ایک روشنی کا مینار تھی اب برج بابل بن گئی ہے۔ جہاں ایک دوسرے کی زبان سمجھنا ہی دشوار ہے۔ تنقید کا ایک فریضہ ادب کی توضیح ہے لیکن اس مکتب فکر کی تنقید کی جست و خیز بہت حد تک ذہنی ورزش کے مرادف ہو گئی ہے۔ یہ بدیہی طور پر اس فریضہ کی نفی اور شکست کا اعلانیہ ہے۔ نتیجتاً بعد ازاں الفاظ اور اصوات کے مطالعہ کا یہ رجحان اس مکتب فکر کے دوسرے نمائندوں ورنن لی، (Vernon Lee) کیر ولائن اسپرجن اور ایڈتھ رکرٹ وغیرہ کی تحقیقات کے ذریعہ ایک ایسے انتہا پسند گروپ کی شکل میں وجود میں آیا ہے جس کے اراکین نے اس ضمن میں ٹیکنیکل جارگن اور پیچیدہ اصطلاحات کی افراط و تفریط کے علاوہ گراف تک بنا ڈالے۔ انہوں نے اس طریقہ تنقید کے فیضان کو غالباً اپنے گروپ کے معدودے چند نقادوں تک ہی محدود کر دیا۔ اس افراط و تفریط کی ترویج میں اس مکتب فکر کی نمائندہ عورتوں کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ انہوں نے اس امر کا بھی خصوصی مطالعہ کیا کہ اوقاف اور ایک خاص قسم کی ہجے کا شعری لطف اندوزی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ مطالعہ بذات خود دلچسپ ہوتے ہوئے بھی زیادہ مروج نہ ہو سکا۔ یہ ہیئت پرستی گو رجعت پسندی کی یکسر دلیل تو نہیں۔ لیکن ادب میں یک رخے پن کی علامت ضرور کہی جا سکتی ہے۔ اس طریقۂ تنقید کو برتنے والے حقیقت کے ادراک میں شعور کو مقدم اور مادہ یا خارجی حالات کو متاخر فرض کر لیتے ہیں۔ جس مکتب فکر میں صرف فنی لوازمات آخری قدریں مان لئے جائیں اور تنقید میں ہم آہنگی تناسب، اندرونی وحدت عضوی کلیت اور ہیئتی تانے بانے سب کچھ سمجھ لئے جائیں۔ اس کے متعلق یہ گمان کہ وہ ارتقاء کے امکانات اور تقاضوں سے منحرف ہو گیا ہے۔ اور ادب و تنقید کے متوازن اور سلامت رو نظریہ کو تسلیم نہیں کرتا کچھ زیادہ غلط نہ ہوگا۔ ہیئتی تنقید کا اول و آخر الفاظ ہیں۔ میں بھی الفاظ کو بے جان اور منفعل چیز نہیں سمجھتا یقیناً الفاظ خود معنی و مفہوم کے ذخیرہ کی واگذاشت میں ایک خلاقانہ حصہ لیتے ہیں اور ان میں حسن کا جادو جگانے کی بڑی صلاحیت ہوتی ہے مگر مواد کی اہمیت، ہیئت کے مقابلہ بہرکیف زیادہ ہے۔ کوئی فنی کارنامہ تصوری مواد (Ideological Content) کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا اور مواد و ہیئت کی مکمل ہم آہنگی کے بغیر ہم ادب یا فن میں حسن و عظمت کا تصور نہیں کر سکتے۔ الفاظ اپنے اندر لازوال قوت کا خزانہ رکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہیں۔ ہم آہنگی تناسب اور اندرونی وحدت وغیرہ کی بڑی اہمیت ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر دو فنی کارناموں میں ہیئت کے عناصر یکساں احساس تکمیل کے ساتھ پائے جائیں اور ہمارے سامنے ان دونوں میں کسی ایک کو فوقیت دینے کا مسئلہ درپیش ہو تو ہم کیسے اور کس بنیاد پر فوقیت دیں گے۔ میرا سیدھا اور دو ٹوک جواب یہ ہے کہ اس ادبی کاوش کو جو اپنے مواد کے لحاظ سے زیادہ وزن و وقار کی حامل ہو، اور اس کے جمالیاتی عناصر لائف فورس (Life Force) سے علیحدہ نہ ہوں۔ ادبی کارنامہ کے درخور اعتنا ہونے کی اولین شرط یہ ہے کہ وہ فنی آداب کا احترام ملحوظ رکھے۔ یہی فنی احترام حسن کو وجود میں لاتا ہے۔ لیکن اس کی عظمت کا انحصار اس کے مواد کی سنجیدگی، گہرائی اور وزن و وقار پر ہے جو لوگ صرف ہیئت پرست ہوتے ہیں اور ہیئت و مواد کے امتزاج اور باہمی تفاعل پر زور نہیں دیتے۔ وہ ادب کی روح اور فن کے صحیح مقام سے نا آشنا ہوتے ہیں اور ادب اور تنقید کے زندگی بخش کام کو جھٹلاتے ہیں۔

لون جائی نس نے ایک اور تنقیدی نظریہ کی تشکیل کی تھی جو فی زمانہ بڑا کارآمد معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جو ادبی کاوش بار بار پڑھنے پر بھی اچھی معلوم ہو، حسین معلوم ہو، وہ یقیناً برتر ہوگی یعنی جو فنی تخلیق زمانہ کی ہزاروں رستخیزیوں کے باوجود بھی زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے آسودگی بخش ہو اور ہمیشہ ایک نئے تجربہ کے مصداق ہو، وہ اعلیٰ فنی کاوش ہے۔ اسی کو وقت کا فیصلہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ ادب یا فن کی اہمیت کا فیصلہ یکسر مستقبل پر چھوڑ دینا چاہئے۔ درحقیقت جو تخلیق برتر ہے اسکو وقت کے احرامات کے باوجود بھی ارباب ذوق اعلیٰ ہی قرار دیں گے اور اگر کسی وقتی دباؤ سے مجبور ہو کر لوگ اس کا اعتراف نہ بھی کریں گے تو کبھی ایسا وقت ضرور آئے گا جب اس کی عظمت مسلم الثبوت ہو ہی جائے گی۔ اس نظریہ میں بہت دور تک سچائی ہے۔ خامی اتنی ہی ہے کہ اس میں یہ دھیان نہیں رہتا کہ ہر دور کی اپنی ایک روایت ہوتی ہے۔ ایک اپنا ذوق ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ہم اس کی ابدی قبولیت و شہرت کا یقین کر لیں۔ اس

ضمن میں میری اتنی ہی گزارش ہے کہ کوئی بھی طریقۂ تنقید کبھی ہمیشہ کے لئے اچھا یا بُرا کامیاب یا ناکامیاب کی سند نہیں پا سکتا جیسے خیرِ مطلق (Absolute God) یا حسنِ مطلق Absolute Beauty کہا جاتا ہے وہ اس خامیوں سے معمور ناممکل اور فنا پذیر کائنات میں ملنے والی چیز نہیں ہو سکتی۔ ہر نوعیت کے تنقیدی اسالیب نسبتی ہی ہیں اور فطرتاً ہر دور میں منقلب ہی ہوں گے۔

کوئی فنی تخلیق اعلیٰ و برتر تسلیم کی جائے اس کے لئے مہذب اور با شعور ادبی طبقہ کے بڑے ہی شائستہ طبع اور ذوقِ سلیم سے بہرہ ور افراد کے ذریعہ ہی اسے برتر سمجھا جانا لابدی ہے۔ یہ کبھی ممکن نہیں ہے کہ سبھی لوگ ہر طرح کے فکر و نظر کے حامل افراد بیک آہنگ اسکو عظیم پکاریں اور نہ یہ ضروری ہے کہ عوام الناس سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس ادبی تخلیق کا اُلٹا سیدھا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نادر شاہی فیصلہ صادر فرما دیں کہ وہ گرانقدر تخلیق ہے یا نہیں صرف اتنا ہی کافی ہوگا کہ علی العموم ادبی اشرافیہ کسی ادبی کاوش کو عظمت بخشنا تسلیم کرنے کی منظوری دیدے گو یہ بھی فرمانِ خداوندی نہیں ہے۔

اسی نظریے سے پیدا ایک دوسرے نئے ادبی جمالیاتی تصور کو مغربی ناقدینِ ادب آج کل برتتے ہیں۔ اس تنقیدی طریقِ کار کو تاثراتی تنقید کہتے ہیں (Impressionistic) ہیں۔ اس کے مطابق ناقد فنی تخلیق کی پوری روح سمجھ سکنے کی یا سمجھ کر تنقید کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ اس کے صرف کسی ایک حصے سے ہی متاثر ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ ایک طرح سے ادھورا اور ناممکل نظریہ ہے اور اس سے قبولیت و اہمیت میں فرق آ سکتا ہے

تاہم یہ تنقیدی روش فنی تخلیق کی جانب ہماری توجہ مرکوز کرنے کا نہایت مفید کام انجام دیتی ہے۔ اس طریقِ کار سے نقاد ایک طرح کے فن کی خود تخلیق کرتا ہے جس کا خصوصی سرچشمہ یا اس کی بنیاد کسی فنکار کی ادبی نگارش ہوتی ہے۔ اس طریقۂ تنقید کی کامیابی اس بات پر منحصر ہے کہ نقاد حُسن کے احساس کو خود سمجھنے کے لئے کتنی تربیت پا چکا ہے یا صلاحیت رکھتا ہے خود اس کا جمالیاتی شعور کتنا بالیدہ ہے۔ دوسرے اس طریقِ کار کے مریدین میں فنی لحاظ سے کچھ تخلیقی صلاحیت بھی ہونا لابدی ہے۔ ان دونوں خوبیوں کے فقدان میں تاثراتی تنقید بہت اعلیٰ تنقیدی روش نہیں کہی جا سکتی۔ یہ مکتب انتہا پسندی کی حد تک ادب برائے ادب کے نظریہ پر عامل ہے۔ تاثراتی دبستان کے نقادوں نے اپنے دل کو کسی ادب پارہ پر تنقید کرنے کے لئے سب سے زیادہ ضروری قرار دیا یعنی کسی فنی تخلیق کو دیکھ کر جو جذبات و کیفیات نقاد کے دل پر طاری ہوں، ان کا بیان وہ مکمل کر کر دے۔ ان کا کام ادب کے متعلق فیصلہ کن انداز میں رائے دہی، خیالات کی صحت و عدم صحت کی نشاندہی سماجی و اخلاقی مقصد براری تخلیق کے متعلق سماجی و سوانحی پس منظر کی فراہمی یا ...یاتی تجزیہ ہیں۔ ان کے نزدیک تو ادب اول و آخر محض تاثر ہے۔ اور ان کی تنقید بھی جیسا کہ اوپر تذکرہ کیا گیا ہے محض ان تاثرات کا مجموعہ [illegible] ادب کا مطالعہ اور اثر پذیری کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ وہ تنقید کو کسی [illegible] نظریہ یا بالائی قانون کے تابع نہیں کرتے بلکہ اپنے [illegible] وجدان کو اپنا راہنما بناتے ہیں۔ ان کی نظر میں [illegible] شعور یا اجتماعی شعور یا اس ہیئتِ اجتماعیہ سے جس [illegible] کو متعین کیا ہے وہ نظرانداز کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اس اسکول [illegible] داخلیت پر ہیں۔ جے۔ ای۔ اسپنگارن اس تحریک کے علمبرداروں [illegible] رہے۔ کزامین، ایڈمنڈ ولسن اور پی، ای، مور کا بھی اسی دبستان سے تعلق ہے اس مکتبِ فکر کا رشتہ انیسویں صدی کے رومانی اسکول کے تنقیدی آداب [illegible] سے ہے، والٹر پیٹر کو یہ اپنا مرشد تسلیم کرتے ہیں۔ آرتھر سائمنز جو اس اسکول کا ایک سربرآوردہ نقاد ہے وہ والٹر پیٹر کی تعریف میں اپنے مرشد [illegible] کی طرح ہی رطب اللسان ہے۔ ان کو بقول آئی۔ اے۔ رچرڈس ہم جذباتی نقاد بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ جذبات کے ذریعہ ادب کے کسی شاہکار کو جانچتے ہیں۔ اگر ان کے جذبات میں کسی فنی تخلیق کو دیکھ کر ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ تو اسی کی ترجمانی کو اصلی اور حقیقی تنقید سمجھتے ہیں۔ اسپنگارن اپنے مضمون "اسائیل" میں کہتا ہے کہ میری خوشی بذاتِ خود ایک جانچ اور پرکھ ہے اور اس سے بہتر پرکھنے کا طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں تو تنقید کرتے ہوئے صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس فن پارہ نے مجھے سب سے زیادہ مسرت بخشی۔ اس لئے یہ سب سے اچھا ہے"۔ ایک کتاب پڑھ کر اس کے متعلق اس کے سوا اور وہ کیا کہہ سکتا ہے کہ اس پر کیا اثر ہوا۔ فنکار کے متعلق اسی تاثرات کے اظہار کو اسپنگارن تخلیقی عمل یا تخلیقی تنقید سے تعبیر کرتا ہے۔ اس طریقۂ تنقید سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ادب میں موضوع و مواد کی کوئی اہمیت نہیں اچھے بُرے، صحیح و غلط جس تصور پر مصنف نے کتاب کی عمارت کھڑی کی ہے اسی پر نقاد کو چپ چاپ آنکھ موند کر یقین کر لینا چاہیئے۔ اس تصور کے مثبت اور منفی ہونے سے بحث نہیں کرنا چاہیئے۔ اب سوال ایسی تنقید کی اہمیت اور افادیت کے متعلق اٹھتا ہے جو تنقید کسی کے تاثرات کے متعلق محض تاثر ہو۔ اس کی افادیت کیا ہو سکتی ہے۔ تنقید کا یہ نظریہ فیصلہ اور رائے زنی سے بچنے اور ادب کو سماجی ذمہ داری سے بچانے کا ایک وسیلہ ہے۔ تنقید نہیں۔ یہ خیالات آجکل دنیا میں تو زیادہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ کیونکہ ان کی اساس ہی انسانیت کش نظریات پر قائم ہے۔ جن میں ذاتی مسرت کو اہم تصور کیا جاتا ہے۔ اور اجتماعی راحت کو نظرانداز کیا جاتا ہے ایسے تنقید نگاروں کا انسانی زندگی سے کوئی رابطہ نہیں ہو سکتا کیونکہ انسانی زندگی صرف یہی نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے۔ وہ زیادہ وسعت اور ہمہ گیری کی متقاضی ہے۔ اس میں انفرادیت سے زیادہ اجتماعیت کو دخل ہونا چاہیئے۔ ورنہ وہ محدود ہو کر رہ جائیگی۔ تاثراتی تنقید فنی کارناموں کے سلسلے میں ہماری تحسین کو گہرا اور معنی خیز تو ضرور بنا دیتی ہے۔ لیکن اس کا مکمل عرفان

نہیں پہنچ سکتی۔

بالآخر ایک ایسے نظریہ کی طرف میں توجہ مرکوز کرانا چاہتا ہوں جس کی رُو سے محض فنی کاوش کی کچھ بھی اہمیت سمجھی جاتی تھی۔ یہ نظریہ بڑا غیر واضح اور مبہم ہے۔ اس کو جاننے کے لئے تیز طور سے فنی تخلیق کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ تمام خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی تمام سماجیاتی اور نفسیاتی نظریات سے کچھ جانے پر بھی ایک غیر واضح " ناقابلِ بیان " عنصر باقی رہ جاتا ہے جس کے رہنے نہ رہنے پر فنی تخلیق دنیا کی عظیم تخلیقات میں منقلب ہو سکتی ہے۔ یہ صفت ہے آفاقیت (Universality) اس کا مطلب ہے وہ رفیع عنصر جس کے باعث کوئی فنی تخلیق یہیں چھوٹے چھوٹے دائرہ عمل سے باہر کر کے ایک دوسری دنیا میں زیادہ وسیع اور بلند تر سطح پر پہنچا دیتی ہے۔ اس عنصر کو کئی پہلو سے جانچا جا سکتا ہے اس عنصر کا تفحص مغربی تنقید نگار بے حد ضروری سمجھتے ہیں۔

مغربی فلسفۂ تنقید کی رو سے ناقد کا کام محض دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا نہیں ہے۔ وہ کسی طرح ادب کی تنقید کر سکتا ہے۔ وہ چاہے تو صرف مشاہد کی حیثیت سے رہ سکتا ہے۔ وہ چاہے تو تاریخ اور نفسیات کی بنیاد پر فنی کاوش کا تجزیہ کر سکتا ہے۔ علی الخصوص فرائیڈ کی نفسیاتی تحقیقات یا مارکس کے نظریات کی بنیاد پر توضیح و توجیہ کر سکتا ہے۔ وہ چاہے تو صرف فنی کاوش کو سمجھنے پر ہی اکتفا نہ کرے بلکہ اس کی کچھ خوبیوں سے متاثر ہو کر تاثراتی تنقید لکھ سکتا ہے جو ایک طرح سے خود بھی ایک فنی تخلیق ہو جائے گی اور اسی سبب سے یہ تنقیدی روش تخلیقی تنقید سے بھی موسوم کی جاتی ہے۔ صرف اسی حد تک نہیں وہ چاہے تو فنکار کے احساسِ جمال کی شدت کو محسوس کر سکتا ہے۔ اس احساسِ جمال کے اظہار و ابلاغ کے مواد کے مناسب اور نامناسب ہونے پر بھی غور و فکر کر سکتا ہے۔ اور فنکار فن پارہ کے ذریعہ اپنے قارئین تک اپنے احساسِ جمال کی ترسیل میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں اور اگر کامیاب ہوا ہے۔ تو کتنی دور تک، ان سب باتوں پر تفکر و تامل کر سکتا ہے وہ چاہے تو اس سے آگے بھی جا سکتا ہے۔ اور فیصلہ کر سکتا ہے۔ کہ موازنہ کرنے سے فنی تخلیق دوسری عظیم تخلیقات کے قریب ہے یا سبقت لے گئی ہے کہ وہ تخلیق صرف اپنے ذہنی نشاط کے حصول کے لئے لکھی گئی ہے یا اس میں کوئی اور برانگیختہ کرنے والی تفسیرِ حیات کی صداقت بھی پوشیدہ ہے۔ اس آخری طریقۂ تنقید کو تشریحی تنقید کہتے ہیں۔ اس کے اساس پر اگرچہ کبھی کبھی عیوب و محاسن کو جانچنے کے لئے بڑے مغالطہ انگیز یکدم ڈھلے ڈھلائے بے لچک متعینہ اور منضبط معیاروں کا بھی پرچار ہوا ہے لیکن فی زمانہ کسی متعینہ اور منضبط معیار کے مطابق غور و فکر کرنا لابدی نہیں ہے۔ فنی تخلیق کوئی نصیحت، اصلاح یا رفاہ عام کے لئے اصلاً نہیں وجود میں آتی بلکہ وہ فنکار کے احساسِ جمال کی شدت کے سبب پذیر

ہلتا اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے۔
فنی تخلیق کی تشکیل انسان کی فنی جبلت Creative Impulse کی آسودگی

کے لئے ہوتی ہے۔ فن ہمارے معاشرے کا ہماری زندگی کا عکس ہے اور وہ اس کی تفسیر کرتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اس تفسیر کی تبلیغ براہ راست سبق آموزی کے طور پر کرنا فنکار کے لئے مناسب نہیں ہے۔ اعلیٰ فنی تخلیق، صداقت اور اخلاق کو تو نظر انداز نہ کرے گی۔ کیونکہ جو حسن ہے۔ وہ صداقت اور خیر کا حامل ہو کر رہے گا جو صداقت اور خیر کے بارے میں کہا گیا ہے۔ وہ حسن کے بارے میں بھی منطبق ہوتا ہے۔ ناقد کا کام صرف تنقیص یا تحسین نہیں ہے اس کا فرض ہے کہ فنکار کے احساسِ جمال کو سمجھے اور تب دیکھے کہ وہ اسکو کامیابی سے ظاہر کر کے قاری تک پہنچا سکا ہے۔ یا نہیں

بقیہ :- آنسو

" تین گھنٹے ہو رہے ہیں " اس کی آواز بھرا گئی۔

" اتنی رات کو اُسے اکیلے بھیجنا چاہیے تھا ؟ " خالد جھلا گیا

" منجو کو بہت تکلیف تھی۔ میں نے سوچا گھر سامنے ہی تو ہے۔ بلا لائے گا۔

" تمہیں معلوم ہے اُسے دو منٹ بھی کوئی بات یاد نہیں رہتی۔ گھر سے نکلتے ہی وہ بھول گیا ہوگا کہ کیوں نکلا ہے "

" اب غصہ کرنے سے کیا فائدہ خالد بھیا۔ آپ لوگ گھبرائیے نہیں، میں ابھی اُسے لاتا ہوں۔ جائے گا کہاں ! "

" چلو میں بھی چلتا ہوں۔ دونوں مل کر جلدی تلاش کر سکیں گے ! "

دونوں کے جاتے ہی رضیہ سسک سسک کر رونے لگی۔

" پریشان نہ ہوئیے دیدی۔ بھگوان نہ کرے وہ کہیں دُور تھوڑی گیا ہوگا۔ رات بھر میری وجہ سے ہلکان رہیں اور . . . "

" نہیں منجو تمہاری وجہ سے مجھے بالکل زحمت نہیں ہوئی۔ بس مجھے گڈو کی پریشانی ہے۔ یا اللہ میرا بچہ مجھے صحیح سلامت مل جائے تو میں . . . " رضیہ کی آواز سسکیوں میں گھٹ کر رہ گئی۔

" امی " اچانک دروازہ کھلا اور گڈو کیچڑ میں لت پت پُر جوش انداز میں داخل ہوا۔

" امی گھر چلئے، کمرہ کھول دیجئے، میرے خرگوش، مرغیاں، سب بھیگ گئے۔ مرغیوں کو تو میں نے ایک ایک کر کے باورچی خانے میں بند کر دیا۔ اب خرگوش... "

گڈو اپنی رَو میں بولے جا رہا تھا مگر رضیہ کے کان اس کی داستان سے بے نیاز تھے۔ اس کے سینے سے اس کا بیٹا لگا ہوا تھا۔ لب پر خدا کا شکر تھا اور چہرہ آنسوؤں سے تر تھا لیکن کتنا فرق تھا ان میں اور کچھ دیر پہلے کے آنسوؤں میں۔

نئی کتابیں

شاد عظیم آبادی کی مثنویاں

سید علی محمد شاد عظیم آبادی مرحوم و مغفور ایک بڑے شاعر تھے ان کا مقام غزل گو شاعروں میں بہت محترم ہے۔ اُن کی ہر غزل ان کی دردمند اور زندگی دوست طبیعت کی آئینہ دار ہوتی ہے لیکن شاید بہت سے اہل ذوق یہ نہیں جانتے کہ اس غزل گو نے مثنویاں بھی کہی ہیں۔ کیونکہ اب تک اُن کا غزلیہ کلام ہی لباسِ طباعت سے مزین ہوا تھا۔ اب جناب نقی احمد ارشاد نے ان کی سبھی مثنویوں کو "شاد عظیم آبادی کی مثنویاں" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ چار سو صفحوں سے زیادہ ضخامت کی اس مجلد کتاب میں دو ایک غزلیں بھی ہیں اور فارسی مثنویاں بھی۔ اُردو مثنویوں میں "نوید ہند" اور "مادر ہند" طوالت اور موضوع کے اعتبار سے زیادہ اہم ہیں۔ اگرچہ ان میں مذہبی رنگ والی مثنویاں بھی کم اہم نہیں، جیسے حضرت محمد کی سیرت والی مختصر سی مثنوی۔

"نوید ہند" اور "مادر ہند" کو موضوع اور رنگ کے اعتبار سے آج شاید قدر کی نظر سے نہ دیکھا جائے کیوں کہ ان میں شاہِ وقت اور حکومتِ وقت کی تعریف ہے لیکن جس دور میں انہوں نے وجود پایا اس میں یہ کارنامہ گنا جاتا تھا۔

اِن دونوں کے علاوہ جتنی مثنویاں ہیں وہ زیادہ طویل نہیں ہیں بلکہ بعض تو ایک صفحے سے بھی کم تر وجود کی مالک ہیں۔ ان میں قرآن مجید کی بعض آیتوں کے منظوم ترجمے بھی ہیں اس لئے ایک مخصوص حلقے میں ان کو پسند کیا جائے گا۔

یہ مثنویاں شاد مرحوم نے کب اور کس دور میں لکھیں اس کا حوالہ کم تر ہی ملتا ہے۔ ایک مثنوی "نامۂ شاد" انیس برس کی عمر میں کہی گئی ہے مرتب نے شروع میں اور کتاب کے آخر میں ان مثنویوں سے متعلق بہت کچھ کہا ہے اور انہوں نے شاد کو عظیم غزل گو تو کہا ہی ہے، عظیم ترین مثنوی نگار کا مقام بھی عطا کر دیا ہے۔ یہ دعویٰ بہت بڑا ہے۔ بلاشبہ شاد کی مثنویاں اُن کی کہنہ مشقی اور موضوع پر عبور کی شاہد ہیں۔ لیکن وہ غزل ہی کے بڑے شاعر ہیں۔ البتہ سبھی مثنویاں یاوہ گوئی اور فحش نویسی سے یکسر پاک ہیں۔ یہ خوبی بلاشبہ شاد کی مثنویوں کو اُردو اور فارسی کی بھی مثنویوں سے [illegible] دیتی ہیں۔

یہ مجموعہ آزاد کتاب گھر دہلی سے شائع کیا ہے جس میں [illegible] مرحوم کی شبیہ بھی ہے۔ قیمت: ساڑھے [illegible]

نوائے عصر:

مشہور اُردو شاعر جناب یحییٰ اعظمی کے [illegible] حیات" کے بعد نوائے عصر کے نام سے اپنا دوسرا مجموعہ کلام شائع کرایا ہے۔ ان نظموں نے جن موضوعات اور تحریکات سے جنم دیا ہے ان کا تعلق زندگی سے ہے۔ یحییٰ صاحب کا نظریۂ حیات قوم پرستی پر مبنی ہے۔ یہ نظمیں عام طور سے سیاسی، قومی اور ایک حد تک مذہبی عنوان اور موضوع رکھتی ہیں۔ ان میں مرثیے بھی شامل ہیں۔ زیادہ تر نظمیہ کلام سیاسی اور قومی شخصیتوں ہی سے متعلق ہے۔

یحییٰ اعظمی صاحب خاصے مشاق شاعر ہیں۔ ان کا کلام پختگی اور نظم کی فنی خوبیوں سے معمور ہے اگرچہ شاعر کی نگاہ محدود قوم پرستی کے دائرے سے باہر نہیں نکلتی۔

$\frac{20 \times 27}{8}$ سائز کے ایک سو آٹھ صفحے کی یہ غیر مجلد کتاب بہت اچھی کتابت و طباعت سے مزین ہونے کے باعث پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے

قیمت:- تین روپے

ناشر:- دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

نظم سائیکلوپیڈیا:-

اب تک اُردو نظم و نثر کے ان گنت انتخابات شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن اس سائیکلوپیڈیا کا طرزِ انتخاب [illegible] خوب ہے۔ جناب ذکی کاکوروی ایم اے علیگ صاحب نے نظم سائیکلوپیڈیا کے نام سے اُردو نظموں کا ایک خاصا ضخیم اور کارآمد مجموعہ شائع کیا ہے اس سے پہلے انہوں نے غزل سائیکلوپیڈیا بھی شائع کیا تھا جس میں غزلوں کا انتخاب تھا۔

نظم سائیکلوپیڈیا میں لگ بھگ پانچ سو سال کی اُردو شاعری کی صنفِ نظم کا انتخاب ملتا ہے اُسے مکمل طور پر نمائندہ انتخاب تو نہیں کہا جا سکتا تاہم مرتب نے اس میں بہت متفرق رنگ والی زائد از [illegible] نظم شامل کر دی ہیں۔ ایسا لگتا ہے اس انتخاب میں [illegible] سے کام نہیں کیا گیا۔ ممکن ہے مرتب کی [illegible] نہ رہ سکا ہو۔ شاید اسی لئے [illegible] کے نام د

نہیں دیتا۔ پھر جو نظمیں شامل ہیں وہ بھی شاعر کی ادبی و فنی شخصیت کی نمائندگی اتنا نہیں کرتیں۔ اس پر بھی یہ ضخیم مجموعہ بہت کام کی چیز ہے اور پڑھنے والوں کو ایک حد تک سیر کر دیتا ہے اس طرح اس کی رنگا رنگی بھی ایک حد تک بھلی لگتی ہے۔ اگر شعراء کے مختصر حالات زندگی ان کلام و فن پر مختصر سا تبصرہ بھی ہوتا تو مجموعہ بہتر بن جاتا۔ ممکن ہے ذکی کاکوروی صاحب اس کمی کو کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں پورا کر دیں۔

نظم سائیکلو پیڈیا چار سو بتیس صفحوں کی مجلد کتاب ہے۔ فہرست کے علاوہ اشاریہ بھی درج ہے۔ کاغذ سفید، گرد پوش سنجیدہ اور کتاب کے موضوع کی متانت کے شایانِ شان ہے۔ مرکزِ ادب ۱۲۱ شاہ گنج لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ قیمت ہے ۹/- روپے۔ جو موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے زیادہ نہیں۔

گونگا ہے بھگوان

کوثر چاند پوری صاحب ایک کہنہ مشق اور زود نویس مصنف ہیں انہوں نے کئی موضوعات پر کتابیں لکھیں اور شائع کرائی ہیں۔ حیرتناک امر تو یہ ہے کہ ان کا بہت زیادہ وقت تو طبابت اور مریضوں پر توجہ میں صرف ہوتا ہے جانے وہ تصنیفی کام کے لیے کیوں کر وقت نکال لیتے ہیں۔ بہرحال وہ لکھتے ہیں اور خالقانِ ادب کے کارواں میں سرگرم عمل ہیں۔

"گونگا ہے بھگوان" ایک ناولٹ ہے۔ اس کی تخلیق کی بنیاد احمد آباد کے فرقہ وارانہ فسادات ہیں۔ واقعات کی ترتیب میں تیز نگاری کسی حد تک حائل نظر آتی ہے اور مصنف کی شاعرانہ شخصیت بھی جگہ جگہ پیش پیش ہے چنانچہ کردار کی بات چیت میں شاعری کہیں کہیں بے محل اور ناگوار گزرتی ہے یہ معلوم نہیں حکیم کوثر صاحب فسادات کے اس دور میں خود بھی موجود تھے یا سُنے سنائے واقعات کو انہوں نے قلمبند کر دیا ہے۔ اس کی گواہی واقعات کی تصویر کشی میں روا روی اور اخباری اندازے دیتے ہیں۔ کہیں کہیں واقعی درد کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن عام طور سے یہ ناولٹ کسی سیاسی پراپیگنڈے ہی کی نمائندگی کرتی ہے۔ حیرت ہے کوثر چاند پوری جیسے مشاق اور ذہین مصنف کو اس کا احساس کیوں نہیں ہوا؟

"گونگا ہے بھگوان" کچھ خوبیاں بھی رکھتا ہے۔ وہ ہے انسان دوستی و وسیع القلبی۔ بعض کردار حقیقی لگتے ہیں۔ گو شروعات کسی خشقیہ یا رومانی افسانے سے میل کھاتی ہے لیکن اختتام شاعرانہ ہونے پر بھی اچھا اور لائق ستائش ہے۔ اہل ذوق اس ناولٹ کا مطالعہ اگر انسان دوستی کے نظریے سے کریں گے تو ضرور متاثر ہوں گے۔

یہ کتاب پاکٹ سائز کی اور غیر مجلد ہے۔ ضخامت ایک سو اٹھائیس صفحے۔ سرورق [illegible] موضوع سے متعلق۔ پشت پر حکیم صاحب موصوف کی تصویر بھی شامل ہے۔

قیمت ڈھائی روپے جو کچھ زیادہ ہی لگتی ہے۔

میکدۂ درد

جناب جگدیش مہتہ درد دہلوی اپنے حلقے کے ایک مشہور و مقبول شاعر ہیں۔ اس سے پہلے ان کے تین مجموعۂ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ اتنی تیز رفتاری اور تسلسل سے ان کی شاعرانہ تخلیقات کا مجموعوں کی صورت میں جلوہ گر ہونا بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس سے ایک خاص حلقے میں ان کے کلام اور شخصیت کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

میکدۂ درد۔ مجلد اور اس کا گرد پوش شاعر کی عکسی تصویر سے مزین ہے شروع میں میکدہ کے عنوان سے ایک طویل پیش لفظ یا مقدمہ ہے۔ اٹھائیس صفحوں کا یہ مضمون ایک ایسی داستانِ حیات ہے جس میں شاعر نے بہت سی باتیں کر دی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بعض احباب اس کا انداز پسند نہ فرمائیں لیکن کہنے والے نے اپنی بات کہہ دی ہے۔ انہوں نے دلی کی سیاسی شخصیتوں پر بھی توجہ کی ہے جو خاصی تلخی اور تند شکوؤں سے بھری ہے۔

'میکدۂ درد' میں شاعر کا غزلیہ کلام ہے۔ اس کے رنگِ سخن میں کوئی نیا پن نہیں لیکن بعض غزلیں خاصی پختگی اور کشش کا اظہار کرتی ہیں۔ ایک سو ساٹھ صفحوں کی اس مجلد کتاب کی قیمت پانچ روپے ہے۔ ناشر ہیں نیشنل پبلشرز نئی دہلی۔۱۸

خوفناک دُنیا

ڈاکٹر سید محمد علی شاہ صاحب سبز واری کی یہ تصنیف نام سے تو خوفناک لگتی ہے لیکن پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اس میں خوف و وسوسہ کی جگہ دلچسپی اور حقیقت نگاری اس حد تک ہے کہ پڑھنے والا اسے ایک ہی نشست میں ختم کر کے دم لے گا۔ کتابت و طباعت دوسرے درجے کی غیر مجلد یک رنگا سرورق ضخامت ۲۲۵ صفحے۔ قیمت: چار روپے

واقعات افریقہ کے شہروں اور جنگلوں سے متعلق ہیں اور اس دور کی باتیں ہیں جب انگریزی حکومت کو ہندوستان میں جینا نصیب ہوا تھا یعنی سنہ ۱۸۹۹ء کا زمانہ۔ کہانی عام طور سے افریقی جنگلوں اور شیر چیتے کے شکاروں کی ہے۔ منظر نگاری ایسی ہے کہ پڑھنے والا خود کو انہی واقعات میں شامل محسوس کرتا ہے۔ سلاست و روانی زبان اگرچہ چند ایک خامیاں یا غلطیاں بھی کہیں کہیں نظر آتی ہیں لیکن یہ تحریر کے جادو کے سامنے نہیں رک سکتیں۔ اس کتاب میں خوبیاں زیادہ ہیں اور خامیاں کم تر ہیں۔ اس کو ایک تاریخی اور کسی حد تک سیاسی دستاویز کا درجہ بھی حاصل ہے۔ اس لیے اس کو پڑھنا چاہیے۔ اور لائبریریوں کی زینت بنانا چاہیے۔ (تاجور سامری)

اگلا بچہ ہونے سے پہلے
ذرا سوچیے

کیا آپ اس بچے
کی صحیح دیکھ بھال
نہیں کرنا چاہیں گے؟



اس کے روشن مستقبل کیلئے اعلیٰ تعلیم کی شروعات اور باقی سبھی ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام... لیکن اگر بچہ جلد ہو گیا تو یہ سب کچھ آپ کے لئے
مشکل ہو گا۔ آپ اس پریشانی سے ضرور بچنا چاہیں گے۔

نِرودھ کی مدد سے اب آپ اگلے بچے کی پیدائش کو تب تک ٹال سکتے ہیں، جب تک آپ اسکی پوری دیکھ ریکھ کرنے لائق نہ
نِرودھ مردوں کیلئے ہے۔ ربڑ سے بنا حمل روکنے کا یہ آسان ذریعہ برسوں سے ساری دنیا میں مقبول ہے۔ آپ بھی

نِرودھ ہر جگہ ملتا ہے۔ سرکاری رعایتی دام، 15 پیسے میں 3

جب تک نہ چاہیں تب تک نہ پائیں سنتان

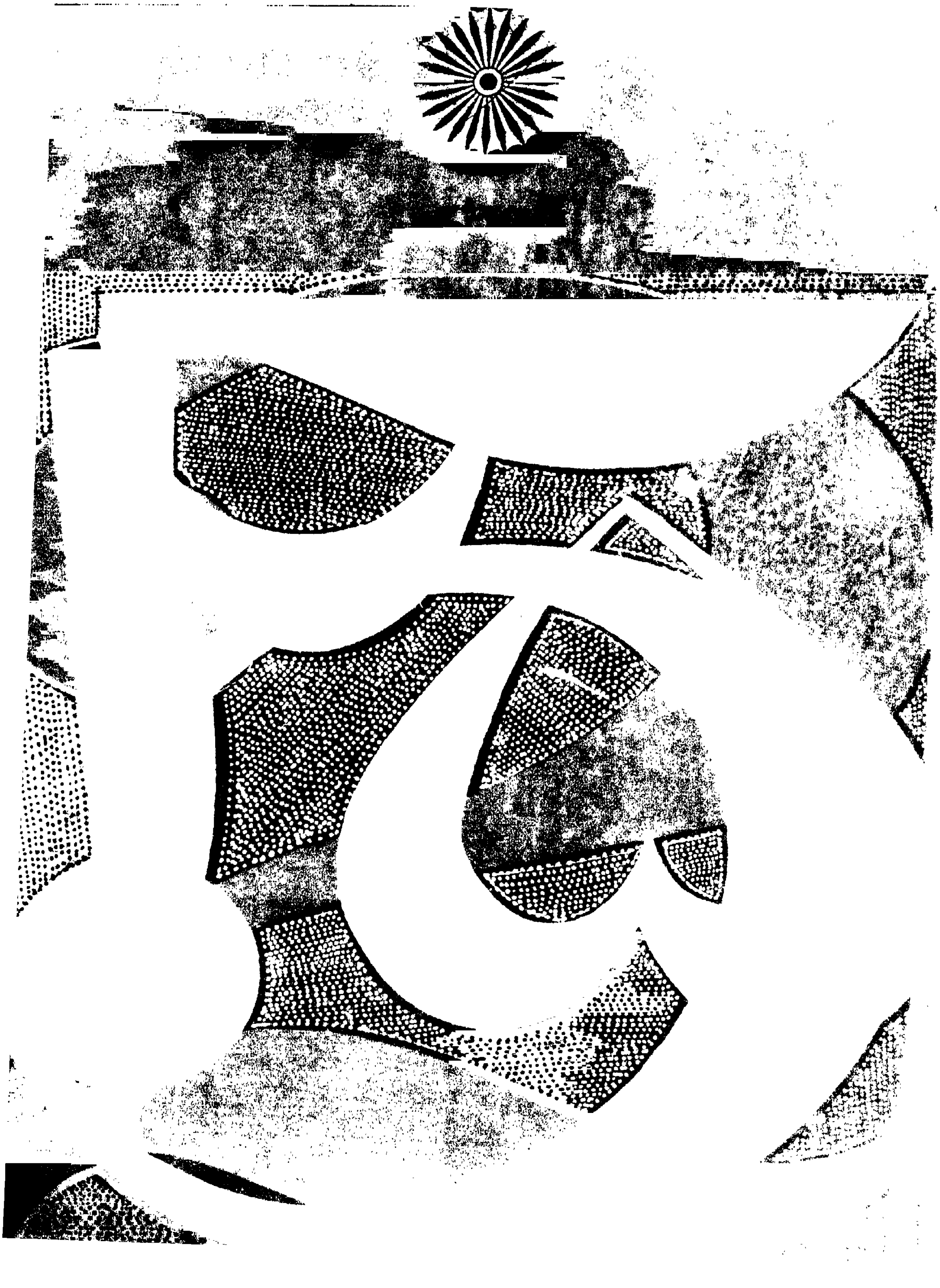


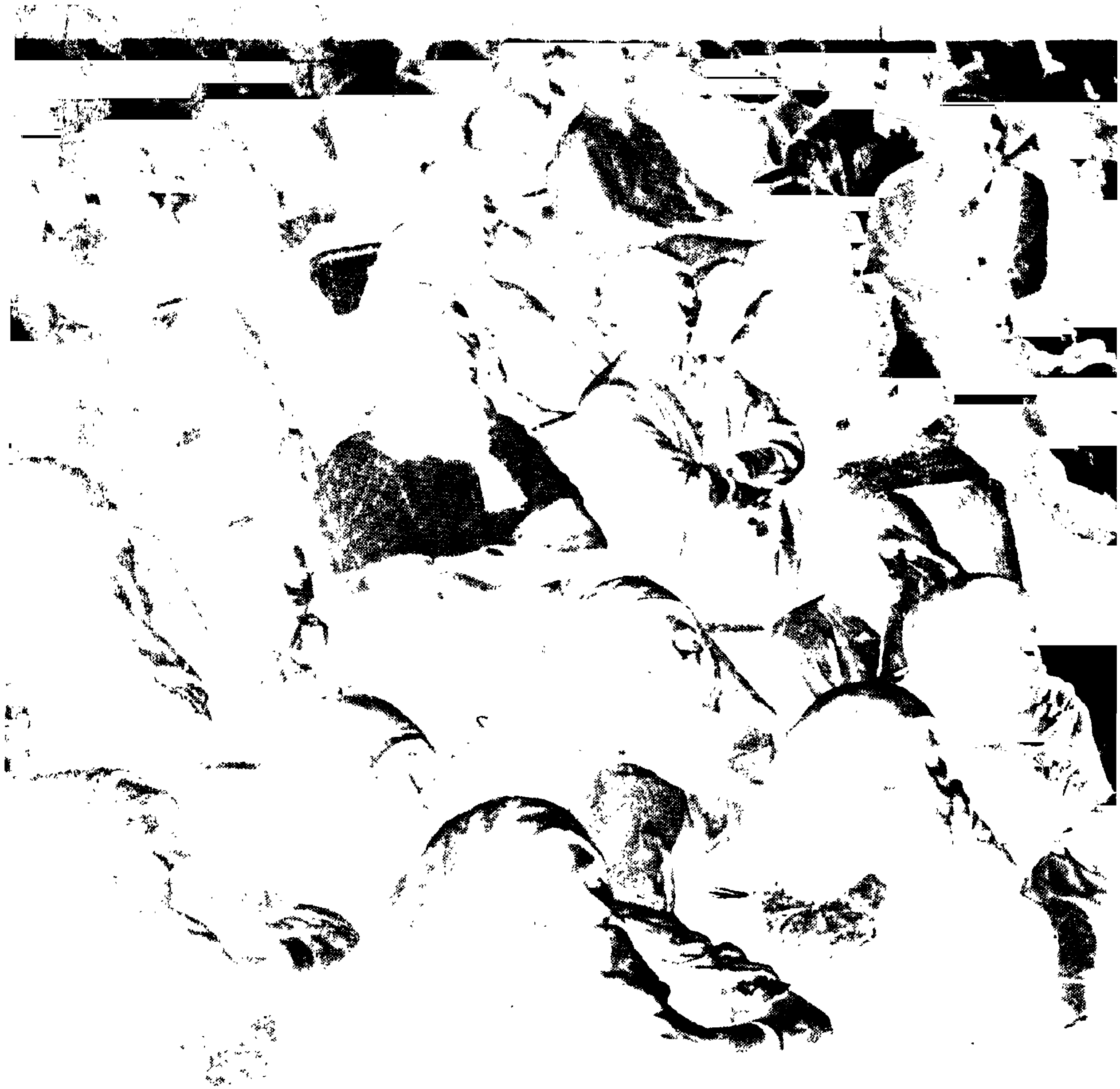
نِرودھ

لاکھوں میں مقبول، بے ضرر اور آسان

کریانہ فروشوں، دوا فروشوں، پنساریوں، پان و سگریٹ کی دکانوں وغیرہ کے یہاں بکتا

davp 71/440





کل آبادی	۵۴,۷۹,۴۹,۸۰۹	
ہندو	۴۵,۳۲,۹۲,۰۸۶	۸۲٫۷۲ فی صد
مسلم	۶,۱۴,۱۷,۹۳۴	۱۱٫۲۱ فی صد
عیسائی	۱,۴۲,۲۳,۳۸۲	۲٫۶۰ فی صد
سکھ	۱,۰۳,۷۸,۷۹۷	۱٫۸۹ فی صد
بودھ	۳۸,۱۲,۳۲۵	۰٫۷۰ فی صد
جین	۲۶,۰۴,۶۴۶	۰٫۴۷ فی صد

حکایتِ حال

محکمہ مردم شماری نے ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے بارے میں جو تازہ ترین اعداد و شمار شائع کئے ہیں
ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہند کی مجموعی آبادی تقریباً ۵۴ کروڑ ۸۰ لاکھ ہے۔ ان اعداد کو کئی پہلوؤں
سے دیکھا جا سکتا ہے مثلاً یہ کہ آبادی میں اضافہ سبز انقلاب اور فیملی پلاننگ دونوں کے لئے
ایک چیلنج ہے، یا یہ کہ ماہرین آبادی نے جو پیش گوئیاں کی تھیں ان کے لحاظ سے تو ۱۹۷۱ء میں
ہماری آبادی ۵۶ کروڑ سے زیادہ ہونا چاہئے تھی لہٰذا تقریباً ۵۵ کروڑ کی آبادی تسلی بخش ہے اور اگر ہم
اپنی مجموعی آبادی کو MANPOWER یا جن شکتی تصور کریں تو یہ ہماری قوت
کارکردگی میں خوش کن اضافہ ہے۔

ترتیب

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی-۱

اُردو کا مقبول عام معتبر ماہنامہ

آج کل

نئی دہلی

ایڈیٹر
مہدی عباس حسینی

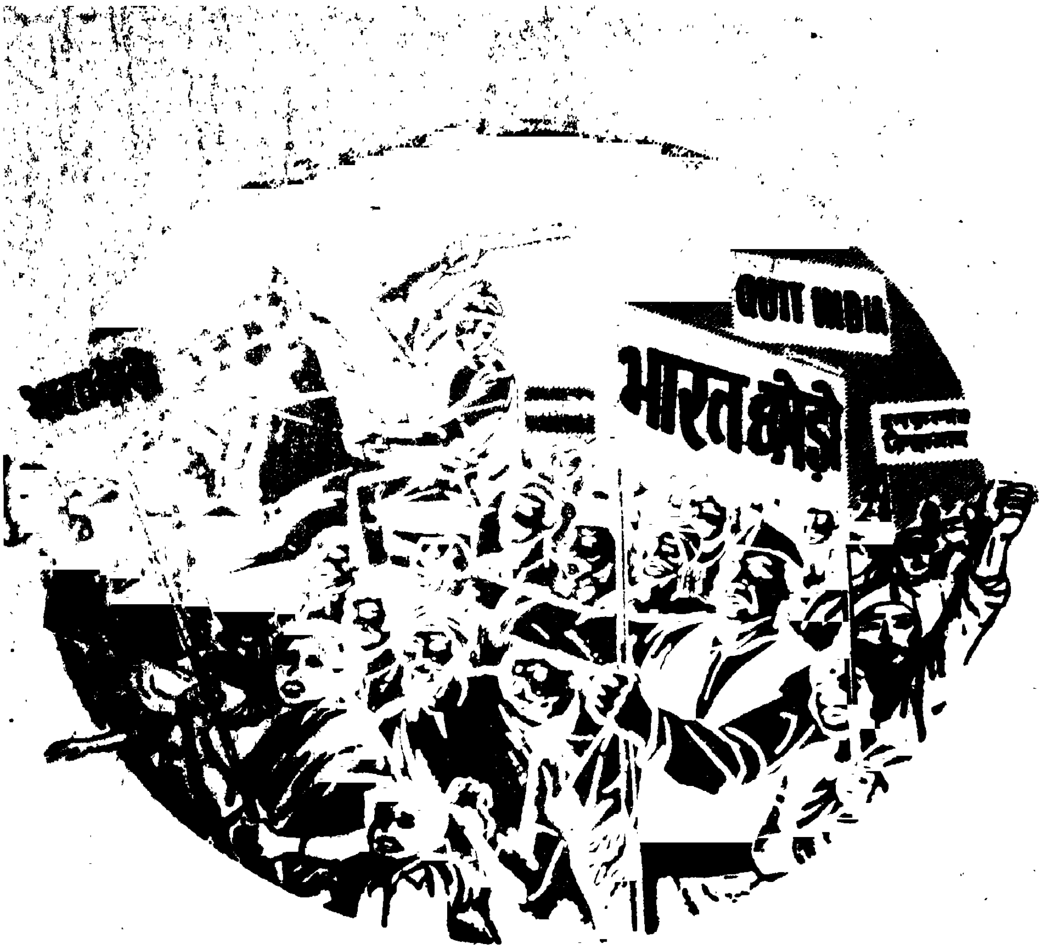
سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۳۱ ــــــ شمارہ ۱
اگست ۱۹۷۲ء
شراون بھادر شک ۱۸۹۴

سرورق - عمل - جیون اڈلجہ
اندرونی کور کی تصاویر: ٹی-ایس ناگاراجن

سالانہ چندہ
ایک سال ... ۷ روپے
۲ سال ... ۱۲ روپے
۳ سال ۱۷ روپے

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ
ایڈیٹر آج کل (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی
(ٹیلی فون نمبر ۳۸۷۰۶۹)


QUIT INDIA
भारत छोड़ो

اداریہ

...لا قدم

...ملہ میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی اور صدر پاکستان جناب ذوالفقار ...بھٹو صاحب کے مذاکرات بخیر و خوبی تمام ہوئے۔ بالآخر پاکستان نے ہندوستان ...دیرینہ مطالبہ منظور کر لیا کہ آپسی اختلافات کا تصفیہ جنگ کی بجائے براہ راست ...ت و شنید کے ذریعے ہوگا! ادھر ہند اس بات پر راضی ہو گیا کہ وہ پاکستان کا ...ہزاروں مربع میل علاقہ واپس کر دے گا جس پر اس کی فوجوں نے حالیہ جنگ میں ...ضہ کر لیا تھا۔ اس طرح ہندنے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ وہ کسی پڑوسی ملک ...ایک انچ زمین بھی لینا نہیں چاہتا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے جائز حقوق سے کبھی ...ست بردار نہیں ہوگا۔ پاکستان بھی اس پر راضی ہو گیا ہے کہ اس نے حالیہ جنگ میں ...ن الاقوامی سرحد پر ہند کی جو تھوڑی سی زمین دبا رکھی ہے وہ واپس کر دے گا۔

کیا اچھا ہوتا اگر پاکستان مقبوضہ کشمیر سے بھی اپنی فوجیں واپس بلا لیتا پھر ...ہند و پاکستان کے درمیان کوئی دائمی وجہ مخاصمت باقی نہ رہتی۔

ہمیں امید ہے کہ وزیر اعظم اندرا گاندھی اور صدر بھٹو کے مذاکرات کے لازمی ...جے کے طور پر ہند و پاک میں جلد ہی سفارتی تعلقات پھر سے قائم ہو جائیں گے ...دونوں ملکوں کے مابین آزادانہ آمد و رفت تجارت اور مواصلت شروع ...جائے گی۔

...شمارہ

...کسی خصوصی شمارے کی تیاری کم از کم چھ مہینے قبل شروع ہو جاتی ہے ہمارا ...صوبہ تھا آزادی کا جشن ہمیں اور اس بسیط موضوع کو سمیٹنے کے لئے صرف ...ن مہینے چنانچہ اس قلیل مدت میں جو کچھ بھی ہو سکا۔ آپ کی خدمت میں حاضر ...ہے۔ ہم ان اہل قلم کے صد درجہ ممنون ہیں جنہوں نے اس شمارے کو کسی قابل ...بنانے میں ہم سے انتہائی حوصلہ افزا تعاون کیا۔ شعراء میں فراق گورکھپوری، ...میل مظہری، سیکش اکبرآبادی، امجد نجمی، شمیم کرہانی، فضا ابن فیضی، ...ست الاکرام، حشار الرحمٰن منشا، مظفر حنفی اور بشر نواز، افسانہ نویسوں ...میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، جیلانی بانو اور آمنہ ابوالحسن اور مضامین نگاروں میں ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر وحید اختر، دیویندر اسّر، جگن ناتھ آزاد، راجندر سنگھ بیدی، خلیق احمد نقوی، مجتبیٰ حسین، عابد علی خاں، راج نرائن راز، حمید الدین محمود، اور شہباز حسین (سابق مدیر آج کل) کے نام نامی اس امر کے شاہد ہیں کہ آج کل کسی مکتبۂ فکر کا پیرو نہ ہونے کے باعث ہر مکتبۂ خیال کے لئے قابل قبول ہے۔ ہاں ہم نے اب کے بار راجندر سنگھ بیدی کو بطور مضمون نگار پیش کیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ قارئین بیدی کو اس بھیس میں بھی دیکھ کر کہہ اٹھیں گے ؎ بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

ہم نے جون کے شمارے میں وعدہ کیا تھا کہ آج کل کو زندگی سے قریب تر لانے کی کوشش کی جائے گی۔ موجودہ شمارہ نہ صرف گزشتہ پچیس برس کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا ایک مختصر جائزہ لینے کی کوشش کرتا ہے بلکہ اقتصادیات، سماجیات، قومی یکجہتی اور فنون لطیفہ میں بھی ہماری سرگرمیوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر خلیق احمد نقوی کا مضمون "غریبی کا مسئلہ" خاصے کی چیز ہے۔ ہم آئندہ بھی کوشش کریں گے کہ ہر شمارے میں ایک ایسا مضمون شامل ہو سکے، جو علم و فن و سائنس اور زندگی کے درمیان ایک پل کا کام دے سکے ــــــ ہم اس شمارے بلکہ اپنے تمام شماروں کے بارے میں قارئین کی رائے معلوم کرنے کے خواہاں ہیں اور آئندہ شمارے سے آج کل کا ایک صفحہ قارئین کے مراسلات کے لئے مخصوص رہے گا۔

ہمیں افسوس ہے کہ بعض نہایت بیش قیمت مضامین تاخیر سے موصول ہوئے جس کے باعث ہم یہ نمبر اس شکل میں پیش نہ کر سکے جو ہمارے تصور میں تھی لیکن تصویر کا روشن پہلو یہ ہے کہ ہمارے اگلے شمارے کی (جو ہم میونک اولمپکس کے لحاظ سے کھیل کود سے مخصوص رکھنا چاہتے تھے) قدر و معنویت میں دل خوش کن اضافہ ہوگا۔ چنانچہ مالک رام صاحب کا "غبار کارواں" غیاث احمد گدی کا افسانہ، ریوتی سرن شرما کا "اردو ڈرامہ کے پچیس سال" اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا ایک بلند پایہ مضمون "راجندر سنگھ بیدی کے فن کی اساطیری جڑیں" بھی اس شمارے کے اعلیٰ معیار کا ضامن ہوگا

اعلان ادارہ آج کل انتہائی مسرت کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ نے اپنی تازہ ترین زیر تصنیف سوانحی کتاب "کار جہاں دراز ہے" کے ابواب کو آج کل میں بہ اقساط شائع کرانا منظور کر لیا ہے چنانچہ انشاء اللہ ستمبر کے شمارے سے اس سلسلے کا بھی آغاز ہو جائے گا۔

صحیفۂ کفر

(غزل)

فراق گورکھپوری

یہ معجزے ہیں کہ ہیں بیسویں صدی کے علوم
سرے سے کھلتے چلے کفر کے نئے مفہوم

نہ کیوں ہو چار طرف فکریاتِ ہند کی دھوم
بہت بلند ہے ایماں سے کفر کا مفہوم

یہ فکرِ ہند کی تابندگی یہ سوز یہ ساز
کہ اُڑ گئے ہیں دُھواں بن کے مذہبوں کے رسوم

دیارِ ہند کی تہذیب تیری عمر دراز
حریف ملتیں اب نیم جاں ہیں یا معدوم

ہمارا کفر بڑا، کفر پستہ قد اُن کے
تبھی تو مٹ گئے یونان و مصر و بابل و روم

تصورات کے شاہیں اُڑائے جا ہر سمت
کہ فتحِ عالمِ امکاں نہیں ترا مقسوم!

جہاں میں تین ہیں نوری تو تیس ناری ہیں
ہمارے کیش میں ایسا عقیدہ ہے مذموم

جہان کے لئے جو ہیں پیامِ تازہ دمی
ترے لئے وہ ہوائیں ہیں موجِ بادِ سموم

یہ ناگنیں اُنہیں ڈس ڈس کے مار ڈالیں گی
جہالتوں کو جو پائیں گے آستیں میں علوم

کھلاتا ہے اُفقِ زندگی پہ گل کیا کیا
دیارِ ہند یہ تیرا تخیلِ معصوم

یہ بزمِ اہلِ چمن، کس قدر اُداس ہے رات!
فسردہ غنچہ و گل ہیں، چراغ ہیں مغموم

حدِ ادب اُنہیں کہیئے کہ اور کچھ کہیئے
جنونِ عشق کے بھی ہیں مگر قیود و رسوم

وہ دن بھی دُکھ بھری دنیا کو دیکھنا ہو نصیب
کہ کہہ سکیں کوئی ظالم نہ اب کوئی مظلوم

نہ جانے کب یہ زمیں ہو سکے گی اس قابل
جہاں ہر ایک ہو خادم، نہ ہو کوئی مخدوم

وہ قوم مٹنے ہی والی ہے جس کا حال یہ ہو — کہ آدمی تو مٹیں اور مال و زر کا ہجوم !!
اُجاڑ کتنا ہے یارو یہ قصرِ سرمایہ — ہے گوشہ گوشہ اس ایوان کا آشیانۂ بوم
تھے اگلے وقتوں کے اک شخص حضرتِ مذہب — دل آج دکھتا ہے لکھتے ہوئے انہیں مرحوم
سنا ہے سب مجھے گاتے ہوئے نوائے حیات — تو میرا منہ لبِ جاں بخش نے لیا ہے چوم
سدا سہاگ ہے ہمدم عروسِ کفر کی کوکھ — اسی کا پہلو ہے گہوارۂ فنون و علوم
مرے کلام کو دنیا کہے گی، صدیوں بعد — ابھی تک اس کی جبیں پر چمک رہے ہیں نجوم
ہمارے ذوقِ طرب کو غم نہ الم کو حریف — ہوا ہے کتنا زمانہ، تجھے کہاں معلوم
فضاؤں میں پرِ ابلیس سنسناتے ہیں — ترقیوں کی جہاں میں اسی سبب سے ہے دھوم
کہو مذاہبِ عالم سے اُس مقام پہ ہول — خدا نہ اہرمن اس جا ہیں لازم و ملزوم
سکھا گئی مجھے وہ رات فنِ سوز و گداز — وہ تیرا وعدۂ آمد، وہ انتظارِ نجوم
ترنمِ سحری ہے ترا تبسمِ ناز... — کہاں شگوفہ و گُل میں یہ شوخیٔ معصوم
سرِ افق وہ جوابِ سلامِ بیداری — وہ دیکھ وقتِ سحر کا تبسمِ معصوم
وہ زندگی ہم ازل سے ہیں منتظر جس کے — ملے گی یا نہ ملے گی ہمیں خدا معلوم
خدا کی ذات سراسر ہے اتحادِ ضدین — ہنوز راز ہیں توحید و شرک کے مفہوم
نظر بھی آئے تو کیا آئے اس دھندلکے میں — ابھی تو چار طرف اُٹھ رہا ہے دودِ علوم
چھوا ہے ہند نے کن زاویوں سے سازِ حیات — کھلے صدی بہ صدی کفر کے نئے مفہوم
یہ کیسی زندگی پائی ہے زندگی والو! — کہ زندگی سے ہر اک کی ہے زندگی محروم

فراق صحبتِ احباب میں کل آئے نظر
ذرا ذرا تھے وہ شاداں ذرا ذرا مغموم

کرشن چندر

ممّی

ملزم کے خلاف الزام یہ ہے کہ اُس نے ۲۹ جون کی رات میں گا بالین میں کھڑی چھ موٹروں کے ٹائر پھاڑ ڈالے۔

میں گا بالین کے نکڑ پر رہتا ہوں اور اوپر کی منزل کی کھڑکی میں کھڑا ہو کر دنیا کا تماشہ دیکھا کرتا ہوں۔ جب عمر ساٹھ برس سے اوپر ہو جائے۔ تو پھر خود کچھ کرنے کو نہیں رہتا۔ پاجامے کے اوپر بنیان پہنے کھڑکی میں کھڑے ہو کر دھیرے دھیرے ہاتھ جھلاتے ہوئے گزرتی ہوئی دنیا کو دیکھنے میں مزا آتا ہے۔۔ نکڑ والے اس بنگلے کی شرقی سڑک ایر پورٹ کو جاتی ہے۔ مغربی سمت ایڈورڈ ایونیو کے بنگلے ہیں۔ جن کے آخر میں عیسائی راہباؤں کا کونوٹ ہے۔ نکڑ کے مخالف سمت یعنی گا بالین کے دوسرے سرے پر ایک بے حد بانکی چھریری خوجن اپنے شوہر اور تین بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ اور تین بچوں کے باوجود بے حد خوبصورت ہے۔ بال کٹے ہوئے ہیں لہرا کر چلتی ہے۔ جیسے وہ اپنے آپ کو عورت نہیں بادِ نسیم کا جھونکا سمجھتی ہو پہلے تو وہ میری تاک جھانک سے بدکتی تھی، مگر اب میرے اور اس کے درمیان ایک خاموش مفاہمت سی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ میری کھڑکی کے قریب آکر دو ایک لمحوں کے لئے رک کر اوپر دیکھتی ہے۔ پھر ایک عجیب ادا سے مجھے اپنا رخ دکھا کر بریدہ گیسو جھلا کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ خوجن کے گھر کے سامنے ایک مشہور پاپ سنگر رہتا ہے۔ اس کی

[illegible] نہیں ہیں، جون اور مارتھا۔ مارتھا نام [illegible] آج تک پسند نہیں کیا۔ ایک صرف اسی مارتھا [illegible] جتنی مارتھائیں دیکھی ہیں، سبھی کرخت شکل [illegible] گداز ہوتا ہے ان کا، اور [illegible] مائیں ہوتی ہیں۔ جون کو البتہ میں پسند کرتا ہوں [illegible] یوں کہنا چاہیئے کہ خوبصورت بنتے بنتے رہ گئی ہے۔ [illegible] کے لئے سج سنور کر جاتی ہے۔ [illegible] ہے سجنے سنورنے سے عورت کا رنگ [illegible] بدصورت ہو جاتا ہے۔

خوجن سے تو علیک سلیک بھی نہیں ہے۔ مگر جون سے [illegible] روز میں ٹیکسی میں آموں کی ٹوکری لا رہا تھا۔ بنگلے کے آگے گیٹ پر [illegible] رکوا کر میں نے آموں کی ٹوکری کو اٹھانا چاہا۔ تو ٹوکری میرے [illegible] چھوٹ کر سڑک پر الٹ گئی۔ اور بہت سے آم ادھر ادھر لڑھک [illegible] کمبخت ٹیکسی ڈرائیور نے ذرا بھی مدد نہ کی۔ مزے سے ٹیکسی میں بیٹھا [illegible] ہنستا رہا۔ مجھے اس قدر غصہ آیا کہ میں نے جیب سے چھرا نکال کر اسے [illegible] مار دیا۔ یعنی خیال ہی خیال میں۔ اب تک میں درجنوں قتل کر چکا ہوں، اور [illegible] کا مزا اس قسم کے قتل میں ہے وہ اصلی قتل میں بھی کیا ہوتا ہوگا۔ پھر [illegible] جانا پڑتا ہے۔ نہ مقدمہ چلتا ہے۔ نہ سزا ہوتی ہے۔ نہ لوگ انگلیاں [illegible] ہیں۔ نہ ضمیر سرزنش کرتا ہے۔ چھری اٹھاؤ۔ قتل کرو۔ پھر مزے سے اس کو صاف کر کے اسی سے آم کاٹ کے کھاؤ۔

چنانچہ جب اس خیالی چھری سے ٹیکسی ڈرائیور کو ہلاک کر کے میں سڑک پر جھکے ہوئے آم اکٹھے کرنے لگا تو جون کہیں سے آ گئی۔ اس نے آ کر ٹیکسی ڈرائیور کو ڈانٹا۔ پھر میرے ساتھ لگ کر آم اکٹھے کر کے میری [illegible] میں ڈالنے لگی۔ جون کی رنگت میرے آموں کی طرح سنہری ہے اور [illegible] پلکیں اس کی آنکھوں کی ہتھیلیوں پر سایہ کئے ہوئے [illegible] پلکیں نقلی ہیں تو کیا ہوا۔ رنگت ٹھیک آپ سے [illegible] ہے۔ اور سڑک سے آم اٹھاتے اٹھاتے [illegible] بوندنیاں نمودار ہو چلی تھیں۔ بہت پیاری لگتی ہے [illegible] ٹوکری میں [illegible] چلی جائیں گی تو کیا ہے۔ ایک دن جانا سب کو ہے۔ لیکن اس خوبصورت لمحے کو میں نے ایک خوش رنگ تتلی کی طرح پکڑ کر اپنی زندگی کی کتاب [illegible] لیا ہے جب کبھی یہ صفحہ کھولوں گا۔ اس تتلی کے رنگ میری آنکھوں [illegible] تھرتھرائیں گے اور آم کی خوشبو سے میرے سامنے احساس بھر جائے [illegible] دو برس ہو گئے اس واقعہ کو، وہ جب بھی مجھے ملتی ہے۔ ہیلو کہتی ہے۔ میں کہتا ہوں، ہیلو جون۔ یعنی انکل کہہ کر اس نے مجھ سے

جراب سکتا ہے۔ میں جب کبھی اس کے قریب جانے کی کوشش کرتا ہوں
بجلی سی چلتی رہے گی۔ سوچتا ہوں ایک روز ایئرپورٹ جا کر اپنے
بیٹھے پر سوار ہوں گے۔ میں چیک کرکے ٹیکسی میں بٹھا دوں گا۔ گھر
جب وہ سو رہے گی تو تینوں لڑکے ٹیکسی سے اتریں
گے۔ اور جب کہیں سے آتی ہوئی ان میں سے کسی
اور اس کے ساتھ گر جا چلی جائے گی۔ جون بے حد قدامت
پرست لڑکی ہے۔ وہ ہر اتوار کو اپنے بوائے فرینڈ نہیں بدلتی ہے۔
تیسرے مہینے جا کر بدلتی ہے۔ اور اپنے بوائے فرینڈ کے سامنے
نہیں کرتی ہے۔ یعنی انکل نہیں کہتی ہے۔ صرف اکیلے میں کہتی ہے،
ہوں تو بس چور نظر سے دیکھ کر خاموش سے گزر جاتی ہے۔ اس کی
نئے کپڑوں میں بسی ہوئی مہک کی طرح میرے نتھنوں میں پھیل جاتی
اس کا ہیلو کہنا مجھے اتنا اچھا نہیں لگتا جتنا ہیلو نہ کہنا۔ کیونکہ کبھی
نہ کہنے کی بلاغت کہہ دینے کی فصاحت سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔

خوجن کے شوہر کے پاس ایک گاڑی ہے، ایک ٹمپو اور ایک لاری۔
اور لاری وہ کرائے پر دیتا ہے۔ اور گاڑی بالعموم اس کی بانکی خوجن
ہے۔ اور آلو یا پیاز تک کے لئے اس کی گاڑی مارکیٹ تک جاتی
خوجے کو میں اکثر اپنی طرح بس میں جاتے دیکھتا ہوں۔ اب میرے پاس
اگر گاڑی ہوتی تو میں گرے ہوئے آم کی طرح سڑک پر نہ لڑھکتا ہوتا۔
عورتیں لپک کر میری گاڑی میں آ بیٹھتیں۔ ہمارے سماج کا الجبرا کچھ
قسم کا ہے۔ گاڑی کو عورت سے ضرب دو تو مرد کی عمر آدھی ہو جاتی ہے۔

جون اور مارتھا کا بھائی جو مشہور پاپ سنگر ہے اور اکثر شام کو اپنی
کی چھت کی منڈیر پر ٹانگیں پھیلائے گٹار کو گود میں لئے گاتا نظر آتا ہے،
کے پاس بھی زرد رنگ کی لو ہاک کی گاڑی ہے۔ یہ گاڑی بڑی سٹائلش
اور اسے دیکھ کر آج کل کی زرد دھاری والی پتلون کا خیال آتا ہے
ہندوستانی ہپیوں میں بہت پاپولر ہے۔

مارسیا کے پاس زینڈا گاڑی ہے۔ اسے مارسیا کے پاس آئے
اتنے ہی سال ہو گئے جتنے سال مارسیا کے شوہر کو مرے ہوئے
زینڈا کو مارسیا کا شوہر انگلینڈ سے لایا تھا۔ اس کا عہدہ چیف
تھا۔ رونڈا ڈیم کی تعمیر میں ڈائنامیٹ کا ایک فلیتہ بے وقت
جلنے سے اس کی موت ہو گئی، تین برس کا ایک بچہ چھوڑ کے مارسیا
مفارقت دے کر چلا گیا۔ گھر کا امیر تھا اس لئے گابین کا سب سے
خوبصورت گھر مارسیا کو دے کر چلا گیا۔ ہماری طرح کا دو منزلہ بنگلہ ہے۔ اوپر
منزل میں مسٹر اور مسز ایلش وڈر رہتے ہیں، یہ اینگلو انڈین جوڑا
عمر کا ہے۔ پامیلا ایلش وڈ کسی زمانہ میں بڑی حسین ہوگی اب بھی اس
آنکھیں مسکراتی ہیں، ایسی گہری کہ ہے۔ ان میں جو دس پندرہ عاشق رکھنے

کے بعد ہی عورت کی نگاہ میں پیدا ہوتی ہے۔ ہم دونوں شام کے جھٹپٹے میں
اکثر سڑک پر ملتے ہیں وہ مجھے دیکھ کر اکثر رک جاتی ہے۔ جاسوسی ناول
ہم دونوں پسند کرتے ہیں۔ اس لئے گفتگو کا موضوع اگاتھا کرسٹی یا ایڈرن
جونز یا راس میکڈانلڈ ہوتے ہیں۔ پامیلا سگریٹ بے تحاشہ پیتی ہے۔ اور
اپنی امپالا سپیڈ ربے تحاشہ تیز چلاتی ہے۔ ممکن ہے شوہر سے جھگڑا رہتا ہو۔
کیونکہ وہ اور ڈیوڈ بہت ہی کم اکٹھے دیکھے جاتے ہیں دو ایک دفعہ مجھے
اس کا سگریٹ سلگانے کا فخر حاصل ہو چکا ہے۔

مگر مارسیا کی بات اور ہے مارسیا تو گابین کا گلاب ہے۔ دو چار
سال تو بیچاری نے ایک وفادار بیوی کی طرح کسی نہ کسی طرح رو دھو کر
بسر کر دئے۔ صرف بیوہ یاں ہی نہیں۔ بیوائیں بھی وفادار ہوتی ہیں اور ہندوستان
میں تو انھیں دمِ آخر تک اپنے مرے ہوئے شوہر کی یاد کو سینے سے لگائے
وفادار رہنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ گو اب حالات بدل رہے ہیں یہ وہ زمانہ
ہے جب یادیں دھندلی پڑنے لگی ہیں، اور جسم کی مانگیں ابھرنے لگی ہیں۔ میرا
اپنا یہ خیال ہے کہ بعض اوقات نوجوان بیوائیں نوجوان بیویوں سے زیادہ
خوبصورت ہوتی ہیں، مارسیا کو دیکھ کر اس کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ حسن
سوگوار میں حسنِ خوشگوار سے زیادہ کشش ہوتی ہے۔

پہلے سال تو مارسیا بالکل سیاہ ملبوس میں رہی۔ دوسرے سال
سے کپڑوں کی تراش بدلنے لگی اور کپڑوں کے رنگ بھی، وہ چمکیلے رنگ تو
نہیں آئے جو اس کے جوان جسم پر پھبتے۔ لیکن ہاں سنجیدہ رنگ اور ڈیزائن
سیاہ رنگ کی جگہ لینے لگے۔ تین چار سال کے بعد وہ بالکل ماڈرن ڈیزائن اور
ماڈرن رنگوں پر آ گئی۔ کبھی کبھی عورت کے کپڑوں کے رنگ اور ڈیزائن دیکھ کر
اس کی نفسیاتی کیفیت اور مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ مارسیا کے کپڑے دیکھ
کر لگتا ہے۔ اب وہ کھل کھلنے پر آمادہ ہے۔ اپنے بنگلے کی دیوار پر پھیلی ہوئی
بوگن ویلیا کے پیچھے دھندلی بھیگی شاموں میں اسے میں نے کئی بار بے قرار دیکھا
ہے۔ کئی بار کسی سے لپٹ کر ہم کنار دیکھا ہے۔ لوگ کہتے ہیں مارسیا کو اپنے
مرحوم خاوند سے بڑی محبت تھی مگر کسی جوان جسم کو کب تک کسی کی مری ہوئی
یاد سے آسودہ رکھا جا سکتا ہے۔ اب مارسیا ایک نیا شوہر چاہتی ہے۔ وہ اکثر
اپنی زینڈا میں کسی کورٹ شپ کے لئے آنے والے مرد کے ساتھ گھومتی دکھائی
دیتی ہے۔ اس کے بوائے فرینڈ بدلتے رہتے ہیں۔ اس کی گاڑی کا رنگ بھی
سال میں دو مرتبہ بدلتا ہے۔ جونہی اس کی گاڑی کا رنگ بدلا میں سمجھ جاتا ہوں
اب اس کا بوائے فرینڈ بھی بدلے گا۔

گابین میں اپر مڈل کلاس رہتی ہے۔ دو ایک کو چھوڑ کر سب کے
پاس اپنے بنگلے ہیں اپنی گاڑیاں ہیں اپنی مطمئن مغرور زندگی ہے گابین
میں دو ایک کو چھوڑ کے سبھی کرسچین رہتے ہیں، ہر گھر میں پیانو ہے اور

مغربی موسیقی کا شوق ہے، مغرب سے آئے ہوئے فیشن سب سے پہلے گا بالین اور ایڈورڈ ایوینیو میں نمودار ہوتے ہیں، لڑکیاں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ گھومتی ہیں، مرد اپنی محبوباؤں کے ساتھ۔ میں کھڑکی میں کھڑا دیکھتا ہوں۔

مگر کچھ دنوں سے اس طمانیت اور فراغت بھری زندگی میں غریبی گھس آئی ہے۔ کوئی بیس پچیس مزدور میونسپل کمیٹی کی طرف سے مامور کئے گئے ہیں۔ گا بالین کے دونوں طرف کنکریٹ کے ڈرین پائپ ڈالنے کے لئے ان لوگوں نے میری کھڑکی کے بالکل سامنے سڑک کے اس پار ریاض پارکر کے بنگلے کے باغیچے کی باڑھ سے لگ کر چھ چھپر باندھ لئے ہیں۔ لگتا ہے گا بالین کا ایک حصہ سلم میں بدل گیا ہے۔ کالے کالے ننگے بدن، نیکر اور پھٹی ہوئی بنیان پہنے ہوئے کدال سے زمین کھودتے رہتے ہیں، چٹائی کے چھپروں میں کھانا پکاتے ہیں۔ دو چھپر پرانی زنگ آلود ٹین کے پتروں سے بنے ہیں، ایک میں تو دروازہ بھی ہے۔ اور اس پر کبھی کبھی تالا بھی دکھائی دے جاتا ہے۔ اس ٹین کے چھپر میں سیمنٹ کے بورے رکھے جاتے ہیں۔ اس کے قریب آٹھ بڑے بڑے لوہے کے ڈرم پانی سے بھرے رکھے ہوتے ہیں۔ یہی پانی سیمنٹ ریت اور بجری ملانے کے کام آتا ہے۔ اسی پانی میں مزدور نہاتے ہیں، اسی پانی کو وہ پیتے ہیں، ہر روز صبح پانی سے بھری ہوئی ایک لاری آتی ہے۔ اور ڈرم بھر جاتی ہے۔ رات کو کھلے چھپروں میں یہی مزدور چولہے کی روشنی میں لوہے کے ایک صاف تپے پر آٹا گوندھتے ہیں۔ دوسرے تپے کو چولہے پر رکھ کر روٹی پکاتے ہیں کھانا کھا کے اسی جھلملاتی روشنی میں جس میں تاریکی زیادہ ہوتی ہے، اور روشنی کم ہوتی ہے، وہ ہجر و فراق کے گیت گاتے ہیں۔ کیونکہ ان کی بیویاں ان کے گاؤں میں ہیں اور وہ اپنے گاؤں سے سیکڑوں میل دور گا بالین کی پکی سڑک کے دو رویہ ڈرین پائپ کے کیڑے ہیں۔ ہم لوگوں کو بہت برا لگتا ہے۔ گا بالین کے افق پر دور دور تک ایسی بدصورتی اور غریبی نہ تھی۔ لگتا ہے اب تک اخباروں میں جو پڑھتے تھے، دن رات، ایکا ایک وہ پرابلم ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ مگر ہمارا اس پرابلم سے کوئی واسطہ نہیں۔ بہت عرصہ ہوا ہم لوگ اپنے لئے اس پرابلم کو حل کر کے گا بالین میں آ کر بس گئے تھے۔ ہمیں کیوں تنگ کیا جا رہا ہے۔

کوئی آٹھ دس دن کی بات ہو تو آدمی دانت بھینچ کر، آنکھ بند کر کے گزار دے۔ مگر یہ لوگ تو سنا ہے چار مہینے تک یہاں رہیں گے۔ اور نہ صرف گا بالین بلکہ ایڈورڈ ایوینیو کی دونوں گلیوں میں کنکریٹ کے پائپ ڈالیں گے۔ کیا کوئی ایسی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ راتوں رات نالیاں کھد جائیں، سیمنٹ کے بستر بن جائیں اور ان میں کنکریٹ کے پائپ جما دئے جائیں۔ سائنس کی دنیا میں کیا ممکن نہیں ہے۔ مگر میونسپل کمیٹی ہمیں تنگ کرنے پہ تلی ہوئی ہے۔ یہ پانچ روپے یومیہ مزدوری پانے والے مزدور جانے کہاں سے ایک کانٹے دار جھاڑی کی طرح ہمارے باغیچے میں اُگ آئے ہیں۔ یہ ہماری گا بالین کی خوبصورت زندگی میں ایک بدنما دھبے کی طرح ابھر آئے ہیں اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ناک سکوڑ کر ان کے قریب سے گزر جاتے ہیں جن کے پاس گاڑیاں ہیں وہ اسے [illegible] جلدی سے نکل جاتے ہیں۔ مگر ان مزدوروں کو ہماری زندگی سے کوئی علاقہ نہیں ہمارے [illegible] کی کوئی پروا نہیں، جیسے یہ لوگ کسی دوسرے سیارے سے آئے ہوں۔ لوگ آپس میں چہلیں کرتے ہیں، ہنستے ہیں، گیت گاتے ہیں، کام کرتے ہوئے گیت گاتے ہیں۔ دال بھات یا دال روٹی کھا کر اپنے چھپروں میں یا سڑک کے کنارے لیٹے ہوئے بڑے بڑے ڈرین پائپ کے اندر بیٹھے جھٹ سے سو جاتے ہیں۔ جبکہ مجھے فوم ربر کے بستر پر سونے کے لئے [illegible] کی گولیاں کھانی ہیں۔ امیر لوگوں کو ہر دم خیال رہتا ہے کہ وہ امیر ہیں، لیکن ان غریب لوگوں کو کبھی خیال نہیں آتا کہ وہ غریب ہیں۔ ان کے ہنستے بشاش چہرے اور تنومند جسم دیکھ کر خیال آتا ہے شاید ان لوگوں نے کوئی ایسی امیری ڈھونڈ لی ہے جسے پیسے کی حاجت نہیں۔

چند دنوں سے ان مزدوروں میں ایک لڑکی شامل ہو گئی ہے۔ سیاہ رنگ، ہرن ایسی چمکتی ہوئی آنکھیں اور ہر وقت مسکراتے ہوئے ہونٹ اور صاف ستھرے ہاتھ پاؤں، میں اسے اکثر ایک چڈی پہنے پانی کے بڑے ڈرم کے قریب نہاتے دیکھتا ہوں، بال اکثر کھلے ہوتے ہیں، کبھی کبھی پھول دار کاٹن کا ایک چیتھڑا اس میں بندھا ہوتا ہے۔ نہا کر وہ اکثر سڑک پر بیٹھ کر بکھرے ٹکڑے جمع کرنے لگتی ہے۔ کبھی مادرزاد ننگی ہو کر ناچنے لگتی ہے۔ نہیں نہیں، وہ پاگل نہیں ہے۔ وہ محض تین سال کی ایک بچی ہے۔ اس کا نام متی ہے، اور اس کے مزدور باپ کا نام گھورو ہے۔ گھورو بالکل ایک نوجوان سا لڑکا ہے، تین سال ہوئے اس کی بیوی نمونیا سے مر گئی۔ متی کو اس کی بیوی کی بڑی بہن نے پالا ہے۔ جو سرلہوپ روڈ پر تعمیر ہونے والی یونائیٹڈ بلڈنگ میں کام کرتی ہے۔ مگر گھورو اپنی بیٹی کے بغیر نہیں رہ سکا اس لئے اب وہ اسے یہاں لے آیا ہے۔

مجھے متی بہت بھا گئی ہے۔ کھڑکی میں سے اسے اکثر دیکھتا ہوں اسے نہانے کا بھی بے حد شوق ہے۔ بھرے ہوئے ڈرم میں سے اپنی چھوٹی سی لٹیا میں پانی لے لے کر نہاتی رہتی ہے۔ نہا کر پھر سڑک پر کھیلتے ہوئے خاک میں لوٹتے ہوئے اتنی ہی گندی ہو جاتی ہے، مگر اسے اس کا کوئی احساس نہیں ہے۔ سڑک کی خاک اس کے لئے گھاس کی لان کے برابر ہے یا کسی عمدہ باغیچے کی طرح۔ شروع شروع میں مجھے اس کا عریاں رہنا بہت کھلا۔ میں اس کے لئے ایک دن دو چڈیاں لے آیا۔ پھر ایک فراک لایا پھر مٹھائی لایا پھر بالوں کے لئے ربن لایا۔ بڑی مشکل سے وہ کافرادا

رام ہوتی ہے۔ پہلے پہل وہ مجھ سے بات تک نہیں کرتی تھی، مجھے دیکھکر چھپر میں چھپ جاتی تھی۔ اور چھپر کے دروازے کی آڑ سے جھانک کر مجھے دیکھتی تھی۔ بات تو اب بھی وہ مجھ سے نہیں کرتی ہے۔ کیونکہ متی ہندی نہیں جانتی اگھولو مدھیہ پردیش کا قبائلی ہے۔ گھولو شہروں میں رہ کر ہماری بولی سیکھ گیا ہے۔ مگر متی تو ابھی تین سال کی ہے ہمیری اور اس کی گفتگو اس کے باپ کے ذریعے ہوتی ہے، یا اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کے ذریعے یا اس کی گردن کی جنبش کے ذریعے، جس سے وہ ہاں یا ناں کرتی ہے، مگر دھیرے دھیرے وہ میری محبت کی رشوت کے قایل ہوتی جا رہی ہے اس نے طے کر لیا ہے کہ اگر وہ شادی کرے گی تو صرف مجھ سے۔ دو نئے فراک ایک نئی چڈی، چند ربن اور کچھ پیسے جو میں اُسے دیتا ہوں اس نے الگ ایک پوٹلی میں باندھ کر رکھ دیئے ہیں۔ کہتی ہے۔ یہ میرا جہیز ہے۔ کبھی تو ہمک کر میری گود میں آجاتی ہے۔ کبھی انگلی پکڑ کر میرے ساتھ ساتھ سڑک پر چند قدم چلتی ہے پھر جہاں پانی کے ڈرم رکھے ہیں وہاں جا کر رک جاتی ہے۔ اور مجھے بازار سے کھلونے لانے کی فرمائش کرتی ہے۔ اب اس کے پاس لکڑی کا گھوڑا ہے کپڑے کا خرگوش ہے، بھالو ہے اور ایک بہت پیاری گڑیا ہے اور پلاسٹک کا ایک ببوا ہے جسے وہ اکثر اپنے ساتھ نہلاتی ہے اور نہلا کر اسے اپنی کمر کے خم میں لٹکا کر بڑی بوڑھیوں کی طرح چلتی ہے۔

میری اولاد میں صرف لڑکے ہی لڑکے ہوئے، لڑکی کوئی نہ ہوئی۔ پر اب متی کے آجانے سے لگتا ہے جیسے وہ کمی پوری ہو گئی، مگر گاپالین والے میری اور متی کی دوستی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ انہوں نے میرے گھر والوں کو سمجھایا اور میرے گھر والوں نے مجھے سمجھایا مگر کچھ اثر نہ ہوا مجھ پر۔ میں متی کے اور متی میرے بہت نزدیک آتے گئے۔ میں نے متی سے کہہ دیا ہے کہ ہم شادی تو کر لیں گے ہی، مگر وہ بار بار پوچھتی ہے "کب ؟" میں جواب دیتا ہوں۔ "جب اس سڑک کے دونوں طرف ڈرین پائپ لگ جائیں گے۔ مگر ایک پائپ ہم رکھ لیں گے، اپنے رہنے کے لیے۔ ورنہ ہم سوئیں گے کہاں ؟" متی کو چھپر کی زندگی پسند نہیں ہے۔ اسے کنکریٹ کا ڈرین پائپ زیادہ پسند ہے۔ صاف ستھرا ہے، دو طرف سے کھلا ہے۔ متی کو اس میں کھیلنا بہت پسند ہے۔ جب سے میں نے اُسے لوہے کے ہک میں پھنسا ہوا لال رنگ کا لنگور لا دیا ہے۔ وہ اُسے اکثر ہک کو پائپ میں پھنسا کر لنگور کو ڈوری سے اوپر نیچے پھلانگتا دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔

ایک روز جب میں بنارسی مٹھائی والے سے متی کے لیے تھوڑی مٹھائی لے کر چلا آ رہا تھا، تو نکڑ پر متی مجھے دیکھ کر دونوں باہیں پھیلا کر بے تحاشا کلکاریاں مارتی ہوئی خوشی سے دوڑتی ہوئی میری طرف بھاگی۔ سڑک کراس کرتے ہوئے اُسے آس پاس کا کوئی دھیان نہ رہا، اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں صرف مجھے دیکھ رہی تھیں۔

عین اسی وقت نکڑ سے ایک تیز ٹرن کاٹتی ہوئی مارسیا کی موٹر سب وے (Sub-way) سے نکل کر اس کے گھر کی طرف نکل گئی، دوسرے لمحے میں میرے منہ سے زور کی ایک چیخ نکلی، کیونکہ متی مارسیا کی موٹر کے نیچے آچکی تھی، جسے مارسیا کا نیا بوائے فرینڈ چلا رہا تھا۔ وہ یونائیٹڈ کنگڈم سے بیس روز کی چھٹی پر آیا تھا اور چند دن کے بعد مارسیا کو انگلینڈ لے جانے والا تھا، جہاں اس کا اور مارسیا کا فائنل کورٹ شپ ہونے والا تھا۔ مارسیا نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور اس کے بوائے فرینڈ نے موٹر سے اتر کر ان ان پڑھ، جاہل، گندے غلیظ مزدوروں کو ہزاروں گالیاں سُنا ڈالیں جو اپنے بچوں کو سڑک پر ننگ دھڑنگ ناچنے گانے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔

میں نے اور گھولو نے اور مزدوروں نے مل ملا کر متی کو موٹر کے نیچے سے نکالا مگر وہ مر چکی تھی۔

ہم لوگ متی کو دفن کر آئے ہیں

گاپالین میں سناٹا ہے آج کسی چھپر میں چولہا نہیں جلا۔ سب مزدور گھولو کے گرد جمع ہیں جو اپنا منہ بازوؤں میں چھپائے چپ چاپ لیٹا ہے، ڈرین پائپ میں لٹکا ہوا لنگور اکیلا ہے، اور متی کی گڑیا چھپر کے ایک کونے میں اُلٹی پڑی ہے، وہ لوگ اس سے بات کرنا چاہتے ہیں مگر گھولو کسی سے بات نہیں کرتا، وہ چپ چاپ لیٹا ہے۔

میں نے ایک مزدور کو چھ روپے دیئے، "اسے شراب پلاؤ، اس سے باتیں کرو، اسے بہکنے دو۔ ورنہ یہ بھی جان سے چلا جائے گا، غم زدہ گھولو"

مارسیا کے بنگلے کی کھڑکیاں کسی مجرم کے ضمیر کی طرح اندر سے بند ہیں۔ لین میں آنے والے نکڑ کے قریب سے سر جھکائے گزر جاتے ہیں۔ رات گہری ہوتی جاتی ہے۔ غم زدہ گھولو کے سینے میں سسکیاں بھری ہیں، مگر اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلتی، وہ اُسے شراب پلاتے ہیں۔ وہ چپکے چپکے پیتا جاتا ہے۔

پھر ایک مزدور نے گھولو کے سامنے متی کی پوٹلی رکھ دی، گھولو نے اسے دھیرے دھیرے سے کھولا، نہ اس کی آنکھ نم ہے، نہ ہاتھ کانپتے ہیں، وہ ایک ایک چیز الگ کرتا ہے، اودے پھولوں والا فراک، بادامی ریشم کا فراک۔ لال چڈی، ہری چڈی، ہاتھوں سے تالی بجانے والا بھالو، لمبے لمبے کانوں والا خرگوش، سونے کے پالش والا جھمکا۔

ایکا ایک وہ ایک زوردار چیخ کے ساتھ اٹھا اور اٹھتے ہی اس نے چھپر کی آہنی دیوار سے لوہے کا ایک پترا کھینچ لیا اور اسے ہاتھ میں لے کر بجلی کی سی تیزی سے — باہر نکل گیا۔

ملزم کے خلاف الزام یہ ہے کہ اس نے ۲۹ جون کی رات میں گاپالین میں کھڑی چھ موٹروں کے ٹائر پھاڑ ڈالے۔

دو غزلیں

جمیل مظہری

ہجر میں کل یہ نئی بات ہوئی
آپ اپنے سے ملاقات ہوئی

دین و دولت میں ملاقات ہوئی
خوب آپس میں مدارات ہوئی

کچھ جو توضیحِ اشارات ہوئی
اور مبہم تری ہر بات ہوئی

رہا کچھ دیر اُجالا دن کا
دفعتاً ذہن میں پھر رات ہوئی

بے تغافل بھی اک احساں تیرا
کچھ تو تربیتِ جذبات ہوئی

گھر ہی زنداں ہوا - زنداں کیسا
سانس تک قیدیِ حالات ہوئی

آنکھیں کرتی ہیں زباں کی تردید
ہم سخن یہ بھی کوئی بات ہوئی

عشق نے ذہن کا سانچہ بدلا (قطعہ)
زندگی خوابِ طلسمات ہوئی

زاویٔے فکر و نظر کے بدلے
نئی ترکیبِ خیالات ہوئی

روشنی جس کو سمجھتی تھی نظر
اب وہ منجملۂ ظلمات ہوئی

عقل نے عشق کی منطق سیکھی
حامیٔ شورشِ جذبات ہوئی

عشق کی بوالعجبی کے آگے
حسن کی فتنہ گری مات ہوئی

مظہری آپ کی ہر جدّتِ فکر
ایک توہینِ روایات ہوئی

جنوں میں شاد ہوں، دشت و دمن ملے نہ ملے
بہار آئے نہ آئے، چمن ملے نہ ملے

یہ راہ ہی تو ہے گلشن نہیں ہے دیوانو
چلے چلو کوئی گل پیرہن ملے نہ ملے

ہوا سے حال کہوں، رہ گزر سے بات کروں
اُس انجمن میں مجالِ سخن ملے نہ ملے

ترے خیال سے مہکا رہا ہوں رات اپنی
شمیمِ زلفِ شکن در شکن ملے نہ ملے

چتا بناؤں خود اپنی چمن کے پھولوں سے
خزاں کے راج میں گور و کفن ملے نہ ملے

کر آئیں سیر ذرا چل کے دشتِ ویراں کی
چمن میں اب وہ بہارِ چمن ملے نہ ملے

سنا کے میری غزل اور ایک جام، کہ پھر
ربابِ "تاج" و سرودِ چمن ملے نہ ملے

مرے سخن کے مخاطب ہیں اہلِ دل میکشؔ
نہیں ہے فکر کوئی اہلِ فن ملے نہ ملے

میکش اکبرآبادی

ـاجہ احمد عباس

ایک لڑکی - سات دیوانے

لڑکی جوان ہوگئی تھی۔

لوگ کہتے تھے لڑکی بڑی خوب صورت ہے، چنچل ہے، طرح دار ہے، دنیا
ـا کی دیوانی ہے، ہر کوئی اس کی خاطر جان دینے کو تیار رہے۔

ساتھ میں لڑکی گنی بھی تھی۔ پڑھی لکھی تھی۔ دنیا بھر کی زبانیں جانتی
ـ ملٹن اور شیلی، ٹیگور اور قاضی نذرالاسلام، سبرامنیم بھارتی اور نرالا،
ـشی اور فیض کی نظمیں اسے زبانی یاد تھیں۔ لنکن اور گیری بالڈی، زولا
ـر مارکس، اینجلز اور لینن، گاندھی اور جواہرلال نہرو کی کتابیں پڑھے
ـئے تھی۔ اُس کی زبان میں جادو تھا۔ اُس کی ایک آواز پر لاکھوں کروڑوں
ـنے مارنے کو تیار ہو جاتے تھے۔

جب اُس کی پچیسویں سال گرہ قریب آئی تو سب نے کہا کہ اب
ـڑکی کو گھر بسانا چاہیئے۔ بچپن کا لاابالی پن کب تک چلے گا۔ دنیا کے
ـب انگلیاں اٹھا رہے ہیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ پچیس برس کی لڑکی
ـنہی واہی تباہی نہیں گھومنا چاہیئے۔ آج اِس کے ساتھ کل اُس کے
ـاتھ۔ اب تو اسے ایک کو پسند کر کے اُسے شریک زندگی بنانا چاہیئے۔

ـا ہر سو اعلان ہو گیا کہ لڑکی اپنا شریک زندگی چنے گی۔ جتنے اُس
ـچاہنے والے ہیں سب سوئمبر کے لئے اکھٹے ہو جائیں جس خوش قسمت
ـو اس قابل سمجھے گی، اُس کے گلے میں جے مالا ڈالے گی۔

ـیوں تو کون لڑکی کا دلدادہ نہیں تھا، مگر اُن سب میں سات
ـسے تھے جو اُس پر دل و جان سے فدا تھے۔ اور اُس کو اپنانا چاہتے
ـ، اپنی بنانا چاہتے تھے۔ ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ لڑکی اس کو پہلے سے
ـپسند کر چکی ہے صرف دنیا کے سامنے اقرار کرنے کی ضرورت ہے۔

پہلے تو ایک صاحب سامنے آئے۔ "مجھے دھرم دیو کہتے ہیں"۔
انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔ لمبے چوڑے۔ اونچا ماتھا۔ سر پر لمبے لمبے
بال۔ گیروے رنگ کا سلک کا لمبا کرتا اور دھوتی پہنے ہوئے۔ پیچھے
پیچھے چیلوں اور چیلیوں کا ایک گروہ کیرتن کرتا، کھڑتالیں بجاتا
ہوا۔ "دھرم دیو کی جے" کے نعرے لگاتا ہوا۔

"بالکا" انہوں نے لڑکی کو مخاطب کر کے کہا۔ "اگر تم مایا موہ کے
جال سے نکلنا چاہتی ہو تو مجھے اپنالو، دھرم دیو بلکہ دھرم کی شرن
میں آجاؤ۔ اور لوگ جو کچھ تمہیں دے سکتے ہیں ــ پریم، دھن، دولت،
عیش و عشرت ــ وہ سب میں بھی تمہیں دے سکتا ہوں۔ مگر ساتھ
میں تمہیں مکتی بھی پراپت ہوگی۔ جو تمہیں اور کوئی نہیں دے سکتا۔ کیا
جواب ہے۔ تمہارا، بالکا؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "مہاراج۔ من تو چاہتا ہے جیون آپ کے
چرنوں میں ہی بتا دوں مگر اوروں سے بھی مل لوں، اُن کی بھی سُن
لوں پھر جواب دوں گی۔"

دھرم دیو نے ہاتھ اٹھا کر لڑکی کو آشیرواد دیا اور کہا "کوئی
چنتا نہ کرو، بالکا۔ تم بے شک اوروں سے ملو، اُن کو بھی پرکھو۔ مگر
تمہارے بھاگیہ میں میرا جیون ساتھی بننا ہی لکھا ہے"۔

لڑکی نے نظریں جھکا کر کہا "جو بھاگیہ میں لکھا ہے وہ تو ہوگا
ہی مہاراج۔"

اس کے بعد مہاراجہ مان سنگھ شان سنگھ کی سواری آئی۔ زرق
برق شاہانہ لباس۔ سفید گھوڑے پر سوار، کمر میں تلوار بندھی ہوئی ـــ

راجپوتی شان کی بڑی بڑی مونچھیں۔ اُن کے جلوس میں کتنے ہی غلام، باندیاں لونڈیاں، گانے والیاں، ناچنے والیاں طبلہ بجانے والے سارنگی بجانے والے۔

گھوڑا روک کر انہوں نے لڑکی سے کہا: "اے سندری، آؤ اور میرے راج محل کی شوبھا بڑھاؤ۔ میں تمہیں مہارانی بنا کر رکھوں گا۔"

لڑکی نے جواب میں کہا: "مہاراج کی جے ہو۔ لگتا ہے آپ نے آنے میں دیر کر دی ہے۔ سنتے تو سُنا کہ آپ کی پریوی پرسز بند کر دی گئیں آپ کے خاص حقوق ختم کر دیئے گئے ہیں۔ پھر آپ کی پہلے ہی بہت سی بیویاں ہیں۔ کیا آپ ایک اور بیوی کا خرچہ برداشت کر سکیں گے۔؟"

مہاراجہ نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا: "سندری تم چنتا نہ کرو۔ پریوی پرسز کے بند ہو جانے کے بعد بھی میرے پاس اتنا کچھ ہے کہ سینکڑوں برس تک نہ صرف میں اور تم اور میری سب رانیاں بلکہ سب رانیوں سے میری اولاد اتنے ہی شان اور اتنے ہی آرام سے رہ سکتی ہے جس آرام اور جس شان سے میں رہتا ہوں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہمارا دور ابھی ختم نہیں ہوا۔ پہلے میرے پاس کروڑوں ایکڑ بنجر زمین تھی۔ رعایا کی دیکھ بھال کرنے کا درد سر تھا۔ اب میرے پاس ہزاروں ایکڑ کا فارم ہے۔ جہاں ٹریکٹر چلتے ہیں۔ شراب بنانے کی فیکٹری میں میرے حصے ہیں۔ موٹروں کے کارخانے میں میری ساجھے داری ہے۔ میری آمدنی پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ تمہیں آج بھی ہیرے جواہرات سے لاد سکتا ہوں۔"

"مہاراج سے یہی امید ہے۔" لڑکی نے کہا: "مگر جہاں اتنا انتظار کیا ہے تھوڑا اور انتظار کیجئے۔ میں یقین دلاتی ہوں کہ فیصلہ ہونے سے پہلے یہ مالا کے پھول باسی نہ ہونے پائیں گے۔"

اس کے بعد ایک بڑی شاندار، لمبی چوڑی امپالا موٹر آ کر رکی۔ اس پر سیٹھ کروڑی مل پکوڑی مل براجمان تھے۔ موٹر پھولوں کی جھالروں سے سجی ہوئی تھی کیونکہ سیٹھ صاحب تو لڑکی کے ساتھ سات پھیرے کروانے کا فیصلہ کر کے ہی گھر سے چلے تھے۔

موٹر کا دروازہ کھلا اور سیٹھ صاحب سہرا لگائے اپنی توند سنبھالتے ہوئے نیچے اُترے۔

"لڑکی،" انہوں نے دیکھتے ہی کہا: "تو تو ہماری ساتھ آجا۔ پنڈت پروہت سب کا پربندھ کروا رکھا ہے میں نے۔ ایک بار میری ہو گئی تو تیری ایسی حفاظت کروں گا جیسی اپنی تجوریوں کی کرتا ہوں۔ بلکہ تجوری ہی میں بند کر کے رکھ دوں گا۔ کوئی سورا تیری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ ہاں!"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے سیٹھ صاحب۔" لڑکی نے [illegible] مسکرا کر کہا: "آپ کے تو مجھ پر پہلے ہی بڑے احسان ہیں۔"

"ہیں تو" سیٹھ جی بولے۔ "میں نہ ہوتا تو تجھے کون جانتا ہے؟ آج تک تیرا خرچہ کس نے اٹھایا ہے؟ میں نے۔ تیرے سولہ سنگھار کس کے پیسے سے ہوئے؟ میرے؟ تیرے کپڑے لتے۔ یہ سارا تیرا تام جھام کس کے پیسے سے آیا؟ میرے۔ اور بول تجھے کیا چاہیے۔ موتیوں کا کنٹھا چاہیے؟ لے تیرے نام کر دیا! ساڑھیاں چاہئیں؟ پوری کی پوری ساڑھیوں کی دکان ہی گھر بھجوا دوں گا۔ تین کوٹھیاں ہوں گی تیرے واسطے — ایک دلی میں، ایک بمبئی میں؟ ایک مسوری میں۔ اور تیرے موتیوں...."

لڑکی نے کہا: "یہ سب تو مہاراجہ مان سنگھ شان سنگھ بھی دینے کو کہہ رہے ہیں!"

"ارے وہ راجہ کیا کھا کے میرا مقابلہ کرے گا۔ میرے ہی کارخانوں میں تو چھوٹا موٹا حصہ ہے اُس کا۔ اب اس کی شان دیکھنے ہی دیکھنے کی رہ گئی ہے اصل مال تو ہمارے پاس ہے۔ اصل مال اور اصل طاقت بینک، کارخانے، انگریزی، ہندی کے بڑے بڑے اخبار اور چھاپے خانے، افسر، منسٹر سب میری جیب میں ہیں۔ میں حکم دوں تو ساری دنیا میں تیری سندرتا کے چرچے ہی چرچے ہوں گے اور اگر الٹا حکم دے دوں تو کوئی تیرا نام بھی نہ جانے گا۔ یہ ہے ہماری شکتی۔ یہ کہہ دے اپنے سب چاہنے والوں سے۔ جو جی چاہے تو طاقت آزما کے دیکھ لیں!"

"سیٹھ جی،" لڑکی نے اٹھلا کے کہا: "بھلا کس کی ہمت ہے کہ آپ کا مقابلہ کر سکے؟ بس ذرا سی دیر کی بات ہے۔ پھر آپ کو کیا فکر ہے۔ آپ کے سر تو سہرا پہلے ہی بندھا ہوا ہے۔"

کروڑی مل پکوڑی مل اپنی موٹر میں جا بیٹھے۔ دروازہ بند کر لیا۔ موٹر روانہ ہو گئی اور پھولوں کی جھالروں کے پردے میں چھپ کر انھوں نے اپنا بیگ کھولا اور ہزار ہزار روپے کے نوٹوں کے بلنڈوں کو گننا شروع کر دیا۔

اب پگڑ باندھے ایک ہٹا کٹا نوجوان آیا جو ایک ٹریکٹر پہ سوار تھا۔ لڑکی کے سامنے آتے ہی دس دس کے نوٹوں کا بنڈل نکالا اور لڑکی کے سر پر سے وار کر ادھر اُدھر پھینکنے لگا۔ اڑوس پڑوس کے چھوکرے، نوکر، منگتے سب دوڑ دوڑ کر نوٹ بٹورنے لگے۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" لڑکی نے بظاہر کسی قدر بگڑ کر مگر دل ہی دل میں خوش ہو کر کہا: "لگتا ہے تمہیں روپے کی قدر نہیں ہے؟"

نوجوان جس کا نام "دھرتی پتی کولاک" تھا۔ ایک بے باک اور

…انداز سے لا میری جان۔ قدر کیوں نہیں ہے ؟ روپے کی قدر کرتا ہوں تب
تو تم پر سے نچھاور کر رہا ہوں۔ تمہاری قدر و قیمت کوئی میرے دل سے پوچھے۔
… "اور یہ کہہ کر اس نے نہایت بے شرمی سے ایک آنکھ بند کر کے منہ میں
… ڈال کر لوفروں کی طرح سیٹی بجائی۔
لڑکی نے بھی بے باکی سے جواب دیا" تم کیا۔ یہاں جو ہے وہ میرا دیوانہ
ہے! دھرم دیو ہوں یا راجہ مان سنگھ ہوں یا سیٹھ کروڑی مل ہوں۔
… سے ایک بڑھ کر قیمت لگا رہے ہیں میری! تم بھی بولی لگاؤ۔"
"وہ تو میں لگاؤں گا ہی، میری جان!" دھرتی پتی گولاک نے کہا۔
… سب تو اگلے وقتوں کے لوگ ہیں بڈھے کھوسٹ۔ میں ہوں ایک تمہاری
… عمر کا جب تم پیدا ہوئیں اُدھر میں پیدا ہوا۔ تمہارے ساتھ ہی کھیل کود کر
… جوان ہوا۔ پرانے جاگیرداروں کی جاگیریں تم نے مجھے دیں۔ زمینداروں
… زمینداری ختم کر کے تم نے مجھے زمینیں الاٹ کیں۔ میں تو جو کچھ بھی ہوں تمہارا
… بنایا ہوا ہوں تم نہ ہوتیں تو مجھے کون پوچھتا۔ اور میں نہ ہوتا تو تمہارا اس
… نیا میں کون ہوتا۔ لو کو۔ تم میری ہو اور میں تیرا، میری جان! ایک دفعہ بس
… کہہ دو پھر دیکھو۔ کس دھوم دھام سے بیاہ رچاتا ہوں۔ ہماری شادی
… دعوت میں تو کم سے کم ایک لاکھ آدمی کھانا کھائیں گے۔"
"ایک لاکھ؟" لڑکی نے تعجب سے کہا۔" اتنے آدمیوں کے لئے اتنا
… ول، اتنا گھی، اتنی شکر کہاں سے آئے گی؟"
"وہ سب میرے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ تمہاری سلامتی چاہئے۔ میرے
… رم میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ اپنی بہن کی شادی میں میں نے تین ہزار مہمان
… ئے تھے۔ وہ بھی معمولی مہمان نہیں ایک سے ایک بڑا افسر اور منسٹر تھا! -
… س دن تمہیں بیاہ کے لے جاؤں گا اُس دن تو میں دودھ، دہی، گھی اور شراب
… دریا بہا دوں گا دریا!"
"وہ تو مجھے معلوم ہے" لڑکی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
… مگر تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔"
"جیسا تمہارا حکم" دھرتی پتی گولاک نے ٹریکٹر کو سٹارٹ کرتے ہوئے
… "میرا تمہارا تو جنم جنمان کا رشتہ ہے!"

اب ایک اور اُمیدوار آئے اور بڑی شان سے آئے۔ آگے آگے لال
… یاں باندھے ہوئے چپراسیوں کی ہراول فوج، پیچھے ایک لمبا چوڑا تخت
… ے ایک سو ہیڈ کلرک اپنے سروں پر اُٹھائے لا رہے تھے۔ تخت پر قالین
… ین پر ایک بہت بڑی میز جس پر پانچ ٹیلی فون رکھے ہوئے تھے اور
… ذوں کی گڈیوں پر سونے چاندی کے پیپرویٹ رکھے ہوئے تھے کہ وہ
… ا میں اُڑ نہ جائیں۔ کرسی پر مسٹر" دفتر شاہی افسر" گلا بند کوٹ اور

پتلون پہنے اکڑے ہوئے بیٹھے تھے۔
کلرکوں نے تخت لڑکی کے عین سامنے لا کر رکھ دیا کیونکہ مسٹر دفتر شاہی افسر کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔ وہ لڑکی کو صرف اُس وقت دیکھ سکتے تھے جب وہ عین اُن کی نظروں کے سامنے ہو۔
مسٹر دفتر شاہی افسر کے ایک سب اسسٹنٹ ڈپٹی سکریٹری نے لڑکی سے آ کر کہا" آپ کو صاحب سے بات کرنی ہے؟"
لڑکی نے بڑی شان بے نیازی سے کہا" اگر وہ بات کرنا چاہیں تو میں بات کر سکتی ہوں۔"
"ٹھیک ہے،" سب اسسٹنٹ ڈپٹی سکریٹری نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا" لائیے پانچ ہزار روپے دلوایئے۔ صاحب کا وقت بڑا قیمتی ہے پانچ منٹ کی ملاقات کروائے دیتا ہوں۔"
لڑکی نے غصّے سے کہا" صاحب جائے تمہارا چولہے میں۔ میری جوتی اس سے بات کرنا چاہتی ہے!"
"سیکشن کلرک!" سب اسسٹنٹ ڈپٹی سکریٹری نے آواز دی اور کہا" جاؤ صاحب سے کہدو کہ لڑکی اس قابل نہیں ہے کہ اسے کوئی پرمٹ یا لائسنس دیا جائے۔ انٹرویو بھی دیا تو وقت ضائع ہوگا۔"
"ایڈیٹ" دفتر شاہی افسر چلّایا" بات کرنے کی تمیز نہیں۔ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں! نکل جاؤ یہاں سے۔ ہم اس لیڈی سے اکیلے میں بات کرتے ہیں۔"
جب وہ دونوں اکیلے رہ گئے تو دفتر شاہی افسر نے اپنی ٹیڑھی گردن کا پینچ ڈھیلا کرتے ہوئے کہا" ڈارلنگ"!
لڑکی نے بڑے طنز بھرے لہجے میں جواب دیا" کیوں خیریت تو ہے۔ آج تو بڑے پیار کا اظہار کر رہے ہو۔ انگریزوں کے زمانے میں تو تم مجھے گولی مار دینا چاہتے تھے!"
"پرانی باتوں کو بھول جاؤ، ڈارلنگ۔ آج کی بات کرو۔ میں پچیس برس سے تمہاری سیوا کر رہا ہوں —"
"میری سیوا؟" لڑکی نے پوچھا" یا اپنی سیوا؟"
"وہ ایک ہی بات ہے ڈارلنگ۔ میں اور تم الگ الگ تھوڑا ہی ہیں۔ تم میرے لئے بہت لکی ثابت ہوئی ہو۔ پہلے میری اوپر کی آمدنی پانچ چھ سو روپے تھی اب پانچ چھ ہزار روپے مہینہ ہے۔ کبھی کبھی تو بھگوان پرمٹ کا چھپّر پھاڑتا ہے تو اس میں سے لاکھوں روپے مل جاتے ہیں۔ یہ سب تمہاری ہی برکت ہے، تمہاری ہی دین ہے!"
"پھر اب کیا چاہتے ہو؟" لڑکی نے پوچھا" تم تو میرے بغیر بھی مزے کر رہے ہو!"

"نہیں ڈارلنگ۔ تمہارے بغیر نہیں تمہاری وجہ سے مزے کر رہا ہوں۔ تم ہمیشہ کے لئے میری ہو جاؤ گی تو ہم دونوں عیش کریں گے۔"

"اچھا:" لڑکی نے بے دلی سے کہا "تو کچھ دیر اور انتظار کرو۔"

"تمہاری خاطر یہ بھی کروں گا، ڈارلنگ۔" دفتر شاہی افسر صاحب نے اپنے کلرکوں کو واپس بلاتے ہوئے کہا: "ورنہ میں تو اور سب کو انتظار کراتا ہوں۔ میں کسی کا انتظار نہیں کرتا:"

اب ایک نئے ڈھنگ کی برات آئی۔

آگے آگے بینڈ۔ آدھا بینڈ انگریزی باجے بجا رہا تھا۔ آدھا ہندوستانی ایک طرف وائلن۔ دوسری طرف سارنگیاں۔ ایک طرف طبلے دوسری طرف بونگو اور کیٹل ڈرم۔

دولہا ننگے پاؤں مگر پتلون پہنے ہوئے۔ پتلون کے اوپر جوگیا رنگ کا سلک کا کرتا۔ سر پر ہیٹ۔ ایک پاؤں کار میں دوسرا چھکڑے میں۔

برات لڑکی کے سامنے آکر رک گئی۔ دولہا نے اپنا تعارف کرایا۔

"مجھے بنتا خاں بھارت سیوک انڈیا والا کہتے ہیں۔ ہم آپ کے پرانے چاہنے والوں میں ہیں۔ سوچا آج سات پھیرے بھی ہو جائیں۔ نکاح بھی پڑھوا لیں اور رجسٹرار کے دستخط بھی ہو جائیں۔"

"یعنی ایک چھوڑ تین تین ڈھنگ کی شادیاں!" لڑکی نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں۔ انڈیا یعنی بھارت یعنی ہندوستان کی مکسڈ اکانومی میں ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

"یہ آپ کو کیسے خیال ہوا کہ میں آپ سے شادی کرلوں گی؟" لڑکی نے پوچھا۔

"شادی تو ایک طرح سے ہماری آپ کی ہو چکی ہے۔" بنتا خاں بھارت سیوک انڈیا والا نے کہا "کیا ہماری قربانیوں کو آپ نے بھلا دیا ہے؟ ہمارے خون سے ہی آپ کی مانگ میں سیندور بھر اگیا تھا، آپ کے ہاتھ پاؤں میں سہاگ کی مہندی لگی تھی!"

"اس کا بدلہ بھی میں نے چکا دیا تھا۔" لڑکی نے کہا "برسوں میں نے آپ کی عنایات کے بدلے میں آپ کی سیوا کی ہے۔ کیا آپ ہمیشہ کی غلامی کرانا چاہتے ہیں؟"

"آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں؟" بنتا خاں بھارت سیوک انڈیا والا نے کہا۔ "غلامی نہیں یہ تو بھارتیہ ستری کا دھرم ہے کہ اپنے پتی کی سیوا کرے۔ پھر ہمارا آپ کا سمبندھ تو پرانا ہے۔ ہم نے ہی آپ کو یہ رنگ روپ، یہ نکھار، یہ انداز دیا۔ بدلے میں کیا آپ کا فرض نہیں

ہے کہ آپ ہماری اور صرف ہماری ہو کر رہیں؟"

لڑکی نے بظاہر لاجواب ہو کر کہا "تب تو آپ کو بھی کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھے فیصلہ کرنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔"

اس کے بعد یکایک ایک بہت بڑا دھماکہ ہوا گویا ہوائی ساتھ پھٹے۔ دھواں ہٹا تو دیکھا کہ ایک نوجوان موٹر سائیکل پر سوار چلا آرہا ہے

"لڑکی!" اس نے موٹر سائیکل روکتے ہوئے ڈانٹ کر پوچھا

"کیا تم ہی وہ لڑکی ہو؟"

"جی ہاں" لڑکی نے ڈرتے ہوئے کہا

"ویری گڈ" "میرا نام ہے کرانتی کاری پورکر۔ چنگ۔ پانگ۔ ناؤ۔ ناؤ۔ پاؤ۔ پاؤ۔"

"جی؟" لڑکی نے تعجب کا اظہار کیا۔

"اس کا مطلب ہے لال سلام۔ کیا تم چنگ پانگ نہیں سمجھتیں؟"

"جی نہیں۔" لڑکی نے اقرار جرم کیا۔

"کوئی بات نہیں۔ لال کتاب تمہیں سب پڑھا دے گی سب سمجھا دے گی۔ تو تم مجھ سے شادی کے لئے تیار رہو؟" کرانتی کاری پورکر نے سوال کیا۔

"مگر" لڑکی نے کہا "میں تو سمجھتی تھی آپ شادی کے خلاف ہیں۔"

"بالکل غلط۔ وہ امریکی بورژوا اور روسی Revisionist ہیں جو شادی کے خلاف ہیں" اور پھر جیب سے لال کتاب نکال کر اس کا ایک ورق پلٹتے ہوئے بولا "کتاب کہتی ہے شادی کرو۔ بہت سے بچے پیدا کرو تاکہ انقلاب کے سپاہیوں کی تعداد بڑھے۔ تم فیملی پلاننگ جیسے بورژوا ڈھکوسلوں میں تو وشواس نہیں رکھتیں۔؟"

لڑکی نے جھجکتے ہوئے کہا "مگر ملک کی آبادی تو خطرناک حد تک بڑھتی جا رہی ہے"

"یہ سب بورژوا لوگوں اور سامراجی ایجنٹوں کا پروپیگنڈا ہے۔ تاکہ کرانتی کاریوں اور انقلاب کے سپاہیوں کی تعداد نہ بڑھے۔"

"شادی کے بعد کیا ہوگا؟" لڑکی نے پوچھا

کرانتی کاری پورکر نے کہا "سرخ سویرا آئے گا۔ مشرق کی کوکھ سے لال سورج نکلے گا۔ مغرب میں اندھیرا چھا جائے گا۔ تمہاری گود میں سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں بچے کھیلیں گے۔"

"مگر ان سب کو ہم کھلائیں گے کیسے؟" لڑکی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

"تیتا سب کا پالن ہار ہے۔"

"تب تو تھوڑی دیر انتظار کرو۔ میرے لال ساتھی؟" لڑکی نے

ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ اور کرانتی کاری پورکر بولا۔" میں انتظار تو نہیں کرسکتا مگر تمہاری خاطر یہ بھی سہی۔" اس نے کہا اور ایک ہینڈ گرینیڈ کے دھماکے کے ساتھ اُس کے دھوئیں میں گم ہوگیا۔

لڑکی ابھی فیصلہ نہ کرپائی تھی کہ ان امیدواروں میں سے کسے اپنائے کہ ایک طرف سے بھاگتا ہوا ایک نوجوان آیا۔ میلے کھدر کا کُرتا پاجامہ پیوند لگا چپل جو دوڑنے میں بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ دو تین دن کی داڑھی بڑھی ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک پوری فوج دوڑتی ہوئی۔ اُن میں دھرم دیو، راجہ مان سنگھ شان سنگھ، سیٹھ کروڑی مل پکوڑی مل، دھرتی پتی کولاک، مسٹر دفتر شاہی افسر، کرانتی کاری پورکر، اور نیتا خاں بھارت سیوک انڈیا والا اور ان کے حالی موالی سب تھے اور سب چلا رہے تھے۔

"مارو — مارو۔"

"پکڑ لو ساتھیو بچنے نہ پائے۔"

"یہ چور ہے۔"

"یہ ڈاکو ہے۔"

"یہ گنڈا ہے۔"

"یہ موالی ہے"

"یہ چار سو بیس ہے۔"

"یہ ہندو ہے"

"یہ مسلمان ہے"

"یہ کرستان ہے۔"

"یہ انقلابی ہے۔"

"یہ کرانتی کاری ہے۔"

"یہ کرانتی کاری ورودھی ہے۔ انقلاب دشمن ہے"

دوڑتا دوڑتا، ہانپتا کانپتا نوجوان لڑکی کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

"لڑکی اب تم ہی مجھ کو بچا سکتی ہو۔"

لڑکی نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

نوجوان نے کہا۔ "میں نہ چور ہوں، نہ ڈاکو، نہ گنڈا، نہ موالی، نہ کرانتی کاری، نہ کرانتی ورودھی۔ میں ایک سیدھا سادا انسان ہوں جو آزادی اور انسانیت کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے اور جس کا پیچھا سب کر رہے ہیں۔ بھاگتے بھاگتے میں تھک چکا ہوں۔ مروں گا تو نہیں سخت جان ہوں لیکن مجھے لگتا ہے، انسانیت میں، آزادی کی خواہش ہمیشہ کے لیے کھو دوں گا۔"

"میری طرف دیکھو۔" لڑکی نے کہا۔ "مجھے پہچانتے ہو؟"

تھکے ہارے نوجوان نے لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا آہستہ آہستہ اُس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں ایک نئی چمک، اُمید کی ایک نئی لہر ابھر آئی۔ اس نے آہستہ سے سر ہلا کر کہا۔ "اب پہچان گیا۔"

اتنے میں جتنے لوگ نوجوان کا پیچھا کر رہے تھے وہ سب لڑکی کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے اور نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلانے لگے۔

"یہ چور ہے۔"

"یہ ڈاکو ہے"

"یہ گنڈا ہے۔"

"یہ موالی ہے"

"یہ چار سو بیس ہے"

"یہ ہندو ہے"

"یہ مسلمان ہے"

"یہ کرستان ہے"

"یہ انقلابی ہے۔"

"یہ کرانتی کاری ہے"

"یہ کرانتی ورودھی ہے۔ یہ انقلاب دشمن ہے۔"

اور اب لڑکی نے اُن سب کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جن میں شعلے بھڑک رہے تھے۔

نوجوان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے وہ بولی۔ "یہ میرا ہے اور میں اس کی ہوں۔ بے شک پچیس برس انتظار کرنے کے بعد میں اُسے مل گئی ہوں۔ اور یہ مجھے۔"

اور پھر اُن سب کی حیرت بھری آنکھوں کے سامنے لڑکی اور وہ نوجوان دونوں فضا میں تحلیل ہوگئے — اور پھر وہاں نہ دھرم دیو تھا نہ راجہ مان سنگھ شان سنگھ، نہ سیٹھ کروڑی مل پکوڑی مل، نہ دھرتی پتی کولاک، نہ مسٹر دفتر شاہی افسر، نہ کرانتی کاری پورکر، نہ نیتا خاں بھارت سیوک انڈیا والا، سب نہ جانے کہاں گم ہوگئے تھے۔ صرف برسات کی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور مشرق میں ایک دھندلا دھندلا سا سویرا گھنے کالے بادلوں کا دل چیرتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ یہ پندرہ اگست کی صبح تھی، یہ آزادی کا دھندلکا تھا۔

●●

شمیم کرہانی

جہانِ مساوات

نمِ صبا سے نہ جوشِ نمو سے ہے بیدار
چمن کی خاک ہمارے لہو سے ہے بیدار
لہو جو ورثۂ دل ہے عظیم ماضی کا
لہو جو موجِ نمو ہے، نخیلِ حق کے لئے
لہو جو کاتبِ تاریخ نوبہاراں ہے
لہو جو حرفِ ابد ہے ورق ورق کے لئے

اسی لہو کا تبسّم وہ طلعتِ سحری
جلوسِ دیدہ و دل جس کی رہگزار میں ہے
لجامِ نیّرِ دوراں ہے جس کے ہاتھوں میں
وہ شہسوارِ سحر، منزلِ بہار میں ہے
شریکِ جذبۂ منزل ہیں بے شمار قدم
ملا ہے جن کو تمنا کا عزمِ سیمابی
نویدِ قطعِ مسافت ہے کارواں کے لئے
دنوں کی کلفتِ غربت، شبوں کی بے خوابی

سفر کی راہ کوئی راہِ کہکشاں تو نہیں
قدم قدم پہ یہاں سنگِ راہ ملتے ہیں
مگر اسی رہِ ظلمت میں، پابرہنہ سہی
امیرِ قافلۂ مہر و ماہ ملتے ہیں
نوائے امن ہے بانگِ درائے اہلِ سفر
نہیں پسند تشدد کا لحنِ شور آمیز
وہ ایک حرفِ ملائم جسے وفا کہیے
صدائے تندِ جرس سے زیادہ ذوق انگیز

تمیزِ بندہ و آقا نہ فرقِ رنگ و نسب
یہ اک جہانِ مساوات ہے بشر کے لئے
رواں ہے قافلۂ نوبہارِ جمہوری
زمیں پہ ایک ابد آشنا سحر کے لئے

بشر نواز

کہانی اپنی

سوچ ندی ہے جو بہتی ہی چلی جاتی ہے۔
ثانیئے پل ہوں کہ روز و مہ و سال
خس و خاشاک ہوں یا پھول کہ پتھر سبھی بہہ جاتے ہیں
موجیں بڑھتی ہیں، بکھر جاتی ہیں
نقش بنتے ہیں، بگڑتے ہیں، مٹے جاتے ہیں
میرے ساحل پہ سکوں مجھ کو محال
میری دھرتی پہ نجس بوٹوں کے ڈالے ہوئے۔
- زخموں کے نشاں
میرے خوں، میرے پسینے سے کسی اور کے چہرے پہ دمک
مُہر ہونٹوں پہ زباں پر تالے
اک بیابانِ سکوت
جس میں فریادِ گناہ
اک سیہ رات جہاں
قتل ہوتی ہوئی شمعوں کی قطار
گولیاں، چیخ پکار
جیل کی کوٹھریاں، تختۂ دار
سوچ ندی ہے جو بہتی ہی چلی جاتی ہے
ایک کمزور، جواں عزم، دمکتا چہرہ
سوچتی آنکھیں — لنگوٹی، لاٹھی
ایک آواز — بڑی میٹھی، دکھی
دھیمے دھیمے سے بلاتی ہوئی اپنی جانب
ایک ہجوم
کتنے پُرعزم، جواں سال، دمکتے چہرے
اک محبت بھری میٹھی مسکان
شیروانی کے گریباں میں، مہکتا ہوا اک سرخ گلاب
کتنے پُرعزم دمکتے چہرے
کالے چشمے میں تڑپتی ہوئی بے چین آنکھیں
لاکھوں پُرعزم دمکتے چہرے
ایک بے تاب ہجوم
جیل، پابندیاں، بندی خانے

سوچ ندی ہے جو بہتی ہی چلی جاتی ہے۔
ایک ہنگامہ بپا ــــ رقص و سُرود
قہقہے، جشنِ چراغاں، خوشیاں
ہونٹوں سے، ہاتھوں سے، پیروں سے، مرے دل سے سبھی
ــــ قفل زنجیریں پگھل کر کہیں نابود ہوئیں
اب میں آزاد ہوں، آزاد مری فکر ــــ مگر
ایک پُرپیچ ڈگر
کھائیاں، سانپ، کنکر
راہ رو سارے پریشان سے ــــ لیکن رہبر
مطمئن یوں کہ سرِ راہِ جنوں
ایسے دو چار مقامات تو آنے ہی تھے۔
مطمئن راہ نما
کھائیوں، کنکروں، کانٹوں سے بچا تا سب کو
لہلہاتے ہوئے میدان میں لے ہی آیا
آنکھ کھلتی، نظر اٹھتی ہے، ہر گام پہ رک جاتی ہے
چار سو دل کی تمازت سے درخشاں چہرے
سیکڑوں خواب نگاہوں میں، دلوں میں ارماں
اک نیا جوش، نیا عزم جواں
سیکڑوں، لاکھوں، کروڑوں آنکھیں
ایک ہی منزلِ خوش رنگ کی تصویر لیے
سیکڑوں، لاکھوں، کروڑوں پاؤں
ایک ہی منزلِ ارماں کی طرف بڑھتے ہوئے
ہر قدم اپنے گزشتہ سے قوی ــــ اور قوی
جگمگاتے ہوئے بیس نشاں
ربع صدی
میری [ایک قوم کی] تاریخ میں اک پل کی طرح
پھر بھی یہ پل کئی یگ، سیکڑوں صدیوں سے گراں
اپنے دامن میں لیے
برق کے، پانی کے، فولاد کے کتنے ہی جہاں
اپنی آنکھوں میں لیے
کتنے ہی خواب، دھنک رنگ، حسیں اور جواں
خواب، فولاد سے، لوہے سے ڈھلے
خواب ایسے جو کڑکتی ہوئی بجلی میں پلے
خواب سرسبز لہکتے ہوئے کھیتوں میں، مہکتی ہوئی فصلوں کی طرح

آنکھ کھلتی ہے، نظر اٹھتی ہے، ہر گام پہ رک جاتی ہے
میرے خوابوں پہ گڑی، مجھ پہ گڑی
کچھ شرر بار، سلگتی آنکھیں
ان سے مجھ پر، میرے خوابوں پہ دہکتے ہوئے شعلوں کی، دھوئیں کی بارش
اور میں ــــ خواب مرے
آگ کے غسل سے کچھ اور نکھر آئے ہیں
خون اور آگ کی برسات میں اجسام کروڑوں اجسام
بن کے اک سنگی حصار
اپنے ہر خواب کو اک عمر نئی دیتے ہیں
سوچ ندی ہے جو بہتی ہی چلی جاتی ہے
مٹتی جاتی ہے زماں اور مکاں کی سرحد
دیکھتی ہیں میری آنکھیں یہ سہانا منظر
میرا ہر خواب مجسم ہے، کھلا پھول ہے دل
چاروں طرف
مسکراتے ہوئے چہرے ہیں کوئی فکر نہیں
گنگناتے ہوئے طیارے فلک پہ رقصاں
بھوری پتھریلی زمیں
دھانی مخمل کی ردا اوڑھے ہوئے
بالیاں ناج کی پہنے ہوئے پودے کچھ یوں
بوجھ سے اپنی جوانی کے جھکی جاتی ہو جس طرح حسینہ کوئی
شرح فولاد بدلتا ہوا شکلیں کیا کیا
قمقمے حدِ نظر تک روشن
کوہ و صحرا ہو کہ گلشن ہو کہ بازار کوئی
سب ہی پہنے ہوئے ان گنت دمکتے ہوئے ہیروں کی چمکتی مالا
رات کی زلفوں میں بکھری ہوئی افشاں جیسے
شہر معمور محبت سے ہنسی سے ایسے
جیسے امرت کا لبالب پیالہ
پیار کی جوت سے آنکھوں پہ ستاروں کا گماں
علم کے نور سے گلنار دمکتے چہرے
روح میں، دل میں کھلی چاندنی اپنے پن کی
سرحدیں ذہن میں ہیں اور نہ زمیں پر ہیں کہیں
جگمگاتی ہے ستارے کی طرح میری جبیں

ٹ پنج سالہ منصوبے ٹ سبز انقلاب

محمد حسن

اُردو تنقید کے پچیس سال

اردو تنقید نے پچھلے پچیس سال میں کئی روپ بدلے اگر آسانی کے لئے اس دور کے میلانات کا تعین کیا جائے تو تین رنگ صاف دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ پرانی طرز کے نقاد تھے جو فصاحت اور ادبیت کے معیاروں کو تقابلی تنقید کے پیمانوں میں ناپتے تولتے تھے۔ ان کا زور بیان اکثر الفاظ کی صحت استعمال اور زبان اور اسلوب کی نزاکتوں پر صرف ہوتا تھا۔ جن میں جعفر علی خاں اثر سے لے کر اختر تلہری تک سبھی طرح کے لوگ تھے۔ دوسرا رنگ ان نقادوں کا تھا جو تاثراتی تنقید کے سہارے مختلف شاعروں کے مزاج کی جستجو اور ان کے شاعرانہ رنگ و آہنگ کی نشان دہی کر رہے تھے۔ ان کا زور محض لفظی گرفت پر نہ تھا۔ بلکہ شعریت کے نت نئے روپ کو پہچاننے پر تھا۔ ان میں سب سے پہلا نام شاید نیاز فتحپوری کا ہے جن کی تصنیف "انتقادیات" ہی نہیں ان کے "نگار" کے مختلف مخصوص شمارے بھی ان کے اس تنقیدی رنگ کے نمائندہ ہیں۔ تیسرا گروہ ان نقادوں کا تھا جو مغربی تنقید کے مختلف اصول و ضوابط سے فائدہ اٹھا کر اردو کے تخلیقی سرمایہ کو اسی معیار پر رکھنا چاہتے تھے۔

مغربی تنقید خود ایک اکائی نہ تھی اس لئے اس کے مختلف رنگوں نے مختلف میلانات پیدا کئے مثلاً کلیم الدین احمد نے ایف آر لیوس کے طرز کو اپنایا اور اعلیٰ شاعری کی ایک عالمگیر کسوٹی فرض کر کے اس پر اردو شاعری اور تنقید دونوں کے سرمایے کو پرکھ ڈالا یا پھر وہ نقاد تھے جنھوں نے مغربی اصول سے روشنی اور بصیرت تو لی مگر اسے اپنے طور پر اردو شاعری کے مزاج کے مطابق برتنے کی کوشش کی۔ ان کے اندر فکری استدلال کی اتنی مضبوط گرفت نہ تھی لیکن آفاقی ادب کے معیاروں کی آگہی ضرور تھی۔ ان میں آل احمد سرور سے کر عبادت بریلوی تک سبھی درجے کے نقاد آتے ہیں پھر وہ گروہ تھا جسے آسانی کے لئے ترقی پسند نقادوں کے نام سے یاد کیا گیا بلا شبہ ۱۹۳۶ء میں باقاعدہ طور پر ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہو چکی تھی اور اس کی فلسفہ طرازی کا عکس پریم چند کے خطبۂ صدارت میں موجود تھا لیکن ترقی پسند تنقید نے پیچیدہ راستوں سے گزری۔ پہلے اسے متشدد اور مبتذل جنھوں نے ترقی پسندی کا ایک تنگ اور ناقص تصور سامنے رکھا اختر رائے پوری اور احمد علی کے بعض ابتدائی مضامین اسی ترقی پسندی کی افراط و تفریط کے سلسلے میں پیش کئے جاتے ہیں جبکہ وہ خود ترقی پسندی سے تائب ہو چکے ہیں پھر مجنوں گورکھپوری کے مضامین "ادب اور زندگی" سے ترقی پسند تنقید کو احترام حاصل ہوا۔ گو مجنوں بھی تاثراتی اور عمرانی تنقید کے درمیان بھٹکتے رہے (اور شاید اب تک بھٹک رہے ہیں) پھر احتشام حسین کے تنقیدی مضامین نے ترقی پسندی کا ایک بالغ نظر تصور رائج کیا۔ پہلی بار اردو ادب کی تنقید میں نہ صرف خیالات تصورات اور اقدار سے بحث کی جانے لگی بلکہ ان خیالات، تصورات اور اقدار کی تخلیق کرنے والے سماجی اور تہذیبی عوامل کی بھی تلاش کی جانے لگی اور تنقید محض حالی کی سماجی اصلاح کے تصور سے وابستہ نہ رہی بلکہ اس کا رشتہ دانش عصر اور حبیت سے ملا دیا گیا۔

۱۹۴۷ء کے لگ بھگ یہ چاروں دھارے مختلف رنگ ڈھنگ سے بہہ رہے تھے۔ ان کے علاوہ اسی زمانہ میں تاثراتی تنقید کے بعد اہم لکھنے والوں نے نسبتاً زیادہ سنجیدگی سے تنقید کی طرف رخ کیا تھا رشید احمد صدیقی اور فراق گورکھپوری، فراق شاعر ہیں اور بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں اس لحاظ سے انھوں نے تنقید کو شعری کیفیت کی بازآفرینی بنا دیا اور ان کے تنقیدی بھاگے غزل کے مصرعوں کا سا ارتباط رکھتے ہیں یعنی وہ کسی تخلیق سے جو بھی حظ پاتے ہیں اس کو کسی قدر جمالیاتی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے ذوق ادب کی جڑیں کلاسیکی طرز و اسلوب میں پیوست ہیں اس لئے ان کا انداز بیان ذاتی اور داخلی ہوتے ہوئے بھی ان کے معیار کلاسیکی ہیں اور اقدار تہذیبی وراثت کی جڑوں میں پیوست اسی دور میں محمد حسن عسکری اور میراجی نے تنقید کی طرف توجہ کی۔ میراجی کی تنقید زیادہ تر عملی اور تشریحی تھی۔ محمد حسن عسکری کی نظریاتی مگر دونوں فرانسیسی انحطاط پسندوں سے متاثر تھے۔ دونوں نے احساس کی بالادستی کو تسلیم کیا اور شعور کے مقابلے میں احساس کی آزادروی کو اہمیت دی۔ ان کے مقابلے میں ممتاز حسین نے مارکسی تنقید کو نئی معنویت دے دی۔ اور ماحول کو اردو ادب کے سیاق و سباق میں زیادہ اہمیت دی۔

کم و بیش یہی چند نام ہیں جو دس بارہ سال تک اردو تنقید کی دنیا میں بار بار سامنے آتے رہے یہاں نام گنوانا مقصود نہیں بلکہ تنقیدی انداز نظر کی مختلف شکلوں کی نشان دہی مقصود ہے۔ اس ضمن میں شاید ان موضوعات اور مسائل کا جا

مناسب ہوگا۔ جہاں اشارہ میں نہیں پہنچ آئے ہیں اور جن پر یا ادبی معرکے ہوئے جنہیں ارباب نظر نے خاص کے درمیان امتیاز حاصل ہوا۔

جن تنقیدی معرکوں کا ذکر یہاں آتا ہے ان میں احتشام حسین اور اختر تلہری کا معرکہ تقاضے بڑی حد تک لفظی نزاع کہا جاسکتا ہے بحث یہ تھی کہ حالی کے مصرعے "حال پیشوں کا مغلوں کرے" میں مغل سے مراد مشہور فارسی شاعر مغل ہی ہے یا پیرمغ ... بہرحال اس سے اس دور کے تنقیدی مزاج کا اندازہ بھی کسی حد تک لگایا جاسکتا ہے۔ یہ نزاع لفظی موشگافیوں سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ جبکہ وہ نزاع سے جو ممتاز حسین کے مضمون "کچھ ادب العالیہ کے متعلق" پر ان میں اور سید محمد مہدی میں چھڑا۔ بحث کا مسئلہ یہ تھا کہ عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کے ہندوستانی سماج کی اقتصادی بنیاد کا تجزیہ اور اس دور کے طبقوں کا تعین ممتاز حسین نے ٹھیک کیا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں تصوف کے طبقاتی کردار کا تجزیہ کس حد تک درست ہے۔ اس بحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادبی نقاد اس بات کو تسلیم کر کے آگے گفتگو کرتے ہیں کہ تہذیبی تصورات کا اصل سرچشمہ خارجی حالات اور خصوصاً اقتصادی ڈھانچہ اور اس کے طبقاتی اجزا ہوتے ہیں۔ ادبی تنقید تصورات کے سماجی اور تہذیبی رشتوں پر زور دینے لگی تھی۔ ویسے یہ اعتراف ضروری ہے کہ شاید ممتاز حسین اس دور کے ترقی پسند نقادوں میں تنہا نقاد ہیں جنہوں نے جمالیات، ہئیت اور اسلوب کے مختلف پہلوؤں پر ہئیت پرست نقادوں سے بھی زیادہ بحث کی ہے۔ تیسرا ادبی معرکہ حسن عسکری اور ممتاز حسین کے درمیان ہوا تھا۔ موضوع بحث تھا حسن عسکری کا مقالہ "آدمی اور انسان"۔ بظاہر بحث کا انداز فلسفیانہ سا تھا۔ آدمی اور انسان کے درمیان جبلت اور تہذیب کی جو تہیں حائل ہیں ان کی توجیہ اور تعبیر میں اختلاف تھا۔ مگر اس بحث کا ادب سے بھی نہایت گہرا رشتہ تھا حسن عسکری اور نئے ادب کے وہ علمبردار جو ترقی پسند ادب کے دائرے سے الگ ہوکر اب شعور پر لاشعور کو انسانی جبلت کے نام پر ترجیح دے رہے تھے جس سے ادب کے منصب، اس کے معیار و اقدار کے بارے میں نئے تصورات ابھرتے تھے۔ الفاظ اور معنی کے نئے رشتے تلاش کرنے پر زور دیا جارہا تھا، اور ترسیل اور ابلاغ کا سوال بڑی اہمیت اختیار کرنے لگا تھا۔

ادبی مناقشوں کے علاوہ جو تند وتلخ بحثیں مدت تک رسالوں کے صفحات کی زینت بنی رہیں وہ صحیح اور تعمیری ادب میں جمود اور غزل کا مستقبل تھیں۔ یہاں اعتراف کر لینے میں مضائقہ نہیں کہ اکثر و بیشتر ہماری تنقید شعری تنقید رہی ہے۔ زیادہ تر تنقید نگاروں نے شاعری کے مسائل سے بحث کی ہے اور نثر سے بڑی حد تک لاپرواہی برتی ہے اس سے ہمارے ادبی اور تہذیبی مزاج کی غمازی بھی ہوتی ہے۔ نثر زیادہ مرتب اور منطقی دور سے قریب تر ذہنوں کا وسیلہ اظہار ہے۔ اس میں جذباتیت زیریں لہر کی طرح ہوتی ہے طوفانی نہیں ہوسکتی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ہماری تنقید منطقی استدلال کی قطعیت اور ایجاز کے فن سے عام طور پر پہلوتہی کرتی رہی ہے۔ مرتب اور منطقی استدلال جذبات سے کسی قدر آزادی اور غیر ضروری آرائش سے نجات چاہتا ہے۔ اور ہمارے تنقیدی اسلوب اور طرز فکر دونوں پر ان کا غلبہ رہا ہے۔ جس تنقیدی مضمون میں شاعرانہ طرز کے آراستہ فقرے نہ ہوں وہ پھیکی اور غیر دلچسپ سا لگتا ہے اور اچھے خاصے پڑھے لکھے قاری بھی اس پر بے نمکی کا الزام دھرتے ہیں۔

سنہ ۱۹۵۰ء سے سنہ ۱۹۶۰ء تک اردو کے تنقیدی سرمایے میں ایک اور جہت بھی نمودار ہوئی، وہ تھی ماضی کے ادبی سرمایہ کی تنقیدی بازیافت کی کوشش۔ ترقی پسند تنقید نے اپنے طور پر نظیر اکبرآبادی کی بازیافت کی تھی نئے ادب کے غیر ترقی پسند حامیوں نے اپنے طور پر میر کے طرز کی بازیافت کی کوشش کی۔ پیروی میر مدتوں تک عام رہی اور اس انداز اور اس محاورے میں شعر کہنا فیشن بن گیا۔ لیکن ماضی کی بازیافت کے سلسلے میں اہم کام تھا خواجہ احمد فاروقی کی کتاب "میر حیات اور شاعری" جس کی اغلاط کی نشان دہی قاضی عبدالودود نے کی۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس کتاب نے ماضی کو دوبارہ پرکھنے اور ذمہ دارانہ سنجیدگی سے اور نئی تنقیدی نظر اور تاریخی شعور کے ساتھ پرکھنے کی روایت پیدا کی۔ اس کے علاوہ اس کوشش کا ایک قابل قدر پہلو یہ تھا کہ اس کی مدد سے خصوصاً قاضی عبدالودود کی سخت نکتہ چینی کے بعد، تحقیقی مواد اور تنقیدی نتائج کے درمیان نیا ربط قائم ہوا۔ اب تک تحقیق اور تنقید گویا دو الگ الگ کوچے تھے جن کے راستے کہیں ملتے نہ تھے۔ لیکن اب ایک ایسی تنقید بھی وجود میں آنے لگی جس کی بنیاد تحقیق پر تھی۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی "روح اقبال" سنہ ۱۹۴۲ء سے قبل چھپ چکی تھی۔ "اردو غزل" اور حسرت کی شاعری کے بعد چھپی۔ اردو غزل میں کلیم الدین احمد کے نظریہ غزل کے برخلاف غزل کی شعری تہذیب کے اجزا دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو عہد جدید میں پہلی کوشش تھی۔ لیکن یوسف حسین خاں روح اقبال کو پیچھے نہ چھوڑ سکے جیسی کہ غالب" اور آہنگ غالب" میں بھی وہ معلوم حقائق کی نئی ترتیب اور ان سے استنباط نتائج تک اپنے کو محدود رکھتے ہیں۔ اسلوب احمد انصاری نے اسی زمانہ میں لکھنا شروع کیا اور کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر احسن فاروقی اور محمد حسن عسکری کی طرح رجحان کی طرح انگریزی کے پروفیسر ہیں یا رہے ہیں، بے تکلفی کو اپنا شعار نہیں بنایا اور مغربی معیار و اقدار پر سنجیدگی سے اردو کے علمی اور ادبی ذخیرے کو پرکھنے کی کوشش کی۔ یہ کوششیں کسی نئے تنقیدی نظریہ کا نقطہ آغاز نہ تھیں بلکہ ڈاکٹر احسن فاروقی، یوسف حسین خاں اور اسلوب احمد انصاری تینوں کے ہاں تجزیے سے زیادہ جائزے کا سا انداز ہے۔

• اس دور کے تنقیدی سرمایے کا لب ولہجہ ترقی پسند تنقید نے متعین کیا۔ پچھلے دس برس میں ترقی پسندی کی تمام اصطلاحات سے وحشت عام ہوگئی ہے

اور نئی نسل کے سبب سے لکھنے والے ترقی پسند تنقید کو کسی قسم کی ادبی اہمیت دینے سے منکر ہیں جواز یہ ہے کہ ترقی پسند تنقید چونکہ ادب اور شعر کی جمالیات سے زیادہ تصورات سے بحث کرتی تھی اور تصورات کو خارج کا تابع ماننے کی وجہ سے تہذیبی اور اقتصادی پس منظر پر زور دیتی تھی، اور نئی نسل کے بعض ادیبوں کے نزدیک یہ سب امور ادبی تنقید کے دائرے سے خارج ہیں، اس لئے ترقی پسند تنقید ادبی تنقید ہی نہیں تھی۔ اس نے سماجیات کا مطالعہ تو کیا لیکن ادبیات کو فراموش کر دیا۔

اس اعتراض کے باوجود ترقی پسند تنقید کی ادبی خدمات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ بلاشبہ تنقید کا رنگ و آہنگ بھی ہر دور کے ذوقِ ادب کے ساتھ بدلتا ہے اور کوئی طرزِ تنقید بھی جامع نہیں کہا جا سکتا کمزوریاں ہر طرز میں ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ترقی پسند تنقید نے پہلی بار تنقید کا رشتہ اوّل تو علم و دانش اور سماجی آگہی سے وابستہ کر دیا اور دوسرے ادبی تصورات کو محض اچانک حادثے قرار دینے کی بجائے انھیں سماجی اور اقتصادی اور دوسرے عناصر کا منطقی نتیجہ قرار دیا۔ دراصل ترقی پسند تنقید پر زیادہ تر اعتراضات ترقی پسندی کو مارکس ازم کے مترادف نہ سمجھنے سے پیدا ہوتے ہیں جو مارکسی ہیں ان کا اعتراض یہ ہے کہ ترقی پسند تنقید نے صحیح مارکسی بصیرت کا ثبوت نہیں دیا۔ (مثلاً ہنس راز رہبر کی کتاب "ترقی پسند تحریک کا تنقیدی جائزہ" میں یہی نقطۂ نظر ہے)، جو ترقی پسندی کا مارکس ازم سے وسیع تر مفہوم مراد لیتے ہیں ان کو شکایت ہے کہ ترقی پسندوں نے ارکسیت یا اشتراکی سیاست کو اتنی اہمیت دی کہ ترقی پسندی کا وسیع تر تصور مجروح ہو گیا۔ ان مباحث سے یہاں گفتگو ضروری نہیں البتہ ترقی پسند تنقید کے ذریعے ہی اردو ادب میں سائنٹفک اور معروضی تنقید کا رواج ہوا۔

ترقی پسندی تنقید میں سب سے بڑا اور اہم نام احتشام حسین کا ہے۔ انھوں نے سنجیدگی سے ادب کے محاکمے کے لئے کسی معروضی اور سائنٹفک معیار کی تلاش کی۔ ان کے نزدیک یہ معیار سماجی اہمیت پر مبنی ہوگا، کیونکہ فنکار اور اس کے مخاطبین کے درمیان ایک مشترکہ سماجی معنویت کا رشتہ لازمی ہے۔ یہ رشتہ عام طور پر مشترکہ تجربات، حقیقتوں سے پیدا ہوتا ہے اور یہ حقیقتیں بڑی حد تک کسی دور کے اقتصادی ڈھانچے اور سماجی نظام پر منحصر ہوتی ہیں جو اقدار اور ترجیحات کی تشکیل کرتی ہیں۔ ان حقیقتوں کی بنا پر ہی یہ رنگ برنگے عنا... کر بنتی ہیں اور شخصیت اور سماج کے مختلف پہلو مل کر انھیں بناتے ہیں۔ اس نظریے کا سب سے واضح عکس احتشام حسین کے مضمون "غالب کا تفکر" میں نظر آتا ہے۔ احتشام حسین کی تنقیدی نظر عہد آفریں ثابت ہوئی پچھلے پچیس سال میں شاید ہی کسی دوسرے نقاد نے اردو تنقید کو ان سے زیادہ متاثر کیا ہو۔

ترقی پسند تنقید کی بڑی کمزوری یہ تھی کہ ایک تو وہ خود اپنے مطالبات کو پورا نہیں کر سکی اور سماجی تاریخ کے جن عوامل و محرکات کا مطالعہ اس کے نزدیک ادب کی تفہیم کے لئے ضروری تھا اسے وہ فراہم نہ کر پائی۔ دوسرے ادب پاروں کے جمالیاتی پہلو کی طرف مناسب توجہ نہ کی۔

اسی بنا پر ایسی تنقیدیں زیادہ کامیاب ہوئیں جن میں یا تو تاثراتی طرزِ تنقید کو ترقی پسندانہ تجزیہ کے ساتھ ملا کر پیش کیا گیا تھا یا ان میں کچھ مطالعۂ ادب کی آگہی اور کچھ انشائیہ رنگ دونوں کو سمو دیا گیا تھا۔ پہلی شکل خورشید الاسلام کے مجموعے "تنقیدیں" اور "غالب" میں ہے اور دوسرے کو متاثر کرنے والی مثال آل احمد سرور کی تنقیدوں میں موجود ہے۔

آل احمد سرور کے تنقیدی نقطۂ نظر میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی وہ ایف آر لیوس کے انداز سے متاثر تھے، حسن کے انداز نظر میں انھوں نے رشید احمد صدیقی کے اسلوب کی چاشنی شامل کر کے اسے شاعرانہ نثر اپنی تنقیدی بصیرت کا آئینہ دار بنا دیا۔ پھر ایک مدت تک وہ مارکسیت اور ترقی پسندی دونوں سے قریب رہے اور پچھلے دس سال سے اد... سے جدیدیت کے ادب کا رنگ ان کی تنقیدوں میں جھلکنے لگا ہے۔

اس دور میں علی سردار جعفری نے تنقید کی طرف توجہ کی۔ سردار جعفری اس سے قبل بھی اکا دکا تنقیدی مضامین لکھتے رہے ہیں لیکن اسی زمانہ میں ان کی کتاب "ترقی پسند ادب" شائع ہوئی جو ان کی پہلی باقاعدہ تنقیدی تصنیف ہے۔ بعد ازاں دیوان غالب، دیوان میر اور کبیر بانی پر ان کے مبسوط دیباچے "پیغمبران سخن" کی شکل میں یک جا شائع ہوئے۔ سردار جعفری نے ان شاعروں کو ان کے دور کے پس منظر میں رکھ کر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ سردار جعفری شاعری کے کلیدی تصورات تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور پھر ان کلیدی تصورات کے تاریخی اور سماجی محرکات تلاش کرتے ہیں۔ البتہ "ترقی پسند ادب" سے "پیغمبران سخن" تک ان کے تنقیدی نظریات میں تبدیلی کے آثار جا بجا نمایاں ہیں۔ طبقہ واری کشمکش اور عمرانی تجزیے سے زیادہ اب وہ تصوریت کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔

اسی زمانہ میں ایک اور طرزِ تنقید بھی نمایاں ہوا جس میں تاریخی اور سماجی عوامل سے قطع نظر کر کے لفظیات اور ان الفاظ سے بنتی ہوئی تصویروں پر زور دیا گیا۔ اس طرزِ فکر کے نقادوں نے بار بار اس خیال کا اظہار کیا کہ ادب کا سماج یا سماجی تصورات سے اس نہج کا نہیں ہے جس پر ترقی پسند تنقید زور دیتی رہی ہے یعنی تنقید کا یہ کام نہ تو بنیادی طور پر ان تصورات سے بحث کرنا ہے جو کسی شاعر یا کسی دور کی تخلیقات میں ابھرتے ہیں کیونکہ یہ کام تو ماہرینِ عمرانیات کے دائرۂ عمل میں آتا ہے۔ اور نہ اس قسم کے تصورات کے سماجی محرکات تلاش کرنے سے اس کا کوئی تعلق ہے، بلکہ ادب کا مطالعہ ان تقاضوں سے ماورا محض جمالیاتی سطح پر کیا جانا چاہئے۔

اس قسم کے تنقید نگاروں میں دو گروہ نمایاں ہیں ایک تو وہ لوگ

جو متن کے مطالعے پر زور دیتے ہیں اور اس کا لسانیاتی تجزیہ کرتے ہیں یا اس کے مختلف اجزا کے درمیان صوتی یا معنوی ربط تلاش کرتے ہیں۔ اکثر ان مضامین میں نقشوں اور گوشواروں کے ذریعے آواز یا تصاویر کے تواتر اور تطابق کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ دوسرا گروہ ان نقادوں کا ہے جو اکثر عملی تنقید یا تشریحی تنقید پر زور دیتے ہیں۔

اس دور کے لکھنے والوں میں ایسے شاعروں کی بھی کمی نہیں جنہوں نے تنقید کی طرف توجہ کی۔ ان میں باقر مہدی، خلیل الرحمن اعظمی اور وحید اختر شامل ہیں۔ ان کے مضامین میں ان کے اپنے فنی معتقدات اور معیار کی روشنی میں مختلف ادبی موضوعات، ادبی تحریکات اور شخصیات کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے مضامین نے مذاقِ عصر کی آبیاری میں مدد دی ہے۔

سید محمد عقیل نے اس دور میں عصری ادب کے مسائل پر سیر حاصل مقالے لکھے ہیں۔ ان مسائل پر ان کی آرا سے اختلاف ممکن ہے۔ مگر جس کاوش اور جس سنجیدگی کے ساتھ انہوں نے ان مسائل کو پورے پس منظر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے وہ یقیناً لائقِ ستائش ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے ادبی مضامین کے مجموعے بھی اسی زمانے میں چھپے۔ ان مضامین میں قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایسی مشترکہ اقدار کی تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جنہیں اعلیٰ ادب کی پہچان قرار دیا جا سکے۔

اس چوتھائی صدی میں قدیم کلاسیکی ادب کی تدوین، بازیافت اور تنقید کا کام بھی کافی ہوا ہے۔ تدوین اور بازیافت کے کام کا تذکرہ تو متنی تنقید کے ضمن میں آتا ہے لیکن قدیم سرمایہ کی تنقید بالتبع ادبی تنقید کا حصہ ہے اور اس ضمن میں تاریخ ادب کی ترتیب بھی آتی ہے۔ اس دور میں علی گڑھ تاریخ ادب کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ بلا شبہ اس میں تحقیقی اور تنقیدی فروگذاشتیں بھی اور کثرت سے تھیں لیکن اس کے باوجود اس کی اپنی تاریخی اہمیت ہے۔ متعلقہ دور کے متعلق معلومات یکجا ہو گئیں اور اس قسم کے کام کی دشواریوں کا اندازہ ہوا۔ لسانیاتی مقدمہ اور تاریخی پس منظر والے ابواب اہم ہیں، گجرات میں اردو اور مہراج العاشقین اور عادل شاہی دور کی ادبی تخلیقات پر اس تالیف سے نئی روشنی پڑتی ہے۔ اسی زمانے میں پروفیسر مسعود حسن رضوی کی معرکۃ الآرا تصنیف "اردو اسٹیج اور ڈراما" شائع ہوئی۔ جس نے اردو اسٹیج کی تاریخ کو بہت آگے بڑھا دیا۔ ڈاکٹر عبد العلیم نامی کی " اردو تھیٹر" طبع ہوئی۔ مسیح الزماں کی کتابیں "اردو مرثیے کا ارتقا" اور "اردو تنقید کی تاریخ" شائع ہوئیں جو ادبی اور تنقیدی تاریخ میں سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔ گیان چند جین کی "شمالی ہند میں اردو مثنویاں" اور سید محمد عقیل کی "اردو مثنوی کا ارتقا" چھپیں۔ پھر غالب صدی کے آس پاس غالب پر متعدد تنقیدی تصانیف شائع ہوئیں جن میں اسلوب احمد انصاری کی "نقشِ غالب" اور "غالب کا فن" اور رشید احمد صدیقی کی "غالب شخصیت اور شاعری" اور یوسف حسین خاں کی "غالب" اور "آہنگ غالب" اور نثار احمد فاروقی کی "تلاشِ غالب" نہایت اہم ہیں۔

اگر پچھلے پچیس سال کے تنقیدی سرمایہ کا محاکمہ کیا جائے تو چند باتیں سامنے آئیں گی۔ بلا شبہ ان پچیس برس میں اردو تنقید میں زیادہ بالغ نظری پیدا ہوئی ہے۔ اس کا مقابلہ اس سے پہلے کے پچیس سال سے کیا جائے تو ہمارا تنقیدی سرمایہ پچھلی چوتھائی صدی میں بہت آگے بڑھا ہے۔ اب نہ اس میں مغرب کے نظریوں اور رفتاروں سے چکا چوند ہو جانے کی کمزوری ہے نہ اپنی اعلیٰ ادبی روایات سے بے خبری کا انداز۔ عام طور پر اس کا اندازِ نظر اور اسلوبِ بیان پہلے سے بہت کچھ سنبھلا ہوا ہے۔ ہر چند کہ یہ دور کوئی حالی یا شبلی پیدا نہیں کر سکا لیکن مجموعی طور پر اس دور کا کارنامہ اپنے پیش رو ادوار کے مقابلے میں قابلِ لحاظ ہے۔

اس دور میں انتخابیت (Eclecticism) کا رواج دوسرے تمام میلانات سے زیادہ ہوا ہے۔ اس میں کچھ تو ہمارے قومی مزاج اور کردار کو دخل ہے۔ کچھ ہماری علمی نارسائی کو، ہم جو کچھ دوسرے علوم و فنون میں اپنی گوں کا پاتے ہیں لے لیتے ہیں، اسی لئے بیک وقت ہمارے نقادوں کی تحریروں میں مختلف مکاتیبِ فکر کی پرچھائیاں ملتی ہیں اور کبھی کبھی ان میں منطقی ربط یا باہمی (Consistency) نہیں ہوتی۔ وہ ذہنی ڈسپلن اور حیاتی تربیت ہمارے نقادوں میں کم ہے جس سے تنقید میں اعلیٰ سنجیدگی پیدا ہوتی ہے۔

جہاں تک عام میلانات کا سوال ہے اس دور میں چار اہم میلانات کی نشاندہی ممکن ہے۔ پہلا میلان عمرانی تنقید کا ہے جس میں فنی تخلیقات کے کلیدی تصورات کا تعین اور ان کے سماجی محرکات اور اثرات سے بحث کی جاتی ہے۔ دوسرا میلان تشریحی یا جمالیاتی تنقید کا ہے جس میں سارا زور متن پر ہوتا ہے اور اسی کے اندرونی اجزا اور عناصر اور ان کے درمیانی رشتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ تیسرا رجحان فلسفیانہ تنقید کا ہے جس کو ابھی عالمِ طفولیت میں سمجھنا چاہیے۔ مگر اس قسم کی تنقیدوں میں ایک طرف تو ادب میں ظاہر ہونے والے بعض اہم تصورات کا ذکر، فن کے دوسرے شعبوں سے رشتے استوار کر کے مطالعہ کیا جاتا ہے اور فرد اور روحِ عصر دونوں کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چوتھا رجحان مکتبی یا "مدرسی" تنقید کا ہے جس میں سارا زور ادیب کی خصوصیات کو سمجھنے سمجھانے میں صرف ہوتا ہے اور اس کی ادبی اہمیت کو مختلف ذریعوں سے واضح کیا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ابھی تک رسالے ہمارے تنقید کے لب و لہجہ اور مقبولیت پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ایک اور قسم کی تنقید بھی نمایاں ہوئی ہے جسے مکتوبی تنقید یا مراسلاتی تنقید کہا جا سکتا ہے۔ اس کا درجہ ہنوز رائے زنی سے بلند نہیں اور اس کے نمونے تقریباً ہر ادبی رسالے کے آخری

(باقی صفحہ ۳۳ پر)

ن کے موضوع پر اچھی نظمیں لکھی تھیں۔ ۱۹۴۸ء میں مہاتما گاندھی کی شہادت کے بعد شعراء نے فسطائی جنگی قوتوں کے خلاف جو طاقتور جذباتی محرک فراہم کیا تھا۔ اس کے زیر اثر بھی کئی اچھی نظمیں لکھی گئی تھیں، مجاز، شمیم کرہانی، علی جواد زیدی، ساحر، احمد سرور اس ذیل میں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ امن کے موضوع پر لکھی گئی نظمیں ایک طرح سے ہم اپنے ان ذاتی تجربات کی عالمگیر پیمانے پر توسیع کہہ سکتے ہیں جو ہمیں فسادات اور گاندھی جی کی شہادت کی صورت میں حاصل ہوئے تھے۔ مگر چند نظموں کو چھوڑ کر بیشتر نظمیں سیاسی اور تہذیبی منشوروں یا نعروں سے آگے نہیں بڑھ سکیں۔ ایک ہی موضوع پر جب مختلف شعراء طبع آزمائی کریں تو یہ خطرہ رہتا ہے کہ ان میں نہ صرف خیالات کی تکرار ہو بلکہ ان کے طرز بیان، تمثالات، استعارات اور علامات میں بھی یکسانیت آجائے۔ امن کا موضوع جب ترقی پسند شاعری کا تمغۂ امتیاز بن گیا تو اس موضوع کا بھی یہی حال ہوا۔

دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریاں اپنے جلو میں ایک بڑی خوش آئند تبدیلی بھی لائیں۔ یہ ایشیا اور افریقہ کے صدیوں سے غلام ممالک میں آزادی بیداری کی وہ طاقتور لہر تھی جس نے تھوڑے ہی عرصے میں سامراجیت کے حلقۂ اثر ان دونوں براعظموں میں بہت محدود کر دیا۔ آزادی کے بعد ہمارے ملک نے جو خارجہ پالیسی اختیار کی اس کا بنیادی ستون ناوابستگی تھی۔ لیکن اس ناوابستگی کے پیچھے دنیا کے نوآزاد ناوابستہ ملکوں کے اتحاد اور سالمیت کی تحریک بھی کام کر رہی تھی جس کے سب سے بڑے معمار جواہر لال نہرو تھے۔ ہمارے ملک کی آزادی کے دو برس بعد دنیا کے سب سے بڑے ملک چین کی آزادی اور وہاں کمیونسٹ حکومت کا قیام اس صدی کا بہت ہی اہم اور انقلاب آفریں واقعہ تھا جس کا خیر مقدم ایک طرف تو ہمارے سیاسی اکابرین نے کیا، دوسری طرف شعراء نے نظموں میں چین کے انقلاب کا اسی طرح خیر مقدم کیا جس طرح اس سے قبل روس کے انقلاب کو اقبال نے خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ ۱۹۶۲ء کے بدبختانہ چینی حملے سے قبل ہند چینی دوستی ایشیا افریقہ کے نوآزاد ممالک کے لئے طاقت کا سرچشمہ سمجھی جاتی تھی۔ چین کے بعد ایشیا اور افریقہ کے کئی ممالک آزاد ہوتے چلے گئے جن میں ایک اور اہم واقعہ مصر کی شاہی سے آزادی اور سویز کو قومیانے کا اعلان تھا۔ الجیریا اور کانگو کی جدوجہد، لومبا کا قتل، کوریا کی جنگ، ویٹ نام کے مجاہدین کا ناقابلِ شکست عزمِ آزادی، یہ تمام واقعات ایسے ہیں جو ہماری شاعری کا موضوع بنتے رہے ہیں۔ سردار جعفری کی نظم "ایشیا جاگ اٹھا" ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے لیکن یہ نظم اس وقت لکھی گئی جب آزادی کی لہر اٹھنی شروع ہوئی تھی۔ اپنے نقطۂ عروج پر نہیں پہنچی تھی۔ نیاز حیدر کی "جمالِ مصر ناصر" کی شخصیت اور مصر کی تعمیر نو پر خالص سیاسی قسم کی نظم ہے جس کی شاعرانہ قیمت زیادہ نہیں۔ پاکستان کے جواں مرگ شاعر احمد ریاض کی ایک نظم چین پر اہمیت رکھتی ہے۔ غلام ربانی تاباں نے اس قسم کی نظموں کا ایک انتخاب "شکستِ زنداں" کے نام سے چھٹے دہے میں شائع کیا تھا جس پر جوش کی تنقید نظم کی صورت میں شاید کتاب سے زیادہ مشہور ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اس کتاب میں جوش خود شامل ہیں اور ان کی تنقید دوسرے شعراء کے ساتھ خود ان کی اپنی ہنگامی سیاسی نظموں پر اتنی ہی صادق آتی ہے۔

اس نظم کو بین الاقوامیت سے اقبال نے جس سطح پر روشناس کیا تھا وہ ایسی بلند تر تخلیقی سطح تھی کہ ہماری نظم تمام عالمی اور بین الاقوامی سیاسی تحریکوں سے وابستگی، افریشیائی اتحاد و سالمیت کی کانفرنسوں اور مقصد کے باوجود تخلیقی لحاظ سے اب تک اس سطح پر نہیں آسکی۔ اس ناکامی کا سبب ہمیں تخلیق اور نظریے کے باہمی تعلق میں دریافت کرنا چاہئے۔ تخلیق کا عمل ایک پیچیدہ ہوتا ہے کہ بظاہر متضاد و متناقض عناصرِ خیال بھی اس کی بھٹی سے گزر کر معقول مرکب ہو جاتے ہیں، اور اگر اس عمل میں ایک آنچ کی بھی کسر رہ جائے تو تمام خلوصِ نیت اور صدقِ دلی کے باوجود شاعر اپنے نظریے کو شعر بنانے میں ناکام رہتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی دین اردو ادب کو اتنی زیادہ ہے کہ اس سے انکار کفرانِ بصارت و بصیرت ہے۔ اس تحریک نے ہمارے ادب کو روایتی مضامین، فرسودہ پامال موضوعات، بندھے ٹکے جذباتی ردعمل، رومانی طرزِ احساس کی سطحیت، عشق کے سادہ و سہل الحصول تجربات کی پستی سے اٹھا کر اسے حقیقت پسندی کی زمین پر کھڑا کیا۔ ادب کی زبان کو stereotype بننے سے بچایا، نظم کا نیا محاورہ ڈھالا، ہیئت کے نئے تجربے کئے، متنوع اسالیبِ بیان کی جستجو کی۔ عام زندگی کے واقعات، سیاسی سماجی تہذیبی اور کبھی کبھی فلسفیانہ نوعیت کے مسائل کو نظم کی زبان میں ادا کئے جانے کا گر سکھایا۔ جہاں داخلی اور خارجی عناصر میں مکمل تخلیقی امتزاج ممکن ہو سکا وہاں خارجی تجربات کو داخلی تجربے کی زبان میں بات کرنے کے قابل بنایا۔ اس اجتماعی شعور کو عام کیا جو ادب کو تفریحِ طبع کے درجے سے بلند کر کے ایک اعلیٰ تر سماجی وظیفہ بناتا ہے۔ جس زمانہ میں ترقی پسند تحریک کو فروغ ہوا، حالات ان باتوں کے متقاضی تھے۔ ہمارے ادب میں جو زوال کے آثار جو تصنع جو مردنی پیدا ہو چلی تھی، وہ کسی بیرونی طاقتور محرک کا خود مطالبہ کر رہی تھی۔ یہ کام ترقی پسند تحریک نے کیا۔ اس نے ہمارے ادیبوں شاعروں کے ذہنی افق کو وسیع کیا۔ انہیں ہم عصر فکری سیاسی عالمی تحریکوں سے آگاہ کیا۔ ادب میں انھیں برتنا سکھایا۔ ترقی پسند تحریک سے قبل رومانیت کے نام سے ہمارے یہاں جس سطحیت کو مقبولیت حاصل ہو رہی تھی اس کے پیر زمین پر تھے نہ سر آسمان پر، وہ فضا میں معلق تھی۔ اس کے تمام تصورات خلائی تھے اور عشق کا تصور افلاطونی۔ انقلاب بھی ایک رومانی خواب تھا اور حبِ وطن اور آزادی بھی رومانی آدرش۔ سماجی اصلاح، مغربی تعلیم، ترکِ پردہ، مغربی فیشنوں کی تقلید، ماضی سے رومانی وابستگی ایک دوسرے سے ایسے خلط ملط تھے کہ کوئی تصور

بھی واضح نہ تھا۔ دراصل ان رومانی شاعروں اور ادیبوں کے سامنے معاشرت اور سماج کا کوئی واضح تصور نہ تھا۔ ترقی پسندی نے رومانیت سے فائدہ اٹھایا مگر اسے واضح سماجی تصور بھی دیا۔ رومانیت کے خمار کا خمیازہ ایک حد تک پوری ترقی پسندی کی تحریک کو بھی کھینچنا پڑا۔ ترقی پسندوں نے انقلاب کا مارکسی اور اشتراکی تصور تو کتابوں میں پڑھ لیا، مگر شاعری میں انہوں نے جو تصور پیش کیا وہ رومانی تصور ہی تھا۔ مجاز کی مشہور نظم "آوارہ" اور ان کی دوسری نظمیں، فیض، مخدوم محی الدین، سردار جعفری، اور کیفی کی ابتدائی نظمیں سب پر جوش کی رومانیت اور بعضوں پر تو اختر شیرانیت تک کا گہرا اثر ملتا ہے۔ خود جوش برسوں شاعرِ انقلاب سمجھے جاتے رہے، انقلابی عمل کے عوامل اور اس کے عواقب و نتائج سے ناآگاہ رہے۔ ان کے لئے انقلاب بھی ایک باغیانہ نعرہ تھا جس کے پیچھے ان کی رومانی سرکشی کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ بعد کے ترقی پسند شعراء جن کا مارکسزم کا مطالعہ کہیں زیادہ وسیع تھا اور جنہیں سیاسی تربیت حاصل کرنے کا موقع بھی ملا تھا، اپنے انقلاب کے تصور میں جوش سے کچھ زیادہ آگے نہ جا سکے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ترقی پسند ادبی نظریے اور تنقید نے سیاسی سماجی حالات و عوامل پر گہرا طور پر زور دیا لیکن یہ فرض کر لیا کہ سماجی اثر خالص خارجی اثر ہے جو شاعر پر بیرونی طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سماجی ماحول اور اس کے تقاضے، نظریے اور اس کے اثرات تخلیقی عمل میں اتنے خارجی نوعیت کے حامل نہیں رہتے جتنے داخلی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ذوق، غالب اور مومن کا سماجی ماحول بظاہر ایک ہی تھا مگر ان کی شخصیتوں نے اپنے تخلیقی عمل میں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں اور بصیرت کے لحاظ سے اس کا جو اثر اور جتنا اثر قبول کیا وہ ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ اس طرح بظاہر ایک ہوتے ہوئے بھی تینوں میں سے ہر ایک کا خارجی ماحول مختلف ہو جاتا ہے۔ خارجی ماحول اسی حد تک حقیقت ہے جس حد تک وہ شخصی تجربے اور تخلیقی عمل، شاعرانہ بصیرت اور اس کے اظہار کا حصہ بنتا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کے منشور، سیاسی نعرے یا اوپر سے عائد کئے ہوئے نظریات چونکہ شاعر کی شخصیت اور اس کے داخلی تجربے کا جز نہیں بن سکتے اس لئے ان کا اظہار بھی تخلیقی عمل میں نہیں ہو پاتا۔ ترقی پسندوں میں سے بیشتر شعراء ایسے تھے جنہوں نے ترقی پسندی کو مروجہ فیشن سمجھ کر سستی شہرت کا آسان ترین وسیلہ سمجھ کر اپنا تو لیا مگر وہ اس کے نظریات سے پوری طرح ہم آہنگ نہ ہو سکے اس لئے ان کی تخلیقی کاوشیں ناپختہ رہ گئیں اور وہ اپنے مقصد سے بھی انصاف نہ کر سکے۔ آزادی کے بعد کے حالات اور ادب کے بدلتے ہوئے میلانات میں جن ترقی پسند شعراء نے اپنی تخلیقی زندگی کا ثبوت دیا ہے۔ مخدوم، فیض، سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی اور ایک حد تک کیفی اعظمی ہیں۔ یہ وہی شاعر ہیں جن کی شخصیت تخلیقی عمل اور نظریات میں ایک حد تک ہم آہنگی تھی، دوسرے بہت سے شعراء یا تو ترقی پسند نظریے سے عدم مطابقت کی وجہ سے ختم ہو گئے یا اگر انہیں نظریے سے پوری طرح ہم آہنگی تھی تو ان کے تخلیقی سرچشمے ہی اتنے محدود تھے کہ وہ زیادہ دنوں تک بنجر زمینوں کو سیراب نہیں کر سکتے تھے۔

۱۹۴۷ء کے آس پاس ادب پر سیاسی نظریے کی گرفت اور آمریت کے خطرناک اثرات کا احساس نئی نسل میں پیدا ہونے لگا تھا۔ اس وقت جو لکھنے والے ابھر رہے تھے۔ ان کی اکثریت نے ترقی پسند مصنفین کے آغوشِ تربیت ہی میں ادبی شعور کی آنکھیں کھولی تھیں۔

انہوں نے امن کے موضوع پر بھی نظمیں کہیں، سیاسی مسائل پر بھی لیکن انہوں نے آزادی کی جدوجہد میں عملی طور پر حصہ نہیں لیا تھا۔ ان کی عمریں کم تھیں جو کالج یا اسکول میں آزادی کے طلوع کے وقت تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انھیں شہرت کے لئے آزادی کی جدوجہد کا پلیٹ فارم بھی میسر نہ آیا۔ انھیں اپنے فن کے لئے ریاض کرنا پڑا۔ ان کے اور پرانی نسل کے ذہنی رویوں میں ایک نسل کا فرق تھا۔ آزادی کے بعد اپنے ماضی کی دریافت اور اس سے اپنی وابستگی کو مستحکم کرنے کا جو میلان عام سیاست میں پروان چڑھ رہا تھا ادب میں اس نے کلاسیکی روایت کے مطالعے اور اس سے اکتسابِ فیض کے میلان کو تقویت دی۔ آزادی کے ساتھ تقسیم اور فسادات کے واقعات نے جو بے یقینی کے حالات پیدا کئے تھے، انہوں نے بعد کے حالات سے شکستِ عقائد و اقتدار کے ساتھ عام بے یقینی و تشکیک کی فضا پیدا کی۔ آزادی کی لڑائی جن بلند بانگ دعووں اور جن اعلیٰ آدرشوں کے نام پر لڑی گئی تھی کچھ تو تقسیم اور فسادات کے ہاتھوں پامال ہو چکے تھے اور کچھ اپنے نام لیواؤں کے عمل سے رسوا ہوئے۔ آزادی کے فوری بعد کے حالات اتنے امید افزا بھی نہیں تھے کہ نئی نسل کے تمام خواب اور توقعات آسودہ ہو جاتے۔ اس بے اطمینانی، ناآسودگی اور شکستِ امید نے تشکیک کو جنم دیا۔ اس تشکیک کو ہوا دینے والے بین الاقوامی حالات بھی تھے۔ کئی نسلوں سے تعلیم یافتہ نوجوان خصوصاً دانشور اور فنکار مذہب اور اخلاق کے پرانے اقدار سے رشتہ توڑ کر اپنا ناتا اشتراکی آدرشوں سے جوڑ چکے تھے۔ اسٹالن کی موت کے بعد اسٹالن کے بت کی شکست، پھر ہنگری اور پولینڈ کے واقعات اور اس کے بعد اشتراکی کیمپ میں روس اور چین کے درمیان آہستہ آہستہ طاقت اور قیادت کے لئے بڑھتی ہوئی کشاکش نے اس عقیدے کو بھی متزلزل کیا۔ یہاں بھی شک کی پرچھائیاں لرزنے لگیں تو احساس ہوا کہ ہمارے ماضی قریب کا ادب جن خوابوں پر تعمیر ہو رہا تھا وہ سب کے سب سچے نہ تھے۔ یہ احساس بھی ہوا کہ وہ ادب جو دیتے ہوئے نعروں اور سیاسی منشوروں کے تحت لکھا جاتا ہے۔ بہت جلد اپنی قدر و قیمت کھو دیتا ہے۔ اس مرحلہ پر ترقی پسند ادب کا از سر نو جائزہ لیا جانے لگا۔ اس جائزے اور نئے میلانات کے تعین کی کوشش میں بعض

امن کے موضوع پر اچھی نظمیں لکھی گئیں۔ ۱۹۴۸ء میں مہاتما گاندھی کی شہادت کے المناک حادثے نے جنگ کی قوتوں کے خلاف جو طاقتور جذباتی محرک فراہم کیا تھا۔ اس کے زیرِ اثر بھی کئی اچھی نظمیں لکھی گئی تھیں، مجاز، شمیم کرہانی، علی جواد زیدی، احمد سرور اس ذیل میں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، امن کے موضوع پر لکھی گئی نظموں کو ایک طرح سے ہم اپنے ان ذاتی تجربات کی عالمگیر پیمانے پر توسیع کہہ سکتے ہیں جو ہمیں فسادات اور گاندھی جی کی شہادت کی صورت میں حاصل ہوئے تھے۔ مگر چند نظموں کو چھوڑ کر بیشتر نظمیں سیاسی اور تہذیبی منشوروں یا قدروں سے آگے نہیں بڑھ سکیں۔ ایک ہی موضوع پر جب مختلف شعراء طبع آزمائی کریں تو یہ خطرہ رہتا ہے کہ ان میں نہ صرف خیالات کی تکرار رہے بلکہ ان کے طرزِ بیان، تمثالات، استعارات اور علامات میں بھی یکسانیت آجاتی ہے۔ امن کا موضوع جب ترقی پسند شاعری کا تمغۂ امتیاز بن گیا تو اس موضوع کا بھی یہی حال ہوا۔

دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریاں اپنے جلو میں ایک بڑی خوش آئند تبدیلی بھی لائیں۔ یہ ایشیا اور افریقہ کے صدیوں سے غلام ممالک میں آزادی بیداری کی وہ طاقتور لہر تھی جس نے تھوڑے ہی عرصے میں سامراجیت کے حلقۂ اثر کو ان دونوں براعظموں میں بہت محدود کر دیا۔ آزادی کے بعد ہمارے ملک نے جو خارجہ پالیسی اختیار کی اس کا بنیادی ستون ناوابستگی تھی۔ لیکن اس ناوابستگی کے پیچھے دنیا کے نوآزاد ناوابستہ ملکوں کے اتحاد اور سالمیت کی تحریک بھی کام کر رہی تھی جس کے سب سے بڑے معمار جواہر لال نہرو تھے۔ ہمارے ملک کی آزادی کے دو برس بعد دنیا کے سب سے بڑے ملک چین کی آزادی اور وہاں کمیونسٹ حکومت کا قیام اس صدی کا بہت ہی اہم اور انقلاب آفریں واقعہ تھا جس کا خیر مقدم ایک طرف تو ہمارے سیاسی اکابرین نے کیا، دوسری طرف شعراء نے نظموں میں چین کے انقلاب کا اسی طرح خیر مقدم کیا جس طرح اس سے قبل روس کے انقلاب کو اقبال نے خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ ۱۹۶۲ء کے بدبختانہ چینی حملے سے قبل ہند چینی دوستی ایشیا افریقہ کے نوآزاد ممالک کے لئے طاقت کا سرچشمہ سمجھی جاتی تھی۔ چین کے بعد ایشیا اور افریقہ کے کئی ممالک آزاد ہوتے چلے گئے جن میں ایک اور اہم واقعہ مصر کی شاہی سے آزادی اور سوئز کو قومیانے کا اعلان تھا۔ الجیریا اور کانگو کی جد و جہد، لومومبا کا قتل، کوریا کی جنگ، ویٹ نام کے مجاہدین کا ناقابلِ شکست عزمِ آزادی، یہ تمام واقعات ایسے ہیں جو ہماری شاعری کا موضوع بنتے رہے ہیں۔ سردار جعفری کی نظم "ایشیا جاگ اٹھا" ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے لیکن یہ نظم اس وقت لکھی گئی جب آزادی کی لہر اٹھنی شروع ہوئی تھی، اپنے نقطۂ عروج پر نہیں پہنچی تھی۔ نیاز حیدر کی "جمالِ مصر ناصر" کی شخصیت اور مصر کی تعمیرِ نو پر خالص سیاسی قسم کی نظم ہے جس کی شاعرانہ قیمت زیادہ نہیں۔ پاکستان کے جواں مرگ شاعر احمد ریاض کی ایک نظم چین پر اہمیت رکھتی ہے۔ غلام ربانی تاباں نے اس قسم کی نظموں کا ایک انتخاب "شکستِ زنداں" کے نام سے چھوٹے دیے میں شائع کیا تھا۔ جس پر [illegible] کی صورت میں شاید کتاب سے زیادہ مشہور ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اس کتاب میں جوش خود شامل ہیں اور ان کی تنقید دوسرے شعراء کے ساتھ خود ان کی اپنی ہنگامی سیاسی نظموں پر اتنی ہی صادق آتی ہے۔

اس نظم کو بین الاقوامیت سے اقبال نے جس سطح پر روشناس کیا تھا وہ ایسی بلند تر تخلیقی سطح تھی کہ ہماری نظم تمام عالمی اور بین الاقوامی سیاسی تحریکوں سے وابستگی، افرو ایشیائی اتحاد و سالمیت کی کانفرنسوں اور [illegible] تخلیقی لحاظ سے اب تک اس سطح پر نہیں آسکی۔ اس ناکامی کا سبب [illegible] نظریے کے باہمی تعلق میں دریافت کرنا چاہئے۔ تخلیق کا عمل عجیب و غریب ہوتا ہے کہ بظاہر متضاد و متناقض عناصرِ خیال بھی اس کی بھٹی سے گزر کر [illegible] مرکب ہو جاتے ہیں، اور اگر اس عمل میں ایک آنچ کی بھی کسر رہ جائے تو تمام خلوصِ نیت اور صدقِ دلی کے باوجود شاعر اپنے نظریے کو شعر بنانے میں ناکام رہتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی دین اردو ادب کو اتنی زیادہ ہے کہ اس سے انکار کفرانِ بصارت و بصیرت ہے، اس تحریک نے ہمارے ادب کو روایتی مضامین، فرسودہ پامال موضوعات، بندھے ٹکے جذباتی رویوں، رومانی طرزِ احساس کی سطحیت، عشق کے سادہ و سہل الحصول تجربات کی پستی سے اٹھا کر حقیقت پسندی کی زمین پر کھڑا کیا۔ ادب کی زبان کو stereotype ہونے سے بچایا، نظم کا نیا محاورہ ڈھالا، ہیئت کے نئے تجربے کئے، متنوع اسالیبِ بیان کی جستجو کی۔ عام زندگی کے واقعات، سیاسی سماجی تہذیبی اور کبھی کبھی فلسفیانہ نوعیت کے مسائل کو نظم کی زبان میں ادا کئے جانے کا گر سکھایا۔ جہاں داخلی اور خارجی عناصر میں مکمل تخلیقی امتزاج ممکن ہو سکا وہاں خارجی تجربات کو داخلی تجربے کی زبان میں بات کرنے کے قابل بنایا۔ اس اجتماعی شعور کو عام کیا جو ادب کو تفریحِ طبع کے درجے سے بلند کر کے ایک اعلیٰ تر سماجی وظیفہ بناتا ہے۔ جس زمانہ میں ترقی پسند تحریک کو فروغ ہوا، حالات ان باتوں کے متقاضی تھے۔ ہمارے ادب میں جو زوال کے آثار، جو تصنع، جو مردنی پیدا ہو چلی تھی، وہ کسی بیرونی طاقتور محرک کا خود مطالبہ کر رہی تھی۔ یہ کام ترقی پسند تحریک نے کیا۔ اس نے ہمارے ادیبوں شاعروں کے ذہنی افق کو وسیع کیا۔ انہیں ہم عصر فکری سیاسی عالمی تحریکوں سے آگاہ کیا۔ ادب میں انہیں برتنا سکھایا۔ ترقی پسند تحریک سے قبل رومانیت کے نام سے ہمارے یہاں جس سطحیت کو مقبولیت حاصل ہو رہی تھی اس کے پیر زمین پر تھے نہ سر آسمان پر، وہ فضا میں معلق تھی۔ اس کے تمام تصورات خلائی تھے اور عشق کا تصور افلاطونی۔ انقلاب بھی ایک رومانی خواب تھا اور حبِ وطن اور آزادی بھی رومانی آدرش، سماجی اصلاح، مغربی تعلیم، ترکِ پردہ، مغربی فیشنوں کی تقلید، ماضی سے رومانی وابستگی ایک دوسرے سے ایسے خلط ملط تھے کہ کوئی تصور

بھی واضح نہ تھا۔ دراصل ہمارے رومانی شاعروں اور ادیبوں کے سامنے معاشرت اور سماج کا کوئی واضح تصور نہ تھا۔ ترقی پسندی نے رومانیت سے فائدہ اٹھایا مگر اسے واضح سماجی تصور بھی دیا۔ رومانیت کے خمار کا خمیازہ ایک حد تک پوری ترقی پسندی کی تحریک کو بھی کھینچنا پڑا۔ ترقی پسندوں نے انقلاب کا مارکسی اور اشتراکی تصور تو کتابوں میں پڑھ لیا، مگر شاعری میں انہوں نے جو تصور پیش کیا وہ رومانی تصور ہی تھا۔ مجاز کی مشہور نظم "آوارہ" اور ان کی دوسری نظمیں، فیض، مخدوم محی الدین، سردار جعفری، اور کیفی کی ابتدائی نظمیں سب پر جوش کی رومانیت اور بعضوں پر تو اختر شیرانی تک کا گہرا اثر ملتا ہے۔ خود جوش برسوں شاعرِ انقلاب سمجھے جاتے رہے، انقلابی عمل کے عوامل اور اس کے عواقب و نتائج سے ناآگاہ رہے۔ اُن کے لئے انقلاب بھی ایک باغیانہ نعرہ تھا جس کے پیچھے اُن کی رومانی سرکشی کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ بعد کے ترقی پسند شعرا جن کا مارکسزم کا مطالعہ کہیں زیادہ وسیع تھا اور جنہیں سیاسی تربیت حاصل کرنے کا موقع بھی ملا تھا، اپنے انقلاب کے تصور میں جوش سے کچھ زیادہ آگے نہ جا سکے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ترقی پسند ادبی نظریے اور تنقید نے سیاسی سماجی حالات و عوامل پر تو بجا طور پر زور دیا لیکن یہ فرض کر لیا کہ سماجی اثر خالص خارجی اثر ہے جو شاعر پر بیرونی طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سماجی ماحول اور اس کے تقاضے، نظریے اور اس کے اثرات تخلیقی عمل میں اتنے خارجی نوعیت کے حامل نہیں رہتے جتنے داخلی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ذوق، غالب اور مومن کا سماجی ماحول بظاہر ایک ہی تھا مگر ان کی شخصیتوں نے اپنے تخلیقی عمل میں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں اور بصیرت کے لحاظ سے اس کا جو اثر اور جتنا اثر قبول کیا وہ ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ اس طرح بظاہر ایک ہوتے ہوئے بھی تینوں میں سے ہر ایک کا خارجی ماحول مختلف ہو جاتا ہے۔ خارجی ماحول اسی حد تک حقیقت ہے جس حد تک وہ شخصی تجربے اور تخلیقی عمل، شاعرانہ بصیرت اور اس کے اظہار کا حصہ بنتا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کے منشور، سیاسی نعرے یا اوپر سے عائد کئے ہوئے نظریات چونکہ شاعر کی شخصیت اور اس کے داخلی تجربے کا جز نہیں بن سکتے اس لئے ان کا اظہار بھی تخلیقی عمل میں نہیں ہو پاتا۔ ترقی پسندوں میں سے بیشتر شعرا ایسے تھے جنہوں نے ترقی پسندی کو مروجہ فیشن سمجھ کر سستی شہرت کا آسان ترین وسیلہ سمجھ کر اپنا تو لیا مگر وہ اس کے نظریات سے پوری طرح ہم آہنگ نہ ہو سکے اس لئے ان کی تخلیقی کاوشیں ناپختہ رہ گئیں اور وہ اپنے مقصد سے بھی انصاف نہ کر سکے۔ آزادی کے بعد کے حالات اور ادب کے بدلتے ہوئے میلانات میں جن ترقی پسند شعرا نے اپنی تخلیقی زندگی کا پے در پے ثبوت دیا ہے۔ مخدوم، فیض، سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی اور ایک حد تک کیفی اعظمی ہیں۔ یہ وہی شاعر ہیں جن کی شخصیت تخلیقی عمل اور نظریات میں ایک حد تک ہم آہنگی تھی، دوسرے بہت سے شعرا یا تو ترقی پسند نظریے سے عدم مطابقت کی وجہ سے ختم ہو گئے یا اگر انہیں نظریے سے پوری طرح ہم آہنگی تھی تو ان کے تخلیقی سرچشمے ہی اتنے محدود تھے کہ وہ زیادہ دنوں تک بنجر زمینوں کو سیراب نہیں کر سکتے تھے۔

۱۹۵۵ء کے آس پاس ادب پر سیاسی نظریے کی گرفت اور آمریت کے خطرناک اثرات کا احساس نئی نسل میں پیدا ہونے لگا تھا۔ اس وقت جو لکھنے والے ابھر رہے تھے۔ ان کی اکثریت نے ترقی پسند مصنفین کے آغوشِ تربیت ہی میں ادبی شعور کی آنکھیں کھولی تھیں۔

انہوں نے امن کے موضوع پر بھی نظمیں لکھیں، سیاسی مسائل پر بھی لیکن انہوں نے آزادی کی جدوجہد میں عملی طور پر حصہ نہیں لیا تھا۔ ان کی عمریں کم تھیں وہ کالج یا اسکول میں آزادی کے طلوع کے وقت تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انھیں شہرت کے لئے آزادی کی جدوجہد کا پلیٹ فارم بھی میسر نہ آیا۔ انھیں اپنے فن کے لئے ریاض کرنا پڑا۔ ان کے اور پرانی نسل کے ذہنی رویوں میں ایک نسل کا فرق تھا۔ آزادی کے بعد اپنے ماضی کی دریافت اور اس سے اپنی وابستگی کو مستحکم کرنے کا جو میلان عام سیاست میں پروان چڑھ رہا تھا ادب میں اس نے کلاسیکی روایت کے مطالعے اور اس سے اکتسابِ فیض کے میلان کو تقویت دی۔ آزادی کے ساتھ تقسیم اور فسادات کے واقعات نے جو بے یقینی کے حالات پیدا کئے تھے، انہوں نے بعد کے حالات سے شکستِ عقائد و اقدار کے ساتھ عام بے یقینی و تشکیک کی فضا پیدا کی۔ آزادی کی لڑائی جن بلند بانگ دعووں اور جن اعلیٰ آدرشوں کے نام پر لڑی گئی تھی کچھ تو تقسیم اور فسادات کے ہاتھوں پامال ہوئے، ان میں اور کچھ اپنے نام لیواؤں کے عمل سے رسوا ہوئے۔ آزادی کے فوری بعد کے حالات اتنے امید افزا بھی نہیں تھے کہ نئی نسل کے تمام خواب اور توقعات آسودہ ہو جاتے۔ اس بے اطمینانی، ناآسودگی اور شکستِ امید نے تشکیک کو جنم دیا۔ اس تشکیک کو ہوا دینے والے بین الاقوامی حالات بھی تھے۔ کئی نسلوں سے تعلیم یافتہ نوجوان خصوصاً دانشور اور فنکار مذہب اور اخلاق کے پرانے اقدار سے رشتہ توڑ کر اپنا ناتا اشتراکی آدرشوں سے جوڑ چکے تھے۔ اسٹالن کی موت کے بعد اسٹالن کے بت کی شکست، پھر ہنگری اور پولینڈ کے واقعات اور اس کے بعد اشتراکی کیمپ میں روس اور چین کے درمیان آہستہ آہستہ طاقت اور قیادت کے لئے بڑھتی ہوئی کشاکش نے اس عقیدے کو بھی متزلزل کیا۔ یہاں بھی شک کی پرچھائیاں لرزنے لگیں تو احساس ہوا کہ ہمارے ماضی قریب کا ادب جن خوابوں پر تعمیر ہوتا رہا تھا، وہ سب کے سب سچے نہ تھے۔ یہ احساس بھی ہوا کہ وہ ادب جو دیئے ہوئے نعروں اور سیاسی منشوروں کے تحت لکھا جاتا ہے۔ بہت جلد اپنی قدر و قیمت کھو دیتا ہے۔ اس مرحلہ پر ترقی پسند ادب کا از سرِ نو جائزہ لیا جانے لگا۔ اس جائزے اور نئے میلانات کے تعین کی کوشش میں بعض

اہم نظریاتی بحثیں چھڑیں۔ جدید اردو ادب و شعر کا نقطہ آغاز تھا۔

۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان جو نظم گو شعرا ابھرے ان کے نام یہ ہیں:

خلیل الرحمن اعظمی، پرکاش کومل، قاضی سلیم، وہاب جعفری، شفیق فاطمہ شعریٰ، محمود ایاز، عزیز قیسی، زبیر رضوی، مظہر امام، مغنی تبسم، شاذ تمکنت، مخمور سعیدی، راج نرائن راز، باقر مہدی، ساجدہ زیدی، حمید الماس، عمیق حنفی، راشد آذر، عزیز تمنائی، حکیم یوسف حسین خاں، بشر نواز، انور معظم، راہی معصوم رضا۔

ان شعرا کے ساتھ پچھلے دور کے جن شاعروں کو خصوصیت سے اہمیت ملی [illegible] اختر الایمان اور [illegible] الرحمن اہم ہیں۔ ترقی پسندوں کے علاوہ اور جو شعرا [illegible] لکھتے رہے ان میں خورشید الاسلام، سلام مچھلی شہری، کمال احمد صدیقی، منظر سلیم، رفعت سروش، سکندر علی وجد قابل ذکر ہیں۔ آزادی کے بعد شہرت پانے والوں میں جگن ناتھ آزاد اور عرش ملسیانی بھی خصوصیت کے حامل ہیں عمر کے لحاظ سے ان کا شمار پچھلی نسل میں ہونا چاہیے لیکن انھیں شہرت آزادی اور فسادات کے بعد کے برسوں میں خاص طور پر آزاد [illegible] کی نظموں کی جذباتی اپیل کی وجہ سے ملی۔ اس زمانے میں بعض بزرگ شعرا بھی لکھتے رہے اور ان میں سے کچھ پر خاص توجہ کی گئی جو اس سے پہلے نہ ہوئی تھی۔ مثلاً جمیل مظہری اور آنند نرائن ملا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد بھی ترقی پسند رسائل نکلتے رہے لیکن آہستہ آہستہ ان میں لکھنے والوں کی تعداد کم ہوتی گئی اور انجمن کی تنظیم کے بگڑنے اور ٹوٹنے کے ساتھ ان کا حلقۂ اثر بھی بہت کم ہو گیا۔ ۱۹۶۰ء تک ادبی رسائل کے صفحات پر جدید نظم گو شعرا کی اکثریت کا غلبہ ہو گیا جن کا طرز بیان ہی نہیں طرز فکر و احساس، زبان اور محاورہ، علائم و استعارات بڑی حد تک ترقی پسند شاعری سے مختلف تھے۔ انحراف ایک طرف تو غیر شعوری طور پر آہستہ آہستہ موضوع کے داخلی تقاضے کے تحت رونما ہوا، دوسری طرف جب ترقی پسندی سے بغاوت کی لے بہت اونچی ہو گئی تو شعوری انحراف پر زور دیا جانے لگا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد شاعروں نے اس انحراف کو تمام کلاسیکی روایت سے انحراف اور بعض صورتوں میں انقطاع کا نام دے کر من مانے ہیئتی اور لسانی تجربوں کے لئے بھی جواز نکال لیا۔ پہلا انحراف صحت مند اور حالات کے تقاضوں پر مبنی تھا تو دوسرا انحراف اپنی انفرادیت کو منوانے کی انتہا پسندانہ کوشش جس نے ماضی کے یکسر انکار ہی میں اپنا اثبات دیکھا۔

۱۹۶۰ء اور اس کے بعد جدید نظم میں انتہا پسندانہ رجحانات کو فروغ ہوا۔ اس زمانہ میں پاکستان کے چند رسائل نصرت، سویرا، سات رنگ نے جدید شاعری میں نئے تجربوں کو فروغ دیا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد کئی اہم نظم گو ہندوستانی شعرا بھی انھی پاکستانی رسائل کے توسط سے ادب کی دنیا میں روشناس ہوئے۔ ان میں سے کچھ شاعر ایسے بھی تھے جو پہلے سے نظمیں لکھ رہے تھے مگر انھیں شہرت ۱۹۶۰ء کے بعد ملی، جیسے مظہر امام۔ اس دور کے شعرا کی فہرست طویل ہے: بمل کرشن اشک، شہریار، محمد علوی، عادل منصوری، کمار پاشی، [illegible] شمس الرحمن فاروقی، صادق، مصحف اقبال توصیفی، زاہدہ زیدی، حسن کمال، علیم اللہ حالی، ظہیر صدیقی، عتیق اللہ، وہاب دانش، فضل تابش، [illegible] مجیب، مظفر حنفی، بشیر بدر، عارف آفتاب، شمیم حنفی، منظور عقیل، تاج محمد، خورشید علی اصغر، علی ظہیر، فاروق نازکی، قیصر قلندر، شعیب، صلاح [illegible] پرویز، شعیب شمس، احمد شمیم، علی حسن فرخ، رؤف خلش، بانی، [illegible] اعجاز عبید، احتشام اختر، فضل المتین، ممتاز راشد، عقیل شاداب، [illegible] اسلم عمادی، کرامت علی کرامت، غیاث صدیقی، علی الدین [illegible]۔

ان میں وہ بھی ہیں جنھوں نے پچھلے دس بارہ سال میں اپنا انفرادی [illegible] بنائی ہے۔ وہ بھی ہیں جو اپنا کوئی رنگ نہیں بنا سکے، ایسے بھی ہیں جنھوں نے [illegible] دو دو چار چار نظمیں لکھی ہیں اس لئے ان کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہو گا۔ اور ایسے بھی ہیں جن کی اٹھان امید افزا تھی مگر بعد میں ان سے وابستہ توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ مجھے یقین ہے کہ اتنی طویل فہرست میں بھی کئی نام یقیناً چھوٹ گئے ہوں گے۔

پچیس برس کی اردو نظم کے اس مختصر سے جائزے میں ہر اہم شاعر کے الگ الگ رنگ کا احاطہ اور اس کی انفرادیت کی قدر و قیمت کا تعین ممکن نہیں یہ کام ایک حد تک میں اس سے قبل اپنے مضمون "اردو نظم آزادی کے بعد" مطبوعہ شب خون ۱۹۶۷ء میں کر چکا ہوں۔ اس لئے بھی ہمارے پیش نظر یہ بہتر ہو گا کہ پچھلے پچیس برس میں نظم کے جو قابل ذکر تجربات و میلانات سامنے آئے ہیں ان کے جائزے تک اس مضمون کو محدود رکھا جائے اور چند ایسے مسائل کی طرف اشارہ کیا جائے جو نظم کی تنقید اور نظم پر جدیدیت کی مختلف تعبیروں کے اطلاق سے پیدا ہوئے ہیں۔

پچھلے دو دہوں میں نظم میں جو بنیادی تبدیلی آئی اس میں سب سے نمایاں لہجے کی تبدیلی ہے۔ بلند آہنگ خطیبانہ لہجے کی جگہ خود کلامی اور اپنے آپ میں گمشدہ افسردگی کے لہجے نے لی۔ اس لہجے پر راشد، فیض، اختر الایمان، منیب الرحمن، مختار صدیقی اور اس قبیل کے دوسرے شاعروں کے لہجے کا اثر بھی پڑا۔ مذکورہ بالا شعرا ترقی پسندی کے دور سے تعلق رکھتے ہیں، مگر ان کا لہجہ نمایاں طور پر اپنے دور کی سیاسی سماجی شاعری کے بیانیہ وضاحتی انداز سے مختلف تھا یہی وجہ ہے کہ راشد، فیض، اختر الایمان اور مختار صدیقی کو انتہا پسندی کے دور میں ان کی داخلیت اور ایک حد تک یاسیت آمیز طرز احساس کی وجہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ مخدوم کی ابتدائی نظموں میں جوش اور اختر شیرانی کی رومانیت کے ساتھ داخلیت کا یہ افسردہ لہجہ بھی کہیں کہیں جھلک اٹھتا تھا مگر بعد میں ان کی نظریاتی بے لچکی نے ان کے لہجے سے یہ آنچ چھین لی تھی، پھر بھی [illegible] کی

نئی دہلی

اپنی نظموں میں داخلی تجربے کی آواز اُس وقت بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ نئی نسل کے شعرا مزاج کے لحاظ سے اِن شاعروں سے قریب تھے۔ اس لئے ایک طرح سے انہوں نے اِن شاعروں کی صحیح معنی میں بازیافت کی اور انھیں اُن کا صحیح مقام دلوانے میں اپنی شاعری سے نمایاں رول بھی ادا کیا۔ اختر الایمان کو اہمیت آزادی کے بعد کے برسوں ہی میں ملی۔ اس سے قبل اُن کی کچھ نظموں کو بعض ناقدین نے سراہا ضرور تھا۔ مگر انھیں ترقی پسند مقبول شاعروں کے مقابلے میں ملک گیر مقبولیت حاصل نہ ہوئی تھی جس کے وہ بعد کے برسوں میں بجا طور پر مستحق قرار پائے۔ راولپنڈی سازش کیس کی اسیری کے دوران فیض کا "دستِ صبا" ایک سوغات کی طرح پاکستان سے ہندوستان آیا۔ اس مجموعے کی نظموں اور غزلوں میں نقشِ فریادی کا فیض زیادہ پختہ رس ہو کر سامنے آیا تھا۔ کلاسیکی لہجے اور اسالیب سے کسبِ نور کی یہ کامیاب کوشش تھی۔ فیض نے اس سمت میں بھی رہنمائی کی کہ پُرانے علائم و استعارات کی کس طرح نئے معانی کے ساتھ توسیع کی جا سکتی تھی۔ فیض نے خصوصیت سے مصحفی کی ملسیت اور سودا کے لہجے کے نشاط آمیز بانکپن سے جس طرح کام لیا تھا وہ جدید عہد کی آواز کے تقاضے کے عین مطابق تھا۔ فیض کے یہاں ہمیشہ سے گہری اور ارفع قسم کی رومانیت کی جو لہر تھی وہ کلاسیکی اسلوب کا رچاؤ پاکر نئی لطافتوں سے آشنا ہو گئی تھی۔ اس مجموعے کی اشاعت سے قبل برصغیر کے نئے شعرا میں غزل کا احیا ہو چکے تھے جو ترقی پسندانہ دور میں بڑی حد تک معتوب و مقہور قرار پا چکی تھی۔ اسی کے ساتھ اساتذہ کے اسالیب اور کلاسیکیت کے از سرِ نو احیا کا رجحان بھی زور پکڑ رہا تھا۔ میر کے رنگ اور لہجے میں غزل لکھنے کا فیشن عام ہو چکا تھا۔ فیض نے کلاسیکیت کی بازیافت کو نئی سمت پر ڈالا۔ فیض "دستِ صبا" کا اثر دو طرح کا ہوا۔ ایک طرف تو نئے نظم گو شعرا نے داخلی علامیہ کی زبان میں سیاسی سماجی موضوعات کو بیان کرنے کا نیا طریقہ سیکھا، دوسری طرف ترقی پسند شاعروں کے لہجے میں وہ نرمی اور ہلکی سی رومانیت شامل ہوئی جس کا برسوں سے فقدان تھا۔ فیض نے اپنے معاصرین تک کو متاثر کیا۔ بہت کم نئے شعرا پر فیض کا براہ راست اثر تلاش کیا جا سکتا ہے۔ جن کے یہاں یہ اثر واضح ہے وہ فیض کے طلسم سے پھر نکل نہ سکے جیسے مصطفیٰ زیدی، شاذ تمکنت، قمر جمیل، رضی اختر شوق۔ اِن شعرا پر دوسرا اثر جوش کی رومانیت اور اُن کے ڈکشن کا ہے۔ یہ دونوں اثرات، جوش اور فیض کے، اس لئے صحت مند ثابت نہیں ہو سکے کہ اتفاق سے جوش اور فیض دونوں اپنی انفرادیت کے باوجود بہت محدود موضوعات کے شاعر ہیں۔ جوش کی شاعری تو بڑی حد تک لفظوں کا کھیل ہے۔ جوش کے اس فن کی تقلید یوں مشکل ہو جاتی ہے کہ اُن کے مقلدین کے لئے جوش کی طرح لفظوں پر قدرت حاصل کرنا ممکن نہیں، پھر جوش کا گہرا جذباتی احساس اُن کی قادر الکلامی زود گوئی، ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھنے پر اُن کی ماہرانہ قدرت یہ ایسی خصوصیات ہیں جو ان سے کمتر درجے کی شاعروں میں یک جا نہیں ہو سکتیں۔

یہی وجہ ہے کہ اپنی تمام تر کمزوریوں اپنی فکری بے مائگی اور عزت احساس کے باوجود جوش نے اپنی شاعری کا تو بھرم رکھ لیا مگر اُن کی تقلید کرنے والے لفاظی اور تکرار کے حصار میں محصور ہو کر رہ گئے۔ فیض کا ڈکشن جوش کے مقابلے میں بالکل مختلف ہے۔ اُن کی لفظیات اتنی ہی محدود ہیں جتنی جوش کی وسیع۔ فیض ہر موضوع کو خواہ وہ سیاسی سماجی ہو یا شخصی اور عشقیہ اپنے لہجے کی شائستگی، نرمی اور لطافت سے قابلِ قبول بنا دیتے ہیں، اُن کے موضوعات کا دائرہ بھی محدود ہے اور اُن کی فکر بھی زیادہ وسیع نہیں۔ اُن کے یہاں جذبے کی شدت بھی کم ہے۔ فیض کا آرٹ نگینہ ساز کا کام ہے جتنی ہی احتیاط اور ریاض، ٹھہراؤ اور نفاستِ طبع چاہتا ہے۔ اس لئے فیض کی تقلید بھی جوش کی طرح کم خطرناک نہیں۔ یہی سبب ہے کہ نئے نظم گو شعرا میں جنھوں نے اس نظامِ روشن اور رنگین مستقبل کی طرف قدم اُٹھائے وہ لفظوں کی رنگین سیپیوں میں اُلجھ کر رہ گئے۔ زیادہ دور تک نہ جا سکے اور اب اپنے آپ کو دُہرا رہے ہیں۔

جدید نظم نے ترقی پسندی کے ردِ عمل کے طور پر عشقیہ تجربات کو بھی ایک بار پھر پوری شدت سے اپنا موضوع بنایا۔ عشقیہ تجربہ داخلی تجربہ ہے مگر آج کا عشق روایتی عشق کی طرح سادہ نہیں۔ نہ ہی آج کے عشقیہ رویے پہلے کی طرح طے شدہ ہیں۔ جدید ذہن اختر شیرانیت اور مجازیت کے جذباتی اُبال اور عنفوانِ شباب کی ہیجان کو عشق کا نام دے کر اُن کے بیان سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ ترقی پسند شاعری نے یہ تو ہمیں بتایا تھا کہ عشق بھی اور معاملاتِ زندگی کی طرح ایک معاملہ ہے۔ فرائڈی نفسیات سے متاثر ادیبوں اور شاعروں نے اس کے جنسی پہلو سے آشنا کر کے عشق کے افلاطونی تصورات کا طلسم بھی توڑ دیا تھا۔ مگر بیشتر ترقی پسند شاعری انقلاب، سیاست، اور عورت و عشق، کو دو الگ الگ خانوں میں بانٹتی رہی۔ ایک طرف انقلاب تھا۔ شاعر کو پہلے انقلاب لانا تھا، پھر عشق کرنے کی فرصت مل سکتی تھی۔ یا وہ اپنے محبوب کے سامنے دنیا کے دکھ درد مزدوروں کسانوں کے مصائب و آلام بیان کر کے اس سے کارزارِ حیات میں جانے کی اجازت طلب کرتا تھا یا پھر ساحر لدھیانوی کی طرح عشق پر جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ اقدار کے غلط تصور کا مریضانہ انطباق کر کے عشق کا بہت ہی غیر طبعی تصور پیش کرتا تھا "تاج محل"، یا وہ کسی فرنگی عورت سے رات بھر اپنے ملک کی بے بسی کا انتقام لیتا تھا (ن م راشد)۔ جدید دور میں عشق کو صحت مند انسانی جذبہ، زندگی بخش قوت اور تقاضائے حیات سمجھ کر اس کی تمام تر نفسیاتی جذباتی اور جسمانی واردات و کیفیات کے ساتھ قبول کیا گیا۔ محبوبہ کو بیوی اور رفیقۂ حیات کی صورت میں بھی دیکھا گیا۔ گھریلو زندگی کی صحت مند نارمل تصویر کشی بھی کی گئی (خلیل الرحمٰن اعظمی)، اور ساتھ ہی جسم کے اُن معاملات کو بھی شدت کے ساتھ بے محابا طور پر بیان کیا جانے لگا جن کا بیان ہمیں اساتذۂ متقدمین کے کلام میں تو مل جاتا ہے۔ مگر بعد کے زوال آمادہ اظہار بند (Inhibited) ذہن نے اُن کا ذکر بھی تجربِ ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اس معاملے میں اگر ہم جدید اردو نظم

کا موازنہ دنیا ہی کی نہیں بلکہ صرف مشرقی جدید نظم سے کریں تو اندازہ ہوگا کہ آج کی ایرانی شاعرات جنس و جسم کے معاملات کے بیان میں جتنی بے باک ہیں آج بھی ہمارے یہاں مرد شعراء ان سے بہت پیچھے ہیں۔ شاعری میں جسم کا بیان ہو یا کسی اور معاملے کا، کوئی موضوع شجرِ ممنوعہ نہیں، بشرطیکہ آدابِ فن اور شریعتِ شاعری کے احکام کی تکمیل ہو۔ اس جہت میں ہمارے بعض نظم گو شعراء ایک بار پھر یا تو پچھلی رومانیت کی سطحیت کے شکار ہیں یا ان کے یہاں جنس کے بیان میں لذتیت کا نمایاں احساس ملتا ہے۔ رومانی قبیلے کے شعراء کے یہاں جنس و جسم کا تصور رومانی تصورات کی دھند میں اس طرح لپٹا ہوا ہے کہ عشق اور اس کی ہر کیفیت محض ایک فرسودہ روایت معلوم ہونے لگتی ہے۔ کچھ شعراء بدلتے ہوئے معاشرے اور عورت کی سماجی حیثیت میں بیسیوں تبدیلیوں کے باوجود اپنی شاعری میں بیسویں صدی کے چھٹے اور ساتویں دہے میں بھی اسی طرح پیش کیا جس طرح بیسویں صدی کے اوائل یا ربع اوّل کے رومانی ادیب اور شاعر اسے دیکھتے تھے۔ رومانیت کا یہ میلان، مخدوم، قتیل شفائی، ساحر کے یہاں آج بھی نمایاں ہے۔ نئے شعراء میں زبیر رضوی اور ندا فاضلی اب اس حد سے نکل کر جذباتی پختگی اور وسعتِ ذہن کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں، شاذ تمکنت کا غالب موضوع آج بھی رومان اور اس کی مختلف النوع کیفیات ہیں۔ ابتداء میں تو اُن کے لہجے اور لفظیات کی انفرادیت نے اُن کے موضوع کو تازگی اور جان عطا کی تھی، مگر بعد کی نظموں میں اُن کی تکرار اس تنگنائے سے نکلنے کا تقاضا کر رہی ہے۔ شاذ تمکنت نے موسیقی پر جو نظمیں لکھی ہیں وہ اُن کے رومانی اسلوب کے اچھے نمونے ہیں، انہوں نے اخترالایمان کے رنگ میں فکری لہجے میں بھی چند نظمیں لکھنے کی کوشش کی ہے مگر یہ اُن کا نمایاں رنگ نہیں۔ جدید تر نظم گویوں میں اب بھی بڑی تعداد ایسے شاعروں کی ہے جو روایتی انداز کے رومانی واردات کو محض نئے الفاظ و علائم میں بیان کرنے ہی کو جدیدیت سمجھتے ہیں حالانکہ جدیدیت بنیادی طور پر رویّے کی تبدیلی کا نام ہے۔ محض زبان یا علائم و ہیئت یا لباس کی تبدیلی سے عبارت نہیں۔ عادل منصوری کے یہاں جنسی تجربے کو بے باک انداز میں بیان کرنے کی بعض کامیاب کوششیں ملتی ہیں۔ کمار پاشی کی "دلاس یاترا" کے کچھ حصّے اور عمیق حنفی کی کچھ نظمیں بھی اس خصوص میں قابلِ ذکر ہیں۔

منیب الرحمٰن، خلیل الرحمٰن اعظمی، محمد علوی، شہریار، کمار پاشی، شہاب جعفری کا رویّہ زندگی اور اپنے موضوعات کی طرف رومانی ہے مگر ان کا رومانی رویّہ روایتی نہیں، بلکہ ان کا اساس داخلی ردِّعمل ہے۔ جو طے شدہ ہرگز نہیں اور اکثر مقامات پر اپنے غیر روایتی انداز کی وجہ سے غیر رومانی بھی ہونے لگتا ہے۔ ایک حد تک شمس الرحمٰن بھی اسی قبیلے میں شامل ہیں۔

شفیق فاطمہ شعریٰ، ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی کے یہاں رومانیت کچھ تو اُن کے نسائی مزاج اور کچھ بعض پرانے آدرشوں سے اُن کی جذباتی وابستگی کا نتیجہ ہے۔ ساجدہ اور زاہدہ اپنی فکر میں جدید ہوتے ہوئے بھی اپنے خیالات و روّیوں میں رومانی حسیات کے زیرِ اثر نظر آتی ہیں۔ ان میں سے اکثر شعراء کے یہاں رومانیت و مخالفِ رومانیت میلانات بھی ایک دوسرے کو کاٹتے نظر آتے ہیں۔

رومانی لہجے کے ساتھ جدید نظم نے فکر کی ایک نئی جہت کو بھی فروغ دیا۔ یہ تشکیک کا میلان ہے۔ بیشتر نظموں میں اس میلان کو عام طور پر کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ مگر بیشتر جدید نظموں میں جن کا تعلق عہدِ جدید کے تناظر سے ہے ایک زیریں لہر کی صورت میں یہ فکری میلان کارفرما نظر آتا ہے۔ اقدار کی شکست و ریخت کا داخلی سطح پر تجربہ، معاشرے کے موجودہ نظام کی طرف سے بے اطمینانی، ایک بے رحم مشینی معاشرے میں فرد کے بے جان مشین کا پرزہ بنا دیئے جانے کا احساس، صنعتی شہر میں انسان کی تنہائی، نیوکلیائی اسلحوں کے ذخیروں کے دہانوں پر بیٹھی ہوئی دنیا میں موت کا آسیب، پرانے رشتوں اور انسانی تعلقات کے ٹوٹنے یا بے حرمت ہونے کا احساس، پرانے آدرشوں کے کھوکھلے پن کا تلخ تجربہ، قائدین و اربابِ سیاست کے قول و عمل میں تضاد، قدم قدم پر سمجھوتہ بازی، مصلحت و مفاہمت، دولت کے حصول کے غلط طریقوں کے ساتھ دیانت و محنت کی بے مائگی، زندگی کی بے مقصدیت اور خود اپنے آپ سے انسان کی اجنبیت، کائنات اور فطرت سے اس کی دوری، یہ تمام مسائل ایسے ہیں جو جدید نظم کا مختلف عنوانات و اسالیب سے موضوع بنتے رہے ہیں۔ ہر موضوع پر غور و فکر ایک ہمہ گیر تشکیک اور بے یقینی سے دوچار کرتی ہے۔ فکر کا یہ میلان ترقی پسند دور کی یقین پر مبنی و یقین پر مبنی شاعری سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اس لئے اس میں پچھلے دور کی رجائیت اور امید پرستی بھی نہیں، لیکن اسے قنوطیت، ہزیمت خوردگی یا مرگ کوشی کا میلان کہنا بھی غلط ہوگا۔ عام طور سے اِن میلانات کی بنیاد پر جدید اردو نظم پرانے ناقدین کے قلم سے آج تک اعتراضات کا ہدف بنتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ اگر ان اعتراضات کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ خود ترقی پسند شاعری پر بھی اعتراضات اس دور کے بزرگوں نے اسی شدومد سے وارد کئے تھے۔ ترقی پسند شاعری کے لئے بھی کہا گیا تھا کہ یہ چند گمراہ، ہزیمت خوردہ، تہذیب اور تمام انسانی قدروں سے بیزار نوجوانوں کے ذہن کی پیداوار ہے۔ اس پر کج روی، گمراہی، قنوطیت، کلاسیکیت اور اس کی روایات سے ناواقفیت، شعر و ادب کے آداب سے لاعلمی، فن سے بے خبری، لسانی اور ہیئتی تجربوں کی بدعتوں کا الزام لگایا اور اس کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ حالانکہ ترقی پسند شاعری اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق ادب کو نئی جہتوں سے آشنا کر رہی تھی جو اس وقت ضروری تھا۔ آزادی کے بعد کے بدلے ہوئے حالات اور نئے ذہنی فکری تقاضوں کے پیشِ نظر ادب میں ایک بار پھر تبدیلیاں ناگزیر

حقیقت۔ انتہاپسندی ہی کو جدید اردو نظم برتنے کار لا رہی ہے۔ افراط و تفریط اس وقت بھی ہوتی، اب بھی ہو رہی ہے۔ انتہاپسندی اس وقت بھی ادب میں در آئی تھی، اب بھی دخل پا رہی ہے۔ ادب کے نام پر چلتے ہوئے فیشن اور فارمولے اس وقت بھی مقبول ہو گئے تھے، آج بھی ہو رہے ہیں۔ تنقید نے اس وقت بھی تخلیق کو غلط راستے پر ڈالا تھا، آج بھی اکثر صورتوں میں گمراہ کر رہی ہے۔ لیکن انتہاپسندی اور چند کلیہ سازیوں کی بنا پر کسی دور کی پوری تخلیقی کاوش سے بدظن ہو جانا اور اس پر تکیہ کئے بیٹھے رہنا صحیح نہیں ہوگا جسے جدیدیت شکن ناقدین قنوطیت کہتے ہیں وہ حقیقت پسندی ہے۔ رجائیت کے نام پر حقیقت پسندی ہے۔ رجائیت کے نام پر حقیقت سے آنکھیں بند کرنا خود فریبی بھی ہے۔ اور دنیا فریبی بھی۔ ہم دنیا اور معاشرے کو تخلیقی تجربے میں جس طرح دیکھتے ہیں، اسی طرح دکھاتے ہیں۔ موت ہمارے سروں پر ننگی تلوار کی طرح لٹک رہی ہے تو زندگی کا جشن منانے کی ترغیب دینا انسان دوستی نہیں۔ ہمیں اس خطرے سے آگاہ رہنا چاہئے۔ آج سے بیس برس قبل امن تحریک کے نام پر جو ادبی تحریک چلائی گئی تھی اور جس نے ہمارے شاعروں سے ڈھیروں نظمیں لکھوائیں، وہ جنگ کے خوف ہی کا نتیجہ تھی۔ جنگ کا وہ خطرہ ٹلنے کے باوجود آج بھی موجود ہے۔ جنگ کا یہی خوف انسان کی انفرادی اور اجتماعی موت کا آسیب بنا ہوا ہے۔ یہ موت کبھی دو ملکوں کی جنگ میں ہزاروں لاکھوں معصوموں پر مسلط کی جاتی ہے۔ کبھی قحط، سیلاب اور بھوک بن کر آتی ہے۔ کبھی کسی ملک کے مجاہدین حریت پر بمباروں کی آگ کی بارش بن کر اترتی ہے اور کبھی جوہری بموں کے تجربے کی شکل میں چپکے چپکے لاکھوں زندگیوں سے کھیلتی ہے۔ ہماری موجودہ سیاست جس وسیع پیمانے پر موت کی تجارت کر رہی ہے اور اسے فروغ دے رہی ہے اسے دیکھتے ہوئے موت کو اگر ہماری شاعری میں غالب موضوعات میں سے ایک کی حیثیت حاصل ہے تو یہ اعتراض کی بات نہیں بلکہ غور کرنے کی بات ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ایسی نظمیں، اگر واقعی ان میں مریضانہ مرگ کوشی کی ذہنیت نہ ہو، ہمارے دور کے سب سے اہم سیاسی اور سماجی مسئلے سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ یہی صورت تنہائی کے مسئلے کی ہے۔ میرے نزدیک تنہائی کا مسئلہ فرد کا ذاتی مسئلہ اتنا نہیں جتنا ایک بڑا وسیع سماجی مسئلہ ہے۔ ہمارے معاشرے میں وہ افراد جو اس کی مشین کے چلانے والے ہیں یا جو اس سے بتدریج توفیق استعمال عیش و زر کرتے ہیں کبھی تنہائی کے احساس کا شکار نہیں ہوتے۔ ایسے افراد کے پاس اقدار کا کوئی تصور ہی نہیں، ان کی اقدار وہی ہیں جو استحصال کرنے والے معاشرے کی اقدار ہیں۔ البتہ وہ حساس خلاق ذہن جو کچھ مثبت اقدار کا اعلیٰ تصور رکھتے ہیں معاشرے سے عدم مطابقت کا شکار ہو کر خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ معاشرتی تبدیلیاں اور انقلابات ایسے ہی "تنہا" افراد لایا کرتے ہیں۔ اس لئے تنہائی کا احساس انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر خالص سماجی اور سیاسی مسئلہ ہے۔ جو ناقدین تنہائی کو خود پرستی یا برخود غلط انانیت کا مرض سمجھتے ہیں وہ اس کے سماجی سیاسی عوامل پر نظر نہیں رکھتے یا اس کا تجزیہ کرنا نہیں چاہتے۔

ان مسائل پر جدید نظم گو شعرا نے کثرت سے ایسی نظمیں لکھی ہیں جن کی خاص سماجی سیاسی تعبیریں کی جا سکتی ہیں، چونکہ ایسی نظموں اور ان کے شاعروں کی تعداد بہت ہے اس لئے میں صرف چند ناموں پر اکتفا کروں گا جن کے یہاں سیاسی سماجی عناصر ان بظاہر داخلی اور شخصی موضوعات کی تہہ میں بھی شدت سے کارفرما ہیں: براج کومل، منیب الرحمٰن، اختر الایمان، خلیل الرحمٰن اعظمی، قاضی سلیم، شہریار، عزیز قیسی، عمیق حنفی، کمار پاشی، شہاب جعفری، باقر مہدی، محمود ایاز، ندا فاضلی، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، شمس الرحمٰن، وحید اختر۔ ان میں سے کئی شاعر ایسے ہیں جنھوں نے اہم سیاسی موضوعات خصوصاً جنگ اور امن، ویٹ نام، لومبا، مارٹن لوتھر کنگ، گوا، مصر، الجیریا اور بنگلہ دیش پر بھی نظمیں لکھی ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ جدید نظم گو شاعر سیاسی سماجی موضوعات و مسائل کو شاعری کے لئے شجر ممنوعہ نہیں سمجھتا۔ عام طور پر جدید نظم گو شعرا پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ وہ ذات کے خول میں اسیر ہیں اور کائنات سے ان کا کوئی رشتہ نہیں، یہ بھی صرف سطح بینی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آج شاعر کا سفر ذات سے کائنات کی طرف ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذات اور اس کے تجربے کے آئینے میں خارجی عالم کو دیکھتا، پرکھتا اور جانتا ہے۔ لیکن یہ سفر یک رخہ نہیں ہوتا۔ شاعر کو بار بار ذات سے کائنات اور کائنات سے ذات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ آج جو اس پر زور ہے کہ شاعری عرفانِ ذات اور اس کا اظہار ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ شاعر صوفی کی طرح کائنات سے بے تعلق ہو کر اپنی ذات کے اندر ہی حقیقت کو تلاش کرتا ہے، حقیقت تو باہر جیسی ہے ویسی ہی ہے لیکن اس کا ذاتی داخلی تجربہ حقیقت کو جس رنگ میں دیکھتا اور دکھاتا ہے وہی اس کی حقیقی کائنات ہے۔ اب یہ شاعر کی شخصیت کی وسعت اور اس کی بصیرت پر منحصر ہے کہ اس کی ذات میں صرف قطرے کی سمائی ہے یا ساتوں سمندر پی کر بھی وہ سیراب نہیں ہوتا۔ مختلف شاعروں کی شخصیت میں جو فرق ہے ان کی بصیرت اور تخلیقی صلاحیت میں جو امتیاز ہے، اسی لحاظ سے ان کی شاعری میں بھی خارجی کائنات کے مسائل کا عکس پڑتا ہے۔ عکس تھوڑا ہو یا زیادہ لیکن عکس پڑنا ناگزیر ہے۔ کیونکہ شاعر اپنے معاشرے کا رکن ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت اسی آب و گل سے بنتی، اس کا شاعرانہ شعور اپنے اطراف ہی سے نمو پاتا اور اپنے عہد ہی سے اخذ قوت کرتا ہے۔ اس کے عہد کے سیاسی سماجی واقعات اور تقاضے خود بخود اس کی شخصیت، تجربے اور تخلیقی عمل کا جز بنتے ہیں، انھیں اس پر مسلط کرنے کی ضرورت نہیں۔ آج شاید ہی کوئی باشعور شاعر زندگی اور ادب، سماج اور ادب کے اٹوٹ رشتے سے انکار کرے۔ اختلاف صرف وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں زندگی اور سماج کے تقاضوں کو مختلف

نظریات یا کسی ایک مخصوص نظریے کے مطابق فن میں داخل کرنے کا سوال ہوتے ہوئے یہاں آکر بیٹھے حقیقی شاعر اپنے ذاتی تجربے اور بصیرت کو کسی بھی نظریے یا عقیدے کی آمریت کے مقابلے میں ترجیح دینا پسند کرے گا۔ جدید شاعری میں بیشتر کا رویّہ زندگی اور سماج کی طرف وہی ہے جو ایک باشعور شہری کا ہونا چاہیئے لیکن وہ ضمیر کی آزادی اور اپنی بصیرت کو کسی نظریئے عقیدے یا نظامِ حیات کے ہاتھوں فروخت کرنے کو تیار نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے دور سے بے خبر ہیں اس کے برخلاف جدید دور کی بہترین نظمیں اپنے زمانہ کی جتنی سچی ترجمانی کرتی ہیں اُن سے بہتر ترجمان ملنا ممکن نہیں۔

اپنے دور کی تلخ اور بھیانک سچائیوں کا حق ادا کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ شاعر پُرانے آدرشوں سے رومانی وابستگی ترک کریں۔ اسی لئے ہمیں جدید اردو نظم میں رومانیت کے برخلاف جو ترقی پسندی کی بیانیہ شاعری کی خارجیت کا ردعمل تھا مخالف رومانیت میلان بھی کار فرما نظر آتا ہے۔ مخالف رومانیت میلان کا مطلب یہ نہیں کہ شاعر نے اب عشق کرنا ترک کر دیا ہے یا عورت اور حسن کے مظاہر سے اس کی دلچسپی ختم ہوگئی ہے۔ یہ تو اس رجحان کی بہت طفلانہ تفسیر ہوگی۔ نہ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ شاعر کا رویّہ داخلی اور شخصی کی بجائے خارجی اور غیر شخصی ہو گیا ہے۔ شاعر خواب پرست ہوتا ہے۔ وہ اقدار کی شکست کا کتنا ہی ماتم کرے، اس کے پاس کچھ اقدار کا تصور ہمیشہ رہے گا جنہیں وہ زندگی سے بھی زیادہ عزیز رکھے گا۔ اس رویّے کے باوجود شاعری کے مزاج میں یہ تبدیلی آئی ہے کہ اب پُرانے عقائد و تصورات جن پر رومانیت نے تقدس اور لافانیت کی دبیز نقاب ڈال دی تھی، اس کے لئے عریاں کھوکھلی اور بے معنی ہو چکی ہیں۔ ماضی سے اس کی جذباتی وابستگی میں کسی قسم کا رومانی عنصر نہیں رہا۔ زندگی عشق کا معاملہ نہیں بلکہ تنازعہ لاتی ہے جو قدم قدم پر ہمیں للکارتی ہے۔ خود عشق کے وہ تصورات جنھوں نے محبوب کو غیر ارضی، آسمانی، الوہی مخلوق کا درجہ دے دیا تھا ٹوٹ چکے ہیں ہمارا محبوب ہماری ہی طرح اسی زمین اسی سماج کا فرد اور ہماری ہی طرح کمزوریوں کا شکار رہے۔ وفا، جفا، خلوص، لطف، کرم، عنایت، شوق وغیرہ ایسے الفاظ کثرتِ استعمال سے بے معنی ہو چکے ہیں۔ زندگی اور خود عشق کو زندگی اور اپنے تجربے کی آنکھ سے دیکھنا چاہیئے۔ اس میں حسین تصورات کی آمیزش کرکے خود کو فریب دینا اور اس کی بنیاد پر شعر و ادب کی ایک طلسمی غیر حقیقی دنیا خلق کرنا حماقت ہے۔ یہ رویّہ بھی آج کے ادب کے بنیادی موضوعی رویّے کی پیداوار ہے جو اقدار کی اضافیت کے عرفان سے پیدا ہوا ہے اور بے رحم حقیقت پسندی کا دوسرا نام ہے۔ اسی رویّہ نے جدید نظم میں عشق اور محبت کے تصورات اور عاشق و معشوق کے رویّوں اور رشتوں کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس شاعری کا مزاج پچھلی رومانی شاعری سے بھی مختلف ہے۔

اور جدید دور میں ہونے والی رومانی احیا کی روایات زدہ عقیدہ شاعری سے بھی جذباً مختلف اس رویّے کا اثر و نفوذ معاملاتِ عشق سے ہٹ کر حیات و کائنات پر غور و فکر اور اس سے اپنے رشتے کے تعین پر بھی پڑتا ہے۔ جدید اردو نظم میں مخالف رومانیت رویّے کی چند مثالیں، قاضی سلیم، عمیق حنفی، عادل منصوری، باقر مہدی، عزیز قیسی، مغنی تبسم اور وحید اختر کے یہاں مل جائیں گی۔ جن شعرا کا ذکر پہلے رومانیت کے ذیل میں آچکا ہے کہیں کہیں ان کے یہاں بھی اس رویّے کا اظہار ہوتے ملیں گے۔ دراصل رومانیت اور مخالف رومانیت رجحان ایک ہی اصل کے دو فروع ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ پچھلے دور کی رومانیت آج کے مخالف رومانیت میلان میں توسیع پائی ہے۔ یہی سبب ہے کہ کچھ شعرا میں مخالف رومانیت مزاج ایک بار پھر انھیں دوسری قسم کی رومانیت کی طرف لے جا رہا ہے۔ رومانیت کی ایک شکل ہمیشہ سے ماضی کی طرف مراجعت اور اس سے جذباتی وابستگی رہی ہے۔ کمار پاشی کے پہلے مجموعے کے سرنامے ہی ماضی سے بے کلے بگاڑ کا اظہار ہوتا تھا۔ اب وہ اس پاتراؔ لکھ کر انہوں نے عقیدے کی تلاش اور ماضی کی روایات میں جذباتی آسودگی کی راہ ڈھونڈ کر اسی رومانیت کی طرف مراجعت کی ہے۔ یہی حال عمیق حنفی کا ہے جن کا متبادل عقیدے کی تلاش میں اب صحرائے عرب کے ریگستان میں چودہ سال کا زمانی فاصلہ پیچھے کی طرف طے کرکے عقیدے یا بازیافت کے قافلے مسلسل آگے ہیں کے ساتھ سرگرم خرام ہے۔ عادل منصوری اپنے مخالف رومانی رویّے کے ساتھ ماضی کے عقائد کے طلسم کے اسیر رہے ہیں اور یہ رجحان اُن کے یہاں روز بروز مضبوط ہی ہوتا گیا ہے۔

اسی سلسلے میں اس بات کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے کہ اردو نظم کے شاعروں نے آزادی کے بعد جہاں کلاسیکی اسالیب اور لہجوں سے فائدہ اٹھایا نیز پرانی اصناف (ہجو، واسوخت، مثنوی، قصیدہ) کے امکانات کو از سرِ نو کھنگالا اور برتا، وہیں انہوں نے اساطیر اور قصص الانبیا اور قدیم تاریخی روایات کو بھی اپنی شاعری میں بطور موضوع بھی برتا ہے اور بحیثیت علامت بھی استعمال کیا ہے۔ اس کی کئی مثالیں ہیں، عمیق حنفی، کمار پاشی، قاضی سلیم، عزیز قیسی، عادل منصوری، شمس الرحمٰن فاروقی، وحید اختر اور کئی دوسرے شاعروں کی نظمیں اس سلسلے میں نقل کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اسے ہم ماضی کی طرف مراجعت کا رجحان نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ اس سے مختلف رجحان ہے جو ماضی کے ادب اور روایات مذہب اور اساطیر کو نئی معنویت کے اظہار و ابلاغ کے لئے بطور وسیلہ برتنے کا رجحان ہے۔ یہ ذریعہ ہے بذاتِ خود مقصد نہیں۔ یہ کوشش ہمارے افسانوی ادب میں بھی ہوئی جس کی کامیاب ترین مثالیں انتظار حسین کے افسانوں میں ملتی ہیں۔ پاکستانی شعرا میں سب سے زیادہ کثرت سے اساطیر و قصص کو عبدالعزیز خالد نے منظوم کیا ہے۔ ترقی پسند دور کے شعرا کے یہاں بھی کہیں کہیں ایسے علائم اور

حوالے تو ملتے ہیں مگر وہ اتنے پیش پا افتادہ ہیں کہ ان سے نظم کی معنویت یا قوتِ اظہار میں زیادہ بلندی نہیں پیدا ہو سکی تھی۔ شاید انہیں علامتی طور پر کسی نظم کا موضوع بنایا گیا تھا جبکہ جدید نظم میں خود ایسے موضوعات پر بیسیوں نظمیں مل جائیں گی جو نئی معنویت کی حامل ہیں۔

جدید نظم کے سلسلے میں تنقید نے سب سے اہم سوال ترسیل و ابلاغ کا اٹھایا ہے۔ یہ سوال نہ صرف معترضین بلکہ جدید ناقدین نے بھی پیدا کیا ہے۔ ترسیل کا سوال کئی سطحوں پر جواب چاہتا ہے۔ ایک تو یہ کہ آزادی کے بعد نظم میں اظہار، لہجے، داخلی علامتوں، تمثالات اور پیکر تراشی کے جو جدید تجربے ہوئے انہوں نے جدید نظم کو پچھلے ادوار کی نظم سے بڑی حد تک مختلف کر دیا۔ یہ انحراف غیر شعوری بھی تھا اور شعوری بھی۔ ترقی پسند دور تک ہیئت کے بعض تجربوں اور لفظیات میں تھوڑی سی تبدیلی کے باوجود ہماری نظم کی فضا، سانچے، لفظیات اور آہنگ ایک حد تک کلاسیکی شاعری سے زیادہ عدم مطابق نہیں ہوا تھا۔ آزادی کے بعد کی نظم میں یہ فضا آہستہ آہستہ اتنی بدل گئی کہ انحراف ہی نہیں روایت سے انقطاع کا بھی گمان اور کہیں کہیں بجا طور پر گمان گزرنے لگا۔ دوسرے ترقی پسند نظم براہ راست وضاحتی اور بیانیہ ہوتی تھی، اس کی علامتیں تک بھی صراحتی ہوتی اور اپنی شرح خود کرتی تھیں اور یہ استعارات عام ادبی روایت ہی سے مستعار تھے۔ اس لئے روایتی انداز سے انحراف کے باوجود یہ قابل فہم تھی۔ تیسرے اس کا موضوع عموماً سیاسی اور سماجی مسائل ہوتے تھے جن شعراء نے اس دور میں داخلی موضوعات پر لکھا، ان پر اس وقت بھی اشکال و ابہام کے اعتراضات وارد ہوئے۔ چوتھے آزادی سے قبل تک ہمارے ملک میں اردو پڑھنے لکھنے والوں کا ایک بہت بڑا حلقہ تھا۔ آزادی کے بعد اردو پڑھنے والوں کا یہ حلقہ بہت محدود ہو گیا ہے۔ ہماری کتابوں اور رسالوں کے قارئین کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ ہماری نئی نسلیں اردو رسم الخط سے عموماً نابلد ہیں اس لئے ہمیں پڑھنے اور سمجھنے والا نیا ذہن میسر ہی نہیں۔ ان حالات میں اگر شاعری عام فہم بھی ہوتی تب بھی ترسیل و ابلاغ کا مسئلہ پیدا ہونا فطری تھا۔ آج مشاعروں میں شعر سننے والے تو بہت جمع ہو جاتے ہیں، مگر سستی روایتی بازاری قسم کی شاعری کو چھوڑ کر ذرا بلند سطح کی ادبی زبان کو سمجھنے والوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ اب خود ترقی پسند شاعروں کی زبان سمجھنے والوں کی تعداد پہلے سے کم ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ اگر ہم جدید نظم کی اور خصوصیات کو بھی پیش نظر رکھیں، اس کا گہرا داخلی تجربہ، شخصی علائم، نامانوس تجربات، غیر روایتی رویے اور زبان، شاعری کا بدلتا ہوا محاورہ، پیکر تراشی اور تمثالات پر وہ توجہ جو اس سے قبل کی نظم میں بہت کم ملے گی، اساطیر اور پرانی روایات کے حوالے، کہیں کہیں غریب الفاظ اور عجیب زبان، تو اندازہ ہو جائے گا کہ ترسیل کا مسئلہ ایک نہیں، بلکہ دراصل کئی مسائل کا مجموعہ ہے جسے مختلف سطحوں پر رکھ کر دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جب

اہم بات یہی ہے کہ اب پوری دنیا اور اس کے ساتھ ہمارے ملک میں شاعری کی وہ قدر و قیمت نہیں رہی جو مثال کے طور پر آزادی سے قبل تک تھی۔ اب دوسری سستی تفریحوں نے شاعری کی جگہ لے لی ہے۔ اور نئی نسلیں اپنی روحانی جذباتی تشفی کے لئے انہی کی تلاش کرتی ہیں۔ پرانے ذہن روایتی انداز کی شاعری پر ہی سر دھنتے ہیں۔ اگر ان عوامل کو کسی طرح ساقط کیا جا سکے اور جدید نظموں کا تجزیہ کیا جائے تو نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انحراف اور ہیئتی و لسانی تجربوں کے باوجود ہماری نظم آج بھی اظہار و ترسیل کی اتنی ہی قوت رکھتی ہے جیسی پہلے رکھتی تھی۔ بلکہ فنی لحاظ سے اب وہ زیادہ پختہ ہوئی ہے اور اظہار کے نئے وسیلوں پر بھی اس نے قدرت حاصل کر لی ہے۔ نئی نظم کے خلاف ایک تعصب ہماری تنقید نے بھی پیدا کیا ہے۔ ایک تو یوں ہی ہماری تنقید غزل کی تنقید رہی ہے۔ اس نے غزل کے تصورات اور معیارات کو نظم پر منطبق کرنے کی میکانکی کوشش کی۔ دوسرے جدید نظم کی طرف تو اس نے ہمیشہ ذہنی تحفظات کے ساتھ دیکھا ہے۔ جب تک تنقید کا رویہ ہمدردانہ، ایماندارانہ اور معروضی نہ ہو وہ نظم کے افہام و تفہیم کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ یہ تو ہوئی مخالفانہ تنقید کی بات خود جدیدیت کے موافقین کی تنقید نے بھی جدید شاعری خصوصاً نظم کے خلاف طرح طرح کی غلط فہمیاں عام کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارے جدید ناقدین نے بھی ترقی پسند تنقید کی طرح فارمولے اور کلیے گڑھنے شروع کیے اور خود کے قامت پر جو قبا موزوں ہوتی تھی، اسے سب کے سر منڈھنے کی کوشش کی۔ دوسرے جدیدیت کی اتنی مختلف و متضاد تعبیریں کی گئیں کہ جدید نظم بھول بھلیاں میں گم ہو گئی۔ تیسرے پچھلے چند برسوں میں یہ رجحان عام ہو چلا ہے کہ شعری نظریے کو شعری تخلیق پر اولیت دی جانے لگی ہے۔ یعنی پہلے خود شاعر یا اگر شاعر میں اتنی صلاحیت نہیں تو کوئی ناقد اس کے لئے کوئی کلیہ تراش دیتا ہے۔ اور پھر شاعر اس کے مطابق نظمیں ڈھالنے لگتا ہے۔ یہ شاعری کا میکانکی رویہ ہے جس کی وجہ سے مصنوعی، غیر حقیقی، بے جان نظموں کی رسالوں میں کثرت ہو گئی۔ جدیدیت خود ایک لیبل بن گیا جسے شاعری سے زیادہ اہم مان لیا گیا۔ اور اس حقیقت کو فراموش کر دیا گیا کہ کسی نظم یا فن کے لئے شاعری شرطِ اول ہے۔ دوسری کوئی اور چیز جس میں جدیدیت اور ترقی پسندی دونوں شامل ہیں ثانوی اہمیت رکھتی ہے بلکہ کبھی کبھی تو کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

آزادی کے بعد نظم کی فنی ہیئت ہی تکمیل کو نہیں پہنچی بلکہ مختلف سمتوں میں بعض کامیاب تجربے بھی کئے گئے۔ مختصر اور طویل دونوں طرح کی اچھی اور کامیاب نظمیں کثرت سے لکھنے کا رجحان عام ہوا۔ پاکستان میں منیر نیازی کے تجربے کی کامیابی کے بعد مختصر نظم کو شہریار، محمد علوی اور بعد کے چند شاعروں نے بہت کامیابی سے برتا۔ اس سے قبل مختصر نظم کے کچھ نمونے خورشید الاسلام کی "رگِ جاں" میں ملتے ہیں۔ طویل نظموں کا آغاز بھی پاکستان سے ہوا۔ ابن انشاء نے

وسط طوالت کی چند کامیاب نظمیں لکھیں، عبدالعزیز خالد نے کئی طویل ڈرامائی یا اساطیری نظمیں لکھیں، جعفر طاہر نے ہفت کشور لکھی۔ ہندوستان میں طویل نظم کا رواج بعد میں ہوا۔ طویل ریڈیائی ڈراموں (منظوم) کی روایت تو پرانی ہے، اس سلسلے میں سلام مچھلی شہری اور رفعت سروش خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مسلم نظامی نے دو منظوم ڈرامے سکھ اور انارکلی کتابی صورت میں بڑی آب و تاب سے شائع کروائے۔ منور لکھنوی نے کچھ منظوم ترجمے کئے۔ اس سے بھی قبل طویل نظم کی روایت کی داغ بیل اردو میں سردار جعفری کی نظموں "ایشیا جاگ اٹھا"، "امن کا ستارہ" اور "نئی دنیا کو سلام" سے پڑ چکی تھی۔ "نئی دنیا کو سلام" کئی حیثیتوں سے اردو میں طویل نظم کا اہم اور دقیع تجربہ ہے جس نے طویل نظم اور نظم میں ڈرامائیت، بیانیہ شاعری اور ایمائیت کے امکانات کو واضح کیا۔ امن کے موضوع پر ساحر نے "پرچھائیاں" دو بحروں میں لکھی، کیفی کی "جمہور نامہ" بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔ نیاز حیدر کی تین طویل نظمیں "جمالِ مصر"، "نوید عصر نیلی" اور "راندر سبھا" خاص سیاسی ہیں، پرانے ترقی پسندانہ انداز کی ہنگامی نظمیں ہیں۔ حال میں جاں نثار اختر کی ایک طویل نظم "آخری نظم" کے عنوان سے چھپی ہے جس میں جاں نثار کی شاعری کی خود کلامی افسردہ تفکر بزمی اور رومانیت جدید نظم کے مسائل سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ غدر کی صد سالہ تقریب کے موقع پر راہی معصوم رضا نے "۱۸۵۷ء" کے عنوان سے ایک طویل رزمیہ شائع کیا تھا جو مختلف ٹکڑوں پر مشتمل تھا اور جس میں لوک گیت اور عوامی شاعری کی اصناف سے بھی استفادہ کیا گیا تھا۔ اردو میں طویل نظم کے یہ تمام تجربے آزادی کے بعد کے برسوں ہی میں منصۂ شہود پر آئے۔ آزادی کے بعد کے ابتدائی برسوں میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی ایک نسبتاً طویل نظم "آئینہ خانے" شائع ہوئی تھی، اس کے کئی برس بعد کسی داخلی تجربے یا شخصی موضوع پر دوسری طویل نظم "سندباد" عمیق حنفی کی شائع ہوئی جو ذات کے سفر اور عقیدے کی تلاش کی داستان ہے۔ یہ نظم دراصل ایک ہی موضوع کے تحت مختلف بحروں میں لکھی گئی چھوٹی چھوٹی نظموں کا مجموعہ ہے لیکن انھیں خیال اور تاثر کی وحدت ایک لڑی میں پرو کر فنی اکائی کی صورت دے دیتی ہے۔ اپنے موضوع اور اس کے برتاؤ کے لحاظ سے "سندباد" شاید عمیق حنفی کی کامیاب ترین نظم ہے۔ اس کے بعد انھوں نے فن پارہ ــ اس سے زیادہ مکمل اور پختہ نظمیں لکھیں کیہ بیا یا شہرزاد، "شب گشت" اور اب "صلصلۃ الجرس"۔ ان سب نظموں میں "سندباد" کی تکنیک ہی برتی گئی ہے۔ "صلصلۃ الجرس"، رسولِ اسلام کے چودہ سو سالہ جشن پر لکھی گئی ہے جس کا موضوع عقیدے کی بازیافت کا عمل ہے۔ اسی سے ملتا جلتا موضوع کمار پاشی کی طویل نظم "ولاس یاترا" کا ہے۔ لیکن اس کا بنیادی کردار عورت اور جنس ہے۔ اس نظم کے کچھ حصے نثری ہیں اور شاید وہی اس کے کمزور ترین حصے ہیں۔ عزیز قیسی کی ایک نظم "تخیش نگری" موضوع کے لحاظ سے طویل نظموں کے ساتھ رکھی جا سکتی ہے۔ اگرچہ مصرعوں کی تعداد کے لحاظ سے اسے طویل نظم کہنا مشکل ہے۔ شہاب جعفری نے بھی کچھ منظوم تجربے اور طویل نظمیں لکھیں ہیں [illegible] کی فہرست کو صرف مکمل کرنے کے لئے یہاں مجھے اپنی تین نظموں کا ذکر کرنا پڑتا ہے۔ "دشت گداں" جس کا انداز داستانی ہے، "مجربۂ شکرت" جو غزل کے سے انداز میں عہد حاضر کا بیان ہے۔ یہ دونوں نظمیں میرے مجموعے [illegible] میں شامل ہیں۔ میری تیسری طویل نظم جو کئی ہزار مصرعوں پر مشتمل [illegible] صورت میں آنے والی ہے "شہر ہوس" ہے اس کے کئی [illegible] چھپ چکے ہیں۔ یہ دورِ جدید کے انسان، معاشرت اور [illegible] یہ تینوں طویل نظمیں ایک ہی بحر میں ہیں اور مسلسل [illegible] مظہری کی "آب و سراب"، اور اختر انصاری کی [illegible] جا سکتی ہیں۔

ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق نے آزاد نظم کو [illegible] دیا۔ جدید نظم گویوں نے اس کے پورے امکانات کو برتنے کی کوشش کی۔ آزاد نظم کے ذیل میں ایک طرف تصدق حسین خالد، راشد، میراجی کے نام اہم ہیں تو دوسری طرف ترقی پسندوں میں سردار اور مخدوم کے نام اہم ہیں۔ خصوصاً سردار جعفری کی "پتھر کی دیوار" کی نظموں سے آزاد نظم کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ جدید نظم گویوں نے ان دونوں کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا۔ اب آزاد نظم غیر مربوط تصورات [illegible] اور پیکروں کی شکل میں پیش کرنے پر بھی قادر ہے اور [illegible] کو زبان میں ادا کرنے پر بھی دسترس رکھتی ہے [illegible] کے رنگ کو کچھ جدید ناقدین نے خصوصیت [illegible] ہیں، مگر اندیشہ ہے کہ راشد کی شعری [illegible] بوجھ ہمارے نئے شاعروں کی زبان اور [illegible] ہے۔ پھر اس میں سب سے بڑا خطرہ شعریت سے [illegible] سادہ طرزِ بیان، کہیں علامتی طرزِ بیان کہیں [illegible] سے تاثر آفرینی کہیں کسی مجرد تصور کی تجسیم [illegible] کے تجربے ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ انھیں اسی [illegible] تو آزاد نظم کے مزید امکانات کو کامیابی سے برتنے کی [illegible] ہیں۔ آزاد نظم کے ساتھ ساتھ پچھلے چند برسوں میں نثری نظموں کے چند تجربے بھی ہوئے ہیں [illegible] نے پہلا ایسی نظموں کا مجموعہ "کچا نیلم" کے عنوان سے ظہیر نے شائع کیا۔ اس میں چند کامیاب تجربے ضرور تھے۔ [illegible] نظموں کا موڈ آہنگ رومانی دور کے ادبِ لطیف جیسا تھا اس کے بعد احمد [illegible] نے نثری نظمیں لکھیں جن کی سطروں میں کہیں کہیں شعلہ سا لپک جاتا ہے مگر [illegible]

ان کی تقلید میں کئی نئے شاعروں نے نثری انداز میں نظمیں لکھنے کی ناکام کوششیں کی ہیں۔ اس ذیل میں مغنی تبسم اور شہریار کے چند تجربے قابل ذکر ہیں۔ ساقی فاروقی کی کچھ نثری نظمیں بھی شریک ہیں جو شہریار کی دوسری نظموں کی سطح تک کہیں بھی نہیں پہنچ پاتیں۔ ادھر اعجاز احمد کی نثری نظموں کو کچھ مدیران کرام بہت اہمیت دے رہے ہیں۔ پہلے تو جب تک تھا — یہاں آزاد نظم کے بہت امکانات [illegible] اور موضوع کا اچھوتا پن خود تمام قیود [illegible] تجربے کا کوئی جواز نہیں، دوسرے نثر میں [illegible] نثر جب خلاقانہ دسترس کی ضرورت ہے۔ اس [illegible] بے بہرہ ہیں۔

جدید [illegible] کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے نظم کے لہجے، اسالیب، زبان کے [illegible] فکر و احساس میں جس تبدیلی کو روشناس کیا، وہ آہستہ آہستہ پچھلے دور کے شاعروں کے لئے بھی نہ صرف قابل قبول ہوتی گئی، بلکہ جو تخلیقی طور پر زندہ تھے ان کے یہاں اس کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔ اگر اسے نئی نظم کا اثر نہ مانا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ آج کے حالات اور میلانات نے پرانے ترقی پسند شاعروں سے بھی ایسی ہی نظمیں لکھوائیں جیسی جدید نظم گویوں سے لکھوائیں۔ اس صورت میں نظم کی تبدیلیوں کے لئے خوبیوں اور خامیوں کے ذمہ دار پرانی اور نئی دونوں نسل کے شعرا ٹھہرتے ہیں۔ لیکن مجموعوں اور نظموں کی تعداد سے بخوبی علم ہو سکتا ہے کہ تخلیقی لحاظ سے پچھلے پچیس برسوں میں نئے شعرا زیادہ زندہ اور توانا رہے ہیں، نظم کی ترقی کی مختلف جہتوں میں ان کی کاوشوں نے اردو ادب و زبان کی زیادہ آبیاری کی ہے، اس لحاظ سے ہم آزادی کے بعد کے پچیس برسوں کو، ابتدائی چند برس چھوڑ کر، جدید نظم گوئی کا زمانہ کہہ سکتے ہیں۔ [illegible] کے شعرا کو چھوڑ کر ترقی پسند دور کے صرف دو شاعر [illegible] جعفری اور مخدوم محی الدین نے آخر وقت تک [illegible] کے باوجود نظم کی نئی تبدیلیوں کو قبول کیا اور [illegible] فکر کے لہجے میں بھی نمایاں تبدیلی ہوئی ہے۔ بعض اور ترقی پسند شاعر جیسے پرویز شاہدی اور کیفی اعظمی بھی جدید طرز بیان سے قریب تر آئے ہیں۔ [illegible] جو ترقی پسندی کے دور عروج میں خالص سیاسی ہنگامی نظمیں لکھتے تھے، [illegible] نظمیں لکھتے تھے، جدید طرز کی نظموں کی طرف آئے تو انہوں نے اس رنگ میں کئی [illegible] نظمیں لکھیں۔ مجاز نے آزادی کے بعد کوئی قابل ذکر نظم [illegible] نہیں۔ [illegible] نے صرف ایک اچھی نظم لکھی، "میری شاعری اور میرے نقاد"۔ البتہ ساحر کی پرچھائیاں اور جاں نثار کی کچھ نظمیں ترقی پسند انداز کی اچھی نظمیں ہیں، جو آزادی کے بعد لکھی گئیں۔ نئے شاعروں میں جنہوں نے پچھلے رنگ میں لکھنے کی کوشش کی وہ زیادہ دور تک چل نہ سکے۔ اس لئے کہ آج کے زمانے کا تقاضہ ہے جس کا حق جدید نظم گو ادا کر رہے ہیں۔ جدید نظم پر کوئی لیبل، کسی نظریے، کسی تحریک کی قبا نہ اڑھائی جائے تب بھی وہ پچھلے ادوار کی نظم سے مختلف اور ممتاز ہی رہے گی۔

بقیہ اُردو تنقید کے پچیس سال

صفحات میں مدیر کے نام خطوط میں ملتے ہیں۔

انداز بیان کے اعتبار سے ہماری تنقید زیادہ علمی اور کم شاعرانہ ہوئی ہے۔ بیچ میں جو رجحان انشائیہ کی زبان اختیار کرنے کا عام ہوا تھا وہ بھی بہت کچھ کم ہو گیا ہے اور تنقیدی مضامین میں پہلے سے سنجیدگی اور باوقار لہجہ واپس آتا جا رہا ہے۔ ہماری زبان و ادب کا مطالعہ پچھلے ۲۵ سال میں جن مسائل سے دوچار رہا ہے ان کو دیکھتے ہوئے اردو تنقید کی رفتار اور اس کا معیار مایوس کن نہیں۔

بقیہ اُردو فکشن کے پچیس سال

کے خلاف پروٹسٹ (Protest) کی کئی تصویریں ملتی ہیں۔ یہ پروٹسٹ چاہے کسانوں کے کھیتوں میں ہو، یا مزدوروں کی چالوں میں یا فلمی دنیا کی گلیوں میں، "جب کھیت جاگے" سے "باون پتے" تک ان کا پروٹسٹ جاری ہے۔ "گدھے کی سرگزشت" میں کرشن چندر نے موجودہ سیاست پر تیکھا طنز کیا ہے۔ کرشن چندر کے ناول ہر دلعزیز ناولوں کے دائرے میں چاہے شمار ہونے لگے ہوں، لیکن ان کے ناولوں میں جو پروٹسٹ کا عنصر موجود ہے وہ ان کی اہمیت کو کم نہیں ہونے دے گا۔

دراصل اردو کا ہم عصر ناول دو دیواروں کے اندر گھر گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنے فنی تجربے کے دائرے کو بہت محدود کئے ہوئے ہے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی ہم عصر زندگی میں ویژن عطا کرنے میں اکثر ناکام ثابت ہوا ہے۔ ان دیواروں کو منہدم کئے بغیر جدید ناول کی تخلیق ممکن نہیں۔ جدید اردو فکشن کب سے جدید اردو ناول کے انتظار میں ہے۔ ●●

جوابی طلب امور کے لئے مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک ٹکٹ ضرور بھیجئے۔

دیوندر اسر

اُردو فکشن کے پچیس سال

افسانہ ہو یا ناول یہ اکثر ان لوگوں کی داستان رقم کرتے ہیں جو کبھی نہ کبھی حادثاتِ زندگی کا شکار ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کے المیے کا باعث چاہے حریفانہ ماحول ہو یا اُن کی اپنی کوئی نفسیاتی الجھن یا مجبوری، وہ ذات اور معاشرے کے باہمی تصادم کی تاب نہ لاکر انجام کار شکست خوردہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ اس تصادم سے ظفریاب ہو کر ابھرتے ہیں تو انہیں ہیرو کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور اگر وہ جدوجہد کرتے کرتے دم توڑ دیتے یا مار دیئے جاتے ہیں تو شہید کا رتبہ حاصل کر لیتے ہیں لیکن اس دَور میں یہ سعادت کسے نصیب ہوتی ہے؟ یہی باعث ہے کہ جدید اردو فکشن کے کردار نہ تو ہیرو ہیں۔ اور نہ ہی شہید، وہ محض انٹی ہیرو (Anti-Hero) یا نان پرسن (Non-Person) ہیں، جو اینگری ینگ مین (Angry youngmen) بیٹس (Beats) اور وجودیت پرستوں (Existentialists) کی تحریروں سے ہماری فکشن میں داخل ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ کردار ایلی نیشن (Alienation) کا شکار ہیں۔ اس لئے یہ اپنے ماحول اور یہاں تک کہ خود سے بھی اجنبی نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی گم شدہ ذات کی تلاش میں نہ جانے کب سے اقدار کے خلاء اور لغویت کی اندھی گلیوں میں بھٹک رہے ہیں، جلا وطن، تنہا، اور دہشت زدہ۔ تعجب نہیں کہ یہ لوگ تمام آدرشوں کے باطل اور خوش آئند مستقبل اور بہتر زندگی کے لئے تمام تر جدوجہد کے لاحاصل ثابت ہونے کے بعد سسی فس (Sisyphus) کی ذہنی نسل میں شامل ہو گئے ہیں۔

ذات کی تلاش انسان کی ایک ابدی جستجو ہے اور اس لئے ہر دَور کے ادیب کا ایک اہم موضوع بھی لیکن کوئی ادیب تلاش کے اس عمل کو اپنے افسانے یا ناول میں کس طرح پیش کرتا ہے۔ یہ اس کی شخصیت اور تخلیقی صلاحیت اور نقطۂ نظر اور فلسفہ حیات پر منحصر ہے۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں ایلی نیشن (Alienation) کے تصور کو سب سے پہلے کارل مارکس (Karl Marx) نے پیش کیا۔ اس نے شہروں میں بڑھتی ہوئی بھیڑ میں فرد کے بے چہرہ اور بے نام ہونے کے فلسفیانہ تفسیریں پیش کیں۔ موجودہ دَور میں سگمنڈ فرائیڈ (Sigmund Freud) نے لاشعور کی گہرائیوں میں ڈوب کر ذات کی اہمیت کو پہچاننے کی کوشش کی اور فرد کی محرومیوں کو موجودہ تہذیب کی مایوسیوں کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔ اُردو ادب میں مارکسی فلسفے اور فرائیڈی نفسیات کے اثرات قریب قریب ایک ہی دَور میں داخل ہوئے۔ جس کے باعث نئے ادیبوں نے طبقاتی کشمکش اور جنسی جبر کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ اس دَور کے بیشتر افسانوں میں مارکس اور فرائیڈ گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان کے افسانے ا لبرژوازی استحصال اور جنسی جبر دونوں کے خلاف پروٹسٹ کی شکل میں سامنے آئے۔ یہ امر دلچسپ ہے کہ موجودہ دور میں کئی مفکر اور ادیب انسان کی آزادی کی جدوجہد میں مارکس اور فرائیڈ کے نظریات کو ایک اکائی کے روپ میں پیش کر رہے ہیں۔ ایرک فرام (Erich Fromm) اور وجودیت پرست ادیب ژاں پال سارتر (Jean Paul Sartre) کی تحریریں جدلیاتی طریقہ کار اور تحلیل نفسی کے امتزاج کو پیش کرتی ہیں۔

مارکسیت کے زیر اثر اُردو فکشن میں سماجی حقیقت نگاری کا دَور شروع ہوا اور ترقی پسند تحریک ... مستحکم ... جہاں ...

آزادی کے ابتدائی دور میں اس تحریک کے زیر اثر افسانہ نگاروں نے کئی قابل قدر افسانے دیئے۔ بیشتر افسانے تقسیم سے پیدا شدہ صورت حال کے موضوعات سے متعلق تھے۔ ان افسانوں میں فنی احساس زیادہ نمایاں تھا۔ ترقی پسند تحریک میں مارکسی، نیم مارکسی یہاں تک کہ رومانی افسانہ نگار بھی شامل ہوئے۔ کرشن چندر، بیدی، عصمت چغتائی، غلام عباس، علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری، اختر انصاری، اختر اورینوی، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، رامانند ساگر، عزیز احمد، ممتاز شیریں، دیویندر ستیارتھی وغیرہ نے آدرش، حقیقت اور رومان کے امتزاج سے انسان دوستی اور سماج کے بارے میں ترقی پسند فکر کی اشاعت کی۔ ان میں بعض اشتراکی سیاست کے حامی نہیں تھے لیکن وہ مساوات اور سماجی تبدیلی کے خواہاں ضرور تھے۔ حسن عسکری اور ممتاز شیریں نے اس دور میں اپنی الگ روش اختیار کی حسن عسکری نے فرد کی نفسیاتی الجھنوں، جنسی کجرویوں اور لاشعور کی گہرائیوں کی داخلی کیفیات کو اپنے افسانوں میں پیش کرنے کی کوشش کی لیکن آزادی کے بعد جیسے اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کے سوتے خشک ہو گئے۔ ادب میں کومٹ منٹ (Commitment) کے ضمن پرچار کرتے کرتے وہ خود نہایت ہی تنگ نظر اور پسماندہ قسم کی وابستگی کا شکار ہو گئے۔

یہاں ذکر ان ادیبوں کا ہے جو آزادی کے بعد بھی لکھتے رہے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے بیشتر انہیں موضوعات پر طبع آزمائی جاری رکھی جن پر وہ آزادی سے قبل لکھ چکے تھے۔ ان میں بہت کم ادیب آج بھی تخلیقی طور پر زندہ ہیں۔ سعادت حسن منٹو کی موت نے اُردو فکشن سے ایک منفرد آواز کو چھین لیا جسے کسی بھی بندھے ٹکے ہوئے یا تنقیدی زاویئے میں بند نہیں کیا جاسکتا۔ وہ انقلابی تھا لیکن آمریت پسند نہیں۔ وہ جنس پر لکھتا تھا لیکن فرائیڈی طرز سے ہٹ کر، وہ اخلاق پرست نہیں تھا لیکن اس کے کردار گہری انسانی ہمدردی کے حامل تھے۔ وہ فن کو اولین درجہ دیتا تھا لیکن انسان اور زندگی سے اس کی گہری وابستگی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ منٹو کا تجربہ یکسر منٹو کے افسانوں کو محض تاریخ کے حوالے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کا تجربہ اُردو فکشن کی رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے جسے شعوری اور غیر شعوری طور پر بعض نئے افسانہ نگاروں نے قبول کیا ہے۔ آزادی کے بعد شائع ہونے والے منٹو کے افسانوں میں ٹوبہ ٹیک سنگھ، ٹھنڈا گوشت اور موذیل اردو کے ناقابل فراموش افسانے ہیں۔

دھیرے دھیرے ترقی پسند افسانے میں تبلیغ، خطابت، نعرے بازی کا رجحان زیادہ نمایاں ہونے لگا یہاں تک کہ فکشن میں بھی اشتمالی ریاست کی بدلتی ہوئی پالیسی کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ افسانوی کردار سیاہ و سفید میں تقسیم ہونے لگے۔ فنی تقاضوں کو نظر انداز کیا جانے لگا اور آدرشی وابستگی نے ایسی مکروہ صورت اختیار کر لی کہ آمریت کے مظالم اور شخصی جبر کو بھی سراہا جانے لگا۔ ایک بار صفائی کی مہم جو شروع ہوئی تو اس کی زد میں غیر اشتمالی ترقی پسند، لبرل اور نفسیاتی افسانوں کے خالق سب ہی آ گئے۔ یہ اردو فکشن کے بحران کا دور تھا۔ اس بحران سے گزرنے والے جن ادیبوں نے تخلیقی عمل جاری رکھا ان میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، علی عباس حسینی، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، ممتاز شیریں اور قرۃ العین حیدر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کے ادبی طور پر زندہ رہنے کا باعث ان کی تخلیقی قوت ہے اور دوسرا اہم باعث یہ ہے کہ ان افسانہ نگاروں کی جڑیں ہماری تہذیب اور معاشرے میں بہت گہری ہیں۔

دوسری طرف فرائیڈی نفسیات کا اثر جاری رہا، جنسی اور لاشعوری کے ملے جلے اثرات کو ہندوستانی معاشرے کے پس منظر میں پیش کرنے کا رجحان ایک ترقی پسند رجحان تھا کیونکہ اس رجحان کے تحت ہمارے سماج میں مروجہ دقیانوسی فکر اور فرسودہ رسم و رواج کے خلاف ان ادیبوں نے نسوانی آزادی اور جنس کے صحت مند نقطۂ نظر کو فکری اور جذباتی گہرائی سے پیش کیا۔ عصمت چغتائی اور ممتاز مفتی نے اس طرز کے کئی پُر اثر افسانے لکھے۔ انہوں نے جنسی گھٹن، جنس کے غیر معمولی رشتوں، نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی کجرویوں کو اپنے منفرد انداز میں پیش کیا۔ ممتاز مفتی اور عزیز احمد نے تحلیل نفسی، خواب، شعور کے بہاؤ، آزاد تلازمۂ خیال اور لاشعوری محرکات کو اپنے افسانوں میں بہ کمال خوبی پیش کیا۔ ممتاز مفتی نے جنس کے لاشعوری اور ذہنی پہلو پر زیادہ زور دیا۔ وہ اپنے کرداروں کا مطالعہ نفسیاتی اور علمی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں جس کے باعث ان کے افسانوں میں کوائف مرض زیادہ اور تخلیقی اشاریت کم نظر آتی ہے۔ یہی باعث ہے کہ ان کے کردار یک رُخے ہوتے ہیں۔

عصمت چغتائی اپنے کرداروں کا تجزیہ اکتسابی نظر سے نہیں کرتیں بلکہ انہیں اپنے ماحول میں پوری طرح رسے بسے ہونے کے روپ میں پیش کرتی ہیں۔ اور پھر اُن کی تہہ در تہہ شخصیت کو بے نقاب کرتی ہیں۔ جس سے ان کی عکاسی میں نئی بعد کا شعور ملتا ہے۔ عصمت چغتائی نے اپنے کرداروں کا تجزیہ اپنے ماحول کے پس منظر میں کیا ہے۔ اس لئے وہ ایک مقام پر آکر ٹھہر نہیں گئیں۔ انہوں نے ہمیں اپنے افسانوں میں نئے نئے کرداروں سے روشناس کرایا۔ آزادی کے بعد بالخصوص فسادات کے پس منظر میں لکھے گئے اُن کے افسانے اپنی منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ بچھو، پھوپھی، چار بڑے، جڑیں، دو ہاتھ، ننھی کی نانی اور چوتھی کا جوڑا، اُن کے اس دور کے قابل قدر افسانے ہیں۔

عصمت چغتائی کے افسانوں کی روایت خواتین افسانہ نگاروں میں بڑی مقبول ہوئی۔ اس روایت کو ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جیلانی بانو، شکیلہ

اختر، واجدہ تبسم، رضیہ فصیح احمد اور بانو قدسیہ نے آگے بڑھایا۔ ترقی پسند نظریات کی آمیزش سے رضیہ سجاد ظہیر نے اس روایت کو نئے پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ جیلانی بانو کے افسانے "ادھوری بات" اور "موم کی مریم" اور واجدہ تبسم کا "گلستاں سے قبرستان تک" اور رضیہ سجاد ظہیر کا "خاص موقع کے لئے" اس دور کے اہم افسانے ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ روایت مفید ثابت ہوئی کہ خواتین افسانہ نگاروں نے گہرے طور پر اپنے معاشرے کی حقیقت پر اور بے باک ترجمانی کی۔ لیکن دوسری طرف یہ مضر اثر بھی ہوا کہ وہ مسلم معاشرے کی عکاسی تک ہی محدود ہو کر رہ گئیں اور زندگی کے دوسرے تجربات کو اپنی تخلیقات میں شامل نہیں کر سکیں جس کے باعث ان کے کرداروں میں اور ان کو پیش کرنے کے انداز میں یکسانیت آ گئی۔ واجدہ تبسم نے دوسری خواتین افسانہ نگاروں کی نسبت جنس کے موضوع کو قدرے زیادہ بے باکی سے پیش کیا۔ بعض اوقات تو یہ بھی گمان ہونے لگتا ہے کہ وہ شاید محض لذت پرستی کے لئے ایسا کر رہی ہیں۔ جمیلہ ہاشمی نے فسادات کے پس منظر میں اپنے کرداروں کے جذباتی اور نفسیاتی عوامل کو ایک متحرک انداز میں پیش کر کے اس محدود دائرے سے باہر نکلنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اس روایت کو جس افسانہ نگار نے بالکل قبول نہیں کیا وہ ہیں قرۃ العین حیدر۔ ان کے افسانے ہم عصر شعور کی روشنی میں انسانی تہذیب اور حیات و کائنات کے مسائل کا فلسفیانہ شعور پورے خلوص اور فنی محاسن سے پیش کرتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں گہرائی بھی ہے اور وسعت نظر بھی۔ ان کے افسانے تقسیم اور مہاجرت کے اندرونی کرب اور جلاوطنی کے احساس کو بڑی تاثر انگیزی سے پیش کرتے ہیں جس میں انسان دوستی اور آفاقیت کے پہلو غالب رہتے ہیں۔ "جلاوطن"، "سیتا ہرن"، "ہاؤسنگ سوسائٹی" اور "پت جھڑ کی آواز" ان کے بہترین افسانوں میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔

ہندوستانی تہذیب اور اپنی جڑوں کا احساس راجندر سنگھ بیدی میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ہندوستانی سماج میں اپنے کرداروں کی جذباتی زندگی کو جس گہرے اور اثر انگیز طریقے اور فنی مہارت سے بیدی نے پیش کیا ہے، اس کی دوسری مثال اردو ادب میں موجود نہیں۔ ان کی وژن (Vision) فنی شعور اور انسان کے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر لکھنے کی خوبی نے "لاجونتی"، "اپنے دکھ مجھے دے دو" اور "گرہن" سے پرے، کو اردو کے زندہ جاوید افسانے بنا دیا ہے۔

اپنے تہذیبی ورثے کو جمالیاتی ذوق کے ساتھ پیش کرنے والوں میں دیویندر ستیارتھی کے افسانے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے افسانے اپنا مواد اجتماعی لاشعور کے سرچشمے سے حاصل کرتے ہیں۔ ان کے ذہن کی تعمیر لوک گیتوں اور دیومالائی عناصر سے ہوئی ہے جس کا رنگ قریباً ان کے ہر

افسانے پر غالب ہے۔ ادھر دیویندر ستیارتھی نے جدیدیت کی رو میں جو افسانے لکھے ہیں وہ الفاظ کی شعبدہ بازی اور لفاظی کا نمونہ بن کے رہ گئے ہیں۔ یہ افسانے ثابت کرتے ہیں کہ جب افسانہ نگار اپنی جڑوں سے کٹ کر محض کرافٹ (Craft) کے زور پر یا فیشن کے لئے ادب تخلیق کرتا ہے تو وہ کتنا مصنوعی بن جاتا ہے۔

آزادی کے بعد افسانہ نگاروں کی جو دوسری نسل سامنے آئی ان میں انور عظیم، شوکت صدیقی، اشفاق احمد، غیاث احمد گدی، رام لعل، اقبال متین، انتظار حسین، عبداللہ حسین اور جوگندر پال کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں ایسے افسانہ نگار بھی شامل ہیں جنہوں نے آزادی سے پہلے بھی افسانے لکھے لیکن ان کو شہرت آزادی کے بعد ملی۔ ان کے علاوہ افسانہ نگاروں میں اقبال مجید، عوض سعید، رتن سنگھ، قاضی عبدالستار، کلام حیدری، [illegible] قیصر تمکین اور ظفر اوگانوی وغیرہ شامل ہیں۔ دوسری نسل کے اولین گروپ میں ترقی پسند تحریک کے عروج اور زوال کے ساتھ ساتھ جدیدیت کے ابتدائی نقوش بھی ملتے ہیں۔ دوسرے گروپ کے افسانہ نگار عام طور پر اپنی منفرد حیثیت قائم نہیں کر سکے۔ وہ بغیر کسی نظریاتی یا ادبی وابستگی کے افسانے تخلیق کرتے رہے۔ اس نسل نے اردو ادب کو کئی اچھے افسانے دیئے ہیں جن میں "درد کا کوئی ساحل نہیں" (انور عظیم) "تیسرا آدمی" (شوکت صدیقی) "گڈریا" (اشفاق احمد) "پیاسی چڑیا" (غیاث احمد گدی) "چاپ" (رام لعل) "گرہویا رڈ" (اقبال متین) "زرد کتا" (انتظار حسین) "ندی" (عبداللہ حسین) "بازیافت" (جوگندر پال) "ٹیلی فون" (اقبال مجید) "تنہا تنہا" (عوض سعید) "جس تن لاگے" (رتن سنگھ) "دود چراغ محفل" (قاضی عبدالستار) "اعتراف" (قیصر تمکین) "میں اور میں" (عابد سہیل) "روشنی" (کلام حیدری) "بیچ کا ورق" (ظفر اوگانوی) وغیرہ ہیں۔

ان افسانہ نگاروں میں انتظار حسین نے اپنی منفرد حیثیت کے باعث جدید افسانہ نگاروں میں کافی شہرت حاصل کر لی ہے۔ انہوں نے داستان کے رنگ میں بڑے پُر اثر علامتی افسانے تحریر کئے ہیں۔ جو کہ ایک ماحول کے پس منظر میں مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ پیش کرتے ہیں۔ جدید دور میں علامتی افسانوں کی تخلیق میں جدیدیت کو کافی تقویت ملی۔ نئے افسانہ نگاروں میں جدیدیت کی حامل تخلیقات پیش کرنے میں بلراج مینرا، سریندر پرکاش، انور سجاد، بلراج کومل، کمار پاشی، احمد ہمیش اور خالدہ اصغر نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔ ان ادیبوں کے اہم علامتی افسانوں میں "ماچس" (بلراج مینرا) "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" (سریندر پرکاش) "ڈوب رہا ہوا اور لنجا" (انور سجاد) "امشب صدائے تیشہ" (بلراج) "کنواں" (بلراج کومل) "پہلے آسمان کا زوال" (کمار پاشی) "دریچے میں گرا ہوا قلم" (احمد ہمیش) اور "شہزادہ پایہ" (خالدہ اصغر) شامل کئے جا سکتے ہیں۔

[illegible] جدیدیت کے ہم معنی نہیں اور نہ ہی یہ محض جدید دور کی ہی دین ہیں۔ [illegible] احمد علی [illegible] "مہالکشمی" اور "مہارلکرہ" جیسے تاثر انگیز علامتی، تجریدی اور تمثیلی انداز کے افسانے پیش کر چکے ہیں۔ کرشن چندر کا "غالیچہ" اور "ایک شہزادی کی تصویر" اور ممتاز شیریں کا "میگھ ملہار" اہم علامتی افسانے ہیں۔ کرشن چندر جن کے فن کے زوال پر آج سب سے زیادہ مایوسی کا اظہار کیا جا رہا ہے درحقیقت اُردو افسانے میں [illegible] قریب قریب ہر نئے طرز کے موجد رہے ہیں۔ انہوں نے اردو افسانے میں [illegible] کامیاب تجربے کئے ہیں جن کی دوسری کوئی مثال نہیں [illegible] کے بارے میں ممتاز شیریں [illegible] "ان کے [illegible] اور طرح کا تجربہ کرنا کھیل سا ہو گیا تھا اور انہوں نے ایک [illegible] تھی۔ [illegible] ایک افسانے میں [illegible] کو بدل کر نئی زبان بنانے کا حوصلہ [illegible] تجربہ بھی کیا [illegible] صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اینٹی پلاٹ کے علاوہ بھی تصور کے تحت افسانے میں [illegible] مروج اور کلائمکس کے بغیر "[illegible] کے سائے میں" جیسے افسانے لکھے اور "غالیچہ"، "بت جاگتے ہیں"، "پانی کا درخت" جیسے تمثیلی اور علامتی افسانے بھی۔ ان افسانوں میں تاثر ہی نہیں شدت تاثر بھی موجود رہے۔ اس نے افسانے کے فارم اور تکنیک میں نئے اور انوکھے تجربے ضرور کئے لیکن اس کا تجربہ محض تجربہ نہیں تھا اس نے اپنے افسانوں کے فارم اور تکنیک میں اگر کوئی نیا تجربہ کیا بھی تو صرف اپنے مافی الضمیر اور موضوع کے فن کارانہ اور موثر اظہار کے لئے جدید افسانہ نگاروں کی طرح صرف قارئین کو چند لمحوں کے لئے چونکانے کی غرض سے نہیں۔"

کرشن چندر کا نام جدید افسانہ نگاروں کے ساتھ لینے میں کچھ نقادوں کو دشواری ضرور محسوس ہوگی۔ لیکن اس اقتباس کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کرشن چندر اپنے رومانی ذہن کے باوجود جدید انسان کے کرب اور مسائل کو بخوبی سمجھتے ہیں اور انہیں پیش کرنے کے فنی راز سے بھی واقف ہیں اور اہل بھی ہیں۔ وہ تجریدیت یا علامت کو محض فیشن یا رائج اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کرتے۔ جدید دور کے علامتی افسانوں میں اپنے ہم عصر دوسرے افسانوں کی طرح فرد کی تنہائی، دہشت اور ذات کے بحران کا کرب بدرجہ اتم موجود ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ علامتی افسانوں کو جو سب سے بڑا خطرہ درپیش آیا وہ یہ ہے کہ یہ افسانے زندگی کی گہرائی اور وسعت اور نئے بعد کو پیش کرنے کا ذریعہ بن کر محض نئی چونکا دینے والی تکنیک کا ہی حربہ بن جاتے ہیں۔ کامیاب علامتی افسانے پیش کرنے والے بھی اس بدعت کا شکار ہوئے ہیں۔ سریندر پرکاش کا افسانہ "ملفارمس" بلراج مینرا کا "پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ" اور انور عظیم کا "کولمبس اور کلشے" (اس کا اعتراف مصنف نے خود کیا ہے) اس نوعیت کے حامل ہیں لیکن عام طور پر ان افسانہ نگاروں نے فرد اور زندگی کے رشتے کو گہرے طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ان میں وہ تخلیقی صلاحیت موجود ہے جس کے باعث وہ اس فہم کی فنی ترسیل کا ذریعہ بن سکیں۔

سریندر پرکاش نے دیومالائی عناصر کے ذریعہ اجتماعی لاشعور کے پس منظر میں جدید انسان کی تہہ در تہہ شخصیت اور کرب کو پُر اثر طریقے سے پیش کیا ہے۔ مینرا کی حزنیت اپنے وجود کی زندگی کو گرفت میں لانے کی جھنجھلاہٹ کو پیش کرتی ہے۔ جس میں دہشت کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ وہ اپنی علامتوں کو سریندر پرکاش کی طرح دیومالائی عناصر سے نہ جوڑ کر موجودہ دور کی بے رحم حقیقتوں سے جوڑتے ہیں جیسا کہ ان کے افسانے "ریپ" سے ظاہر ہے۔ مینرا کا موضوع جنس نہیں بلکہ ان کے نزدیک جنس بھی ایک علامت ہے۔ اس علامت کو انہوں نے بھرپور معنویت سے استعمال کیا ہے۔ مینرا زندگی کو مارکس اور فرائیڈ کی اصطلاحات میں اپنے نئے بائیں بازو کے نظریے کے باوجود نہیں سمجھتے بلکہ وہ فرد کے جذبات کو خمیر و شر میں جانبدارانہ مداخلت کے ذریعے پیش کرنے کے قائل ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد اُردو افسانے میں جن نئے رجحانات کی پرورش ہوئی ہے۔ ان میں نئے فکر و احساس کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان افسانوں میں ترقی پسندی کی کٹر پرستی سے انحراف اور آدرشوں کے پامال ہونے کا کرب موجود ہے۔ ان میں جہاں زندگی کی بے معنویت کا شعور ملتا ہے وہاں فنی تجربے بھی ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ ان میں کہانی پن اور پلاٹ غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ ان میں اینٹی پلاٹ اور اینٹی افسانے کی جھلک ملتی ہے۔ یہاں تک کہ کردار بھی اب ضروری نہیں کہ گوشت پوست کے ہوں۔ ان میں افسانے کی روایتی وحدت اور ربط اب ضروری نہیں ہے۔ ان میں کچھ افسانہ نگار ایسے بھی ہیں جو زمان و مکاں کا ماورائی تصور اور کسی حد تک انسان کا مابعد الطبیعاتی نظریہ پیش کرتے ہیں لیکن بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان افسانوں میں مستند احساس کو کم اور فکری احساس کو زیادہ دخل ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ اپنے افسانوں کو شعوری طور پر تجریدی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بیشتر جدید افسانہ نگار اس امر کو فراموش کر دیتے ہیں کہ وجودیت پرستی نے جہاں زندگی کے لغو اور بے معنی ہونے کا تصور پیش کیا ہے وہاں ارادے اور عمل کی آزادی پر بھی زور دیا ہے۔ اسی باعث وہ ادب میں وابستگی (Commitment) کے قائل ہیں۔ خودکشی کے معاملے میں بغاوت کے علمبردار ہیں۔ اُردو کے بعض جدید افسانہ نگار ہر قسم کی وابستگی کے خلاف ہیں۔ اور وہ فرد اور ذات کو ہی مقدم سمجھتے ہیں۔ اور وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ خالص ادب کی تخلیق کر رہے ہیں۔ خالص ادب جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ یہ دعویٰ محض کچھ سیاسی اور معاشرتی موضوع کو ادب کے دائرے سے خارج کرنے کا بہانہ ہے۔ اسی لئے جدیدیت کے خلاف جو ردِ عمل شروع ہوا ہے اس میں یہ سوال کافی اہم ہے کہ جدید افسانے کا کردار

سسی فس (Sisyphus) کی نسل سے کیوں ہے پرو میتھیس (Prometheus) کی نسل سے کیوں نہیں۔ جدیدیت بھی ترقی پسندی کی طرح روایت بنتی چلی جا رہی ہے اس میں متحرک اور جدلیاتی عمل کی تازگی اور قوت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ شاید ہمارا افسانہ ایک نئے بحرانی دور سے گزر رہا ہے اور اب پھر ایک نئے افسانوی رجحان کا سورج طلوع ہونے والا ہے۔

افسانے کی نسبت ناول میں ہم عصر رجحانات اور جدید حسیت کی عکاسی بہت کم ملتی ہے تکنیک کے جو نئے تجربے افسانے میں ہو رہے ہیں، اُردو ناول ان سے جیسے بالکل اچھوتا ہے۔ چند مثالوں کو چھوڑ کر اردو ناول ابھی تک روائتی طرز اور ہیئت کا ہی حامل ہے۔ حالانکہ فکری سطح پر اس میں چند تبدیلیاں ضرور رونما ہوئی ہیں۔ مغرب میں ناول ایک مقبول ادبی صنف ہے۔ اس لئے نثری ادب میں جو اہمیت ناول کو حاصل ہے وہ افسانہ کو نہیں۔ اس لئے جدیدیت کی بحث کا مرکز بھی ناول ہی ہے نہ افسانہ۔ اردو ناول میں ماسوائے "شعور کے بہاؤ" کی تکنیک کے جو اب روایت بن چکی ہے۔ دوسرا کوئی اہم فنی تجربہ نہیں ہوا۔ اس تکنیک کا اثر بھی شروع شروع میں احمد علی کی تحریروں اور بعد میں قرۃ العین حیدر کی ناولوں تک ہی محدود ہے۔

شعور کے بہاؤ کا براہ راست رشتہ فرد کی نفسیات اور وقت کے تصور کے ساتھ ہے۔ وقت کے تصور کو مغرب میں برگساں جیسے فلسفی اور آئین سٹائن جیسے سائینسداں نے مقبول کیا۔ ہندوستانی فلسفے اور مذہب میں اس تصور کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ حیات و موت کے مسائل اور آفاقی شعور کی تفسیریں ہندوستانی فلسفے میں ملتی ہیں۔ وہ مغربی فلسفے میں موجود نہیں، کارل ژونگ (Carl Jung) نے اپنی نفسیات میں اس سے ضرور استفادہ کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے وقت کے اس تصور کو ہندوستانی فلسفے سے اخذ کیا ہے اور کارل ژونگ کے اجتماعی لاشعور کی روشنی میں اس کا فلسفیانہ استعمال کیا ہے جبکہ عزیز احمد فرائڈ کی لاشعور تک ہی محدود رہ گئے۔ عزیز احمد تحلیل نفسی، آزاد تلازمۂ خیال اور خواب وغیرہ کے عناصر سے اپنے ناول کے تانے بانے بنتے ہیں۔ لیکن قرۃ العین حیدر تحلیل نفسی کے بجائے ہندوستانی فکر کے نظریے Integrated نفس کو قبول کرتی ہیں۔ ہمارے ہاں جدیدیت کے بہت سے عناصر مغرب سے مستعار ہیں۔ جو ان ممالک کے مخصوص ماحول سے متعلق تو صحیح ہیں لیکن جب ان کا اطلاق ہندوستانی ماحول پر کیا جاتا ہے تو وہ اجنبی محسوس ہوتے ہیں۔ اس معنی میں اُردو ناول جدید نہیں۔

تخلیقی ناول نگار کی یہ مجبوری ہے کہ وہ افسانہ نگار کی طرح زندگی کے ایک ٹکڑے یا فرد کے ایک پہلو کی عکاسی کر کے تشکیل فن نہیں کر سکتا۔ اُسے مکمل زندگی اور پورے انسان کا احاطہ کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ جدید ذہن کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اپنے ماحول سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ اور اس کی جڑیں اپنی تہذیب میں گہری ہوں۔ اسی صورت میں وہ عظیم ناول کی تخلیق کر سکتے ہیں جیسا کہ راجندر سنگھ بیدی اور قرۃ العین حیدر کے ناول ہیں۔ جہاں تک ناول کی ادبی روایت کا تعلق ہے مرزا محمد ہادی رسوا کی امراؤ جان ادا اور پریم چند کی گئو دان کے علاوہ شاید ہی کوئی دوسرا ناول ایسے ناول کی روایت بن سکے جن ناول نگاروں نے پریم چند کی ... ناول کو اپنی روایت بنایا ہے وہ کسی اہم ناول کی تخلیق ... اس کی وجہ ... کی قرأت اور آورش کردار نگاری کے باعث ... کرنے کی کیفیت موجود نہیں۔ خالد عابد حسین کے قریب ... نہ صرف آدرش کی تکمیل کی خواہش رکھتے ہیں بلکہ روایتی اسلوب بیان کے حامل ہیں۔ پانچ جلدوں پر مشتمل حیات اللہ انصاری کی انعام یافتہ "لہو کے پھول" ایک کہنہ مشق ادیب کی تخلیق ہونے اور اپنی ضخامت کے باوجود ایک عظیم ناول نہیں بن سکی بمحض ضخیم ہو کر ہی رہ گئی ہے اس کا باعث بھی یہی ہے کہ وہ آزادی کی جدو جہد کی تاریخ مرتب کرنے میں زیادہ کم دلچسپی رکھتے تھے اس کے تخلیقی پہلو کو اجاگر کرنے نہ کسی ادیب کے لئے ناول میں رقم اس دور کی تاریخ ہی نہیں بلکہ فلسفۂ تاریخ کے مطالعہ کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے "آگ کا دریا" اور عبداللہ حسین نے "اُداس نسلیں" میں بھی تاریخ سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن انہوں نے اسے افراد کی نفسیات سے منسلک کر کے پیش کیا ہے اور ہندوستانی تہذیب کے مختلف دھاروں سے جوڑ دیا ہے۔ "آگ کا دریا" میں قرۃ العین حیدر نے ثقافتی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا ہے اس لئے وہ کردار نگاری پر کم توجہ دے سکیں جبکہ عبداللہ حسین نے کردار نگاری اور فنی خوبیوں پر زیادہ زور دیا ہے۔

"اداس نسلیں" ہندوستانی تاریخ کے ایک اہم دور ۱۹۱۴ء-۴۷ء کو پیش کرتی ہے۔ اس میں تواریخ، واقعات اور کرداروں کی پیچ در پیچ ساخت کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے اور یہ سب کچھ ایک مربوط ڈھانچے میں منتقل ہو گئے ہیں۔ ناول میں انسانی جذبات و احساسات، مسرتوں اور خواہشوں ناکامیوں اور نامرادیوں، خوابوں اور خوف کو بڑے جاندار طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ "اداس نسلیں" ہمارے دور کے پیچیدہ ذہن کے کرب کو قاری تک منتقل کرنے میں کامیاب ہے آزادی کے بعد تین چار ناولوں کو ادبی اہمیت حاصل ہے "اداس نسلیں" ان میں ایک اہم ناول ہے

دوسری ناول جو ہندوستانی تہذیب کے لاشعوری عناصر اور فلسفے کو فن کارانہ صلاحیتوں سے پیش کرنے میں کامیاب ہوئی ہے وہ ہے قرۃ العین حیدر کی تخلیق "آگ کا دریا" یہ ناول ہندوستانی تہذیب کے قریب ڈھائی

ہزار سالوں کی روح کو سموئے ہوئے ہے۔ گوتم، ہری شنکر، چمپا اور کمال اسی تہذیبی دھارے میں بہتے ہوئے، مختلف روپ دھارن کرتے ہوئے، ابھرتے ڈوبتے حصول آزادی کے اہم موڑ تک آپہونچتے ہیں، جہاں تاریخ کا ہی نہیں تہذیب کا بھی فیصلہ ہوجاتا ہے۔ پوری نسل کے تہذیبی سمبلز اور اجتماعی لاشعور کو قرۃ العین حیدر نے پوری فکری اور جذباتی گہرائی سے علامتی اور تاثراتی انداز سے خوابوں اور یادوں کے فیتے پیش کیا ہے۔ ناول میں ماضی، حال اور مستقبل یکے بعد دیگرے آنے والے دور نہیں بلکہ وقت کی ایک مسلسل کیفیت کو پیش کرتے ہیں۔ "آگ کا دریا"، خدا اور کائنات، وجود اور عدم وجود، فرد اور ضمیر ذات، جبر اور اختیار، مذہب اور سائنس، عقل اور عشق، شعور اور لاشعور کی آمیزش سے پیدا جستجو اور تلاش، کرب اور مسرت کی عکاسی کرتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے ناول کو اس کی مروجہ فنی اور فکری سطح سے بلند کرکے ایک اہم صنف بنا دیا ہے۔ جس میں کردار، واقعات، مکالمے، تاثرات اور یادیں ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہوجاتے ہیں کہ زندگی کے ایک مکمل پیٹرن (Pattern) کے وجود کا احساس ہوتا ہے۔ "آگ کا دریا" قرۃ العین حیدر کی دوسری ناولوں "میرے بھی صنم خانے" اور "سفینہ غم دل" سے فنی طور پر کمزور ہے لیکن ناول محض تکنیک کا ہی مسئلہ نہیں بلکہ حیات و موت کے اسرار و رموز کی تلاش اور فلسفیاتی فکر کا نتیجہ بھی ہے۔ کوئی بھی اہم تخلیق محض تکنیک کے نئے پن یا مکمل ہونے کے باعث، زندہ نہیں رہتی۔ بلکہ اس کے برعکس یہ بات زیادہ صحیح ہے کہ تکنیک کی کمزوریوں کے باوجود ناول کی عظمت، مصنف کی شخصیت اور اس کے فلسفۂ حیات اور فکری گہرائی اور نقطۂ نظر کے باعث اہم رہی ہے۔ "آگ کا دریا" کی وجودیت پرستانہ تفسیریں بھی پیش کی گئی ہیں۔ ایک حد تک یہ ناگزیر بھی تھا۔ کیونکہ ہندوستانی فلسفے میں بدھ مت ہی ایسا فلسفی نظام ہے جو وجودیت پرستی کے سب سے زیادہ قریب ہے قرۃ العین حیدر کی دوسری ناولیں "چائے کے باغات" اور "آخر شب کے ہم سفر" ان کے فنی اور ذہنی ارتقاء کو بخوبی پیش کرتے ہیں۔

ممتاز مفتی کی ناول "علی پور کا ایلی" کرداروں کی لاشعوری نفسیات پر زیادہ مرکوز ہے نہ کہ محض جنسی میلانات پر۔ ممتاز مفتی جنس کے جسمانی پہلو سے زیادہ اس کے ذہنی پہلو کو پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ "علی پور کا ایلی" نفسیاتی جبریت کا کسی حد تک حامل ہوتے ہوئے بھی عمیق کردار نگاری کی جانب ایک اہم قدم ہے جبکہ عزیز احمد کی ناولیں نفسیاتی فطرت نگاری تک ہی محدود رہتی ہیں۔

اجتماعی لاشعور، تہذیبی زندگی اور عمیق کردار نگاری کی سب سے اہم مسائل راجندر سنگھ بیدی کی ناول "ایک چادر میلی سی" ہے۔ بیدی، اپنے ماحول اور اس کے باسیوں کو نہ ہی آدرش سائڈر سمجھتے ہیں۔ اور نہ ہی ایک آوٹ سائڈر کی نظر سے انہیں دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے اردگرد کی زندگی میں ڈوب کر لکھتے ہیں لیکن جب وہ تخلیق کرتے ہیں تو فنی طور پر بے رحم ہوتے ہیں اور انسانی طور پر ہمدرد۔ جذباتی کشمکش اور داخلی زندگی کے تیز و تند دھاروں کو بیدی انسانی نفسیات اور فلسفۂ حیات، پلاٹ اور کردار کے تانے بانے میں بڑی چابک دستی سے بُن کر کبھی ہلکے اور کبھی گہرے رنگوں میں تصویر کو کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ وہ سیدھے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ ان کی علامتیں اور تمثیلیں حقیقت کی ہی رنگا رنگ تصویریں پیش کرتی ہیں بیدی نے اپنے کرداروں کی پیچ در پیچ شخصیت کو جس فنی احتیاط اور ویژن سے پیش کیا ہے وہ بیدی کی منفرد حیثیت کو تسلیم کراتی ہے۔ روزمرہ کی زندگی کی معمولی معمولی جزیات کو زندگی کی اہم دستاویز بنا کر پیش کرنا بیدی کے فن کا ہی کمال ہے۔

اس دور میں ناولوں کی تعداد کی کمی نہیں لیکن ان میں سے بیشتر ناول متذکرہ ناولوں کے معیار تک نہیں پہنچ سکے۔ چند اہم ناولوں میں شوکت صدیقی کی "خدا کی بستی" اور "کوکا بیلی" جمیلہ ہاشمی کی "تلاش بہاراں" اور "داغ فراق" مہندر ناتھ "آدمی اور سکے" اور "رات اندھیری ہے" خواجہ احمد عباس کی "اندھیرا اور اجالا" اور "چار دل چار راہیں" رضیہ سجاد ظہیر کی "پھول اور سموم" رضیہ فصیح احمد کی "آبلہ پا" عصمت چغتائی کی "معصوم" اور واجدہ تبسم کی "شجر ممنوع" شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر ناول سماجی جبریت اور ٹائپ کرداروں پر مبنی ہیں۔ جن میں سیاہ اور سفید کرداروں کی بہتات ہے۔ ان ناولوں کی انسانیت پرستی تو مستحکم ہے لیکن یہ فنی طور پر کمزور ہیں۔ ان میں زندگی کی پیچیدگیوں کو سہل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ فسادات سے متعلق آزادی کے فوراً بعد رامانند ساگر نے "اور انسان مر گیا" اور قدرت اللہ شہاب نے "یا خدا" پیش کئے۔ ان ناولوں کی ذہنی ساخت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ مہاجرین کے مسئلے کو شوکت صدیقی نے ہی پورے فنی خلوص سے پیش کیا ہے۔ خدیجہ مستور کی ناول "آنگن" میں بھی تہذیبی گہرائی اور فنی شعور کی جھلک ملتی ہے۔ زندگی کی گوناگوں کیفیات کو ایک مکمل اکائی کے روپ میں دیکھنے اور پیش کرنے میں خدیجہ مستور کو کافی مہارت حاصل ہے۔ کرداروں کے نازک رشتوں کو اپنے دور کی تہذیبی زندگی کے پس منظر میں متحرک طور پر پیش کرنے میں "آنگن" ایک اہم ناول ہے۔

آزادی کے بعد سب سے زیادہ ناول کرشن چندر نے لکھے ہیں۔ اور وہ سب سے زیادہ مقبول بھی ہوئے ہیں۔ کرشن چندر طبقاتی سماج اور جنسی ناآسودگی اور ذاتی اور سماجی غلاظت کو انسان کی جبلی اور معاشری آزادی کے لئے مضر قرار دیتے ہیں۔ ان کی ناولوں میں آدرش کی تکمیل کی خواہش، روحانی افسردگی، جمالیاتی احساس، سماجی ناانصافی اور ناہمواری

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

مجتبیٰ حسین

اُردو طنز و مزاح کے پچیس سال

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ملک آزاد ہوا تو ہندوستانی زبانوں کے طنز و مزاح نگار اچانک ایک بڑے اور گمبھیر مسئلہ سے دوچار ہوگئے۔ مسئلہ یہ تھا کہ طنز و مزاح کا ایک بڑا اور دیرینہ ٹارگٹ یعنی برطانوی اقتدار ان کی گرفت سے آزاد ہوگیا۔ طنز کا یہ دیرینہ ٹارگٹ مرزا غالب سے لے کر منشی سجاد حسین کے اودھ پنچ تک اور اودھ پنچ کے دور سے لے کر ۱۹۴۷ء تک مستقلاً برقرار رہا۔ اب ہندوستانی زبانوں کے طنز و مزاح نگاروں کو اپنے آپ پر ہنسنا تھا۔ اپنے زخموں کو خود کریدنا تھا۔ اور خود ہی ان کا مرہم بھی بننا تھا گویا ہندوستان کا طنز و مزاح نگار آزادی کے بعد خود ہی قاتل اور خود ہی مسیحا بن گیا۔ دوسروں پر طنز کرنا اور دوسروں کا مذاق اڑانا تو بہت آسان ہے لیکن اپنے آپ پر ہنسنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے اور جو قوم اپنے آپ پر ہنس سکتی ہے اور اپنی کمزوریوں کا مذاق اڑا سکتی ہے وہی مہذب اور شائستہ قوم کہلائی جاسکتی ہے۔

آزادی کے بعد زندگی کے ہر شعبہ میں ایک زبردست تبدیلی آئی اور ایک نئے زاویۂ نگاہ کی تلاش میں ساری قوم نے فکر و عمل کے ایک نئے سفر کا آغاز کیا۔ آزادی کا خواب پورا ہوچکا تھا۔ اور اب حقیقت سامنے کھڑی تھی۔ اگرچہ آزادی کی مسرت بڑی بے پایاں تھی مگر ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی شروع ہونے والے فسادات نے آزادی کے خواب کو جھلسا دیا اور سارے برصغیر میں افراتفری پھیل گئی۔ آزادی کے بعد پیش آنے والے واقعات نے ادیبوں اور فنکاروں کی ذمہ داریوں کو اور بھی گرانبار کردیا۔ انہیں آزادی کے زخمی خواب کی تعمیر نو اور نگہداشت کرنی تھی۔ اصولوں اور سماجی اقدار کی اس شکست و ریخت نے ان کے فرائض کچھ اور بھی بڑھا دیئے۔ اس پس منظر میں اُردو کے طنز و مزاح نگاروں کے گزشتہ ۲۵ برسوں کے ذہنی سفر کا جائزہ لیجیے تو پتہ چلے گا کہ اُردو کے طنز و مزاح نگاروں نے اپنے آپ پر ہنسنے کی شرط کو نہ صرف پورا کیا ہے بلکہ اس عمل کو ایک اعلیٰ روایت کا درجہ عطا کیا ہے۔ انہوں نے نہ صرف مزے کے نئے نئے ٹارگٹ تلاش کئے ہیں بلکہ طنز و مزاح کا اعلیٰ معیار بھی قائم کیا ہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد اردو کے طنز و مزاح نگار بھی دو ملکوں میں بٹ گئے لیکن خوش قسمتی سے ہندوستان کے حصہ میں چوٹی کے طنز و مزاح نگار آئے۔ رشید احمد صدیقی، مولانا عبدالماجد دریابادی، کرشن چندر، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی اور غلام احمد فرقت کاکوروی وغیرہ ایسے طنز و مزاح نگاروں نے آزادی کے بعد اُردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کو نئی راہیں اور ایک نیا زاویۂ نگاہ عطا کیا اور طنز و مزاح نگاروں کی نئی نسل کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے۔ آزادی کے فوراً بعد پیش آنے والے فسادات اور افراتفری کے زمانہ میں اُردو کے طنز نگاروں نے کتنا اہم رول ادا کیا ہے اس کا اندازہ کرشن چندر کی تصنیف "ہم وحشی ہیں" کے مطالعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ اُردو کے سارے طنز نگاروں نے اس بحرانی عہد میں جبکہ فرد پر جنون طاری تھا، بڑی شدت اور توانائی کے ساتھ ہوش مندی کی بات کی اور ملک کی اعلیٰ روایات کی پاسبانی کی۔ انہوں نے بڑی بیباکی کے ساتھ نشتر زنی کی۔ اور جذباتی شدتوں کے درمیان ایک ہموار راستہ کی نشاندہی کی۔ یوں بھی طنز نگار کا سب سے اہم فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ شدتوں پر پہونچی ہوئی بے اعتدالیوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنائے اور بالآخر انہیں اعتدال کی کیفیت پر لے آئے۔

جب یہ بحرانی دور ختم ہوا اور قوم اپنے آپ پر سکون سے ہنسنے

سے قابل ہوگئی تو اُردو کے طنز و مزاح نگاروں نے مزاح کے نئے نئے گوشوں کی تلاش شروع کردی اور قوم کی حسِ مزاح کی شائستگی اور سلیقہ مندی سے روشناس کرانے کا آغاز کیا۔ اُردو کی جدید طنز و مزاح نگاری کا آغاز رشید احمد صدیقی کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ رشید احمد صدیقی جدید طنز و مزاح نگاروں کے لئے سینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے فلسفیانہ اسلوبِ نگارش اور موضوع سے ان کے اچھوتے Treatment نے اردو مزاح نگاری کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ان کی تحریروں کی اعلیٰ شان و شوکت نے اردو مزاح نگاری کو نئی منزلیں عطا کیں۔ اگرچہ آزادی کے بعد رشید احمد صدیقی نے بہت کم لکھا لیکن جو کچھ بھی لکھا وہ کتنے ہی مزاح نگاروں کے لئے آج بھی "سرچشمۂ فیضان" کی حیثیت رکھتا ہے۔

اُردو کے طنز نگاروں میں کرشن چندر بہت اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر طنز نگار ہیں۔ ان کے گہرے سماجی شعور، ان کی تیز سیاسی بصیرت اور مسائل کو پرکھنے کے مخصوص زاویۂ نگاہ نے ان کے طنز کو بے حد موثر، تیکھا اور راست بنا دیا ہے۔ کرشن چندر اُردو کے سب سے حساس طنز نگار ہیں۔ سماج کی چھوٹی موٹی تبدیلی بھی ان کے احساس کو جگا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے موضوعات کا Span بہت وسیع ہوتا ہے۔ گزشتہ ۲۵ برسوں میں کرشن چندر نے قوم کو اپنے آپ پر ہنسنے کا جو سلیقہ سکھایا ہے وہ خود ایک عظیم دین کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزادی کے بعد جب جمہوریت کے تجربہ کا وسیع پیمانہ پر آغاز ہوا تو ہر تجربہ کی طرح اس میں بھی بعض خامیاں منظرِ عام پر آئیں۔ اُردو کے تقریباً سارے ہی طنز و مزاح نگاروں نے جمہوریت کے تجربہ کے دوران میں پیش آنے والی غلطیوں اور کوتاہیوں کو طنز کا نشانہ بنایا۔ سیاسی سرگرمیوں کی بے اعتدالیاں اور سرکاری نظم و نسق کی پیچیدگیاں اور بدعنوانیاں طنز کا نشانہ بننے لگیں اور انہی موضوعات کے سہارے قوم نے اپنے آپ پر ہنسنے کی ایک اعلیٰ روایت قائم کی۔ کرشن چندر کی تصانیف "گدھے کی سرگزشت" اور "گدھے کی واپسی" کے علاوہ ان کے بہت سے مضامین جیسے "جامن کا پیڑ" اور "کتا پلاٹنگ" وغیرہ میں آزادی کے بعد کے سماجی اور سیاسی حالات پر گہرا طنز کیا گیا ہے۔ اُردو کے طنز و مزاح نگاروں نے آزادی کے بعد ایک نئے سماج کی تشکیل میں سرگرم حصہ لیا ہے اور قدم قدم پر قوم کو اس کی کوتاہیوں سے آگاہ کرنے کا اہم فرض ادا کیا ہے۔

کنہیا لال کپور بھی آزادی سے پہلے سے لکھتے آ رہے ہیں۔ وہ اپنے تیکھے اندازِ بیان اور شگفتہ مزاح کے باعث اردو کے طنز نگاروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ آزادی سے پہلے انہوں نے اُردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کو بڑے معیاری مضامین سے مالا مال کیا ہے۔ لیکن آزادی کے بعد وہ کچھ بجھ سے گئے ہیں۔ حالیہ عرصہ میں انہوں نے جو مضامین لکھے ہیں ان میں وہ بات نہیں پائی جاتی جو ان کے پرانے مضامین میں نظر آتی ہے تاہم کنہیا لال کپور نے اُردو کے طنزیہ ادب کو نئے رجحانات سے روشناس کرانے میں جو حصہ لیا ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔

غلام احمد فرقت کاکوروی بھی آزادی سے پہلے کے لکھنے والوں میں شامل ہیں۔ انہوں نے بے شمار مضامین لکھے ہیں۔ شاید ہی کوئی موضوع ایسا چھوٹا ہو جس پر انہوں نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ ملازمی کا کٹکش، انتخابات، جدید فیشن، فیملی پلاننگ، غالب، جدید شاعری، جمہوریت، سماجی رسومات اور سیاسی جوڑ توڑ۔ انہوں نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کا ایک مخصوص اسلوب ہے۔ وہ زیادہ تر کرداروں اور زبان کے چٹخارے سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ زبان بڑی مرصّع لکھتے ہیں لیکن بعض اوقات اتنی بھاری بھرکم زبان استعمال کرتے ہیں کہ مزاح کی کیفیت بوجھل ہو جاتی ہے۔

آزادی کے فوری بعد اُردو کے جو طنز و مزاح نگار سامنے آئے ان میں فکر تونسوی، یوسف ناظم، سلمیٰ صدیقی، بھارت چند کھنہ، تخلص بھوپالی، احمد جمال پاشا، عبدالمجید سہالوی اور وجاہت علی سندیلوی نمایاں ہیں۔

فکر تونسوی بلا کے ذہین آدمی ہیں۔ زندگی کے ہر موضوع پر بڑے اعتماد کے ساتھ قلم اٹھاتے ہیں۔ ان کا طنز بڑا گہرا اور کاری ہوتا ہے۔ بات میں بات پیدا کرنے کا انہیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ فکر تونسوی نے کالم نگار کی حیثیت سے طنز و مزاح نگاری کا آغاز کیا ہے اسی لئے ان کی تحریروں میں سیاسی طنز کا عنصر زیادہ غالب رہتا ہے۔ سیاسی طنز نگاری کے میدان میں فکر تونسوی اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے۔ وہ برسوں سے ہر روز طنزیہ کالم لکھتے ہیں لیکن اتنا کچھ لکھنے کے باوجود وہ Exhaust نہیں ہوئے بلکہ ان کی طنز نگاری میں اور بھی نکھار پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ طنز کرنے کے سارے حربوں سے بخوبی واقف ہیں۔ سیدھی سادی زبان کے ذریعہ وہ طنز کی بڑی عالی شان عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے چھوٹے موٹے واقعات اور مسائل کی مدد سے بڑے مسائل کی تہہ تک پہونچتے ہیں۔

یوسف ناظم اردو کے جدید طنزیہ و مزاحیہ ادب میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ وہ زیادہ تر سماجی موضوعات کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان کی مزاح نگاری کی خوبی یہ ہے کہ وہ قدم قدم پر چونکاتے ہیں۔ اچنبھا اور تحیّر ان کے فن کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ایک سیدھی سادی سی بات کے بعد کچھ ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ قاری حیران رہ جاتا ہے اور اس کے دماغ میں پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگتی ہیں۔ یوسف ناظم کی تحریروں میں ایک عالمانہ شان ہوتی ہے۔ وہ مختصر جملوں میں بڑی بات کہنے کے عادی ہیں۔ اسلوب کے اعتبار سے وہ رشید احمد صدیقی سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں لیکن شوخیٔ طبع کے لحاظ سے وہ پطرس سے قریب نظر آتے ہیں۔ یوسف ناظم

کی مزاح نگاری اردو کی کلاسیکی مزاح نگاری کا ایک تسلسل ہے۔ ان کے موضوعات کافی متنوع اور اچھوتے ہوتے ہیں جن پر وہ بڑی بے تکلفی اور بے ساختگی کے ساتھ قلم اٹھاتے ہیں۔ "کیف و کم" "فٹ نوٹ" اور "دیوالیے" ان کے مضامین کے باغ و بہار مجموعے ہیں۔

سلمیٰ صدیقی کو مزاح نگاری ورثہ میں ملی ہے۔ ان کے انداز تحریر میں رشید احمد صدیقی کے اسلوب کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ یہ ادبیات سے کردہ بہتر تلطیف، ہلکا پھلکا اور شگفتہ مزاح لکھتی ہیں۔ "سکندر نامہ" جیسے مزاحیہ ناولٹ کے علاوہ انہوں نے بیشتر مزاحیہ مضامین اور خاکے لکھے ہیں۔ ایک اعتبار سے سلمیٰ صدیقی کو اردو کی پہلی خاتون مزاح نگار کہا جا سکتا ہے۔

احمد جمال پاشا کافی جوان اور تر و تازہ مزاح لکھتے ہیں۔ وہ زیادہ تر واقعات سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ پیروڈی لکھنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ "اندیشۂ شہر" میں ان کی مزاح نگاری کے بڑے اچھے نمونے نظر آتے ہیں۔

بھارت چند کھنہ اردو کے کہنہ مشق مزاح نگار ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے چار مجموعے "مصیبتیں" "مسکراتے آنسو" "ٹھنڈی بجلیاں" اور "تیر نیم کش" منظر عام پر آ چکے ہیں۔ وہ طنز سے زیادہ مزاح کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ کلاسیکی زبان لکھتے ہیں اور نہایت نکھرا ستھرا مذاق رکھتے ہیں۔ وہ زیادہ تر سماجی موضوعات سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کا انداز بیان بڑا شگفتہ اور بے ساختہ ہوتا ہے۔

تخلص بھوپالی بنیادی طور سے مزاحیہ کرداروں کے ذریعہ مزاح پیدا کرتے ہیں۔ غفور میاں اور پاندان والی خالہ تخلص بھوپالی کے دو اہم مزاحیہ کردار ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ معاشرہ کی ٹوٹتی ہوئی قدروں کی بڑی کامیاب عکاسی کی ہے۔

عبدالمجیب سہالوی اور وجاہت علی سندیلوی متوسط طبقے کے مسائل کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ وجاہت علی سندیلوی کے اسلوب میں بڑی تر و تازگی پائی جاتی ہے۔

حالیہ عرصہ میں اردو کے طنز و مزاح نگاروں کی جو نئی نسل سامنے آئی ہے اس کی فہرست کافی طویل ہے۔ ان میں شفیقہ فرحت، رشید قریشی، نریندر لوتھر، برق آشیانوی، ماتک ٹالہ، فرحت قمر، مسیح انجم، ڈاکٹر رشید موسوی، عطیہ پروین، سرور جمال، عبدالبصیر نعیمی، پرویز یداللہ فضل جاوید، احمد جلیس، رشید الدین اور سلیم مقصود شامل ہیں۔ اس مختصر سے جائزے میں ان سارے طنز و مزاح نگاروں کے فن پر روشنی ڈالنا تو بہت دشوار ہے لیکن یہ طویل فہرست اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ اردو کے طنزیہ مزاحیہ ادب کا مستقبل کافی تابناک ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ آزادی کے بعد خواتین بھی طنز و مزاح کی جانب توجہ کر رہی ہیں اور بعض موضوعات کے معاملہ میں اس فن میں مردوں سے زیادہ کامیاب نظر آتی ہیں۔ بالخصوص شفیقہ فرحت اور عطیہ پروین کی تحریروں میں بلا کی روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ اب تک مردوں نے خواتین کو نشانہ تمسخر بنایا تھا اب مرد بھی خواتین کے ہاتھوں نشانۂ تمسخر بنے ہیں۔ اس اعتبار سے مزاح نگاری کے لئے کئی نئے گوشے سامنے آ رہے ہیں۔

آزادی کے بعد طنز و مزاح کا اگر کوئی شعبہ بری طرح متاثر ہوا ہے تو وہ مزاحیہ کالم نگاری کا شعبہ ہے۔ اردو صحافت نے ماضی میں کالم نگاری کی عظیم روایات قائم کی ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالماجد دریابادی، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت اور قاضی عبدالغفار جیسے بلند پایہ ادیبوں نے کالم نگاری کی روایت کو بہت اونچا مقام عطا کیا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت اب ختم ہوتی جا رہی ہے۔ حالیہ عرصہ میں صرف فکر تونسوی اور شاہد صدیقی مرحوم نے علی الترتیب "ملاپ" دہلی اور "سیاست" حیدرآباد کے کالموں کے ذریعہ اس روایت کو آگے بڑھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

یہی شکایت اردو کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے متعلق بھی کی جا سکتی ہے۔ اکبر الہ آبادی کی جگہ کئی برس گزرنے کے بعد آج بھی خالی نظر آتی ہے۔ اردو نے اکبر الہ آبادی کے بعد کوئی قدآور طنزیہ و مزاحیہ شاعر پیدا نہیں کیا۔ برخلاف اس کے نثر میں اردو مزاح نگاری نے ترقی کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔ آزادی کے بعد جو مزاحیہ شعراء منظر عام پر آئے ان میں راجہ مہدی علی خاں (مرحوم)، دلاور فگار، رضا نقوی واہی، مرزا شکور بیگ، ماچس لکھنوی مرحوم، آفتاب لکھنوی مرحوم، ہلال سیوہاروی، ہلال رام پوری، اسمعیل ظریف، گرما گرم حیدرآبادی، راہی قریشی، عادل لکھنوی، شگار لکھنوی، علامہ گنبد، اور علامہ بے تام کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔

راجہ مہدی علی خاں نے بڑی کامیاب پیروڈیاں لکھی ہیں۔ رضا نقوی واہی نے طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے خلا کو پُر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انہیں زبان و بیان پر بڑی قدرت ہے اور وہ اپنے موضوع سے انصاف کرنا خوب جانتے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی اردو کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری نے کوئی خاص ترقی نہیں کی ہے۔ البتہ سرزمین دکن میں دکنی مزاحیہ شاعری کی روایت نہ صرف باقی ہے بلکہ بتدریج آگے بڑھ رہی ہے۔

سلیمان خطیب دکنی مزاحیہ شاعری کے سب سے کامیاب اور جاندار شاعر ہیں۔ وہ مزاح پیدا کرنے کے سارے ہی حربوں سے واقف ہیں۔ سلیمان خطیب انوکھی، اچھوتی تشبیہات اور پُر اثر امیجری کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں طنز و مزاح دونوں کا بڑا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ علی صاحب میاں، حمایت اللہ اور گلی نلگنڈوی کی دکنی مزاحیہ شاعری اپنے اندر بڑی گہرائی اور معنی خیزی رکھتی ہے۔

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

عابد علی خاں

اُردو پریس کے پچیس سال

ہمارے ملک کی آزادی کی ربع صدی کی مختصر مدت ایک عہد بھی ہے اور ایک تاریخ بھی۔ آزادی کے بعد معاشی آزادی اور جمہوری استحکام کی جانب قوم نے سفر کی منزلوں کے روشن نشان شریمتی اندرا گاندھی کی مدبرانہ اور قابل فخر قیادت میں جگمگانے لگے ہیں معاشی، سماجی، سیاسی، تہذیبی اور لسانی قدروں کے نشان منزل ابھر آئے ہیں۔ اس موقع پر "اُردو صحافت کے ۲۵ سال" بھی ایک ایسا موضوع ہے جو صرف صحافتی نہیں بلکہ سیاسی اور تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

ہمارے ملک کا پہلا اخبار انگریزی زبان میں ۱۷۸۰ء میں نکلا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے تعلق رکھنے والوں نے اپنے اغراض و مقاصد کے لئے اظہار خیال کے لئے اشتہار و اخبار کی درمیانی قسم کے اس ایک ذریعہ کو اپنایا۔ پھر "بنگال گزٹ" اور "کلکتہ جنرل ایڈورٹائیزر" نے ایک باضابطہ اخبار کی شکل اختیار کر لی۔ ہندوستانی زبانوں میں ہمارے ملک میں بہت سے اُردو اخبارات نے وہ فریضہ انجام دیا جو اس "چوتھی مملکت" کا طرۂ امتیاز ہے۔ ہندوستان میں "جام جہاں نما" اردو کا پہلا اخبار ہے، اور ملک کی دوسری زبانوں میں بنگالی کو یہ فخر حاصل ہے کہ ملک میں کسی دوسری زبان کا اخبار بنگال میں شائع ہوا۔ لیکن اُردو کو اس دور میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ راجہ رام موہن رائے جیسے دانشور، مصلح، اور مفکر نے بھی اردو میں "مراۃ الاخبار" جاری کیا۔ اس موقع پر یہ ذکر غیر ضروری نہیں ہوگا کہ ملک میں سیاسی شعور و بیداری اور رائے عامہ کی تربیت کے لئے ملک کی تمام زبانوں میں اُردو کو ترجیح و اہمیت حاصل تھی چنانچہ اُردو اخبارات بنگال سے لے کر پنجاب اور سرحد تک اور شمال سے جنوب تک مقبول تھے۔ دوسری جنگ کے بعد اور آزادی ہند تک اُردو اخبارات اہم، موثر اور ہمہ گیر و کل ہند نوعیت کے اخبارات تھے۔ اُردو اخبارات ایک بہت بڑی میراث لے کر آزادی کے بعد کے دور میں داخل ہوئے۔ اُردو اخبارات کی تاریخ ملک کی تحریک آزادی و جہاد آزادی کی تاریخ ہے۔ اس وقت یہ وضاحت کا موقع نہیں کہ اُردو اخبارات نے آزادی کے لئے کیا قربانیاں دی ہیں کس طرح نامور اور جید اڈیٹروں نے اپنا خون جگر دے کر اخبارات کو برقرار رکھا اور برطانوی سامراج کا مقابلہ کیا۔

سر سید احمد خاں کا "علی گڑھ گزٹ"، مولانا آزاد کا "الہلال"، ظفر علی خاں کا "زمیندار" اور محمد علی جوہر کا "ہمدرد" یہ اخبارات بھی تھے اور سیاسی تحریک کے علمبردار، رہنما اور نشان منزل بھی۔ ان اخبارات کے خلاف انگریز سرکار نے تعزیری اقدامات کئے اور ضمانتیں طلب و ضبط کیں اور کتنے اخبارات شروع ہوئے، بند ہوئے اور پھر اُٹھے، الگ کر دئے، یہ ایک علحدہ بات ہے۔ جو ملک کی آزادی کی جدوجہد میں ایک مستقل جگہ رکھتی ہے۔ بہرحال اُردو اخبارات ایک بہت بڑے عہد ساز ورثہ کے علمبردار ہیں اور آزادی کے بعد بھی ملک میں اُردو اخبارات کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ آج بھی ملک کی تقریباً تمام ریاستوں سے شائع ہوتے ہیں اور اپنی اشاعت کے لحاظ سے تیسرے درجہ پر ہیں۔ سری نگر سے مدراس تک اور مہاراشٹر سے بنگال تک اُردو اخبارات موجود ہیں۔ انگریزی و ہندی کے بعد اُردو اخبارات ہی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ ملک گیر رسائی رکھتے ہیں۔

آزادی کے بعد "اُردو صحافت کے ۲۵ سال" بڑا نازک اور اہم موضوع ہے۔ آزادی سے پہلے اُردو صحافت زبان و مذہب کی قیود و بند سے آزاد تھی آزادی کی جدوجہد میں انگریزی سے زیادہ اُردو اخبارات کا حصہ رہا ہے۔ اردو کے اخبارات صرف مسلمانوں ہی کے نہیں تھے بلکہ کئی اہم اخبارات کے ایڈیٹر

ہندو بھی تھے اور اب بھی ہیں۔

جس طرح تقسیم کے فوری بعد آبادی کا تبادلہ ہوا تھا اسی طرح شمالی ہند میں مخصوص اخبارات کو بھی نقل مقام یا ترک وطن کرنا پڑا۔ "ملاپ" اور "پرتاپ" لاہور سے دہلی آئے اور دہلی کے "جنگ" اور "انجام" کراچی چلے گئے۔ تقسیم سے پہلے ملک کی سیاسی فضا کانگرس و مسلم لیگ کی تائید و حمایت میں سرگرم تھی۔ اخبارات بھی ایسی صف بندیوں اور خانوں میں بٹ گئے تھے۔ چونکہ اردو ملک گیر زبان تھی اس لئے مختلف گروہوں، جماعتوں، مذاہب و دیگر زبانوں کے بولنے والوں کے زیر اہتمام نکلنے والے اخبارات بھی مختلف عقائد رکھتے تھے۔ اس لئے تقسیم کا اثر صحافت پر بھی پڑا۔ آزادی سے پہلے اردو صحافت کے دو بڑے اہم مراکز دہلی اور لاہور تھے۔ لاہور سے "انقلاب"، "زمیندار"، اور "ملاپ"، "پرتاپ" ایسے کثیر الاشاعت اخبار شائع ہوتے تھے۔ تقسیم کے بعد لاہور کی صحافت کا ہمارے ملک سے سرکولیشن کی حد تک تعلق ختم ہو گیا اور اسی طرح ہمارے ملک سے نکلنے والے "جنگ" اور "انجام" جیسے اخبارات کو جو پنجاب و سندھ میں زیادہ پڑھے جاتے تھے، نقل مقام ہی کرنا پڑا۔

جونہی ہمارے ملک میں آزادی کا سورج طلوع ہوا۔ "دو قومی نظریہ" یا مسلم لیگ و کانگرس کی علیحدہ علیحدہ تائید و حمایت کی ضرورت بھی ختم ہو گئی۔ انڈین یونین مسلم لیگ کی طرح اردو صحافت بھی ایک دوراہے پر ٹھہر گئی جو نئے حالات سے مطابقت نہ کر سکے انہوں نے یہاں اپنی اشاعتیں بند کر دیں۔ اس سلسلے میں اگر دہلی میں "جنگ" اور "انجام" کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ تو حیدرآباد میں اخبار "جناح" اور "وقت" کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔

آزادی کے بعد اس صحافت کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی جو قومی مفادات و نظریہ کی زبردست پشت پناہ تھی۔ حیدرآباد میں قاضی عبدالغفار کا "پیام" جیسے نظریاتی "فتح" و کامیابی کا ایک مینار عظیم بنا ہوا تھا کہ "جسے دیکھ کر میں نے صحیح رہنمائی کی" جس نے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا کہ اس دیش کی رنگا رنگ تہذیب کا قافلہ ہم قدم ہی چل سکتا ہے۔ قدم نہ ملانے کی کوشش نقصان پہونچائے گی۔ "پیام" کی طرح ملک میں کئی اور چھوٹے بڑے اخبار تھے جنہوں نے اردو کے پہلے اخبار "جام جہاں نما" کے عہد سے لے کر اب تک قومی دھارے اور تحریکات کو مستحکم بنایا، عوام کی رہنمائی کی اور یہ ثابت کیا کہ اخبار صرف خبروں اور اداریوں کا نام نہیں بلکہ وہ قومی تحریکات کا آئینہ بھی ہے اور تاریخ بھی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تقسیم وطن نے اقلیتوں کے لئے کئی نازک مسائل پیدا کئے جیسے زبان کے، یہ معاشی، تعلیمی و تہذیبی مسائل پیدا ہوئے ابتداً اردو اخبارات نے ان کی ترجمانی کو بھی اپنا پہلا فرض سمجھا۔ آزادی کے فوری بعد بلکہ ایک ڈیڑھ دہے تک کا دور ایسا تھا کہ اکثر اردو اخبارات کے لئے اقلیتی مفاد کے تحفظ اور قومی دھارے کی ذمہ داریوں کے درمیان امتیاز کرنا مشکل تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ملک کی بعض دیگر زبانوں کے اخبارات جو رجعت پسند، تنگ نظر اور مفادات حاصلہ کے ترجمان ہیں اور جو خود بھی قومی دھارے سے کٹے ہوئے ہیں اور احیاء پرستی پر عقیدہ رکھتے ہیں؟ ان کے کالموں میں مسلم اقلیتوں کے خلاف دل آزار مضامین اور خبریں شائع ہوتی رہیں اور بعض اردو اخبارات اس کا جواب دینا مناسب سمجھتے تھے۔ بعض اخبارات نے اقلیتی طبقہ کے مفادات کو بنیادی طور پر ترجیح دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو اخبارات کو صحیح طور پر سمجھا نہ گیا اور بدقسمتی سے "مسلم اخبارات" کی ایک نامناسب و غیر صحیح اصطلاح بھی گھڑ دی گئی لیکن جیسے جیسے شعور ترقی کرتا گیا یہ بات بھی واضح ہونے لگی کہ اردو صحافت مجموعی طور پر اور بہت بڑی حد تک قومی دھارے کے ساتھ ہے۔

بنگلہ دیش میں جدوجہد آزادی کے دوران اردو اخبارات ایک اہم مسئلے کی شکل میں سامنے آئے۔ بعض مفادات حاصلہ نے یہ الزام لگایا کہ اردو اخبارات نے بنگلہ دیش کے مسئلہ پر حکومت ہند کی پالیسی کو نہیں سمجھا ہے۔ چنانچہ دہلی میں اردو اخبارات کے ایڈیٹروں کا ایک اجتماع بھی منعقد ہوا جس میں ملک کے تمام مدیران جرائد نے شرکت کی۔ بحث مباحثہ، تنقید و تجزیہ اور بین السطور کے مطالعہ پر ایک جائزہ کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ ریاست بہار کے ایک دو اخبارات اور دوسرے مقامات کے چند ایک سنسنی خیز ہفتہ وار رسائل کے علاوہ اردو اخبارات قومی دھارے کے ساتھ ہیں اور اکثر اخبارات نے تو بنگلہ دیش کے مسئلہ پر رجعت پسند پارٹیوں کے غیر قومی رویہ کے برعکس بہت واضح صاف قومی اور جرات مندانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ جن گوشوں نے بنگلہ دیش کی جدوجہد کے دوران اردو صحافت کے رویہ پر دوسروں کی آنکھ کا شہتیر تلاش کرنے کی کوشش کی تھی، ان کی نگاہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ بنگلور میں کانگرس کے تاریخی اجلاس کے موقع پر اور پھر لوک سبھا کے درمیانی مدت کے انتخابات اور اسمبلیوں کے انتخاب کے مواقع پر ملک بھر کے اردو اخبارات نے کانگرس کے ترقی پسند، سوشلسٹ اور سیکولر نظام کی کس طرح حمایت کی۔

جون ۱۹۷۲ء میں دہلی میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں کانگرس کے جنرل سکریٹری مسٹر ہنری آسٹن نے یہ اعتراف کیا ہے کہ ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات میں مسلمانوں کی بڑی بھاری اکثریت نے کانگرس کو ووٹ دیا ہے حالانکہ آرگنائزیشن کانگرس اور جن سنگھ نے ہماری مسلمانوں کی حالت زار کی دہائیاں دے کر مسلمانوں کے ووٹوں کی تقسیم کی غرضمندانہ کوشش کی تھی۔

آزادی کے بعد یقیناً اردو صحافت کا ایک حصہ دوراہے پر ٹھہرا ہوا تھا کیونکہ مسلم

لیگ کے حامی تھے لیکن جواہر لعل نہرو اور مولانا آزاد کی قیادت کے باعث ایسے صحافتی حلقوں کو جلد ہی یہ محسوس ہو گیا کہ ہندوستان کا جمہوری نظام اور نیا سیاسی ڈھانچہ تنگ نظر صحافت کے لئے بھی ناموزوں ہے۔ چنانچہ ایسے اخبارات جو مسلم لیگ کی پالیسی کے حامی تھے اور مسلمانوں کے مسائل کو حل طلب سمجھتے ہوئے صرف مخالفت کیا کرتے تھے۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ وہ خود بھی کوئی حل پیش نہیں کر سکتے تو وہ ختم ہو گئے یا انہوں نے اپنی پالیسی تبدیل کر دی اور اس طرح انگریزوں نے اختلافات کی جو دیوار کھڑی کرنی چاہی تھی اور جس کے لئے بعض اخبارات بھی پشت پناہ بنے ہوئے تھے، آزادی کے بعد وہ اپنا مقام کھو بیٹھے۔ ایسے اخبارات صرف برائے نام ہی سہی دہلی اور اترپردیش تک محدود تھے۔

اُردو صحافت کو یہ فخر ہے کہ وہ ایک عظیم ورثہ کی وارث ہے۔ راجہ رام موہن رائے، مولانا محمد حسین آزاد، رتن ناتھ سرشار، منشی نول کشور، سید احمد خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں جیسے جید صحیفہ نگاروں نے اردو اخبارات کے معیار کو بلند کیا اور ان اخبارات کو تحریک آزادی ہند کا ایک روشن باب بنایا۔ اس میں "جام جہاں نما"، "مراۃ الاخبار"، "علی گڑھ گزٹ"، "ہمدرد"، "وکیل"، "پیسہ اخبار"، "زمیندار" اور "خلافت" صرف اخبار کے نام نہیں بلکہ تحریک آزادی کے نشان اور تاریخ کی دین ہیں۔ اردو اخبارات اپنے اس شاندار ورثہ پر صرف نازاں ہی نہیں بلکہ اب بھی وہ اپنا تاریخی رول انجام دے رہے ہیں۔ کل کا مورخ جب آج کے اُردو اخبارات کی خبروں کا انداز ترتیب اور اداریوں کے بین السطور کو پڑھے گا، تو بلا شبہ یہی نوٹ درج کرے گا، کہ اردو اخبار نے انتہائی اہم فریضہ بڑی دیانت داری اور ذمہ داری سے انجام دیا ہے۔ تاریخ اور حالات کی تبدیلیوں کے باعث جہاں اُسے خود اپنی زبان کے تحفظ کا فرض انجام دینا ہے وہیں اسے اس تمدن و تہذیب کے لئے بھی زحمت اٹھانی ہے جس ماحول میں یہ زبان پروان چڑھی اسی کے ساتھ اسے قومی دھارے میں اپنے تمام قارئین کو ساتھ لے کر چلنا ہے۔

روزنامہ "قومی آواز" اُردو کا ایک اخبار ہی نہیں بلکہ تحریک آزادی اور صحافت کا ایک باب ہے۔ جواہر لال نہرو نے ملک کے سیاسی مسائل کے لے "نیشنل ہیرالڈ" جاری کیا۔ اور اسی ادارے سے ایک اردو اخبار "قومی آواز" بھی جاری کیا گیا۔ جہاں یہ اخبار قومی تحریکات۔ اور قومی آزادی اور امنگوں کا ترجمان اور نقیب ہے وہاں اس اخبار نے مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لئے بھی اپنی آواز موثر طریقے سے بلند کی ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اہم اقلیت ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے ملکوں کی اقلیت میں ایک اہم درجہ رکھتے ہیں۔ خود کانگرس اور حکومت بھی اس اقلیت کے مسائل کے لئے باضابطہ غور اور فیصلے کرتی ہیں اور جب سے کانگرس نے اپنے ہی حصے کے دائیں بازو کو جو ترقی اور روشنی کا مخالف تھا علیحدہ کر دیا ہے، اقلیتوں کے معاشی و سیاسی و سماجی مسائل اب تصفیہ کے لئے سامنے آئے ہیں۔ "قومی آواز" نے علی گڑھ کا مسئلہ ہو یا اُردو زبان کا مسئلہ اس پر قومی، تعمیری اور اشتراکی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے جسے ہم بجا طور پر تاریخ کا تسلسل قرار دیں گے اور اس تسلسل پر نہ صرف اُردو صحافت بلکہ ساری قوم فخر کرے گی۔ حالات اور مسائل کے تجزیہ اور پس منظر کی تحقیق کے اس دور میں آپ اُردو کے اخبارات کا جائزہ لیجئے تو یقیناً یہی نتیجہ اخذ کریں گے کہ نناوے فیصد سے زائد اُردو اخبارات قومی، غیر جانبدار اور آزاد موقف رکھتے ہیں۔ وہ کسی جماعت، ادارے یا تنظیم سے وابستہ نہیں ہیں۔ اکثر اخبارات نے اپنے مسلک اور عقیدے کے لئے بڑے ایثار سے کام لیا ہے۔

"ملاپ" دہلی اس ملک کا سب سے بڑا اُردو اخبار ہے جو دہلی، جالندھر اور حیدرآباد کے علاوہ لندن سے بھی شائع ہو رہا ہے۔ "ملاپ" ہماری مشترکہ تہذیب و تمدن اور اُردو کی قومی اہمیت کا ایک مینارہ ہے۔ اگر اُردو کے ایسے اخبارات جن کے مالک مسلمان ہیں۔ اُردو کے تحفظ اور مسلمانوں کے معاشی مسائل پر لکھا کرتے ہیں تو "ملاپ" نے بھی اُردو زبان اور لسانی اقلیتوں کے معاشی و تہذیبی مسائل پر بے باکی سے قلم اٹھایا ہے۔

اُردو صحافت پر پاکستان کے ایک نامور محقق عبدالسلام خورشید نے جو شہرۂ آفاق اخبار "انقلاب" لاہور کے ایڈیٹر اور عبدالمجید سالک کے فرزند ہیں، اپنی ایک کتاب "صحافت پاکستان و ہند" میں لکھا ہے کہ تقسیم سے پہلے "ملاپ" نے لاہور کی فضا میں جہاں مسلم لیگ اور کانگرس کی حمایت زوروں پر تھی یک جہتی کے لئے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ ہمارے ملک میں آج بھی کئی ایسے اخبارات و رسائل ہیں جن کے مالک و ایڈیٹر سر تیج بہادر سپرو کے ان الفاظ کی توثیق ہیں کہ اُردو کسی فرقے کی زبان نہیں یہ ہماری قومی اور مشترکہ میراث ہے۔

آزادی کے بعد اُردو اخبارات کو سیاسی تبدیلیوں کے جس دور سے گزرنا پڑا ان میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے لیکن آزادی کے بعد خود ہمارے ملک میں لسانی اور سیاسی تبدیلیوں کا جو دور شروع ہوا ہے اس چوکھٹے میں اُردو اخبار کس طرح بیٹھتا ہے ابھی اس بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ لسانی ریاستوں کے قیام کے باعث ہر ریاست میں علاقائی زبان بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ حیدرآباد کو ہی لیجئے یہاں آج سے پچیس سال پہلے صرف اُردو اخبارات کا چلن اور زور تھا۔ یہاں تلگو کے ایک دو اور انگریزی کے ایک دو اخبارات تھے۔ آج انگریزی اخبارات نیشنل پریس کی اصطلاح بن کر چھائے ہوئے ہیں اور سات آٹھ سے زائد تلگو اخبارات شائع ہو رہے ہیں، جن میں سے بعض کا سرکولیشن ساٹھ (۶۰) ہزار سے زائد ہے۔ ظاہر ہے یہ سیاسی حالات اور لسانی علاقوں کی نئی گروپ بندی اور سیاسی تنظیم جدید کا نتیجہ ہے۔ تلگو اخبارات کی ترقی تاریخی ضرورت ہے لیکن اُردو اخبارات کا وہ مقام بل گیا ہے جو کبھی انہیں حاصل

تھا لہٰذا سرسے کہ اس کی وجہ زمانہ اور حالات کی تبدیلیاں ہیں لیکن یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اب ہمارے ملک میں اردو اخبارات کی اہمیت اور اس کا موقف کیا ہے۔ گو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آزادی کی جدوجہد کے دوران جبکہ اردو اخبارات کا طوطی بولتا تھا ان کی اشاعت دس ہزار سے زائد نہیں تھی لیکن آج جبکہ عام تعلیم کے باعث تمام اخبارات کا سرکولیشن بڑھ گیا ہے اردو اخبارات کی اشاعت بہت کم ہے۔ اگرچہ اس مسئلہ کو یوں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ملک بھر میں اردو اخبارات کی تعداد/اشاعت انگریزی و ہندی کے بعد تیسرے درجہ پر ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو اخبارات ملک کی تقریباً تمام ریاستوں سے شائع ہوتے ہیں اس لئے ان کی مجموعی اشاعت قابلِ اطمینان و لائقِ تحسین ہے لیکن جہاں تک اخبارات کی انفرادی اشاعت کا تعلق ہے کم ہے۔ یہ اردو زبان ہی کا نہیں بلکہ حکومت، قوم اور سیاسی جماعتوں کی ذمہ داری کا مسئلہ بھی ہے کہ وہ اس زبان کے اخبارات کے تحفظ اور ترقی کے لئے اپنا فریضہ ادا کریں جس نے اس ملک کی آزادی کے لئے رائے عامہ کو منظم کیا اس میں سیاسی بیداری پیدا کی اور برطانوی راج کے کڑے صحافتی قانون کی سخت سزائیں بھی بھگتیں۔

اردو اخبارات خود اردو صحافت اور اس کے قاری سے بھی ہم ایک اہم سوال کرتے ہیں کہ کیا کوئی محمد علی جوہر، ظفر علی خاں، ابوالکلام آزاد اور قاضی عبدالغفار جیسا جید صحیفہ نگار اب اس میدان میں داخل نہیں ہوگا اور اسے وہ نطق دے گا جو اس زبان کے اخبارات اور حالاتِ حاضرہ کی موثر ترجمانی کرے۔ یہ سوال ذہن میں بار بار پیدا ہوتا ہے کہ اردو صحافت اپنی بے مائیگی اور تہی دستی کے باوجود قومی دھارے کا ساتھ دے رہی ہے۔ رائے عامہ کی ترجمانی کر رہی ہے۔ قوم کے ذہن کی تشکیل کے کام میں مصروف ہے لیکن خود اس کی مشکلات کے حل کے لئے کیا سوچا جائے گا۔ اردو پڑھنے والوں کی تعداد کم ہو رہی ہے شری رنبیر ایڈیٹر "ملاپ" کے اداریے کے بموجب اگر اردو سے سرد مہری کا یہی عالم رہا تو وہ دن دور نہیں کہ اردو کا خط پڑھانے کے لئے کسی کو تلاش کرنا پڑے گا۔ ایسے وقت جبکہ قوم آزادی کی سلور جوبلی تقاریب کی تیاریوں میں ہے اور قیادت نے ملک کی معاشی، سیاسی، تہذیبی اقدار کو بلند کرنے کا عزم کیا ہے یہ امید بندھتی ہے کہ ملک میں اردو کے تحفظ کے لئے اس کا جائز مقام ملے گا۔ قوم اور حکومت سے ان توقعات کے ساتھ ساتھ خود صحافت کو بھی اب یہ جائزہ لینا ہوگا کہ لیتھو مشینوں اور کتابت کے دور کی بجائے نئے طباعتی طریقوں اور ٹائپ کی انقلابی سہولتوں سے استفادہ کے لئے اب انہیں سرگرمِ عمل ہونا پڑے گا۔

اردو صحافت کے پچیس سال ہمارے ملک کی ربع صدی کی تاریخ و ترقی کے ان گنت موضوعات میں سے ایک ہیں لیکن یہ موضوع اتنا غیر اہم نہیں کہ اسے نئی تاریخ میں کوئی علیحدہ باب یا عنوان نہ ملے۔ اردو صحافت ایک زبان کی صحافت نہیں بلکہ قوم کی صحافت ہے۔ جو ملک کے تقریباً ہر گوشہ میں ہے اور ملک و قوم کی صحافت میں تیسرا درجہ رکھتی ہے۔ نامساعد حالات، موانع اور مشکلات کے باوجود اس کا اس مقام پر برقرار رہنا اس زبان کی سخت جانی نہیں اس کی زندگی کا ثبوت ہے۔ اس لئے یہ توقع رکھی جانی چاہیے کہ اس ملک میں جہاں "جام جہاں نما" جیسے اردو اخبار نے جنم لیا تھا وہاں اردو صحافت اپنی تاریخی موقف پر برقرار رکھا جائے گا۔ اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس دور میں جبکہ لندن سے اچھے معیاری اردو اخبارات نکل رہے ہیں تو اس کی جنم بھومی ہندوستان میں بھی اردو زبان کے شاہکار اخبارات کی حکومت، قوم اور عوام ہمت افزائی اور قدردانی کریں گے۔

بقیہ : طنز و مزاح کے پچیس سال

آزادی کے بعد لوگ طنز و مزاح کی اہمیت کو محسوس کرنے لگے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طنزیہ و مزاحیہ ادب سے متعلق ادبی انجمنیں قائم ہوتی جا رہی ہیں۔ چنانچہ زندہ دلانِ حیدرآباد ملک کا ایک ایسا ادارہ ہے جس نے طنزیہ و مزاحیہ ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے کئی ٹھوس اقدامات کئے ہیں۔ اسی ادارہ کی جانب سے مئی ۱۹۶۲ء میں اردو کے مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس حیدرآباد میں منعقد ہوئی تھی جس کی صدارت کرشن چندر نے کی تھی۔ اس ادارہ نے طنز و مزاح سے متعلق کئی مطبوعات بھی شائع کی ہیں۔ اور اس کی جانب سے مزاحیہ محفلیں پابندی سے منعقد ہوا کرتی ہیں۔ اس ادارہ کے زیر اہتمام ایک طنزیہ و مزاحیہ رسالہ "شگوفہ" بھی شائع کیا جاتا ہے۔ ابھی حال میں علی گڑھ سے ایک اور مزاحیہ رسالہ "ہنسی پنچ" شائع ہونے لگا ہے۔

مزاحیہ اردو ڈراموں کے فن نے بھی گزشتہ ۲۵ برسوں میں قابلِ لحاظ ترقی کی ہے، حضرت آوارہ، بھارت چند کھنہ، رشید قریشی اور اظہر افسر نے بڑے کامیاب مزاحیہ ڈرامے لکھے ہیں۔

عوام میں طنزیہ و مزاحیہ ادب سے دلچسپی دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ اور مزاحیہ ادب کے لئے ماحول بڑا سازگار بنتا جا رہا ہے لیکن یہ بات بُری طرح کھٹکتی ہے کہ اردو کے نقادوں نے طنز و مزاح کے ساتھ بڑی بے اعتنائی برتی ہے۔ دو ایک نقادوں کو چھوڑ کر کسی نے مزاح نگاری کے فن کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اگرچہ وہ جانتے ہیں کہ طنز و مزاح نگاری مشکل ترین فن ہے لیکن پھر بھی وہ مزاح نگاری کو دوسرے درجہ کا ادب سمجھتے ہیں جب تک نقاد اس فن کے تنقیدی جائزے سے دلچسپی نہ لیں گے اس وقت تک اس فن کی ترقی کی صحیح راہیں متعین نہ ہو سکیں گی۔

پچیس برس

چند سنگِ میل



سلطانیِ جمہور کا آیا ہے زمانہ۔
دہلی میں جشنِ جمہوریت کا نظارہ



جمہوریت و آمریت کی ٹکر۔
بنگلہ دیش میں شکست کے بعد پاکستانی افواج نے
۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہتھیار ڈال دیے۔

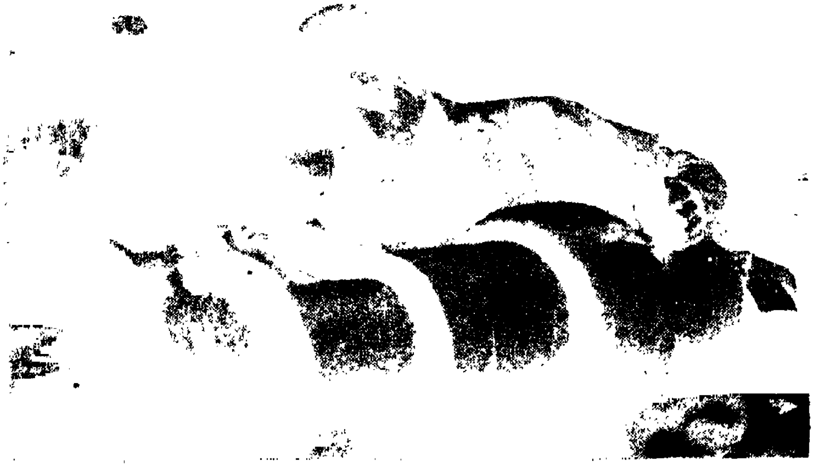


ایک نئی جمہوریہ بنگلہ دیش کا قیام
وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی بنگلہ دیش سرکار
کو مبارک باد دینے ڈھاکہ گئیں۔

سبز انقلاب:۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی اپنے فارم پر اپنے مبارک ہاتھوں سے فصل کاٹ رہی ہیں۔

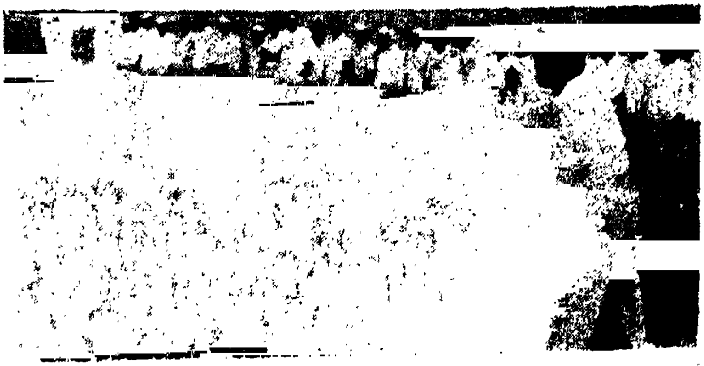


ہیوی الیکٹریکلز لمیٹیڈ بھوپال ایک کاریگر پرائمری کوائل بنا رہی ہے۔



خود کفالتی

زراعت و صنعت کے میدان میں



زراعتی یونی ورسٹی پنت نگر

اتر پردیش میں کسان بڑے شوق سے ایک نئے بیج کا مظاہرہ دیکھ رہے ہیں۔ سبز انقلاب ایسی ہی تحقیقوں کا نتیجہ ہے۔

آکاش سے پاتال تک



ہمارے جاں باز کوہ پیما جنہوں نے دنیا کی عظیم ترین چوٹی ایورسٹ سر کرلی۔

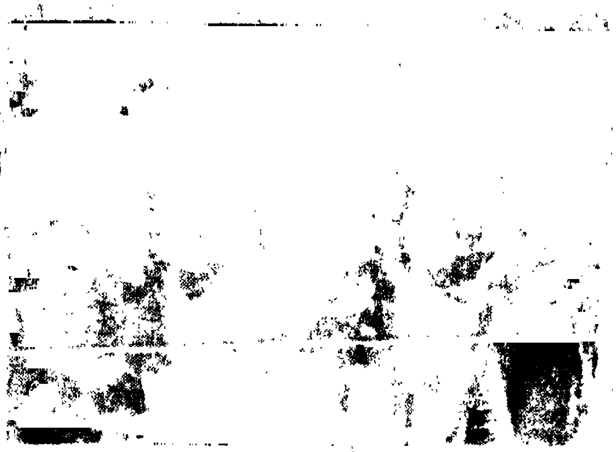


بھاکڑا بند سے پانی کی پہلی بار نکاسی - جواہرلال نہرو نے برقی قوت و آب پاشی کی ان اسکیموں کو ہند کی نئی عبادت گاہیں قرار دیا تھا۔

خلیج کھمبات میں علیا بیٹ کے مقام پر سمندر کا سینہ چیر کر اس سے سیال سونا یعنی تیل نکالنے کی کوشش۔



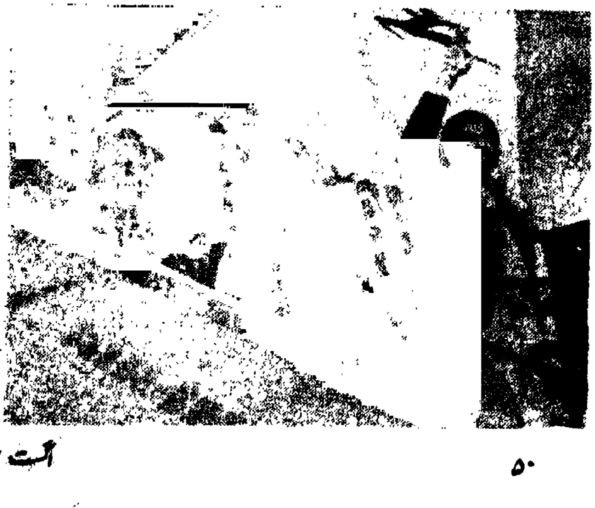
ہند میں صحت کے میدان میں مایۂ ناز ترقی ہوئی ہے۔ ۱۹۴۷ء
میں ہند میں عمر کا اوسط ۳۲ سال تھا۔ آج یہ لگ بھگ
پچاس سال ہے۔



نئی نسل روشن مستقبل



ہماری ملکی پالیسی کے ہدایتی اصول کے تحت چودہ سال تک کے بچوں کو
تعلیم مفت اور لازمی ہونی چاہیے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں چھ سال سے گیارہ
سال تک کے ۶ر۴۲ فی صد بچے تعلیم پاتے تھے۔ ۶۹-۱۹۶۸ء میں
ان کی تعداد ۳ر۷۷ فی صد ہو گئی جو چوتھے پلان کا نشانہ ۳ر۸۵
فی صد ہے۔



فاتحین کی واپسی۔ ۱۹۷۱ء میں ہند کی کرکٹ ٹیم نے اجیت واڈیکر
کی کپتانی میں لاجواب اتحاد و اشتراکِ عمل کے جذبے سے کام
لے کر ویسٹ انڈیز اور انگلینڈ کو ہرا دیا۔

جگن ناتھ آزاد

ہندوستان کے تہذیبی عناصر اور اردو

تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ہندوستان کی ثقافت کی بنیاد مذہب اور مذہبی رواداری پر قائم ہے۔ بدھ دھرم ابتدا میں ایک الگ ثقافتی نظام کی صورت میں چلا ہو تو اور بات ہے لیکن انجام کار ہندو دھرم اور بدھ دھرم دونوں ایک دوسرے کے اس قدر قریب آگئے کہ ہندو فن تعمیر اور بدھ فن تعمیر کی جھلکیاں ایک دوسرے کی تعمیروں میں نظر آنے لگیں۔ آج بھی مہاتما بدھ کی اکثر مورتیاں کنول کے پھولوں پر بنی ہوئی ملتی ہیں جسے ہندو دھرم میں ابدیت کی ایک علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مہاتما بدھ کو ہندوؤں نے اپنا ایک دیوتا تسلیم کرکے ان کی پوجا شروع کر دی۔

ان دو ملے جلے دھاروں میں تیسرا عظیم دھارا جو آکے ملا وہ اسلامی تہذیب کا دھارا ہے۔ اسلامی تہذیب نے ہندوستان کو ایک شدید جمالیاتی احساس دیا جو فن لطیف میں مختلف پہلوؤں سے نمایاں ہوا۔ اس جمالیاتی حس کا سب سے زیادہ منفرد اظہار فن تعمیر میں ہوا جس کے نقوش مسلمان ماہرین کی زیر نگرانی ہندو اور مسلمان کاریگروں نے مل کر ابھارے۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندو ماہرین فن تعمیر اپنی ساری قوت فکر مندروں کی تعمیر پر صرف کیا کرتے تھے۔ ان مندروں کو دیکھ کر آج بھی پرانے ہندو ماہرین فن تعمیر کے تصور جلال و جمال کی صحت مندی پر ایمان لانا پڑتا ہے لیکن اکثر اوقات ہندوؤں کا جذبۂ عقیدت مورتیوں کو اتنی بھاری تعداد میں ایک چھوٹی سی جگہ پر لا بٹھاتا تھا کہ حسن جو سادگی کی بدولت پیدا ہوتا ہے نظروں سے مفقود ہو جاتا تھا۔ مسلمانوں کا فن تعمیر اپنے ساتھ صرف پرکاری ہی نہیں بلکہ سادگی بھی لایا اور جب فن تعمیر میں یہ سادگی رونما ہوئی تو نگاہوں کو اس فن میں ایک ایسا حسن نظر آیا جو اس وقت تک نظر سے اوجھل تھا۔ تاریخ اس فن تعمیر کو انڈو اسلامک یا ہند اسلامی یا بعض اوقات ہند ایرانی فن تعمیر کے نام سے یاد کرتی ہے اور آگرے کا تاج محل اس فن کا ایک جلیل ترین اور جمیل ترین مظہر ہے۔

ہندو دھرم اور اسلام کے علاوہ ایک اور مذہب جس نے ہندوستان کے تہذیبی عناصر کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا عیسائیت ہے۔ انگریزوں پر یہ الزام لگانا کہ انہوں نے حکومت کے زیر سایہ عیسائی دھرم یا عیسائی تہذیب کو ہندوستان پر ٹھونسا بڑی حد تک ایک غلط الزام ہے۔ بلکہ تاریخ ہم کو یہ بتاتی ہے کہ جب انگریزوں نے مشرقی وضع کے اسکول ہندوستان میں کھولنا شروع کئے تو نامور ہندوستانی ریفارمر راجہ رام موہن رائے نے اس بات پر شدید اعتراض کیا اور کہا کہ اس طرح ہمارے بچے نئی تعلیم کے اثرات سے بالکل بیگانہ رہ جائیں گے۔ اس لئے ہندوستان میں ایسے اسکول کھولے جائیں جن میں انگریزی تعلیم دی جائے۔

یہ تینوں مذاہب ہندو دھرم، اسلام اور عیسائیت ایک دوسرے میں مدغم تو نہ ہوئے جیسے مرور ایام کے ساتھ بدھ دھرم، ہندو دھرم میں مدغم ہو گیا لیکن آپس میں قریب آکر ایک دوسرے کو اس طرح متاثر کرتے رہے کہ ان کے باہمی اتصال نے ہندوستان میں رواداری اور بردباری کی ایک فضا پیدا کر دی اور یہ وہ فضا تھی جس میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب کو پروان چڑھنے کا بھرپور موقع ملا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس ثقافت کی تشکیل میں اردو زبان اور ادب نے کیا حصہ لیا۔ اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں مختلف نظریات ہمارے سامنے ہیں۔ بعض محققین کے نزدیک اس کی ابتدا شاہجہاں کے دور حکومت میں ہوئی۔ بعض اس کی قدامت کے پیش نظر اس کا تعلق محمود غزنوی کی فتوحات سے جوڑتے ہیں۔ بعض حضرات اس کی ولادت اس دور میں دکھاتے ہیں جب محمد بن قاسم کی فوجیں سندھ میں داخل ہوئیں اور بعض اس کی ابتدا کا سراغ امیر خسرو کی شاعری میں ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم فرماتے ہیں کہ شہاب الدین غوری جب فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوا تو اردو دہلی کی گلیوں میں گھٹنیوں چلتی تھی۔ حافظ محمود شیرانی نے اردو کو پنجابی کی بیٹی قرار دیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اردو کا جنم پنجاب میں ہوا اور اکثر محققین کی رائے یہ ہے کہ اردو کا آغاز شمالی ہند سے بہت دور دکن میں ہوا لیکن شاہجہاں کا دور حکومت ہو یا امیر خسرو کے ممدوح حکمرانوں کا یا دکن کے فرماں

رواؤں کا اُردو کو سرچشمہ ایک ایسا ماحول میسر آیا جس کی بدولت یہ زبان ہندوستان کی تہذیبی رنگا رنگی کی وحدت کا آئینہ بن گئی۔

مسلمان بادشاہوں کی حکومتیں نہ مذہبی حکومتیں تھیں نہ مذاہب سے لاتعلق تھیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان حکومتوں نے مذہبی اقدار کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا اور ان سے کبھی بے اعتنائی نہیں برتی بلکہ ہمیشہ مذہب کے اس پہلو کو پیش نظر رکھا ہے جسے رواداری کا پہلو کہتے ہیں اور جو صحیح معنوں میں تہذیبی اقدار کو جنم دیتا ہے۔

امیر خسرو کی غزل ۔

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

صرف ایک بڑے شاعر کا صوفیانہ نغمہ ہی نہیں ہے بلکہ اُس ماحول کی صدائے بازگشت بھی ہے جس میں امیر خسرو کی شاعری پروان چڑھی۔

ہر ادب جہاں اپنے ماحول کی تخلیق ہوتا ہے وہاں وہ اپنے ماحول کو متاثر بھی کرتا ہے۔ اُردو ادب بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ ہندوستان روزِ ازل سے ایک ایسا ملک رہا ہے جس میں مختلف تصورات کی رنگا رنگی نے ہمیشہ ایک تہذیبی وحدت کی صورت میں اپنا جلوہ دکھایا ہے۔ تلسی داس نے رامائن میں رام راجیہ کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی مختلف خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی گنوائی ہے کہ یہ ایک ایسا راج ہے جس میں مختلف عقائد کے لوگ اپنے اپنے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کریں۔ کثرت میں وحدت کا یہ حسن ہندوستان نے ہمیشہ برقرار رکھا ہے۔

ہمارے ملک میں مسلمان بادشاہوں کا دورِ حکومت اسی باطنی یک رنگی اور اندرونی وحدت کی ایک تصویر ہے۔ ان بادشاہوں کے دور میں نہ ہندو مسلم نفاق کا کوئی سراغ ملتا ہے نہ حکومت کے خلاف فرقہ وارانہ احتجاج کا۔ نہ ہی اس بات کا کہ ملک کے کسی حصے سے ہندو آبادی ہجرت کر کے ملک سے باہر چلی گئی ہو۔ نہ ہی اس دور کے ہندو راجاؤں، مہاراجاؤں کی ریاستوں سے مسلمانوں نے کبھی نقلِ مکانی کیا۔ یہ تمام کرشمے انگریز کے دورِ حکومت کے ہیں اور اس دورِ حکومت میں بھی راجاؤں اور نوابوں کی ریاستیں فرقہ واری کی اُس لعنت سے بڑی حد تک پاک رہیں جس سے برطانوی ہند کا دامن اکثر داغدار رہا۔ انگریز نے اپنی تین سو سالہ حکومت میں ہندوستان کی مٹی میں جو زہر لو یا وہ آخر کار رنگ لایا اور اس تہذیبی اکائی کو تسلیم نہ کرنے والوں نے اپنے لئے ایک الگ ملک اور الگ انتظامِ حکومت کی بنیاد ڈالی۔

آج اردو کے بظاہر حامی اور در پردہ مخالف اُردو کا رشتہ مسلمانوں سے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن تاریخ اس نظریے کو قدم قدم پر جھٹلاتی ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اُردو ہندوستان اور ایران کی تہذیبوں کا ایک مقامِ اتصال ہے۔ یہ ان دو تہذیبی دھاروں کا ایک سنگم ہے۔ اردو کا دامن دیوانِ خاص نہیں ہے بلکہ دیوانِ عام ہے اس میں ہر مکتبِ فکر اور ہر عقیدہ سما سکتا ہے۔ یہ ہندوستانی معاشرے کی ایک جامع اور مکمل تصویر ہے یہ سرزمینِ وطن کا ایک اسانگا نغانہ ہے جس میں تہذیب کے لاتعداد پہلو بکھرے ہیں۔ یہ ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک تسلسل ہے۔ اور اس تسلسل میں ایک ہی رو جاری و ساری ہے اور وہ ہے وحدتِ روحِ ہندوستان۔

یہ محض اتفاق کی بات نہیں ہے کہ اردو کی ابتدائی شعری اور نثری تصانیف کے موضوعات ویدانت، تصوف، اخلاقیات اور وطنیت کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ہیں بلکہ اس کا سبب تاریخ کا یہی مذکورہ تسلسل ہے۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف معراج العاشقین اردو نثر کے ابتدائی رسائل میں بڑی اہمیت کی حامل ہے جس کی زبان آج سے پانچ سو سال پہلے کی زبان ہے۔ یہ رسالہ تصوف اور ویدانت کی تعلیم سے لبریز ہے۔ اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر قلی قطب شاہ کا کلام ایک نظر دیکھئے۔ ہندوستان کی تہذیبی جلوہ گری آپ کو قدم قدم پر نظر آئے گی قلی قطب شاہ کے ذکر میں صرف یہ کہنا کافی نہیں ہوگا کہ اس نے ہندوستان کے رسم و رواج اور تہواروں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا یا اس کی شاعری دکن کے پھلوں کی شیرینی سے لبریز ہے اور دکن کے پھولوں کی خوشبو سے مہک رہی ہے وہ بسنت کا بھی عاشق ہے اور شب برات کا بھی اور اس کی شاعری پر ہندی شاعری کا گہرا اثر ہے بلکہ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ یہ وہی بادشاہ ہے جس نے حیدرآباد میں چار مینار بنوا کر اس کی چھت پر آمنے سامنے مسجد اور مندر کی عمارتیں بھی تعمیر کرائیں۔

محمد قلی قطب شاہ سے پہلے کے شاعر نصرتی ملک الشعرائے بیجاپور کی تخلیقات دیکھئے اس کی تین قابلِ ذکر تصانیف میں ایک گلشنِ عشق ہے اور باقی دو کنور منوہر اور مدمالتی کے قصے ہیں۔

وسعتِ نظر ہندوستانی تہذیب کا روشن ترین پہلو ہے۔ یہ وسعتِ نظر اُردو ادب میں طرح طرح سے جلوہ گر ہوئی مسلمان شعراء نے (اگرچہ میں ذاتی طور پر شاعر کو ہندو اور مسلمان کے خانوں میں تقسیم کرنے کے خلاف ہوں۔) ہندوؤں کے تیوہاروں اور ہندو شعراء نے مسلمانوں کے رسم و رواج اور تیوہاروں کے متعلق اتنا کچھ لکھا ہے کہ ہر موضوع پر الگ الگ دفتر تیار ہو سکتے ہیں۔ ان شعراء میں نظیر اکبر آبادی کا نام سرِ فہرست ہے ان کی نظمیں جنم کنھیا جی، بال پن بنسری بجیا، بانسری، لہو و لعب کنھیا، کنھیا جی کی شادی، رسم کتھا، ہر کی تعریف میں، درگا جی کے درشن، بھیروں کی تعریف اور مہادیو کا بیاہ اور اس کے علاوہ بسنت، ہولی، دیوالی اور راکھی وغیرہ کے موضوعات پر جو کچھ کہا ہے اُسے مذہبی رنگ نہیں بلکہ خالص تہذیبی رنگ عطا کیا ہے یہ نظریے کی روشن خیالی کی ایک دلیل ہے نظیر نے اٹھارویں صدی

ہی میں بالغ اور پختہ ہوئے شعور کی بدولت ہندو دھرم کی روایات کو خالص ہندوستانی اور قومی تہذیب کی جھلکیاں بنا کے پیش کیا گیا۔ یہی رجحان شعور مختلف منزلیں طے کرتا ہوا دو سو سال بعد اقبال اور جواہر لال نہرو کے حصے میں آیا۔ اقبال نے جب جاوید نامے میں شوجی مہاراج کو قدیم ہندوستانی تہذیب کے نمائندے کی حیثیت سے دیکھا یا مثنوی میں گنگا کے بارے میں ہمالہ کی زبانی یہ کہلوایا کہ گنگا شوجی کی جٹاؤں سے نکلی ہے، تو وہ صرف ہندو دیومالائی تصور کے ایک پہلو ہی کو نظم نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کے پیش نظر اس کثرت میں وحدت کو اپنے کلام میں اجاگر کرنا تھا جس سے مختلف الخیال لوگوں کے ظاہری اختلافات کے باوجود ہندوستان کی باطنی یک رنگی عبارت ہے۔

یہی دلاویز نکتہ بعد میں ہندوستان کے جلیل سپوت جواہر لال نہرو کی وصیت بن کر سامنے آیا جب انہوں نے مذہبی تصور سے ہٹ کر گنگا کی ایک جھلک ہمیں دکھائی اور اسے ہندوستان کی وحدت کی ایک علامت کے طور پر پیش کیا۔

اس وسعتِ نظری نے اردو ادب کی وسعتیں دور دور تک پھیلا دیں جوش کا یہ کہنا ؎

آب و گلِ ہند سے ہوں اور ہندی ہوں
نسلِ آدم سے ہوں اور انساں ہوں میں

صرف ایک فرد ہی کی آواز نہیں ہے بلکہ اس سے اس ساری قوم کے کردار کا پتہ چلتا ہے جس کے جذبے اور فکر کی نمائندگی اردو شاعری نے کی۔ سیماب اکبرآبادی اپنے وطن کے بارے میں کہتے ہیں:

ہمارے پہلوؤں سے کوئی آخر سرگراں کیوں ہو — کوئی ناشادماں کیوں ہو
ہمارا باغ ہے ہم اس میں محوِ گلفشانی ہیں — کہ ہم ہندوستانی ہیں
وطن کی خاک میں ملنا ہمارا دین و ایماں ہے — یہیں مرنے کا ارماں ہے
شبابِ زندگانی یا خرابِ زندگانی ہیں — کہ ہم ہندوستانی ہیں
کہاں کی فرقہ بندی اور جماعت سازیاں کیسی — یہ کثرت سازیاں کیسی
ہمیں ہندی کہو ہم ربطِ قومیت کے بانی ہیں — کہ ہم ہندوستانی ہیں
جو قوت تھی دلیروں میں کبھی ہے آج ہم میں بھی — نہیں مایوس غم میں بھی
ہم اپنے مسلکِ اسلاف کی زندہ کہانی ہیں — کہ ہم ہندوستانی ہیں

اور یہی مذکورہ مسلکِ اسلاف جب انہیں دنیا کے ہر انسان سے محبت کرنا سکھاتا ہے تو اس وقت صرف ہندو مسلمان ہی نہیں۔ بلکہ ہندوستانی اور ایرانی، عراقی اور جاپانی کی قید بھی اٹھ جاتی ہے۔

غلط سمجھا خیالِ ہندوستاں تک ہے وطن میرا
جہاں تک حدِ امکاں ہے وہاں تک ہے وطن میرا

میں انساں ہوں یہ انسانی کرہ ہے آج تک میرا
جہاں جاؤں جدھر جاؤں زمیں میری فلک میرا
ہوا میں سانس لوں تو کون مجھ کو روک سکتا ہے
بھرے دریا پہ سیرابی سے کوئی ٹوک سکتا ہے
میسر ہر جگہ ہے دھوپ خورشیدِ درخشاں کی
مہیا ہر قدم پر چاندنی ہے ماہِ تاباں کی
چمک تاروں کی راتوں کو رہِ منزل بتاتی ہے
کسی کا ہو چمن خوشبو مجھے پھولوں کی آتی ہے

حقیقت میں زمیں سے آسماں تک ہے وطن میرا
یقیناً وسعتِ کون و مکاں تک ہے وطن میرا

میراجی کے یہاں آکر سرزمینِ وطن اور اس کی روایات سے لگاؤ دھرتی پوجا کی حد تک پہنچ گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں "میراجی کی روح دھرتی ماتا کی روح سے ہم آہنگ ہے اور اس کے سوچنے اور محسوس کرنے کا آغاز قدیم تر روایات، تاریخ اور دیومالا سے مملو ہے۔ دوسرے لفظوں میں میراجی نے ایک بھگت، درویش یا جان بار بنجارے کی طرح اپنی دھرتی کی پوجا کی ہے"۔ محض رسمی طور پر وطن دوستی کی تحریک کا ساتھ نہیں دیا۔

حسرت موہانی کی نظم

متھرا سے اہلِ دل کو وہ آتی ہے بوئے انس
دنیائے جاں میں شور ہے جس کے دوام کا

ظفر علی خاں کی نظم

سری کرشن کا میں احترام کرتا ہوں
اور اس میں روز نیا اہتمام کرتا ہوں
ہنود بھول گئے ہیں کرشن کی تعلیم
مگر میں ان سے یہی صبح و شام کرتا ہوں

حفیظ کا گیت

کاہن مرلی والے نند کے لال
بانسری بجائے جا

اور ساغر کی نظم:

سچ بتا اے میری جنتا کیا وہی جمنا ہے تو

اور ان کے علاوہ متعدد دوسرے ادباء اور شعراء کے اسی طرح کے ادب پارے کوئی وقتی جذبے کی تخلیق نہیں ہیں بلکہ اس شعور کی نمائندگی کرتے ہیں جس نے ہندوستان کی تہذیب میں پرورش پائی۔

ہندوستان کی یہی تہذیب سچے فن کاروں کے مزاج کا، شعور کا،

بلکہ ساری زندگی کا نچوڑ و بن چکی ہے۔ مرحوم نے پاکستان سے ہجرت کرتے وقت پاکستان سے ان لفظوں میں خطاب کیا۔

الوداع اے ارضِ پاکستان ہمیشہ کے لئے
یاد رکھیں گے ترے احسان ہمیشہ کے لئے

جائے سامانِ معیشت داغِ حسرت لے چلے
سبزۂ بیگانہ تھے ہم تیرے گلشن سے چلے
دیکھئے کیا رنگ ہو آگے تری تاریخ کا
خونِ ناحق سے ہے پہلا باب تو لکھا گیا
تو پھلے پھولے رہے تجھ پر کرم اللہ کا
دور دامن سے ترے شعلہ ہماری آہ کا
تو ہوا دشمن ہمارا ہم ترے دشمن نہ تھے
تو ہوا کیوں ہم سے بدظن تجھ سے ہم بدظن نہ تھے

اور یہ نظم اس شعر پر ختم ہوتی ہے

خیر سے تجھ کو محبت اور شر سے عار ہو
تاکہ پاکستان کہلانے کا تو حقدار ہو

یہ تو خیر ایسے دور کی بات تھی جب دو نظریوں میں ٹکراؤ بہت واضح طور پر سامنے آگیا تھا اور اس نے ہزاروں لاکھوں کی آبادیوں کے نقلِ مکانی کی صورت اختیار کرلی تھی اور شاعر خود بھی اس نقلِ مکانی کا شکار ہوا۔ لیکن اس وقت بھی جب کہ اس ٹکراؤ کی کوئی واضح تصویر پردۂ وقت پر نہیں ابھری تھی محروم کی شاعری میں اُن نظموں کی ایک نمایاں حیثیت رہی ہے جو مشترکہ تہذیب کی ایک رنگا رنگ تصویر پیش کرتی ہیں۔ غالباً ۱۹۴۳ء کی بات ہے "نوائے وقت" لاہور میں خلیق قریشی کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس کا موضوع تھا "اردو شاعری میں علاقائی رنگ"۔ اس میں فاضل مقالہ نگار نے جو اگرچہ پاکستان میں مسلم لیگ کے ایک رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ اگر ہم اردو شاعری میں مغربی پاکستان کے کلچر کی نشان دہی کرنا چاہیں تو تلوک چند محروم کے کلام سے زیادہ بہتر مثال ہمیں نہیں مل سکتی۔

یہاں میں نے اُس نعتیہ کلام کا ذکر نہیں کیا جو ہندو شعراء کے قلم بلکہ دل سے نکلا۔ کون نہیں جانتا کہ درگا سہائے سرور کی ایک نعت مدتوں مولود شریف کے جلسوں میں پڑھی جاتی رہی۔ وہ زمانہ مجھے آج بھی یاد ہے جب لاہور میں دو تین بچے بچے کی زبان پر تھیں۔ ایک پنڈت ہری چند اختر کی نعت :

اک عرب نے آدمی کا بول بالا کردیا

اور دوسری مولانا ظفر علی خاں کی

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

تصویر کا یہ رخ منشی کنہیالال شاد کے رسالہ علم تصوف، منشی پریم چند کے افسانوں اور ناولوں اور بالخصوص ناول "کربلا" اور بشیشور پرشاد منور لکھنوی کے آیاتِ کلام پاک کے چند ترجموں کے بغیر نامکمل رہے گا۔

منشی روپ چند آمی اردو کے ایک بہت اچھا کہنے والے شاعر تھے۔ عشرت لکھنوی نے ان کا ذکر اپنے تذکرے "ہندو شعراء" میں کیا ہے۔ عشرت لکھنوی لکھتے ہیں کہ ان کی ہر غزل میں ایک نعتیہ شعر ضرور ہوتا تھا۔ ایک شعر انہوں نے درج کیا ہے۔

آیا جو نام پاک محمد زبان پر
صلی علیٰ کا شور اُٹھا آسمان پر

ان کے علاوہ مشہور اور معروف شعراء میں مرزا ہرگوپال تفتہ، مہاراجہ کشن پرشاد، پیارے لال رونق، چندی پرشاد شیدا، دوارکا پرشاد افق اور مہاراجہ بہادر برق دہلوی ایسے نام ہیں جن کے کہے ہوئے سلام اور مرثیے آج بھی اردو ادب کی زینت ہیں۔

نامور محقق مالک رام کی تصنیف "عورت اور اسلام" کے بارے میں میرے لئے کچھ کہنا چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے۔ اس لئے میں اس کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے چند الفاظ نقل کردینا زیادہ مناسب خیال کرتا ہوں جو انہوں نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھے تھے۔ وہ الفاظ یہ ہیں۔

"قرآن اور تفسیر کے علاوہ مصنف کی نظر حدیث پر بھی بہت وسیع ہے۔ کم از کم تبصرہ نگار سے زیادہ۔"

کرشن بھگوان کی تعلیمات کے سلسلے میں مولانا ظفر علی خاں اور حسرت موہانی کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔ وہ ذکر اردو شاعری کے تعلق سے تھا۔ یہاں میں ایک نثر پارے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور وہ ہے خواجہ حسن نظامی کے مقالے "قلمی چہرے" کا ایک جز۔ کرشن جی کے عنوان سے خواجہ حسن نظامی مرحوم لکھتے ہیں :

"متھرا میں آدھی رات کو نکلنے والا چاند، گوکل میں گئووں اور بے زبانوں کا نگہبان، بندرابن میں تلوار کھینچ کر کنس پر چڑھ جانے والا اغدائی بہادر، من موہن، حسن بے پروائی کی مورت، رب العالمین جگ داتا کی رحمتِ عام کا سبق پڑھانے والا۔ ہندوستان کا سب سے بڑا محبوب سب سے زیادہ پیارا کرشن کنھیا۔

"اس کی بانسری کی لوک آج تک سنائی دیتی ہے کان ہو تو سنو۔ اس کے معجزانہ کرشمے اب بھی نظر آتے ہیں۔ آنکھ ہو تو دیکھو"

یہ تحریر دل پذیر جو خواجہ صاحب کی دل کی گہرائیوں سے نکلی ہے سری
سے اُن کی عقیدت کا ایک پَرتو ہے۔ یہ عقیدت کن مضبوط بنیادوں پر
ہے اس کا اندازہ خواجہ صاحب کی اُس تصنیف سے ہوتا ہے جس کا نام ہے۔
ئے کی یادن پہ اپنا بیان" خواجہ صاحب نے اس کتاب میں گاندھی کے
یہ قرآن القدس کے لحاظ سے روشنی ڈالی ہے۔

مہاتما گاندھی ہندوستان میں مشترکہ تہذیب کی ایک علامت ،
جیتی جاگتی تصویر بن کر آئے اور مہاتما گاندھی کا اثر جس طرح اُردو
نے قبول کیا وہ تاریخ ہند کا ایک اہم حصہ ہے۔ اصل بات یہ ہے
دو نے مہاتما گاندھی کے میدان عمل میں آنے سے قبل ہی اسی تہذیب
سی ثقافت کے ماحول میں پرورش پائی تھی اس لئے اردو ادب نے
ندھی جی کے اندازِ فکر کو قبول کرنے میں دیر نہ لگائی۔ اُردو شاعروں ،
یوں اور افسانہ نگاروں میں اکبر الہ آبادی، اقبال، آرزو لکھنوی
میر تقی، سیماب اکبر آبادی، پروفیسر محمد مجیب، جمیل مظہری، یحییٰ اعظمی
نرائن چکبست ، دیا نرائن نگم ، محمد علی جوہر، حسرت موہانی، لالہ لاجپت
ئے ، پریم چند، ظفر علی خاں، درگا سہائے سرور، محروم ، حیات اللہ
اری ، آنند نرائن مُلا، جوش ملیح آبادی ، فراق گورکھپوری اور امن
و گاندھی سے براہ راست متاثر ہوئے ۔ بعد کی نسل میں ساغر نظامی
صدیقی، شمیم کرہانی ، مجاز ۔ آل احمد سرور، سکندر علی وجد، احسان
ق ، علی جواد زیدی، خواجہ احمد عباس، نشور واحدی اور رام لعل کا نام
سکتا ہے۔ جہاں انہوں نے اور ان کے علاوہ متعدد ادیبوں ، شاعروں
فسانہ نگاروں نے ہندوستانی تہذیب کو ادب کا جُزو بنایا وہاں
ر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین نے تعلیم اور تہذیب و تمدن کے موضوعات
ں کی روشنی سے منور کیا ۔

آل احمد سرور نے آزادی کے چار برس بعد ۱۹۵۱ء میں ایک نظم
ی "سعی وفا" یہ نظم جہاں شاعر کے جمہوری نظام پر اعتماد کی ایک
یہ ہے وہاں ہندوستانی تہذیب کی اُن تمام پنہاں قوتوں کو بھی آشکار
ہے جن کی بدولت کسی بھی سماجی یا جمہوری نظام کو پختگی اور استحکام
ب ہوسکتا ہے۔ سرور اس نظم میں کہتے ہیں۔

وہی مے آج بھی ہے تاج کے جام بلوریں میں
اودھ کی شام کے وہ میکدے آباد ہیں اب بھی
بہاریں میری صدیوں کی چمن بندی کا حاصل ہیں ۔
لب تاریخ کو میرے فسانے یاد ہیں اب بھی
" قفس کیا حلقہ ہائے دام کیا رنج اسیری کیا "
یقیں کی روشنی جاگے تو دل آزاد ہیں اب بھی

بہار جنت کشمیر سے تا ارض کاویری
وطن میں میری کتنی نکہتیں آباد ہیں اب بھی
یہ صدیوں کی حنا بندی کبھی تو رنگ لائے گی
بہاروں میں مری سعی وفا بھی جگمگائے گی

یہ سعی وفا تنہا شاعر ہی کی نہیں ہے بلکہ یہ ساری اُردو زبان اور اردو ادب
کی سعی وفا ہے۔

اُردو ادب کی حریم میں ہندوستانی ثقافت کا یہ چراغ آج بھی روشن ہے۔
اگرچہ کبھی کبھار بادِ مخالفت کے جھونکے اُسے بجھانے کی کوشش میں بھی مصروف
نظر آتے ہیں لیکن مقام مسرت یہ ہے کہ اس چراغ کی روشنی پہلے سے زیادہ تیز
ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس وقت جب کہ ہمارا ملک بعض اندرونی اور بیرونی خطرات
سے دوچار ہے، ہمارے نظام فکر کا سب سے بڑا سہارا یہی ہے کہ ہم اپنی اس
مشترکہ تہذیب کا دامن مضبوطی سے تھامے رہیں۔ ۱۹۶۵ء میں جب پاکستان
اور ہندوستان آپس میں محوِ کشاکش تھے اور ہندوستان اپنی تہذیبی روایت
کا سہارا لے کر پاکستان کے مقابلے میں صف آرا ہوا تھا تو ساحر لدھیانوی
نے ہندوستانی زاویۂ نگاہ کو بڑی خوبصورتی سے اپنی ایک نظم "یہ جان لے
پاکستان" میں یوں بیان کیا تھا۔

طاقت سے جھکائے کوئی ہمیں یہ کام نہیں آسان
ٹیپو کی چمکتی تیغ ہیں ہم ارجن کا دہکتا بان
وہ وقت گیا وہ دور گیا جب دو قوموں کا نعرہ تھا
وہ لوگ گئے اس دھرتی سے جن کا مقصد بٹوارہ تھا
اب ایک ہیں سب ہندوستانی اب ایک ہے ہندوستان
یہ جان لے پاکستان :
تاج اور اجنتا کے وارث اتہاس بنانے نکلے ہیں
کاشی اجمیر امرتسر کے سنگم کو بچانے نکلے ہیں
اس راہ میں جو بھی خون بہے تہذیب پہ ہے احسان

ساحر نے ان اشعار میں پاکستان کے خلاف کسی عسکری طاقت کے مظاہرے
کا اعلان نہیں کیا نہ ہی کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ لگانے
کی کوشش کی ہے بلکہ اس نے ہندوستان کے اس تہذیبی ورثے کی طرف
اشارہ کیا ہے جو امن میں بھی ہمارے لئے چراغ راہ ہے اور جنگ میں بھی۔
یہی بات جاں نثار اختر نے اسی زمانے میں اِن الفاظ میں کہی تھی۔

دیکھنا سنگم کے ماتھے پر سیاہی پھر نہ جائے
تاج کا کوئی منارہ تھرتھرا کر گر نہ جائے
اس فضائے حسن پرور کی حفاظت فرض ہے
ہمارا گھر ہے اس گھر کی حفاظت فرض ہے

فضا ابن فیضی

طلوعِ صبحِ وفا

طلوعِ صبحِ وفا کو پچیس سال ہوئے
یہ روشنی ہے شعورِ تفکر کا گہوارہ
یہ روشنی ہے تفکر، یہ روشنی ادراک
یہ روشنی ہے بصیرت، یہ روشنی وجدان
یہ روشنی ہے صداقت یہ روشنی تعمیر
یہ روشنی ہے تمدن یہ روشنی تہذیب
یہ روشنی ہے مقدس روایتوں کی امیں
یہ روشنی ہے نئی نسل کے لہو کا کنول
یہ روشنی ہے امنگوں کے کارواں کا چراغ
یہ روشنی ہے ہمالہ کی جگمگاتی دھوپ
یہ روشنی ہے مہکتا ہوا گلاب کا پھول

نزولِ حرفِ وفا کو پچیس سال ہوئے
یہ نغمگی ہے نشاطِ غزل کا گہوارہ
یہ نغمگی ہے لطافت، یہ نغمگی تاثیر
یہ نغمگی ہے اجالوں میں آگہی کا سفر
یہ نغمگی ہے اندھیروں میں نور کا اثبات
یہ نغمگی ہے جدید ارتقا کا خوابِ رواں
یہ نغمگی ہے نیا "عہد نامۂ جمہور"
یہ نغمگی ہے ضمیر و قلم کی انگڑائی
یہ نغمگی ہے حدیثِ فروغِ مستقبل
یہ نغمگی ہے دلِ تاج کی جواں دھڑکن
یہ نغمگی ہے لبِ بوالکلام کا آہنگ

یہ نور و نغمہ کی دنیا حسین ہے کتنی
یہ رنگ و صوت کا پیکر جوان ہے کتنا
مہکتے خواب ہیں سمٹے ہوئے نگاہوں میں
تمام حسنِ زمیں کا ہے جذب بانہوں میں
کسے یہ فکر کہ دور آسمان ہے کتنا
حریرِ عیش و طرب میں بدن لپیٹے ہوئے
نفس میں خوشبوئے آسودگی سمیٹے ہوئے
مرے وطن کے خوش اوقات شاعروں کی طرح
تمام لوگ ہیں فکرِ غزل میں کھوئے ہوئے

یہ لمحہ ہم سخنو! مہربان ہے کتنا
یہی وہ لمحہ ہے جو کارگاہِ ہستی میں
طویل صدیوں کا عرفان تم کو بخشے گا
نیا شعور، بصیرت نئی، نیا ادراک
نیا وجود، نئے خواب، اور نیا ماحول
یہ لمحہ جینے کا ارمان تم کو بخشے گا

دھواں دھواں سے مناظر، تپاں تپاں سی کرن
یہ بے چراغ دریچے، اداس اداس یہ گھر
یہ زہر گھلی ہوائیں، یہ خون پیتے کنول
یہ زندگی کی ڈگر اور جراحتوں کا سفر
یہ آگہی کا جنازہ، صداقتوں کا کفن
یہ انتشار، یہ فرقہ پرستیوں کا غبار
یہ نفرتیں، یہ تعصب، یہ ابلہی، یہ جنوں
اس ایک لمحہ کے قاتل ہیں یہ تمام آشوب
اس ایک لمحہ کے رہزن ہیں یہ تمام انداز
اس ایک لمحہ کے دشمن ہیں یہ تمام اسباب

یہ لمحہ تو ہے تمہارے ضمیر کی آواز
تم اس ضمیر کی آواز کو نہ قتل کرو
یہ لمحہ تو ہے تمہارے وجود کا اثبات
تم اس وجود کے اثبات کو نہ قتل کرو
محبتوں کی گھنی چھاؤں میں چھپا لو اسے
کہ نفرتوں کی کڑی دھوپ اس کو چھو نہ سکے
صبا ہو تم نفسِ شوق میں بسا لو اسے
کہ اس گلاب کی خوشبو کوئی چرا نہ سکے
پنہاؤ اس کو شباب و حیات کا زیور
ابھارو آنکھوں میں کاجل کی سرمئی تحریر
جلاؤ سینے کی محرابِ صاف میں شمعیں
سوادِ زلف کو دو نذر عنبریں راتیں،
سجاؤ چاند جبیں پر، لبوں کو بوسہ دو
تم اس کے جسم پہ دوشیزگی کا عطر ملو
کہ جب بھی گزرو دیارِ وطن کی گلیوں سے
تمہیں پکارے یہ رنگ اور نور کا پیکر
نظر کو چومے یہ عطر و بہار کی تحریر
تمہارے ساتھ چلے یہ نکہت فشاں آواز

طلوعِ صبحِ وفا کو پچیس سال ہوئے
نزولِ حرفِ وفا کو پچیس سال ہوئے

حرمت الاکرام

بجتے ہیں دہل

قافلے والو: ذرا تیز چلو، تیز چلو
کتنے دلدار ہیں آغازِ سفر کے لمحات
بامِ گردوں سے اترتی ہے ستاروں کی برات
اپنے شعلوں سے الجھتی ہے نئی تاریخ کی لو
نور افگن ہیں جبینوں پہ دلوں کے پرتو
زندگی سجتی ہے کس شوخ ادا کا محمل
خم بخم راہ گزاروں کے دھڑکنے لگے دل
وسعتِ نجد میں بیدار ہوا ذوقِ جنوں
عشق کی نبضوں میں بھڑکی نئے انداز سے آگ
دل کے ہر تار پہ لہراتے ہیں انگاروں کے راگ
کتنا ہے شوخ زباں کاکل و رخ کا افسوں
حسن نے بھیجا ہے دیوانوں کو پیغام نیا
بڑھ گئی کہہ کے صبا: تیز چلو، تیز چلو
قافلے والو! ذرا تیز چلو، تیز چلو
بڑھتے قدموں کے دئے جلتے چلے جاتے ہیں
سانسوں کی آنچ سے کہسار گلے جاتے ہیں
جرسِ وقت کی آواز کھلاتی ہے کنول
موجِ انفاس سے باجتے ہیں سینوں میں دہل
حوصلے، شورشِ طوفاں کو صدا دیتے ہیں
قطرے کو منزلِ گوہر کا پتہ دیتے ہیں
منجمد لمحوں کے خرمن پہ لپکتے ہیں شرار
جھلملاتا ہوا اٹھتا ہے مراحل کا غبار
سوزِ پنہاں کی تڑپ کب ہوئی پابندِ رسوم
کس کو بتلائیے کلیوں کی چٹک کا مفہوم
آئی آواز: ذرا تیز چلو تیز چلو
قافلے والو! ذرا تیز چلو تیز چلو

خلیق احمد نقوی

غریبی کا مسئلہ

آج کل 'غریبی ہٹاؤ' تحریک کے سلسلہ میں 'سماجی انصاف' 'سماجی برابری' 'مساوات' وغیرہ کا تذکرہ ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ ایک نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ سیاسی تحریک معلوم ہوتی ہے۔ بعض لوگ تو اسے ایک سیاسی مذاق سمجھتے ہیں یا عوام کو بہلاوا دینے کا نعرہ گردانتے ہیں۔ آیئے ہم اس سوال پر معاشی نقطۂ نظر سے غور کریں۔

(۱)

پہلا سوال تو یہ ہے کہ آخر غریبی کا مطلب کیا ہے؟ جب ہم کسی فرد، خاندان یا آبادی کے حصہ یا طبقہ کو غریب کہتے ہیں تو اکثر اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس کی آمدنی اتنی کم ہے کہ دو وقت کا کھانا میسر نہیں ہے۔ پھٹے پرانے کپڑے ہیں، وہ بھی ناکافی اور صحت کے لئے، رہنے سہنے کے لئے، پڑھائی کے لئے اور دوسری بنیادی ضروریات کے لئے آمدنی کی کمی ہے۔ اب غور کیجئے تو ان سب میں زندہ رہنے کے لئے غذا اور تھوڑا بہت کپڑا سب سے زیادہ بنیادی ضروریات ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر زندہ رہنا ناممکن ہے۔ غریبی کی اس تعریف کو ہم 'مطلق غریبی' کہہ سکتے ہیں۔

غریبی کا دوسرا مفہوم ہے کہ کسی ملک یا طبقے کے پاس ذرائع زندگی، دوسرے ملکوں اور دوسرے طبقوں کی نسبت کم ہیں۔ کچھ لوگ عیش و عشرت سے زندگی بسر کرتے ہیں اور کچھ لوگ ان کے مقابلہ میں عیش و عشرت کے سامان سے محروم ہیں۔ ایسی غریبی کو ہم 'اضافی غریبی' کہہ سکتے ہیں۔

سماجی نقطۂ نظر سے 'اضافی غریبی' کے نتائج بھی افسوس ناک ہو سکتے ہیں۔ مگر ہر سمجھدار آدمی یہ بات مان لے گا کہ 'مطلق غریبی' کا مسئلہ زیادہ تکلیف دہ اور سنجیدہ ہے۔ یہ اس لئے کہ 'مطلق غریبی' میں زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ اپنے آپ کو غریب کہتے ہیں، روپیہ پیسے کی تنگی کی شکایت کرتے رہتے ہیں کیونکہ وہ 'اضافی غریبی' سے پریشان ہیں۔ ان لوگوں کے مسئلے سے قطع نظر کر کے ہم صرف واقعی غریب طبقہ کو اپنی نظر کے سامنے رکھیں گے۔

ہمارے سامنے سوال یہ ہیں۔ ہندوستان کی آبادی کا وہ کون سا حصہ ہے جو 'مطلق غریب' ہے یعنی وہ کون سا طبقہ ہے جس کو اتنا کھانا اور کپڑا بھی میسر نہیں کہ جسم اور جان کا تعلق قائم رکھ سکے؟ آزاد ہندوستان کے پچھلے پچیس سال میں اس طرح کے غریبوں کی تعداد بڑھی ہے یا گھٹی ہے؟ منصوبہ بندی کے دور میں جو کچھ معاشی ترقی ہوئی ہے اس سے ان غریبوں کو کچھ فائدہ پہونچا ہے یا نہیں؟ یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ آزاد ہندوستان میں غریب پہلے سے زیادہ غریب ہو گئے ہیں اور امیر پہلے سے زیادہ امیر؟ اگر ہم واقعی غریبی ہٹانا چاہتے ہیں تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

ظاہر ہے کہ ایک چھوٹے سے مضمون میں اتنے بہت سے پیچیدہ سوالوں کا خاطر خواہ جواب دینا ناممکن ہے پھر بھی یہ کوشش کی جا سکتی ہے کہ ہندوستان کے ماہرین معاشیات نے اس سلسلہ میں جو تحقیقات جو کھوج بین کی ہے اس کا چند لفظوں میں خلاصہ پیش کر دیا جائے۔

(۲)

اس تحقیق کا ایک طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ان چیزوں کی ایک فہرست بنائی جائے جو زندگی کے لئے ازحد ضروری ہیں۔ کچھ غلہ، نمک، ترکاری اور تیل کھانے کے لئے اور چند میٹر کپڑے کو اگر ضروری قرار دیا جائے اور ان کی مقدار مقرر کر دی جائے تو ہماری فہرست تیار ہو جائے گی۔ چونکہ چیزوں کی قیمت بدلتی رہتی ہے اس لئے کسی سال میں جو قیمتیں بازار میں ہوں ان سے ہم حساب لگا سکتے ہیں کہ کتنی کم سے کم آمدنی میں کوئی فرد یا خاندان ان بنیادی ضروریات کی چیزوں کو خرید سکتا ہے۔ اب اگر ہم کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے ملک میں اس سال میں کتنے لوگوں کی آمدنی اس سطح سے کم تھی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ آبادی کا کونسا حصہ 'مطلق' طور پر غریب تھا۔

مثال کے طور پر جولائی ۱۹۶۲ء میں یہ حساب لگایا گیا تھا کہ ۱۹۶۰-۶۱ء کی قیمتوں کے مطابق فی کس ۲۰ روپے ماہانہ آمدنی سے زندگی کی بنیادی ضروریات کی چیزیں خریدی جا سکتی تھیں۔ اگر کسی خاندان میں پانچ فرد ہوں اور مکان، تعلیم، دوا، وغیرہ پر خرچ نہ کرنا ہو تو سو روپے ماہانہ آمدنی یا اس سے زیادہ والے زندگی اور موت کے مسئلہ سے بچ سکتے ہیں اور وہ سب خاندان جن کی آمدنی سو روپے ماہانہ سے کم ہے (پانچ افراد پر مشتمل خاندان) مطلق غریب گنے جا سکتے ہیں۔ اپریل، مئی ۱۹۷۲ء میں ۱۹۶۰ء کے مقابلہ میں قیمتوں میں لگ

۴۰ فی صدی اضافہ ہوا ہے، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں آج جن خاندانوں کی آمدنی ۱۸۳ روپے ماہانہ سے کم ہے وہ صحیح معنوں میں غریب ہیں۔ اگر خاندان پانچ افراد سے زیادہ یا کم ہوں تو اسی حساب سے اضافہ یا کمی کر دینی چاہیے۔

اگر غریبوں کی تعداد کا اندازہ لگانے کا یہ طریقہ صحیح مان لیا جائے تو ہم کو معلوم کرنا ہوگا کہ مختلف برسوں میں آبادی کے کتنے بڑے حصہ کو زندگی کی یہ بنیادی ضروریات میسر نہ تھیں۔ اس بنیاد پر ہم کہہ سکیں گے کہ غریبوں کی تعداد بڑھی ہے یا گھٹی ہے۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ چونکہ گاؤں میں رہنے والوں کی ضرورتیں، اور ان ضرورت کی چیزوں کی قیمتیں، شہر کے رہنے والوں کی نسبتاً کم ہوتی ہیں، اس لئے گاؤں کی آبادی میں اس حساب سے ان لوگوں کو مطلق غریب کہا جا سکتا ہے جن کی ماہانہ فی کس آمدنی پندرہ روپے سے سترہ روپے تک یا اس سے کم ہو۔ (۶۱-۱۹۶۰ء کی قیمتوں کے مطابق) اس حساب سے آج کل کی قیمتوں کے مطابق گاؤں میں رہنے والے اس طبقہ کو غریب کہا جا سکتا ہے جس کی آمدنی لگ بھگ بیس روپے فی کس ماہانہ یا اس سے کم ہو۔

(۳)

ہمارے ملک میں نیشنل سیمپل سروے (NATIONAL SAMPLE SURVEY) کے ذریعے اور بہت سی معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ عوام کے مختلف طبقوں اور گروہوں کی کفالت اور خرچ کے بارے میں بھی اعداد و شمار جمع کئے جاتے ہیں۔ سائنٹفک طور پر چنے ہوئے گھرانوں میں جا کر پوچھ تاچھ سے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ خاندان نے روزمرہ کے خرچ کی مختلف مدوں میں کتنا کتنا خرچ کیا۔ ۵۵-۱۹۵۶ء سے یہ اعداد و شمار باقاعدگی سے جمع کئے جا رہے ہیں۔ اس طرح ہمیں غریب، متوسط اور امیر طبقوں کی خرید و فروخت، خرچ اور اشیاء کے استعمال کے بارے میں ضروری معلومات مل جاتی ہیں۔ ان سے ہمیں اوپر پیش کئے ہوئے سوالات کا جواب دینے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

۶۱-۱۹۶۰ء میں ہندوستان کی آبادی تقریباً ۴۳٫۹ کروڑ تھی، جس میں سے ۳۴٫۱ کروڑ گاؤں میں اور ۸٫۹ کروڑ شہروں میں رہتے تھے۔ ملک کی کل آبادی نے ۶۱-۱۹۶۰ء میں قیمتوں کے مطابق لگ بھگ دس ہزار پچپن کروڑ روپے اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے خرچ کیا یعنی اوسطاً فی کس خرچ ۲۵۲ روپے سالانہ یا ۲۱ روپے فی کس ماہانہ۔ ایک لمحہ کے لئے غور کیجئے کہ اس کا کیا مطلب ہے ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ ۲۰ روپے ماہانہ یعنی ۲۴۰ روپے سالانہ فی کس خرچ سے کم سے کم اشیاء جو زندگی کے لئے ازحد ضروری ہیں خریدی جا سکتی ہیں۔ یہ ہماری غریبی کی تصویر ہے کہ اگر پورے ملک میں خرچ کے جو وسائل تھے ۶۱-۱۹۶۰ء میں انہیں بالکل مساوات اور برابری سے بانٹ دیا جاتا تو بھی صرف ایک روپیہ ماہانہ فی کس کا فرق پڑتا۔ اس سے ہمارے ملک کی عام غریبی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں مساوات نہیں ہے۔ آبادی کا کچھ حصہ ۲۱ روپے ماہانہ سے بہت زیادہ خرچ کرتا ہے اور آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ اس مقدار سے بہت کم خرچ کرتا ہے۔ اسی غیر مساوی تقسیم سے ملک کی عام غریبی کی مشکلات اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہو جاتی ہیں۔ اگر ملک میں خرچ کی تقسیم میں برابری نہ ہو تو ظاہر ہے کہ کچھ لوگ اوسط فی کس خرچ سے زیادہ خرچ کریں گے تو باقی فی کس اوسط سے کم کے حق دار ہوں گے۔ اب آفت یہ ہے کہ جیسے ہی فی کس خرچ اوسط سے کم ہوا مفلسی کا خطرناک گڑھا سامنے آ گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ 'اوسط خرچ' اور 'مطلق غریبی' میں فاصلہ بہت کم ہے۔ ابھی بتایا گیا ہے کہ ۶۱-۱۹۶۰ء میں جبکہ فی کس خرچ کی مقدار ۲۱ روپے ماہانہ تھی صرف اوسط سے ایک روپیہ ماہانہ کمی سے ایک شخص غریبی کے منحوس غار کے قریب پہونچ جاتا تھا۔

(۴)

۶۱-۱۹۶۰ء میں ہمارے ملک کی قومی پیداوار بازاری نرخ کے حساب سے (جس میں ٹیکس بھی شامل ہے) ۱۴٫۲۲۸ کروڑ روپے تھی۔ اس میں اگر برآمد کو نکال دیا جائے اور درآمد کو جوڑ دیا جائے تو ۴۱۱ کروڑ روپے کا اضافہ ہو جائے گا۔ (برآمد کو اس لئے کم کرنا ہے کہ یہ سامان ملک سے باہر چلا جاتا ہے اور درآمد کو اس وجہ سے جوڑا جاتا ہے کیونکہ یہ سامان ملک کے اندر آ جاتا ہے) اس طرح ہمارے ملک میں استعمال کرنے کے لئے ۱۴٫۶۳۹ کروڑ روپے کی قیمت کا سامان موجود تھا۔ اب اگر اس میں بچت اور حکومت کے خرچ کو نکال دیا جائے تو ملک کی آبادی کو ذاتی خرچ کے لئے ۱۱٫۹۸۸ کروڑ روپے ملے۔ آئیے اب دیکھیں کہ یہ ذاتی خرچ ہمارے شہروں اور دیہاتوں میں غریبوں، متوسط اور امیر طبقوں میں کس طرح بٹا۔

ذرا مندرجہ ذیل اعداد و شمار پر نظر ڈالیے۔

فی کس ذاتی خرچ کی دیہی اور شہری آبادی میں تقسیم ۶۱-۱۹۶۰ء

ماہانہ فی کس خرچ (روپے)	فی صد آبادی: دیہی	فی صد آبادی: شہری
صفر سے ۱۵	۳۸٫۰۳	۲۱٫۶۹

۱۵ سے ۲۱	۲۵٫۲۳	۲۲٫۱۱
۲۱ سے ۵۵	۳۳٫۴۶	۴۶٫۷۰
۵، اور اس سے زیادہ	۳٫۲۸	۹٫۵۰
	۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰

اوپر دیئے ہوئے اعداد وشمار سے یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ اگر ۲۱ روپے
ماہانہ فی کس خرچ کو اوسط مان لیا جائے تو ۶۱-۱۹۶۰ء میں دیہات میں لگ بھگ
۶۱ فی صد اور شہر میں لگ بھگ ۴۴ فی صد آبادی اوسط سے کم خرچ کرتی تھی۔
م یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ پانچ افراد کے خاندانوں میں ۵٫۲۷ روپے یا اس
ے زیادہ ماہانہ خرچ کرنے والوں کی تعداد شہروں میں دس فی صد سے کم تھی
ںگاؤں والوں میں ۱/۲ ۳ فی صد بھی نہیں تھی۔ اب آپ خود سوچیے کہ ہمارے
ں کے 'امیر' بھی بہت امیر نہیں ہیں۔ شہری آبادی کے سب سے امیر دس
صد لوگ بھی اوسطاً ایک ہزار روپے سال فی کس خرچ کرتے ہیں۔ یہی
ہ ہے کہ ہمارے ملک میں جو لوگ اضافی طور پر یعنی 'مطلق غریب' لوگوں
مقابلہ میں 'امیر' کہے جاسکتے ہیں وہ بھی ہمیشہ تنگی ترشی سے زندگی گزارنے
شکایت کرتے رہتے ہیں۔ پولینڈ کے ایک ماہر معاشیات کے لِسکی نے
ندوستان کی غریبی کا مسئلہ یوں بیان کیا ہے "ہندوستان کی سب سے بڑی
کل یہ ہے کہ یہاں کے غریبوں کا خون چوسنے والے بھی غریب ہیں" اس
ت سے ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر ملک کے سرمایہ دار، ٹھیکیدار، بڑے
ان جنہیں عرفِ عام میں لوگ زمیندار کہتے ہیں اور دوسرے طبقے جو دوسروں
محنت پر زندہ رہتے ہیں، ختم بھی کر دیئے جائیں تو بہت زیادہ بچت کی
بد نہیں ہے۔

بہرحال، ۶۱-۱۹۶۰ء میں ۳۸ فی صد دیہی آبادی، جو پندرہ روپئے ماہانہ فی کس
م خرچ کرتی تھی اور ۴۴ فی صد شہری آبادی جو ۲۱ روپے فی کس ماہانہ یا اس
م میں گزارا کرتی تھی، یقیناً غریبوں میں شامل ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں نہ تو پیٹ
نا ملتا ہے اور نہ تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا۔ ان کے لیے بیماری میں دوا دارو
ئی انتظام نہیں، بچوں کی تعلیم کا سوال نہیں، غرض کہ یہ لوگ انسانوں کی
ں کے ماحول سے خارج ہیں کھاتے پیتے لوگوں سے اگر پوچھا جائے کہ کوئی
ے چھ پیسے روزانہ میں کیسے رہ سکتا ہے تو یہ بات ان کے قیاس سے باہر
یکن ہندوستان کی زندگی کی تلخ حقیقت یہ ہے کہ خود حکومت کی طرف
ع کئے گئے اعداد وشمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ واقعی غریبوں کی تعداد بہت
، ہے۔ یہ بات ان لوگوں کو خاص طور پر نظر میں رکھنی چاہیئے۔ جو نسبتاً خوش
ی مگر اپنی غریبی کی شکایت کرتے رہتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ دفتر کے چپراسی اور
رخانوں کے مزدور جن کی مستقل نوکری ہے، چھوٹے موٹے دفتر کے
دوکان دار وغیرہ ہماری غریبی کی تعریف سے خارج ہوجاتے ہیں کیونکہ
ان کا معیار زندگی انہیں زندہ رہنے کی بنیادی ضروریات سے محروم نہیں کرتا۔

(۵)

ہمارے ملک میں غریبوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے یا کمی ہمارے ماہرین معاشیات آپس میں غریبی کی تعریف کے بارے میں اختلاف رائے کے باوجود اس بات پر متفق ہیں کہ غریبی میں جس قسم کی کمی کی امید پہلے پنج سالہ منصوبہ کے شروع ہونے کے بعد سے کی جاتی تھی وہ خواب ابھی پورا نہیں ہوسکا۔ خاص طور پر گاؤں کی آبادی کی حالت ہندوستان کے اکثر علاقوں میں بہت حد تک پہلی سی ہے اور اس میں خاطر خواہ تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

۵۷-۱۹۵۶ء میں ۲۰ روپے ماہانہ یا ۲۴۰ روپے سالانہ فی کس یا اس سے کم خرچ کرنے والے ۵٫۲۱ کروڑ دیہات میں رہتے تھے۔ یہ دیہات کی آبادی کا ۶۵ فی صد تھے۔ ۶۸-۱۹۶۷ء میں ان کی تعداد لگ بھگ وہی تھی یعنی ۲۱ کروڑ مگر آبادی بڑھنے کی وجہ سے لوگ کل آبادی کا ۵۰ فی صد سے زیادہ تھے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ غریبوں کی تعداد میں کمی برائے نام ہوئی ہے یہ ضرور ہے کہ یہ غریب کل دیہات کی آبادی کا نسبتاً ایک حقیر تر حصہ ہیں مگر پھر بھی دیہاتوں کی آبادی کا آدھے سے زیادہ حصہ مطلق غریبی کا شکار ہے۔

اگر ۲۰ روپے ماہانہ خرچ یعنی ۲۴۰ روپے سالانہ خرچ کی جگہ ہم ۲۰۰ روپے سالانہ خرچ کی سطح پر غریبی کی لائن کھینچیں تو ۵۷-۱۹۵۶ء میں غریبوں کی تعداد ۱۷٫۳ کروڑ تھی جو دیہی آبادی کا ۵۲٫۴ فی صد تھی اور ۶۸-۱۹۶۷ء میں ۱۵٫۴ کروڑ یعنی ۳۷٫۱ فی صد۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ غریبی کی اس تعریف کے مطابق بھی غریبوں کی تعداد میں بہت زیادہ کمی نہیں ہوئی مگر نسبتاً غریبی میں ضرور کمی ہوئی ہے پھر بھی کل دیہی آبادی کا ایک تہائی سے زیادہ حصہ سخت غریبی کے عالم میں زندگی بسر کر رہا ہے۔

ان اعداد وشمار کی بنیاد پر ایک نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ غریبوں کی تعداد کا انحصار کھیتی کی پیداوار پر ہے۔ جن برسوں میں غلہ اور کھیتی کی دوسری پیداوار بڑھتی ہے، غریبوں کی تعداد میں کمی ہوتی ہے، اور جن برسوں میں پانی کی کمی یا موسم کی خرابی سے کھیتی کی پیداوار کم ہوتی ہے، غریبوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیوں کہ ہمارے ملک میں ۷۰ فی صدی لوگوں کی آمدنی کا ذریعہ زراعت ہے۔ زراعتی پیداوار کی کمی سے غریب کسان اور کھیت مزدور طبقوں کے معیار پر گہرا اثر پڑتا ہے اور ان میں سے کچھ حصہ جو پہلے غریب نہیں تھے غریبوں کی صف میں شامل ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح جب فصل اچھی ہوتی ہے تو کچھ حد تک غریبوں کی تعداد میں کمی ہوجاتی ہے۔

اوپر دیئے ہوئے اعداد وشمار سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ صورت حال

ایک طرح سے تو زیادہ امید افزا نہیں معلوم ہوں گے کیونکہ کل غریبوں کی تعداد میں خاطر خواہ کمی نہیں ہو رہی ہے مگر اگر ایک دوسرے نظریہ سے دیکھا جائے تو کل آبادی کا وہ حصہ جو غریبی کا شکار ہے پہلے کے مقابلہ میں کم ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اب بھی تبدیلی بہت دھیرے دھیرے ہو رہی ہے۔

(۶)

ہمارے شہروں اور دیہاتوں میں غریبی ملک کے مختلف حصوں میں یکساں نہیں ہے۔ یہ تو سب ایک جانتا ہے کہ ہمارے ملک کے بعض حصے بہت پچھڑے ہوئے ہیں اور بعض نسبتاً خوش حال ہیں۔

جن علاقوں میں نئے طرز کی کھیتی شروع ہو گئی ہے وہاں یہی نہیں ہوا کہ فصل پہلے سے زیادہ اچھی ہونے لگی بلکہ ایک کی بجائے دو یا تین فصلیں بھی ہونے لگیں نئے بیج، آبپاشی، کیمیاوی کھاد وغیرہ سے ہر فصل میں پیداوار بھی بڑھی اور پرتی چھوڑنے کی بجائے کھیتوں سے ایک ہی سال میں ایک سے زیادہ فصل بھی اگائی جانے لگی۔ جب ایک ہی فصل ہوتی تھی تو سال کے کچھ حصوں میں گاؤں میں کام نہ رہتا تھا ایک سے زیادہ فصل ہر سال ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کام بڑھ گیا کیوں کہ ایک فصل کٹنے کے بعد دوسری فصل کے لئے کھیت جوتنے پڑتے ہیں اس کے علاوہ نئی طرز کی کھیتی میں مزدوروں کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ . . . .

سینچائی کے لئے، کھاد ڈالنے کے لئے، نرائی (گھاس پھونس ہٹانے) کے لئے، نقصان دہ کیڑوں کو مارنے کے لئے، ہر چیز میں محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح سے گاؤں میں کام بڑھ جاتا ہے۔ جن کسانوں کے اپنے کھیت ہیں وہ زیادہ کام کرتے ہیں، مگر جو کھیت مزدور ہیں انہیں بھی کام ملتا ہے۔ اگر مزدوری میں اضافہ نہ بھی ہو تو پہلے کے مقابلہ میں زیادہ باقاعدگی سے کام ملنے سے سالانہ آمدنی بڑھ جاتی ہے جب کام بڑھتا ہے تو مزدوروں کی کمی کی وجہ سے مزدوری بھی کچھ نہ کچھ بڑھ ہی جاتی ہے۔

ان سب باتوں سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ نئے قسم کی کھیتی سے انتہائی غریبی میں ضرور کمی ہوئی ہے۔ پنجاب، ہریانہ، مغربی اتر پردیش، آندھرا، تامل ناڈو، مہاراشٹر اور دوسری ریاستوں میں جس حد تک نئی کھیتی بڑھ رہی ہے۔ "مطلق غریبی" ختم ہوتی جا رہی ہے مگر ملک کے دوسرے حصوں میں جہاں ابھی زرعی انقلاب شروع بھی نہیں ہوا ہے۔ کوئی خاص تبدیلی اس سلسلے میں نہیں ہوئی ہے۔

تحقیقات نے یہ بات بھی ثابت کر دی ہے کہ کسان اپنے کھیت میں اور اپنے خاندان کے ساتھ جتنی محنت کرتا ہے اور جتنی پیداوار حاصل کرتا ہے وہ نہ تو مزدوروں کے ذریعے کھیتی کرانے سے ہو سکتی ہے، نہ بٹائی پر کی جانے والی کھیتی سے ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اب زمین کی ملکیت پر حد بندی کی موافقت زیادہ تر ماہرین معاشیات کر رہے ہیں۔ اس طرح اگر سب زمین خود کسانوں کی ملکیت ہو جائے اور مزدوروں سے کھیتی کرانے یا بٹائی پر کھیتی کی بجائے خود کسان خاندان اپنی زمین پر کھیتی کریں تو زیادہ محنت کی جائے گی۔ کام بھی زیادہ ملے گا۔ اور پیداوار بھی زیادہ ہوگی۔

شہروں میں غریبی گاؤں کی غریبی کا عکس ہے۔ گاؤں کے غریب بھاگ بھاگ کر شہر میں آتے ہیں اور چوں کہ شہروں میں ابھی اتنا کام نہیں بڑھ رہا ہے۔ اس لیے گاؤں سے آنے والے شہر میں باقاعدہ روزگار نہ پانے کی وجہ سے غریبی کا شکار رہتے ہیں۔ شہر کی غریبی بے روزگاری کی غریبی ہے یہ شہر میں جیسے باقاعدہ کام مل جاتا ہے وہ مطلق غریبی کے پنجے سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ دیہات میں غریبی بھی بے روزگاری ہی کی وجہ سے ہے جب نئی کھیتی سے یہ بے روزگاری کم ہوتی ہے تو غریبی بھی کم ہو جاتی ہے۔ اگر گاؤں میں کام بڑھ جائے تو گاؤں سے شہر کی طرف ہجرت میں بھی کمی ہو جائے گی۔ اب اگر شہروں میں صنعتی ترقی کی وجہ سے کام بڑھے گا تو گاؤں سے لوگ ضرور زیادہ آمدنی کی تلاش میں آئیں گے مگر اس وقت جتنے لوگ دیہی بدحالی سے پریشان ہو کر شہر میں آتے ہیں، ان کی تعداد کم ہو جائے گی۔

اوپر پیش کئے گئے اعداد و شمار کی بنیاد پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ آزادی کے بعد سے، اور خاص طور پر منصوبہ بندی کے دور میں، غریبی میں کچھ حد تک کمی ہوئی ہے، مگر یہ کمی بہت سست رفتاری سے ہو رہی ہے، اور غریبوں کی مطلق تعداد تو بہت خفیف حد تک کم ہوئی ہے۔ اگر نئے پنج سالہ منصوبوں میں بے روزگاری کو دور کرنے کی کوشش ٹھیک سے کی جائے، اور صنعتی اور زرعی ترقی کے وہ راستے اختیار کئے جائیں جن سے مطلق غریبوں کو روزگار ملے تو ہم شاید دس سال کے اندر مطلق غریبی بالکل ختم کر سکیں مگر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ہم اس وقت تک غریبی کی تعریف بدل دیں گے اور آج جو نسبتاً خوش حالی کی سطح ہے اُسے غریبی کہیں گے۔ معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ جب تک بالکل مساوات نہ ہو جائے انجیل کا یہ قول ضرور سچ رہے گا کہ "غریب ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔۔!" ●●

از

قومی یک جہتی
— ایک مذاکرہ



لکھ سنگھ مسافر
یہ سبھا، نئی دہلی

ایکتا کا مطلب میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر ایک ہندوستانی علیحدہ مذہب،
یا صوبہ رکھتے ہوئے بھی اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھے۔ اختلافِ
ات رائے تک محدود رکھے۔ اسے نفرت یا جھگڑے کا باعث نہ
ت مند زندگی کی علامت جانے اور ہمیشہ مشترکہ مفاد کو ترجیح دے۔
پہلے پچیس برسوں میں، باوجود کوششوں کے ہم قومی یک جہتی کی منزل
زیادہ نہیں بڑھ پائے۔ قومی یک جہتی کے لیے کاں فرنسیں ہوئیں۔
ں کچھ کام بھی ہوا لیکن وہ صورت پیدا نہ ہو سکی جو پیشِ نظر تھی۔
سمجھتا ہوں اس کے بعض بنیادی اسباب ہیں۔ منافرت کی سب
یہ جداگانہ انتخابات کا طریقہ تھا، جسے بدیشی سرکار نے رواج دیا تھا۔
ہوا۔ آئین میں مشترکہ انتخابات کا طریقہ اختیار کیا گیا لیکن اس کا
راہ نہ نکل سکا۔ اس لیے کہ ایسی جماعتیں بدستور قائم رہیں۔ جو
موقع پر علیحدگی کا پرچار کر کے فرقہ واریت کو ہوا دیتی تھیں۔ ایسی
کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا۔
دوسری وجہ زبان کی بنیاد پر صوبوں کی تشکیل ہے۔ اس سے
ازم اور لنگویج ازم کو بڑھاوا ملا ہے۔
یسرا سبب بھی زبان ہی سے متعلق ہے۔ ہم نے مہاتما گاندھی کو
پتا مانا لیکن ان کی باتوں کو نہیں مانا۔ گاندھی جی نے کہا تھا، آزاد
ان کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ ہم نے اس پر عمل نہیں کیا۔ اب ہندی
بان مان کر بھی ہم سارے ملک کو اس مسئلے پر یکجا نہیں کر سکے۔
اں، اب صورتِ حال پہلے جیسی نہیں۔ ادھر دو تین برسوں میں

سوال نامہ

۱۔ آپ کے ذہن میں قومی یک جہتی کا کیا تصور ہے؟

۲۔ پچھلے پچیس برسوں میں ہم قومی یک جہتی کی منزل کی طرف کس حد تک بڑھ پائے ہیں؟

۳۔ کیا موجودہ سماج میں بعض خاص گروہ یا جماعتیں تفریق و امتیاز کا شکار ہیں؟ اگر ہیں تو حالات کے سدھار کے لئے آپ کیا اقدامات ضروری خیال کرتے ہیں؟

۴۔ آپ کے خیال میں حکومت اس ضمن میں کس حد تک معاون ثابت ہو سکتی ہے؟

۵۔ کیا آپ کے خیال میں مخلوط شادیوں سے قومی یک جہتی کو فروغ مل سکتا ہے؟

مجھے کچھ روشنی کی جھلک دکھائی دی ہے۔ اندرا گاندھی نے اس سلسلے میں کامیاب قدم اٹھائے ہیں۔ وہ جواہر لال جی کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرنے والے "دیش بھگتوں" سے بے نیاز ہو کر اس کام میں کچھ کامیابی حاصل کر سکی ہیں۔

۳۔ بعض حلقوں میں نا اطمینانی ہے۔ میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ نوکریوں وغیرہ کے لئے بھرتی کی ایجنسیاں غیر جانب دار نہیں۔ اس لیے کچھ گروہ اور فرقے ضرور تفریق و امتیاز کا شکار رہتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم میں ہندوستانیت ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ اس صورتِ حال کا علاج اسی میں ہے کہ یک جہتی کو فروغ دیا جائے۔ اس سے تمام اختلافات دور ہو جائیں گے۔

۴۔ ہاں، سرکار اس سلسلے میں بعض بنیادی کام کر سکتی ہے۔ مثلاً سیاسی جماعتوں کی مذہب کی بنیاد پر سیاست میں شرکت قانوناً ممنوع قرار دے دے۔ اس لیے کہ اس کے بغیر اس مرض کا علاج ممکن نہیں۔

درسی کتابوں کو فوراً قومیا لے۔ ایک بورڈ بنا دے۔ جب تک یہ بورڈ منظور نہ کرے۔ کوئی کتاب سکول، کالج یا یونی ورسٹی میں پڑھائی نہ جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی مذہب نفرت کا پرچار نہیں کرتا۔ اس کی تفسیر کرنے والے اپنے مطلب کی وضاحت سے کام بگاڑ دیتے ہیں۔ کتابیں صرف اچھے اور روشن خیال اسکالرز سے لکھوائی جائیں۔ جو یک جہتی کو اولیت دیں۔

۵۔ میں مخلوط شادیوں کے خلاف نہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں ان سے یک جہتی کا مقصد حاصل نہیں ہوگا اور اس کے عام پرچار سے، نفاق، اور انتشار بڑھے گا اور اس پر عمل سے اثر صرف چند محدود جگہوں پر ہوگا۔ میرے نزدیک یہ اس مسئلے کا فی الحال کوئی حل نہیں۔ ممکن ہے کچھ عرصے بعد یہ مفید ثابت ہوں۔

ئی دہلی



شریمتی سبھدرا جوشی

ممبر لوک سبھا، نئی دہلی

۱۔ میں سمجھتی ہوں: لوگوں میں زبان، مذہب اور علاقے کی بنیاد پر کسی قسم کے اختلافات نہ ہوں۔ سب برابر ہیں، سب کے ساتھ برابر کا سلوک ہو، سب کی ایک جہت ہو، ایک منزل ہو، ملک کی تعمیر و ترقی۔

۲۔ ہاں اس عرصے میں ہم قومی یک جہتی کی طرف بڑھے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ عوام میں خاصی بیداری پیدا ہوئی ہے تاہم اس سلسلے میں ابھی بہت کام کرنا ہے۔

۳۔ میں سمجھتی ہوں مذہب اور علاقے کی بنیاد پر اقلیتیں تفریق کا شکار ہیں زیادہ تفریق ملازمتوں کے سلسلے میں پائی جاتی ہے۔ اونچی سرکاری ملازمتوں کی صورت مختلف ہے لیکن چھوٹی ملازمتوں میں خاصی تفریق محسوس کی جاتی ہے۔ پرائیوٹ اداروں کی حالت بھی ایسی ہی ہے۔ یہ خیال جڑ پکڑ رہا ہے کہ پڑھنے پڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایسا نہیں کہ یہ خیال بالکل درست ہو تاہم ایسے اقدامات کی ضرورت ہے جو اقلیتوں کے لئے باعث تشویق ہوں۔
یہ صحیح ہے کہ ہماری زندگی میں مختلف سطحوں پر عوام میں بیداری آئی ہے لیکن اس سلسلے میں مزید کارروائیاں کرنے کی ضرورت ہے۔
حالات کے سدھار کے لئے موجودہ غیر یقینی حالت کو دور کرنا ضروری ہے۔ نیز اقلیتوں کے شکوک و شبہات کو رفع کرنے کے لئے اقدامات کئے جانے چاہئیں۔ میں سمجھتی ہوں۔ اقلیتوں کے لئے ملازمتوں میں اسامیاں مخصوص نہیں کی جانی چاہئیں۔ تاہم روزگار وغیرہ کی فراہمی کے سلسلے میں خاص توجہ اور کوششوں کی ضرورت ہے۔ ادھر کے حالات سے ظاہر ہے کہ سرکار ہی نہیں لوگ خود بھی اس سلسلے میں پیش قدمی کر رہے ہیں۔

۴۔ ہاں سرکار اس کام میں بڑی مدد دے سکتی ہے۔ پہلے کانگریس میں ایسے عناصر موجود تھے جو اس کام میں حارج ہوتے تھے اب صورت حال بدلی ہوئی ہے اب مفید کام کی توقع کی جا سکتی ہے۔
سب سے پہلی ضرورت تعلیم ہے بچوں اور استادوں کی تعلیم پر توجہ کرنے کی ہے۔ نصابی کتابیں بچوں میں سیکولر نظریہ اور قومی یک جہتی کا جذبہ پیدا کرنے کے بنیادی مقصد کے پیش نظر لکھوائی اور مرتب کرائی جانی چاہئیں۔ یہی نہیں۔ اسے بحیثیت ایک مضمون کے شامل نصاب کیا جانا چاہئے۔
اس مقصد کے مکمل حصول کے لئے تعلیم کو قومیانہ ضروری ہے۔ تعلیم ریاست کا معاملہ ہے لیکن اسے پورے طور پر مرکزی سرکار کے انتظام و نگرانی کے تحت لایا جانا چاہئے
ملک کے اچھے مصنفوں کو اس طرف متوجہ کرنا چاہئے۔ انہیں صرف انعامات ہی نہیں دیئے جانے چاہئیں، ان کی لکھی کتابیں شامل نصاب بھی کی جانی چاہئیں۔ میرا خیال ہے کہ مصنف کے لئے یہی ایک صحیح اعزاز ہوگا۔ اس مقصد کے پیش نظر نیشنل بک ٹرسٹ جیسے اداروں کو بچوں اور بڑوں کے لئے مزید اچھی کتابیں زیادہ تعداد میں شائع کرنی چاہئیں۔

۵۔ مخلوط شادیاں — ہاں ہونی چاہئیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ یہ مفید ثابت ہوں۔



شری وجے کمار ملہوترہ

سابق چیف ایگزیکٹو کونسلر و موجودہ کونسلر، دہلی میٹروپولیٹن کونسل، دہلی

۱۔ ملک کے سبھی لوگوں کی، خواہ وہ کوئی زبان بولتے ہوں، کسی ریاست یا جاتی یا فرقے کے ہوں، پہلی وفاداری ہندوستان کے تئیں ہو۔ انہیں اس ملک کے ثقافتی ورثے سے، اس کے ادب اور فنون سے، اس کی دھرتی سے اس دھرتی کے ذرے ذرے سے پیار ہو۔ یہی پیار، جذباتی ہم آہنگی اور قومی یک جہتی کی بنیاد بن سکتا ہے۔

۲۔ پچھلے ۲۵ برسوں میں قومی یک جہتی کے ضمن میں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ جو بھی سرکاریں دیش میں رہی ہیں انہوں نے اختلافات پیدا کر کے اپنے مفاد کی تکمیل کی ہے۔ پہلے جہاں رنگا رنگی میں یک رنگی تھی، ایکتا تھی، اب صرف بھید بھاؤ ہے، اختلافات ہیں علاقہ و زبان کی بنیاد پر لوگوں میں تعصبات پائے جاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عیسائیوں اور مسلمانوں اور دوسرے سبھی فرقوں کو قومی دھارے میں شریک کیا جائے۔ ان کے آپسی تعصبات ختم کئے جائیں۔

۳۔ میں سمجھتا ہوں: ہری جن خاصی تفریق و امتیاز کا شکار رہیں۔ باقی دوسرے تمام فرقوں مسلمانوں، عیسائیوں وغیرہ کو ادھر کافی سہولتیں ملی ہیں اور مل رہی ہیں۔ ثبوت میں ایک یہی مثال ہوگی کہ گزشتہ عرصہ میں حالیہ مردم شماری کے مطابق ان کی آبادی باقی فرقوں کی نسبت زیادہ بڑھی ہے
میں سمجھتا ہوں: آدی واسیوں اور ہری جنوں کی بھلائی و بہتری کے لئے خاص اقدامات کئے جانے چاہئیں۔ انہیں زیادہ تعلیمی سہولتیں دی جانی چاہئیں ان کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے لئے کام دھندوں میں ان کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے۔

۴- سرکار کو لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے تعلیم پر زور دینا چاہیئے۔ تعلیم ایسی ہونی چاہیئے کہ مسلم، عیسائی اور دوسرے فرقے خود کو بڑے قومی دھارے کا حصہ سمجھنے لگیں۔ اسکولوں میں دعا یعنی پرارتھنا الگ الگ نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کا تعلق کسی ایک مذہب سے ہو۔ اس کا ناتا ہندوستانی تہذیب و ثقافت سے جوڑا جا سکتا ہے۔

۵- شادی ایک نجی معاملہ ہے۔ میں اتنا ہی کہوں گا۔



مولانا عبدالوحید صدیقی

مدیر "واقعات" نئی دہلی

۱- تمثیلی طور پر میں اسے رنگ رنگ کے پھولوں کے گلدستے سے تعبیر کروں گا۔ ایسے گلدستے سے جس میں ہر پھول ایک اپنا رنگ، خوشبو اور انفرادی حسن رکھتا ہے۔ کسی دوسرے سے مزاحم نہیں ہوتا اور گلدستے کے مجموعی حسن میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ مراد یہ کہ ہمارے ملک میں رہنے والے تمام فرقے اپنی جداگانہ خصوصیات کو برقرار رکھیں۔ ایک دوسرے سے الجھیں نہیں۔ ان میں کوئی آویزش نہ ہو اور سب کی مساعی کا مقصد ملک کی تعمیر، استحکام اور ترقی ہو۔ گویا ہندوستان گلدستہ ہے جس میں انہیں سجنا ہے، جس کو انہیں سجانا ہے۔

۲- پچھلے پچیس برسوں میں ہم نے اس ضمن میں کیا بہت کچھ ہے۔ کیا کم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ عرصے میں حالات کا رُخ دوسری طرف رہا ہے۔ ہاں ادھر دو تین برسوں سے اچھے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں اب ہمارا رُخ صحیح سمت میں ہے۔ اب صورت پہلے جیسی نہیں۔

ماضی میں قومی یک جہتی کے ضمن میں زیادہ کامیابی حاصل نہ ہونے کی دوسری بڑی وجہ ہماری سیاست کی نہج رہی ہے۔ ان میں کارفرما عناصر نے بھی تفرقہ اندازی ہی کو ذاتی مفاد اور اغراض کی تکمیل کا سہل وسیلہ جانا۔ ساری بنیاد اختلافات پر رکھی۔ مذہب کے نام پر سیاسی جماعتوں کو فروغ دیا۔ ایسے میں ذہنی اور جذباتی سطح پر آویزش ناگزیر تھی۔ وقتی طور پر لوگ یہ بھول گئے کہ معاملہ صرف مذہب کا نہیں ہے، یہ پورے ملک، معاشرے اور سیاست سے تعلق رکھتا ہے

۳- ہاں، ہمارے موجودہ سماج میں کافی تفریق اور امتیازات ہیں۔ صدی ڈیڑھ صدی کی برائیوں کے اثرات ہر جگہ، ہر شعبے میں موجود ہیں۔ ان کی کارفرمائی، دفاتر، کاروبار، اسکولوں، کالجوں وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ظاہر ہے یہ سب برائیاں، یہ تفریق اور امتیازات ایک دن میں ختم ہونے والے نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ اب ہوا کا رخ صحیح سمت میں ہے۔ ایسے میں ہم توقع کر سکتے ہیں کہ جلد ہی ان برائیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

حالات کے سدھار کے لیے پہلی اور بڑی ضرورت تعلیم کو فروغ دینے کی ہے اور اتنی ہی بڑی ضرورت نصاب تعلیم میں اصلاح کی ہے۔ درسی کتابوں میں باہمی نفرت پھیلانے والے جو بھی عناصر در آئے ہیں انہیں خارج کرنا ضروری ہے۔ ظاہر ہے یہ کام سرکار کا ہے۔ ہاں تعاون ہمیں کرنا ہے۔

میں اپنے طور پر اقلیت اور اکثریت کی اصطلاحوں کو مہلک سمجھتا ہوں۔ صرف ایک اصطلاح ہونی چاہیئے اور وہ "ہندوستانی" ہے۔ ہمارے ملک میں اسی کا چلن ہونا چاہیئے۔ بہر حال جب تک اس نوع کا احساس موجود ہے، اس امر کی بڑی ضرورت ہے کہ اقلیتوں کی جائز اور مناسب حد تک دلجوئی کی جائے۔ اُن کے شکوک و شبہات دُور کیے جائیں۔ اکثریت کا ذہن ایسا بنایا جائے کہ وہ سمجھیں اقلیتیں انہیں کے جسم کے اعضاء ہیں۔ ان اعضاء کو تندرست اور فعال رکھنا انہیں کی ذمہ داری ہے گویا فکر میں اور عمل میں رواداری اور باہمی اختلاط کو راہ دینا ضروری ہے اور اس کے لیے دانشوروں کو تدبیریں کرنی ہیں۔

۴- ہاں، سرکار اس ضمن میں کئی اعتبارات سے مفید، ممد اور معاون ہو سکتی ہے۔ انتظام تعلیم اور نصاب تعلیم کی اصلاح ظاہر ہے حکومت کی سعی چاہتی ہے۔ نیز ماحول کو بہتر بنانے کیلئے حکومت کو اقلیتوں اور ان کے مسائل پر توجہ کرنی چاہیئے۔ ساتھ ہی اکثریت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے تاکہ تفریق پسندی کو ہوا نہ مل سکے۔ تفریق پسند عناصر بے دست و پا ہو جائیں۔ اقلیتوں کے لیے تعمیری کام ہونے لگے۔ ہر ایک کو اس کا جائز حق ملنے لگے، وہ یہ محسوس کرلے کہ جو سکون اور اطمینان اسے یہاں میسر ہے کہیں اور حاصل نہیں ہوگا۔ نیز جو مشکلات ہیں وہ آج نہیں تو کل ضرور دُور ہو جائیں گی۔ گویا اس کے لیے حکومت کو یہ دیکھنا ہے کہ اس کے جائز تعلیمی، معاشی اور سماجی مفادات کیا ہیں اور کیسے اقدامات اس کے لیے باعث تشویق ثابت ہو سکتے ہیں۔

نیز ایسے اقدامات ضروری ہیں، جن سے اکثریت محسوس کرے کہ اس کی حق تلفی نہیں ہو رہی۔ کوئی کسی کا حریف نہیں۔ سب حلیف ہیں اور جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ ازبس ضروری ہے۔ ایسے حالات میں تفرقہ پسند عناصر اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو پائیں گے۔ اور ایک زیادہ مربوط، خوش گوار اور بہتر مجلسی زندگی کی داغ بیل پڑ سکے گی۔

۵- مخلوط شادیاں۔ میرے نزدیک بہت دُور کی منزل ہیں۔ میں جن مراحل کا ذکر پیشتر کر چکا ہوں۔ وہ طے پا جائیں تو یہ منزل از خود آ جائے گی۔

شادی دو فریقوں کی باہمی رضامندی کا معاملہ ہے مذہب اور سماج اس میں روڑا نہیں بن سکتے تاہم یہ مرحلہ موزوں ذہنی تربیت کے بعد کا ہے۔ یک جہتی کی بنیاد رکھتے ہوئے اس کے بارے میں سوچنا صحیح نہیں ہوگا۔ میرے نزدیک یہ تمثیل مرغ باد نما کی ہے جسے عمارت کی تکمیل کے بعد سب سے اونچی محراب پر نصب ہونا ہے۔



خلیق انجم۔ لکچرار
کروڑی مل کالج، دہلی

۱۔ میرے نزدیک قومی یک جہتی عبارت ہے اس بات سے کہ ہر شخص اپنے مذہب کی بنیادی روح کو مانے اور دوسرے کو برا نہ سمجھے۔ تمام مذاہب کو برابر جانے اپنے تہذیبی ورثے سے آگاہ ہو اور دوسری علاقائی تہذیبوں کا احترام کرے۔ اپنی زبان سے پیار کرے لیکن دوسرے کی زبان کو بھی اتنا ہی اہم سمجھے۔ ہر ایک کو اپنی ہر چیز سے محبت کا حق ہے۔ دوسروں سے مزاحم ہونے کا نہیں۔

۲۔ جہاں تک قومی یک جہتی کی منزل کی طرف بڑھنے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں ہم نے تاریخ کے پہیئے کو پیچھے لوٹایا ہے۔ آزادی سے پہلے ہمارے عوام میں زیادہ اتحاد و یگانگی اور زیادہ یک جہتی تھی۔ حالیہ برسوں میں اس میں کمی واقع ہوئی ہے۔

۳۔ ہمارے موجودہ سماج میں زبان، مذہب و علاقہ کی بنیاد پر بعض فرقے تفریق و امتیاز کا شکار ہیں۔ مسلمانوں ہی کو لیجئے یہ صحیح ہے کہ اونچی سرکاری ملازمتوں میں کسی قسم کی تفریق یا امتیاز روا نہیں رکھا جاتا۔ لیکن نچلی سطح پر تعصب موجود ہے۔ کاروبار اور دوسرے دھندوں میں بھی انہیں رکاوٹوں کا سامنا رہتا ہے۔ کوٹے اور لائسنس وغیرہ انہیں کم ملتے ہیں۔ پرائیوٹ سیکٹر میں تو حالت اور بھی خراب ہے۔

حالات کو سدھارنے کے لئے متعدد سطحوں پر کام کرنا ہوگا۔ ضرورت تعلیم، تشہیر، تدارک اور اصلاح کی ہے۔

۴۔ سرکار بڑی مفید اور مدثابت ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے بنیادی طور پر یہ سارے کام سرکار کو کرنے ہیں۔ تعلیم کو لیجئے۔ میں سمجھتا ہوں نصاب تعلیم اور اس کو تشکیلی دور میں بچوں کے لئے نصاب ایسے ہوں جو قومی یک جہتی کو فروغ دینے کے نظریئے سے تیار و مرتب کرائے گئے ہوں۔ لیکن یہ اقدام اپنی جگہ کافی نہیں۔ اس کے لئے تعلیم کو قومیانہ ضروری ہے۔ بجز اس کے مقصد کے حصول میں کامیابی ممکن نہیں۔ ظاہر ہے یہ کام سرکار کا ہے۔

مذکورہ سعی کا ثمرہ ایک مدت میں حاصل ہوگا لیکن یہ مسئلہ فوری حل چاہتا ہے۔ اس کے لئے نشر و اشاعت کی ضرورت ہے۔ قومی اتحاد کے فروغ اور سیکولر نظریئے کی ترویج کے لئے زیادہ مواد کتابچے وغیرہ شائع کرنے چاہئیں۔ لوگوں میں رواداری کا راسخ جذبہ پیدا کرنے کے لئے ہندوستان کی سیکولر روایات پر زور دیا جانا چاہئے۔ قومی یک جہتی کے لئے نشر و اشاعت کا کام اسی پیمانے پر ہونا چاہئے جس پر خاندانی منصوبہ بندی کی نشر و اشاعت کا ہو رہا ہے۔

ہر شہر، قصبے وغیرہ میں تنخواہ دار کارکن ہونے چاہئیں جو ذاتی تال میل سے لوگوں میں صحیح نظریات پیدا کریں۔

سماجی بہبود کی سرکاری و غیر سرکاری تنظیموں کو بھی اس طرف توجہ کرنی چاہئے۔ جن غیر سرکاری تنظیموں اور افراد نے اس سلسلے میں مفید کام کیا ہے۔ ان میں شریمتی سبھدرا جوشی اور ان کی سامپردایکتا ودودھی کمیٹی خاص تذکرے و تعریف کے لائق ہیں۔ سرکار کو اس نوع کی مساعی کی بھی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔

۵۔ میرا تجربہ ہے کہ مخلوط شادیاں جتنی ہوں گی سیکولر روایات اتنی ہی راسخ ہوں گی اور فروغ پائیں گی۔



ہرچرن سنگھ جوش
جنرل سکریٹری دہلی پردیش یوتھ کانگرس

۱۔ مطلب یہ ہے کہ ہم مل کر ایک ایسے سماج کو جس میں ذات پات کا فرق نہ ہو کیسے آگے لے جا سکتے ہیں۔ جہاں سبھی انسانوں کو برابر کا درجہ ملے کوئی کسی قسم کی تفریق روا نہ ہو۔

۲۔ ہم کافی حد تک آگے بڑھے ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں ہمیں اتنی کامیابی نہیں ہوئی جتنی کہ ہونی چاہئے تھی اس لئے کہ غیر سیکولر تنظیمیں اور فرقہ وارانہ سیاسی جماعتیں آج بھی سرگرم ہیں۔ جب تک کہ مذہب کے نام پر ووٹ مانگنے کا اور عوام کے استحصال کا خاتمہ نہیں ہو جاتا اس صورت کے سدھرنے کا امکان کم ہے۔

۳۔ سرکاری ملازمتوں میں نچلی سطح پر اور پرائیوٹ سیکٹر میں مذہب، زبان اور علاقہ کی بنیاد پر تفریق اور امتیازات پائے جاتے ہیں تاہم یہ بیشتر خویش پروری کا لبادہ اوڑھے ہوتے ہیں۔

جہاں تک حالات کو سدھارنے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں اس خرابی کا علاج خود قومی یک جہتی ہے لوگوں میں قومی احساس اور قومی

مساسیں پیدا کرنے کے لیے، تعلیم کی بڑی ضرورت ہے۔ مذاکروں،
ں کی اہمیت بھی مسلم ہے۔ نشر و اشاعت کے دوسرے وسیلوں
یا ملنا چاہیئے۔
ہاں بھی سرکار اس سلسلے میں بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ بڑی
ہے۔ مثلاً قومی یک جہتی کے فروغ کے لیے بڑے پیمانے پر نشر و
کام بنیادی طور پر سرکار کو کرنا ہے۔
ار، اپنے ملازموں، افسروں اور اہل کاروں کے تبادلے کر کے،
ری ریاستوں میں بھیج کر، ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے
ننے کے مواقع فراہم کر سکتی ہے۔ ان تبادلوں کا جتنے پیمانے
ری ہے اس سے غلط فہمیاں دور ہوں گی اور آپسی یگانگی بڑھے گی۔
رکو دوستی اور بھائی چارے کے دوروں کا انتظام اور ان کی حوصلہ
نا چاہیئے۔ اس کام کو نچلی سطح سے کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً سرکار
ں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے کہ وہ ملک کی دوسری پنچایتوں
م کریں۔ اپنے اپنے علاقے کے کچھ لوگوں کو ہر برس، پندرہ بیس روز
کے مختلف علاقوں میں بھیجیں۔ دوستی اور بھائی چارے کے دورو
ں کے تجربات و خیالات سے دوسروں کو آگاہ کریں۔ اس طرح
میں ایک ایسی فضا پیدا ہو جائے گی جس میں گہری مفاہمت کو
ا۔ اسی طرح سرکار کو تعلیمی اداروں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے
طالب علموں کو دوستی و خیر سگالی کے دوروں پر بھیجیں۔
پر بھی تال میل ضروری ہے۔
ار نصاب تعلیم میں اصلاح کر کے بھی بڑا مفید کام کر سکتی ہے۔
ں کو نصاب سے خارج کر دیا جانا چاہیے، جن کی عملی زندگی میں
ت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں یورپ کی تاریخ جاننے سے زیادہ
پنے ملک کی، ملک کی مختلف ریاستوں کی تاریخ و تہذیب کو
نصاب میں اس قسم کی ترمیم و اضافہ کیا جانا چاہیئے۔
ے کے نصاب میں ایک علاقائی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی جانی
پنی مادری زبان کے علاوہ ایک سے زیادہ علاقائی زبانیں جاننے
ب علموں کو تشویق کے طور پر خاص سہولتیں دی جانی چاہئیں۔
ب سے بڑی اور بنیادی ضرورت فرقہ وارانہ بنیادوں پر کام
سیاسی جماعتوں کو ممنوع قرار دینے کی ہے۔ اس کے بغیر بہتر
ہی مفید ثابت نہیں ہوگا۔
جوان و درس تبدیلیاں لا سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں
ں سے قومی یک جہتی کو فروغ ملے گا۔



رشمی جاوا
متعلمہ دہلی یونی ورسٹی دہلی

۱۔ میرا مطلب ہے: ہندوستان کل ہے۔ سبھی ہندوستانی، خواہ وہ کسی فرقے یا علاقے کے ہوں، اور کوئی زبان بولتے ہوں، اس کے جزو ہیں۔ وہ بھلے مختلف ہیں لیکن مربوط ہیں۔ آویزشیں وقتی چیز ہیں۔ وہ متحد ہیں ان کی ایک منزل ہے، ہندوستان کی اور سبھی عوام کی بھلائی و ترقی۔

۲۔ ہمارے آئین کی رو سے ملک کے سبھی عوام، سبھی فرقوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے، کوئی تفریق یا امتیاز روا نہیں رکھا جاتا۔ لوگوں میں ایسا کوئی جذبہ نہیں پایا جاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ مساوات اور سب کے لیے مساوی حقوق اور مواقع کی فراہمی کا انحصار سرکار اور عوام نیز عوام کے آپسی اشتراک پر ہے۔

۳۔ اگر کوئی تفریق و امتیاز ہے تو وہ صرف ذات پات کی بنیاد پر ہے دوسرے امتیازات کو مفادات کے ٹکراؤ سے تعبیر کیا جانا چاہیئے یا اپنی جگہ افراد کا معاملہ ہے۔ یہ کسی فرقے یا طبقے کا معاملہ نہیں۔ تاہم اسے بھی ختم کرنا ضروری ہے اور ایسا تعلیم کو فروغ دے کر کیا جا سکتا ہے۔ تعلیم سے میری مراد بی اے، ایم اے کی تعلیم نہیں جسے ان دنوں روزگار کا وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ میری مراد ایسی تعلیم سے ہے جو شخصیت کی مکمل نشو و نما میں معاون ہوتی ہے اور صحیح قدروں کے شعور اور صحت مند نظریات کا باعث بنتی ہے۔

۴۔ ظاہر ہے یہ کام سرکار کا ہے۔ بڑے پیمانے پر موزوں و مناسب تعلیم کی اشاعت سرکاری معاملہ ہے لیکن یہاں بھی عوام کا اشتراک ضروری ہے سماجی اصلاح کے سوتے بالواسطہ اسی تعلیم سے پھوٹیں گے۔

۵۔ شادی کے تعلق سے لوگوں کے تاملات ابھی باقی ہیں۔ ان کی وجہ ذات پات کی جکڑ بندی ہے۔ بہرحال میں سمجھتی ہوں، مخلوط شادیاں یقیناً مفید ثابت ہوں گی ان سے اشتراک و تعاون کا جذبہ بڑھے گا۔

بادہ دوشینہ

روشؔ صدیقی (مرحوم)

ہم نشیں وہ ستم ایجاد نہیں
اس کی بیداد بھی بیداد نہیں
کیا کہوں عشق میں کیا بیت گئی
سچ تو یہ ہے مجھے کچھ یاد نہیں
نہ کہو اس کو چراغِ منزل
جو سرِ رہ گزرِ باد نہیں
وہ جو آزاد ہیں کچھ تو سوچیں
وہ بھی انساں ہیں جو آزاد نہیں
حرفِ شکوہ بھی گراں ہے لب پر
شکر ہے عادتِ فریاد نہیں
دل کی بستی بھی عجب بستی ہے
روزِ اوّل سے ہی آباد نہیں
بوالہوس تو یہ کہاں سمجھے گا
زندگی داد ہے فریاد نہیں
عصرِ حاضر میں ہزاروں پرویز
ایک بھی وقت کا فرہاد نہیں
دلِ ناداں ہے غنیمت کہ روشؔ
کسی عالم میں بھی ناشاد نہیں

امجد نجمی

دیکھ کر ہم کو اسیرِ آرزو
اور بھی وہ ہو گئے بیگانہ خو
پھاڑ ڈالا دستِ وحشت نے جسے
پھر کریں کیا اس گریباں کو رفو
پھر سجا دو محفلِ دار و رسن
مضطرب ہے پھر زبانِ گفتگو
گر زیادہ سے زیادہ ہوں گناہ
کم نہیں ہے آیتِ لاتقنطو
مجھ کو ڈر لگتا ہے اپنے شہر میں
ہیں بہت اونچے یہاں کے کاخ و کو
جب بھی رت آتی ہے پت جھڑ کی یہاں
چوس لیتی ہے بہاروں کا لہو
تجھ میں مجھ میں فرق بس اتنا ہی ہے
میکدہ رو میں تو تُو ہے قبلہ رو
کھلتی ہے اب کس کی غلطی دیکھئے
آتے ہیں وہ آئینے کے روبرو
ایک قطرہ، ایک آنسو، ایک اشک
میری آنکھوں کی یہی ہے آبرو
رہ کے نجمی نے پسِ پردہ یہاں
کر دیا ہے سب کو محوِ جستجو!

ابوالحسنات

ساہتیہ اکاڈمی

غالباً بہتوں کو علم نہ ہوگا کہ ہندوستان کی ممتاز ترین ادبی تنظیم کا نام ساہتیہ اکاڈمی ہے۔ یہ مرکزی حکومت کی سرپرستی اور امداد سے ۱۹۵۴ء میں قائم ہوئی اور یونیورسٹیوں کی طرح خود مختار ہے۔ یہ اکاڈمی، آسامی، بنگالی، انگریزی گجراتی، ہندی، کنڑ، کشمیری، ملیالم، مرہٹی، اڑیا، پنجابی، سنسکرت، سندھی تامل، تیلگو اور اردو زبانوں میں کتابیں لکھواتی، ترجمہ کرواتی اور چھپواتی ہے۔

اردو میں اس اکاڈمی نے اب تک ۴۴ کتابیں شائع کی ہیں جس میں دوسری زبانوں سے تراجم بھی شامل ہیں۔ اس کی چند اہم مطبوعات یہ ہیں۔

ترجمان القرآن از ابوالکلام آزاد حصہ اوّل، دوم، سوم اور چہارم

غبار خاطر از ابوالکلام آزاد

تذکرہ از ابوالکلام آزاد

سمن زار از ضیا احمد بدایونی

اردو شاعری کا انتخاب از سید محی الدین قادری زور

ملک کی ۱۶ زبانوں میں ہندوستانیوں کی لکھی ہوئی کتابوں میں ہر زبان کی بہترین کتاب پر (بشرطیکہ وہ اعلیٰ معیار کی ہوں) ساہتیہ اکاڈمی ہر سال پانچ پانچ ہزار روپے انعام دیتی ہے۔ ۱۹۵۵ء سے انعاموں کی تقسیم جاری ہے۔ انعام پانے والی اردو کتابوں اور ان کے مصنفین کے نام ذیل میں دیئے گئے ہیں۔

۱۔ مآل و مشیت ۔ ظفر حسین خاں (۱۹۵۵)
۲۔ قومی تہذیب کا مسئلہ ۔ ڈاکٹر سید عابد حسین (۱۹۵۶)
۳۔ میر تقی میر ۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (۱۹۵۷)
۴۔ آتش گل ۔ جگر مرادآبادی (۱۹۵۸)
۵۔ اردو ڈرامہ اور اسٹیج ۔ سید مسعود حسن رضوی (۱۹۵۹)
۶۔ گل نغمہ ۔ فراق گورکھپوری (۱۹۶۰)
۷۔ دیوان غالب ۔ امتیاز علی خاں عرشی (۱۹۶۱)
۸۔ یادیں ۔ اختر الایمان (۱۹۶۲)
۹۔ آندھی میں چراغ ۔ خواجہ غلام السیدین (۱۹۶۳)
۱۰۔ میری حدیث عمر گریزاں ۔ آنند نرائن ملا (۱۹۶۴)
۱۱۔ ایک چادر میلی سی ۔ راجندر سنگھ بیدی (۱۹۶۵)
۱۲۔ پت جھڑ کی آواز ۔ قرۃ العین حیدر (۱۹۶۷ء)
۱۳۔ بساط رقص ۔ مخدوم محی الدین (۱۹۶۹)
۱۴۔ لہو کے پھول ۔ حیات اللہ انصاری (۱۹۷۰)
۱۵۔ غالب۔ شخصیت اور شاعری ۔ رشید احمد صدیقی (۱۹۷۱)

۱۹۶۶ء اور ۱۹۶۸ء میں اردو زبان کی کسی کتاب کو انعام نہیں دیئے گئے۔

اکاڈمی نے ہر زبان کی ترویج و ترقی کے لئے دس دس افراد کی مشاورتی کمیٹی مقرر کی ہے ــــــ اردو کمیٹی مندرجہ ذیل اراکین پر مشتمل ہے۔

(۱) پروفیسر احتشام حسین (۲) ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (۳) مالک رام صاحب (۴) پروفیسر مسعود حسین خاں (۵) پروفیسر محمد مجیب (۶) آنند نرائن ملا صاحب (۷) ڈاکٹر سید اختر احمد اورینوی (۸) قرۃ العین حیدر صاحبہ (۹) سید سجاد ظہیر (۱۰) پروفیسر آل احمد سرور۔

اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی، ثقافتی انجمن (یونیسکو) نے ساہتیہ اکاڈمی کی سفارش پر انگریزی زبان میں مندرجہ ذیل کتابیں شائع کی ہیں۔

(۱) غالب، لائف اینڈ لیٹرز۔ خورشید الاسلام اور رالف رسل

(۲) امراؤ جان ادا مترجمہ خشونت سنگھ اور مہدی عباس حسینی

(باقی صفحہ ۸۷ پر)

راجندر سنگھ بیدی

فلم بنانا کھیل نہیں ہے

سماجی فلمیں

فلم یوں تو کھیل ہے، لیکن اس کا بنانا کھیل نہیں۔ خیال اور خواب سے لے کر اس کی مکمل تصویر کشی تک بیچ میں بیسیوں، سینکڑوں ایسی منزلیں آتی ہیں کہ بڑے سے بڑے جی گردے والا آدمی بھی دم توڑ سکتا ہے۔

سماجی فلم باقی دوسری قسموں سے الگ نہیں لیکن زیادہ مشکل اس لئے ہے اس کے ساتھ آپ پر زیادہ ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ ہمارا سماج مختلف النوع ہے، کئی مذہب ہیں، کئی فرقے ہیں، بولیاں ٹھولیاں۔ قومی منشور نے انفرادی طور پر سب کو بنیادی حقوق دے رکھے ہیں اور جماعتی طور پر حقوق خصوصی۔ میرا یہ کہنے کا مطلب نہیں کہ میں ان حقوق کے خلاف ہوں۔ لیکن ایک بات ضرور ہے کہ انفرادی اور جماعتی طور پر ابھی میرے بھائیوں کو ان حقوق کا استعمال کرنا نہیں آتا۔

مجھے یاد ہے جب میں نے تصویر 'مرزا غالب' لکھی تو اول و آخر مقصد ہمارے سامنے یہ تھا کہ ملک کے ہر کونے میں مرزا غالب کا کلام گونجے۔ لوگ ان کے خیالات اور ان کی شاعری کے بنیادی ترنم سے شناسا ہوں۔ کہانی تو ایک بہانہ ہوتا ہے۔ جس کی مدد سے آپ اس وقت کے سماج کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر کہتے ہیں: صدا اٹھی اور نہ آنسو بہے۔ بشمنت، ہند کی حکومت جنگ کے کنارے تک وہ کئی مغل اقتدار ختم ہو رہا تھا اور برطانوی سامراج دھیرے دھیرے اپنے پنجے پھیلا رہا تھا۔ کتنی عبرت کی بات تھی کہ مرزا صاحب جب جیل سے رہا ہو کر اپنی محبوبہ کے ہاں آئے اور دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں تو کوئی جواب نہیں آتا۔ اس وقت وہ ایک سادہ مگر دلدوز فقرے میں اس وقت کے عالم کا پورا نقشہ کھینچ دیتے ہیں: 'ارے کہاں ہو، دلی والو؟ ... دن دہاڑے ہی سو گئے'۔ اس پر بھی کچھ لوگوں کو سوجھی کہ مرزا صاحب کی حیاتِ معاشقہ کیوں پیش کی گئی جبکہ وہ افسانہ نہیں تھا ان کے دل نہیں تھا۔ وہ کہتے: دل نہ ہاتھ سے گیا۔ ان کے مخطوطات پڑھنے سے پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ آن واحد میں مرزا صاحب کے عزیز پیدا ہو گئے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ مرزا صاحب جہاں دفن ہیں، وہاں ان کا مزار نہایت ہی کس مپرسی کی حالت میں تھا۔ ان عزیزوں سے اتنا بھی نہ ہوا کہ اپنے محبوب اور چہیتے شاعر کا مزار ہی پکا کروا دیتے۔ اب آپ ہی بتائیے ان حالات میں میں ان لوگوں کی نیت پہ شک کرنے میں حق بجانب ہوں یا نہیں؟

تاریخی فلموں کا ذکر فضول ہے کیونکہ حقیقت میں وہ کسی نہ کسی طرح سے سماجی پہلو لئے ہوئے ہیں مگر اس کا کیا کریں کہ اس کے ساتھ کسی نہ کسی مفاد کا اجارہ ہوتا ہے۔ مثلاً مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بارے میں فلم بنانا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ حقائق کے سلسلے میں دو تاریخ دانوں کی رائے آپس میں نہیں ملے گی۔ ہر وہ مفاد ان کی زندگی کے شخصی پہلو کو فلم کے پردے پر نہیں لانے دے گا۔ آپ کو کئی سنستھاؤں سے کلیرنس حاصل کرنا ہو گا اور جب وہ حاصل ہو گا تو اسکرپٹ کی شکل بالکل بدل چکی ہو گی۔ جس میں آپ اپنا چہرہ پہچان ہی نہیں پائیں گے۔ کچھ اس قسم کی باتیں ہو جائیں گی۔ آپ بڑے اچھے ہیں، میں بھی بہت اچھا ہوں۔ ہندوستان مہان ہے وغیرہ وغیرہ اور اگر آپ ان کے فرمودات کے خلاف جائیں گے تو مورچے لگیں گے۔ آپ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی اور آپ گھر سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ آپ زیب النساء مخفی کے بارے میں فلم نہ ہی بنائیے تو اچھا ہے کیونکہ وہ اورنگ زیب کی بیٹی تھی۔ اور اس لئے سیزر کی بیوی کی طرح سے تمام

شکوک وشبہات سے بالاتر محافل خاں گورنر ملتان سے ان کی محبت کو صرف محض سمجھا جائے گا، بلکہ اس کی صحت ہمیرا مطلب ہے قصہ کی صحت کو سرطانی قرار دیا جائے گا۔ آپ دُور کیوں جاتے ہیں۔ حال ہی میں ستیہ جیت رے نے جنہیں دُنیا ایک بڑے ڈائرکٹر کی حیثیت میں مانتی ہے، ایک فلم بنائی جس میں ایک نرس دکھائی گئی جو اپنے گھر کے حالات سے مجبور ہو کر رات کو دھندہ کرتی تھی۔ اب وہ ایک فرد تھی، جس کا جماعتی طور پر نرس پیشہ عورتوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن اس پر بھی ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ نرسوں نے ایجی ٹیشن شروع کر دیا اور آخر رے کو ان سے معافی مانگنی پڑی۔ میں پوچھتا ہوں کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ ایک طرف لوگ مرزا غالب اور سنسکار ایسی فلموں کے خلاف جہد کرتے ہیں اور دوسری طرف حکومت ہند انہیں سال کی بہترین فلم قرار دیتی ہے۔ اس کے بنانے والے کو راشٹرپتی اپنے ہاتھوں سے طلائی تمغہ اور سند عنایت فرماتے ہیں۔

سماجی فلم اپنے ہاں بنانے کے سلسلے میں ملکی حالات نہایت دل شکن ہیں۔ مختلف گروہ، فرقے اور مفاد تو ایک طرف خود حکومت بھی اس الزام سے جدا نہیں۔ مثلاً حکومت کی مسلمہ پالیسی عدم تشدد ہے لیکن اس کا کیا کیجئے گا کہ کئی تشدد استعمال کرنے والوں کو ہم نے راہبر مانا ہے۔ ان کے سامنے سر جھکایا ہے اور ان کے سہرے گائے ہیں۔ میں شہید بھگت سنگھ کی مثال آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ بھگت سنگھ اوّل اور آخر انقلابی تھے۔ وہ دل سے سماج وادی تھے اور یقین رکھتے تھے کہ سختی کے بغیر برطانوی سامراج کا تختہ الٹنا ناممکن ہے۔ اب آپ ان کے بارے میں فلم بنائیں تو ایک طرف آپ ان کو ان کے ساتھی بھگوتی چرن کی بیوی کو بار بار بھابی کہہ کر ایک Sublimated Sex کی طرف اشارہ کرنا پڑے گا اور دوسری طرف ان کے اسمبلی میں بم پھینکنے کو یا تو حذف کرنا پڑے گا یا اس کی ترجمانی کچھ یوں کرنی پڑے گی کہ وہ صرف سامراج کو چونکانا چاہتے تھے۔ جبھی ایک تضاد پیدا ہو جائے گا کہ کیا لاہور میں پولیس سپرنٹنڈنٹ سانڈرس کا قتل انہوں نے صرف انگریزوں کو چونکانے کے لئے کیا تھا۔ اگر آپ ان واقعات کو ایسے ہی دکھائیں گے جیسے کہ وہ ہوئے تو آپ پر عتاب نازل ہوگا کیونکہ ملک میں کئی ایسے گروہ ہیں جو گولی بندوق پیشہ ہیں اور حکومت کی پالیسی ایسی ہے کہ وہ دھماکہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ ورنہ ان کروڑوں نوجوانوں کا کیا ہوگا جو دن رات یونیورسٹی کیمپس میں اودھم مچاتے رہتے ہیں؟

یہ تاریخ کو مسخ کرنے والی بات ہوگی اگر ہم کہیں کہ ہندوستان کو آزادی صرف عدم تشدد کی پالیسی کے کارن ملی۔ اس میں رائل انڈین نیوی کے Ratings اور Ensigns کا بھی ہاتھ

تھا جنہوں نے ناقص خوراک اور بدسلوکی کے سبب [illegible] ہندوستان کی آزادی کے لئے لڑائی لڑی، غدر کیا اور بمبئی کی گلیوں میں انگریزی گولیوں سے شہید ہوئے۔ جلیانوالا باغ کے بیسیوں سال بعد اودھم سنگھ نے لندن پہنچ کر سر مائیکل اوڈوائر کو گولی مار دی اور ہماری [illegible] بدلہ لیا۔ لیکن آپ اس سیاسی اور سماجی حقیقت کو سکرین پر [illegible] نہیں دکھا سکتے۔ اس لئے کہ برطانیہ کے ساتھ ہمارے کامن ویلتھ تعلقات ہیں جو موجودہ بین الاقوامی حالات کے پیش نظر ہم کسی طور نہیں توڑ سکتے۔ ہم حقیقت کی آنکھوں میں نہیں گھور سکتے۔

سماجی فلم بناتے ہوئے ہم ہر قدم پر ایسے بیسیوں خطروں سے دوچار ہوتے ہیں۔ آپ قومی ایکتا پر فلم بنا رہے ہوں تو آپ کی ہمت نہیں ہوگی کہ رانچی، بھیونڈی اور مالیگاؤں کے واقعات کی سچی عکاسی کر سکیں۔ کیونکہ ان میں ایک مذہب یا فرقے نے دوسرے پر وحشیانہ مظالم برپا کئے تھے۔ آپ فرقہ وارانہ فسادات دکھائیے تو آپ کے لئے لازمی ہے۔ جہاں دو ہندو مرے ہوں وہاں دو مسلمان مار کے دکھائیے۔ اس سے بھی نہ ہندوؤں کی تسلی ہوگی اور نہ مسلمانوں کی۔ دونوں آپ سے ناخوش۔ حکومت ناراض اور اس پر آپ کو سنسر سرٹیفکیٹ لینے میں تکلیف ہوگی تو جو۔ آپ موجودہ طالب علموں کی خودسری کو بھی نہیں ٹٹول سکتے۔ ان کی بے چینی اور اضطراب کی وجہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کر سکتے۔ یونیورسٹی Campuses میں جو ہو رہا ہے۔ آخر ہے کیا؟ کیا صرف یہ بات ہے کہ آج کل نوجوانوں کا دماغ پھر گیا ہے وہ اپنا اصل مقصد تعلیم چھوڑ کر سیاسی ہوتے جا رہے ہیں یا وہ مختلف سیاسی پارٹیوں کے ہتھکنڈوں کا شکار ہیں؟ آخر اس مار دھاڑ کی وجہ کیا ہے؟ یہ بھی تو گاندھی جی کو مانتے ہیں پھر کیوں ایکا ایکی یہ لوگ اٹھ کر مار کاٹ کرنے لگتے ہیں۔ ان باتوں کی تہہ میں جانا اور ان کے بارے میں فلم بنانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ ایسا کریں گے تو کئی اجارہ داروں کے پاؤں پہ آپ کے پاؤں پڑیں گے اور وہ سب ہیں بڑی پہنچ والے۔ اس لئے آپ صرف گول گول دال والی باتیں کیجئے۔ پانچ چھ گانے ڈال دیجئے، دو چار ناچ، ماں باپ بیٹے بیٹیوں کا بچپن ہی سے بچھڑ جانا تا کہ بڑا بھائی جوان ہو کر پولیس انسپکٹر بن جائے۔ اُن جانے میں اپنے ہی چھوٹے بھائی کو عدالت میں ملزم کے طور پر پیش کرے اور یہ بعد میں پتہ چلے کہ جج ان دونوں کا باپ تھا اور ماں جو بیٹے کے خلاف گواہی دے رہی ہے، اس کی بیوی تھی۔ پھر پتہ چلے تو باپ کے لئے مشکل ہو جائے، ماں کے لئے مصیبت۔ نوجوانوں کے بارے میں فلم بنائیے تو صرف یہاں تک پہنچئے کہ بڑوں کا عشق عشق تھا اور چھوٹوں کی محبت بدمعاشی اور بے کاری۔ آپ "اسپت" مت لکھئے کہ خرید بھگوت سے لے کر ان تک [illegible]

بچے پیدا کر دیتے ہیں، بس صرف اسی پر اکتفا کیجئے کہ چند مصیبتوں میں پڑے ہوئے بزرگوں کے پاس کوئی وقت نہیں ہے۔ وہ ان کو ذہنی اور سیاسی بچے سمجھتے ہیں اور اگر سمجھتے بھی ہیں تو انہیں اپنے ہی معکوس Perverted ہو جاتے ہیں۔

اب آپ اس بدنام لفظ جنس Sex پر آ جائیے۔ ہمارا سماج یہ تو برداشت کر سکتا ہے کہ راما اور رادھا ناچتے ہوئے ایک پیڑ کے گرد یا جھاڑیوں میں جیسوں گیت گائیں اور اخلاق سے گری ہوئی حرکتیں کریں لیکن جس میں جو پیار کرنے والے کا اپنی پیاری کو چھونا ہوتا ہے۔ ہم اپنی فلموں میں دو تین چار ریلیں صرف یہ ثابت کرنے کے لئے بیچتے ہیں کہ راجو کو رادھا سے محبت تھی لیکن ذہنی بات جو چند سیکنڈ میں ثابت ہو سکتی ہے پوری تہذیب اس کے خلاف ہے۔ ہمارا سماج اس بات کی اجازت نہیں دیتا مجبور ہو، کو تارک کے وارث یہ بات کہتے ہیں اور بار بار کہتے ہیں۔ اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس عمل کو صحت مند طریقے سے پیش کیا جائے، اور فلم جو کسی حد تک آرٹ بھی ہے، کمرشل لوگوں اور پیشہ وروں کے ہاتھوں سے نکالی جائے لیکن عملی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ چند مناظر کے فلمانے کی اجازت اچھے اور برے دونوں فلم سازوں کو یکساں طور پر نہیں ہے۔ یوں سنسر نے اپنے لئے گنجائش رکھی ہے کہ ہر فلم اور اس میں ہونے والے واقعات کو بنانے والے کی نیت اور واقعے کے پس منظر میں دیکھا جائے گا۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ ایک لمحے کے لئے مان بھی لیا جائے کہ سنسر کے چودھری بڑے دل والے ہیں مگر ان کا کیا کیجئے گا جو پبلک کی سطح پر تصویر کو پاس کرنے کے سلسلے میں پہلے دیکھتے ہیں۔ اور جن کا ادب اور شعور قابل غور ہے، اور جو بار بار اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ میں فلم نہیں لکھتا نہ دیکھتا۔

مثال کے طور پر میں ایک فلم بناتا ہوں، جس کا بنیادی خیال ہے کہ بالغ ہوتے ہوئے بچے کو جنسی تعلیم دینی چاہیئے اور اسے ان تمام خطروں سے آگاہ کرنا چاہیئے جو پیدا ہو سکتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ لڑکے اور لڑکی کے سلسلے میں اگر میں کوئی لغزش نہیں دکھاؤں گا تو ڈراما پیدا نہیں ہو گا اور دکھاؤں گا تو اس کا حل مجھے وہی پیش کرنا پڑے گا جو قابل قبول ہے اور وہ نہیں جو کہ سائنسی حقیقت ہے۔

حال ہی کی بات ہے میں ایک فلم بنا رہا تھا جو کہ نفسیاتی تھی۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک عورت کا مرد کسی اور لڑکی کی وجہ سے گھر چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد اس عورت کے بچی پیدا ہوتی ہے۔ جوان ہو کر وہ شادی کرتی ہے لیکن وہ عورت اس کے ساتھ کچھ یوں چپک جاتی ہے کہ داماد کے لئے سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک دن ایسا آتا ہے کہ وہ اپنی بیٹی اور داماد کو ایک دوسرے کے بازوؤں میں دیکھ لیتی ہے اور ایک لمحے کے لئے اپنے آپ کو اپنی بیٹی کی جگہ پروجیکٹ کر دیتی ہے . . .

انسان اپنے دماغ میں بعض وقت ایسی ایسی باتیں سوچ لیتا ہے، جو سماجی یا اخلاقی طور پر کسی طرح سے قابل قبول نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ سمجھ لیتا ہے چاہے اس کے بعد وہ اپنے آپ کو ایک بہت بڑا پاپی اور گناہگار سمجھے چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ساس ایک لمحے کے لئے رک تو جاتی ہے لیکن فوراً ہی چونک کر پیچھے ہٹ جاتی ہے اور گناہ کے احساس سے معمور مندر میں جا کر بھجن گانے لگتی ہے۔ میرو تو گردھر گوپال، دوسرو نہ کوئے . . .

اس منظر کو فلمایا تھا کہ میری ہیروئن نے اس پر اعتراض کیا۔۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے کہا۔ ہوتا ہے میڈم اور پھر جب میں یہ دکھاتا ہوں کہ وہ ایک (Incest) کے جذبے سے صدمہ زدہ سیٹ کے سامنے چلی جاتی ہے، تو پھر آپ کو کیا اعتراض ہے۔ میڈم نے وہ سین کر تو دیا لیکن سوچتی رہیں کہ اس پر پبلک سے جوتے پڑیں گے۔ میں نے اس پر بھی کہا کہ جوتے جو پڑیں گے، آپ مجھے بھیج دیجئے۔ میرے اپنے جوتے پرانے ہو گئے، بلکہ پھٹ چکے ہیں۔

سماجی فلم بنانے والے کی حیثیت اس عورت کی طرح سے ہے جو غرارہ پہنے ہوئے کسی پارٹی میں گئی اور جب لوٹی تو برسات ہو چکی تھی اور گھر کے سامنے پانی ہی پانی تھا۔ اس کے مرد نے سر والٹر ریلے کی طرح راستے میں اینٹیں اور سلیں رکھ دیں اور وہ غرارے کو سنبھالتی ہوئی چلی لیکن اسے کیا معلوم کہ ایک اینٹ بے ڈھبی رکھی ہوئی ہے۔ وہ دھپ سے پانی میں گری غرارے ہشکو کے سمیت . . . احتیاط اسے لے ڈوبی۔ نا بابا! سماجی فلم بنانا بڑا جوکھم ہے۔ چاروں طرف سے آپ ننگے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بدن پہ کھال بھی نہیں اور نمک کی کان میں سے گزرنا پڑ رہا ہے۔

فلمیں سماجی اور دوسری کن حالات میں بنتی ہیں اس کا آپ کو اندازہ نہیں۔ نام کو ہمیں پوری آزادی ہے۔ جس سے حافظ کا شعر یاد آتا ہے ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوید کہ دامن تر مکن ہشیار باش

دریا میں عین بھنور کے بیچ تم نے مجھے ایک تختہ پر کھڑا کر دیا ہے اور اس پر یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ہوشیار رہو، دامن نہ بھیگے۔

جیلانی بانو

ہریا

ہریا کو دیکھ کر کنچو کے آگے سورج سا نکل آیا
گھٹنوں میں سر سے پیر تک لدی، سرخ چنری میں لپٹی گھونگھٹ نکالے ہریا جب اسٹیشن کے نکڑ پر نظر آئی تو کنچو کی ہنسی چھوٹ گئی۔

اتنے زیور — ؟ اسے ہریا کی باتوں پر یقین نہ آتا تھا کہ اس کے پاس پچیس تولہ سونا ہے مگر اس وقت ہریا کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ آنے والے دن کیسے سنہرے اور روپہلے ہوں گے!

ان زیوروں کو بیچ کر وہ ایک آٹو رکشا خریدے گا۔ ہریا کو نکال باہر کرنے کی بجائے بدو کے حوالے کر دے گا۔ پانچ روپے روز کمیشن پر — اب تو پانچوں گھی میں ہیں۔

بمبئی جیسی جگہ پر انسان کے پاس دس پانچ ہزار روپے ہوں اور ہریا جیسی کماؤ لڑکی بھی مل جائے تو انسان کیسے کیسے عیش کر سکتا ہے۔

کنچو اپنے پروگرام بنانے میں مست تھا۔ اور جب ہریا اس سے آکر لپٹ گئی تو وہ چونک پڑا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ہریا کو بھر کے بڑے غور سے اس کے زیوروں کو جانچا۔

"کیسی لگ رہی ہوں میں —؟" وہ اترا کے بولی

"اتنے زیور، کپڑے پہن کر کیوں نکلی —، گٹھریا میں باندھ لئے ہوتے"

"بغیر زیور پہنے گھر سے بدا کیسے ہوتی۔" ہریا اچانک رونے لگی۔

کنچو نے سوچا، اسے دلہن بننے کا بڑا ارمان ہے اور اس وقت اگر بے رخی برتی تو ممکن ہے وہ واپس چلی جائے۔ بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔

اگر ہریا کا پتی گونا کرنے میں ایک سال کی دیر اور نہ کر دیتا تو یہ گہنوں میں لدی ہریا کنچو کے پلّے کیسے پڑتی۔ کیسی جلد باز تھی یہ لڑکی — صرف دو مہینے میں اس نے کنچو کے ساتھ اتنی پینگیں بڑھائیں کہ آج وہ کنچو کے ساتھ بمبئی بھاگنے کو تیار تھی۔

کنچو بمبئی کی کسی مل میں مزدوری کرتا تھا۔ اسے گاؤں سے گئے پانچ برس ہو گئے تھے۔ پانچ برس بعد وہ گاؤں گیا تو بمبئی کی پینٹ اور بش شرٹ اس کے بدن پر تھی اور بمبئی کا پانی اس کی رگوں میں سرایت کر چکا تھا۔

اس کا ایک دوست عبدل اپنے گاؤں سے ایک مالدار بیوہ کو بھگا لایا تھا۔ پھر اس کے پیسے سے خوب عیش کئے۔ ذاتی ٹیکسی خریدی۔ دیکھتے ہی دیکھتے عبدل کے دن پھر گئے۔ اس بیوہ کو اس نے مار پیٹ کے نکال دیا۔

کنچو اپنے گاؤں کو بھول چکا تھا۔ مگر عبدل کی کہانی سن کر وہ فوراً اپنے گاؤں بھاگا۔ کسی گہنے پاتے والی بوڑھی ڈھونڈ کر عاشق ہونے کا پورا ارادہ کر چکا تھا مگر پکے پھل کی طرح خود بخود ہریا اس کی جھولی میں آگری۔

ہریا کو اللہ میاں نے میدہ میں گھی شکر گھول کر بنایا تھا پھر اس کی بے لگام نڈر اور بے صبر جوانی تھی جو اسے ایک پل نچلا نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ وہ کھیتوں میں ہوتی تو چلنے کی بجائے اڑتی ہوئی جاتی۔ کسی جوان لڑکے کو دیکھتی تو کھی کھی ہنسنے لگتی۔ کسی دلہن کو دیکھتی تھی تو اس کے بال نوچ ڈالتی تھی۔ اس کا گھونگھٹ پھاڑ ڈالتی۔ ہریا کی جتنی بیاہی سہیلیاں تھیں سب سے اس کی لڑائی ہو چکی تھی

اپنی بیٹی کو اسی لئے اس کے باپ نے دسویں برس بیاہ دیا تھا اکلوتی بیٹی تھی۔ پھر گھر میں بہت کچھ تھا کھیت۔ گھر گائے بھینس۔ ہریا کا صرف گونا ہونا باقی تھا مگر اس کے دولہا کو پڑھائی کا بڑا شوق تھا ہریا کی سسرال کے سب ہی لوگ شہر میں جا بسے تھے۔ اس کا دولہا کوئی ایسی بڑی پڑھائی پڑھ رہا تھا جو ختم ہی نہ ہو پاتی تھی۔

ادھر ہریا کی بے قراری کے ساتھ ساتھ اس کا جہیز بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ اتنے قابل داماد کو اس کا باپ کیا دیتا۔ ؟ ہریا تو نہ نری جاہل تھی۔ اس لئے اس کا باپ محنت مزدوری کر کے اس کے جہیز میں اضافہ کرتا جا رہا تھا ــ سنا ہے شہر کے لڑکے پیسے کے میت ہوتے ہیں۔ ہریا کا دولھا بھی پچیس تولے سونے تلے دبا رہے گا۔

مگر یہ کپڑے اور زیور ہریا کے لئے سانپوں کا بچھونا بن گئے تھے۔ اس کا بس چلتا تو خود ہی بھاگ کر شہر چلی جاتی جہاں اس کا دولھا پڑھ رہا تھا۔ پینٹ اور بش شرٹ پہنے والے مرد اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ سینڈل پہنے، منہ میں سگریٹ دبائے انگریزی بال کٹے ہوئے سونے کی گھڑی باندھے۔

ہریا نے اپنے دولھا کو نہیں دیکھا تھا۔ مگر اسے یقین تھا کہ وہ ایسا ہی چمکتا دمکتا بمبئی کا بابو ہوگا۔

ان ہی دنوں کچو شہر سے گاؤں آیا۔

کچو کی ماں ہریا کی پڑوسن تھی۔ کچو کا باپ مر چکا تھا اور کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔ اس لئے بڑھیا اکیلی ڈنڈار گھر میں پڑی رہتی۔ دو ایک کھیت تھے وہ ادھ بٹائی پر اٹھا دیتے تھے۔ مگر کچو شہر سے سگریٹ پیتا، پینٹ بش شرٹ پہنے آیا تو سارے گاؤں کے لوگ اس کے رشتہ دار بن گئے۔ خود ہریا اب دن رات کچو کی ماں کے ہاں گھسی رہتی۔ اس کی روٹی پکا رہی ہے اس کی جوتیں بین رہی ہے۔ سال بھر چلنے والا سارا اچار اس نے دو مہینے میں کچو کو کھلا ڈالا۔ اور کچو جو کھٹائی کے نام سے میلوں دور بھاگتا تھا۔ کیری کی پھانکیں، برفی کی ڈلی کی طرح چباتا گیا۔ کیونکہ رفتہ رفتہ اس پر اس بات کا انکشاف ہونے لگا کہ ہریا نہ صرف خود برفی کی ڈلی ہے بلکہ وہ پچیس تولے سونے کی بھی مالک ہے۔ بس پھر کیا تھا وہ دن رات ہریا کی خوشامد میں لگا رہتا اسے شہر کے رنگین قصے سناتا۔ ہریا تو اس کی پینٹ اور بش شرٹ پر قربان ہو چکی تھی۔ پھر کچو بمبئی سے آیا تھا۔ جہاں پر کپڑے، زیور، بمبئی کا بابو اور اس کی رنگین مزاجی، ہر ہر چیز گاؤں کے لوک گیتوں میں سراہی جاتی تھی۔

اس نے بھی کچو کا نام بمبئی کا بابو رکھ دیا تھا۔ وہ دن رات کچو کے ساتھ رہتی۔ کئی بار اس کی ماں نے روکا بھی کہ کہیں ہریا کی سسرال میں یہ بات نہ پہنچ جائے۔ مگر ہریا کہیں رک سکتی تھی۔ وہ اتنی تیزی سے دوڑی کہ صرف دو مہینے بعد وہ کچو کے ساتھ شہر بھاگنے پر پوری طرح تیار ہو چکی تھی۔

باپو کی کھٹیا تلے گڑا ہوا چار ہزار روپیہ اور پچیس تولہ سونا نکال کر اس نے گٹھریا میں باندھ لیا۔ راستے کے لئے چنے کا ساگ اور باجرے کی روٹی بھی پکا کر بستے میں باندھ لی اور اس کی ماں کے کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ آج اس کی بیٹی بدا ہو رہی ہے۔

شام ہوئی تو اس کی ماں نے روز کی طرح خود کواڑ بند کئے۔ آنگن میں بھینسوں کے طویلے کے کھاٹ ڈالے ہریا سو رہی تھی۔ اس کی ماں نے کئی بار ٹوکا کہ آج اتنی ٹھنڈ میں اکیلی کیوں پڑی ہے۔ مگر ہریا بے خبر سوتی رہی جیسے اپنے بڑھاکو دولھا کے خوابوں میں کھوئی ہوئی ہو۔ ہریا کا صحت مند بدن دیکھ کر اس کی ماں کو بھی خیال آیا کہ جانے کیوں اس کا دولھا دیر کئے جا رہا ہے۔ کبھی آ کر تو دیکھے کہ ہریا کلی کی طرح کھلی جا رہی ہے۔

اور جب ماں خواب میں ہریا کے گونے کا آغاز کر چکی تھی عورتوں کے بیچ شگن کے گلگلے بانٹتے بانٹتے اس کی سسکیاں نکل گئیں تو ہریا سچ مچ اس گھر سے بدا ہو رہی تھی۔ ماں کو خواب میں سسکیاں لیتے دیکھ کر اس کی اپنی بھی ہچکیاں گلے میں رندھ گئیں۔

ہریا نے اپنے بیاہ کا سرخ جوڑا پہنا تاکہ صبح سویرے کوئی اسے اسٹیشن کی اور جاتا دیکھے تو یہ سمجھے کہ کوئی نئی نویلی دلہن کھیتوں پر دولھا کا کھانا لئے جا رہی ہے۔

روٹیوں اور کھانے کی گٹھریا اس نے سر پر رکھ لی۔ اس ترکیب کو سوچتے وقت سب سے زیادہ چاؤ اسے دلہن بننے کا تھا۔

" دیکھو تو میرے پاس بھی تو پانچ ہزار روپے ہیں۔" کچو نے اپنا ٹوٹا ہوا بکس دکھایا۔

" تو کیا تمہارے کھیت بک گئے ــ ؟ ارے میری میا ــ اب کتے بہت سے پیسے ہو گئے تمہارے پاس ؟"

" ہاں ماں کو بمبئی سے خرچ بھیجنا پڑے گا۔"

" میں تو اس بڑھیا کو ایک کوڑی بھی نہ دوں گی۔ ہریا نے بکسا اس کے ہاتھ سے چھین کر سر پر رکھا اور وہ دونوں اسٹیشن کی اور چلنے لگے

کچو نے اپنے کھیت بیچ کر پانچ ہزار روپیہ بھی ساتھ لے لیا تھا۔ کیونکہ ہریا کو بھگانے کے بعد اس گاؤں واپس آنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ اب رہا ماں کا سوال: تو وہ دو چار برس میں مرنے ہی والی ہے۔

ہریا بکسا سر پہ رکھ کر ٹھمک ٹھمک چلے تو کچو کو ایک فلم کی ہیروئن یاد آ گئی حالانکہ وہ ہریا سے اچھی نہ تھی۔ مگر چال ڈھال تیزی طراری میں بھی یہی تھی۔

" کچو اب تو بمبئی جا کر اپنے لئے ایک سوٹ بنوا لینا اور گھڑی بھی خرید لینا۔ داروغہ جی کے لڑکے کی طرح وہ کتنا اچھا لگتا ہے نا۔

اس وقت داروغہ جی کے لڑکے کو سراہنے پر اسے غصہ تو بہت آیا مگر صبر کر کے بولا۔

" اری گھڑی کون سی انمول چیز ہے صرف پانچ بیک روپے میں آ جاتی ہے

اسٹیشن پہ جو ٹرین کھڑی تھی۔ کنجو نے اسی کے ٹکٹ لے لئے کیونکہ عبدل کی کہانی میں اس نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ عورت کو سیدھے راستے سے لے کر جاؤ گے تو پکڑے جاؤ گے۔ اس لئے خوب گھما پھرا کے لے جاؤ تاکہ پولیس کے ہتھے نہ چڑھ سکو۔

ٹرین بھری ہوئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر رکتی تو اور ہجوم بڑھ جاتا۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکا دے رہے تھے۔ اوپر سامان پھینک رہے تھے، لڑ رہے تھے۔ جیسے ہریا کی طرح سب کہیں نہ کہیں فرار ہونا چاہتے ہوں، اس کی گاڑی میں جگہ نہ ملی تو مارے جائیں گے۔

دروازے کے کونے میں گھسی ہریا کھڑی تھی۔ سر پہ بکسا اٹھائے بکسے کے اوپر اپنی گٹھریا سنبھالے۔ اس کے پاس ہریا کو اپنے آپ سے چھپائے کنجو کھڑا تھا جب کوئی اسٹیشن آتا تو کنجو جلدی سے لیٹرین میں گھس جاتا تھا۔ کئی لوگوں کی نظریں ہریا کے دمکتے ہوئے چہرے اور چمکتے ہوئے بدن پر تھیں آس پاس کھڑے ہوئے مردوں کی آنکھوں میں اجالا سا بھر رہا تھا۔ وہ سب کنجو کی قسمت پر رشک کر رہے تھے کہ خود تو لنگور کی صورت ہے اور اتنی پیاری سی دلہن کو بیاہے لئے جا رہا ہے۔ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ پاکر کنجو کا خون خشک ہوا جا رہا تھا کہیں کسی نے انہیں پہچان لیا تو ـــ؟

ٹرین تیزی سے دوڑ رہی تھی پیچھے ـ چھوٹتے والے گاؤں، کھیت، درخت ہر ہر چیز ہریا سے کہہ رہی تھی، کہ اب تم آزاد ہو چکی ہو۔ اس کا جی چاہ رہا تھا ابھی سب کے سامنے کنجو سے لپٹ جائے۔ بیاہ بعد میں ہوتا رہے گا۔

"ہریا ـــ اگلے اسٹیشن پر میں کسی اور ڈبے میں چلا جاؤں گا جب میں کسی اسٹیشن پر اشارہ کروں تو جلدی سے اتر جئیو!" کنجو نے آہستہ سے کہا ہریا خود بھی ڈر کے مارے کانپ رہی تھی۔ اگر باپو نے پولس دوڑا دی تو ساری عمر جیل میں سڑنا پڑے گا۔ اور پھر باپو کا غصہ ـــ! اس کی ایک ہی لٹھیا میں ہریا کا دم نکل جائے گا، سارے گاؤں والے نفرت سے اس کے منہ پر تھوک دیں گے۔ اس کا شہر والا دولہا کبھی بیاہنے نہیں آئے گا ساری عمر وہ کنواری بیٹھی رہے گی ـــ کنجو کے اتر جانے کے بعد ہریا کو سارے امکانی خطروں کا احساس ہو رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے بکسا تھامے وہ رونے لگی۔ اس نے بکسا اتار کے نیچے رکھ دیا اور اپنے گلابی ریشمی دوپٹے سے ناک پونچھنے لگی۔

"کیوں رونے لگیں ـــ کیا وہ تمہیں مارتا ہے؟"

ہریا چونک پڑی ـــ اس کے پاس ایک چاند کے ٹکڑے جیسا نوجوان کھڑا پوچھ رہا تھا بہت بڑھیا پتلون پہنے۔ سونے کی گھڑی ـــ بالوں کی پٹیاں جمائے ـــ ہونٹوں میں سگریٹ دبائے۔

ڈر کے مارے وہ کچھ نہ بولی ـــ آنسو پونچھ کر دو در ہٹ گئی۔

"ڈرو مت ـــ اگر تمہارا آدمی مارتا ہے تو میں ابھی پولیس کو اطلاع کر دوں گا۔"

"نہیں نہیں ـــ وہ مجھے نہیں مارتا ـــ" ہریا نے جلدی سے کہا کہیں سچ مچ پولیس کا جھگڑا نہ کھڑا ہو جائے۔ اس نے غور سے اس نوجوان کی شاندار شخصیت کو دیکھا ـــ اس بار اور بھی سہم گئی ـــ یہ ـــ یہ تو کوئی شہر کا بابو ہے ـــ شاید ہریا کا پتی ہی ہو ـــ اب کیا ہو گا ـــ؟

"کیا تم شہر میں کوئی بڑی سی پڑھائی پڑھتے ہو ـــ؟"

"ہاں بہت بڑی پڑھائی ـــ" وہ کیسی ندیدی نظروں سے ہریا کو دیکھ رہا تھا ـــ اس کے کاندھے سے کاندھا ملائے کھڑا تھا اور کسی نہ کسی بہانے قریب آتا جا رہا تھا۔

ارے میری میا ـــ؟ وہ کانپ اٹھی ـ یہ تو وہی ہے ـ اب کیا کروں! اگر اس نے کنجو کی صورت دیکھ لی تو جان سے مار ڈالے گا ـــ لو اسے اپنا دولہا کہاں مل گیا! ممکن ہے۔ وہ گاؤں جا رہا ہو ـــ ہریا کو لانے ـــ مگر میں اسے یہ بات کیسے بتاؤں کہ میں ہی اس کی دلہن ہوں۔

"لو یہ کوکا کولا پیو ـــ جی سنبھل جائے گا" وہ جانے کہاں سے ایک کالی ٹھنڈی بوتل لے آیا۔

"نہ ـــ میں نہ پیوں گی ـــ" اس نے ناک سکوڑ کر کہا

"اری پی کر تو دیکھ ـــ بڑا میٹھا شربت ہے" اس نے زبردستی اسے اپنے قریب کر کے بوتل منہ سے لگا دی۔

ہریا نے ذرا سا چکھا تو کوئی سنسناتی ہوئی چیز دماغ کی طرف جانے لگی۔ اور اسے بڑے زور کا اچھو لگا ـــ

کمپارٹمنٹ کے سب لوگ ہریا کی حالت پر ہنسنے لگے۔ ہریا خود بھی کھسیانی سی ہو گئی ـــ مگر وہ نوجوان ابھی تک اسے اپنے ہاتھوں میں تھامے اس کا منہ اپنے منہ کے قریب کئے ہوئے تھا۔

"تمہارے ساتھ وہ کون ہے ـــ؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

ہریا گھبرا گئی۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ میں کنجو کے ساتھ بھاگ رہی تھی تو ـــ مارے گھبراہٹ کے اسے رونا آ گیا۔

"کیوں ـــ؟ کیا بات ہے ـــ؟ مجھے بتاؤ نا ـ ـ"

"وہ ادمی میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ تم مجھے کہیں دور لے چلو"

پیچھے کی طرف دوڑتے ہوئے، درختوں پر نظر جما کے اس نوجوان نے پوچھا۔

"تمہارا پتی کہاں ہے ـــ؟"

وہ روتے روتے ہنس پڑی ـ اور اس نوجوان کے منہ میں سے سگریٹ نکال کر بولی۔

"تم مجھے اپنے ساتھ کہیں لے چلو نا ـــ میں تمہیں ساری بات سنا دوں

(باقی صفحہ ۸۲ پر)

آمنہ ابوالحسن

گھمنڈی

میرے پڑھنے والو آپ نے اس سے پہلے بھی صدہا کہانیاں پڑھی ہوں گی۔ مسرت کی، محبت کی، عداوت کی، یاس و مایوسی کی، دشمنی کی غرض کہ دنیا کے ہر اچھے بُرے جذبے کی کہانیاں۔ خود میں بھی جذبوں کی پیداوار ہوں۔ مجھ میں بھی بہت سے اچھے موڑ، انوکھے انداز، دلچسپ و دلنشیں خم ہیں۔ مایوسی کے اندھیرے، یاس کا بن، عداوت کی جلن بھی۔ مگر نہ بھولئے کہ کبھی میرا بدن بھی مرمریں تھا۔ میرے پیراہن بھی رنگین۔

میں نے ایک معزز گھرانے میں جنم لیا۔ اطلس و کمخواب میں پلی۔ اپنا سارا بچپن کسی شاداب پودے کی طرح گزارا۔ اس وقت میں رنگ تھی، میں روپ۔ پھر سایہ اٹھ گیا اور تیز دھوپ پڑی تو میں یکایک سوکھنے ٹھٹھرنے لگی۔ میرا رنگ روپ، شادابی سب ختم ہوئے۔ میرے گھر سے دولت تو نہیں گئی مگر میرے سر سے اپنے والدین کا سایہ ضرور اٹھ گیا۔

جب محبت اور شفقت نہ رہی تو میرا بانکپن بھی مر گیا۔ میرا رنگ بھی زرد پڑ گیا۔ میری روشنی بھی بجھنے لگی۔ میری شگفتگی پالا کھا گئی۔ میں نے اپنے تمام خواب تمام خیال، تمام منصوبے سمیٹ کر ایک گٹھری بنائی اور اُسے کہیں ڈال کر بھول بھال گئی۔

جب میں کچھ نہ رہی۔ امید اور تمنا بھول بیٹھی تو نہ جانے کہاں سے ایک پگلا شخص آیا اور بولا "تم بہار ہو۔ تم کائنات ہو۔" میں نے اُس سے بھی زیادہ پگلے پن سے اُسے دیکھا اور بولی۔ "تمہاری بینائی شاید خراب ہے تم کسی ماہر چشم کے پاس جاؤ۔"

اس نے مسکرا کر کہا: "تم کچھ بھی کہو، کچھ بھی سمجھو، لیکن میں سچ کہتا ہوں۔ تم کسی مصور کے موقلم سے بنے ہوئے عمدہ و نفیس کینوس پر کھینچی ہوئی بڑی بامعنی اور بڑی خوبصورت تصویر ہو۔"

میں نے کہا: "شاعری مت کرو، مجھے شاعری سے نفرت ہے۔ میں کسی مصور کو نہیں جانتی۔ میں تو تمہیں بھی نہیں جانتی۔ تم کون ہو کہاں سے آئے ہو کس کے پاس جانا چاہتے ہو کس سے ملنا چاہتے ہو۔ یقیناً تم راستہ بھٹک گئے ہو کیونکہ میں وہ نہیں جس سے تمہیں ملنا ہے۔"

وہ بولا: "میں کسی سے ملنے کے ارادے سے نہیں چلا تھا۔ میں ایک مسافر ہوں۔ زندگی کی شاہراہ میں۔ یونہی چھان رہا تھا کہ مجھے تم نظر آئیں۔"

"میرے علاوہ کیا تمہیں کوئی اور نظر نہ آیا۔؟"

"بہتوں کو دیکھا مگر تم نے مجھے روک لیا ہے۔"

میں نے اپنے سراپا پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور تمسخر سے بولی۔

"وہی دو ہاتھ دو پیر۔ ایک بدن، ایک چہرہ۔ ایک شکل۔"

"ٹھہرو، ٹھہرو۔" اس نے مجھے روک کر کہا: "تم حساب کتاب میں خاصی ماہر معلوم ہوتی ہو مگر مجھے حساب کتاب بالکل نہیں آتا۔ میں اس لحاظ سے بالکل بدھو ہوں لیکن مجھے اپنی پسند پر اعتماد ہے، اپنی نگاہ پر فخر۔"

"یہ فخر اور اعتماد کیا ہوتا ہے۔؟"

"تم یوں نہیں سمجھو گی کیونکہ یہ کوئی فارمولا نہیں بلکہ تم اُس وقت ان لفظوں کے معنی سمجھو گی جب تم بھی کسی اور پر نہ سہی مگر خود پر اعتماد اور فخر کرنے لگ جاؤ۔"

"واہ اچھی زبردستی ہے یعنی میں چاہوں نہ چاہوں مگر فخر اور اعتماد ضرور کرنے لگ جاؤں۔؟" میں نے ذرا وحشت سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ جھٹ بولا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ زور زبردستی کا کوئی سوال نہیں لیکن اگر تم میرے ساتھ رہنے کا وعدہ کرو تو میں ضرور یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ تم بہار ہو، تم کائنات ہو۔"

"اور میں فقط تمہاری زبان کے بھروسے تمہارے ساتھ ہو جاؤں۔ ایک بالکل اجنبی آدمی کے ساتھ۔ یہ کس طرح ممکن ہے بھلا؟"

"تو ٹھیک ہے میں جاتا ہوں لیکن غور کر لو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک اجنبی بھی اپنوں سے بڑھ کر ثابت ہو جائے۔"

میں غور کرتی رہی مگر میری سمجھ میں خاک نہ آیا۔

نہ میرا دل دھڑکا، نہ لب پھڑکے، نہ دماغ نے کچھ سمجھایا، نہ جسم نے کچھ چاہا، نہ تمنا نے کچھ طلب کیا مگر وہ اجنبی مجھے یاد رہ گیا، بھلایا نہ گیا۔

زندگی کے ریلے میں، انسانوں کے ہجوم میں، گزرتے ہوئے شب و روز میں وہ نہ جانے کہاں گم ہو گیا اور میں اس کی راہ تکتی رہ گئی۔ مجھے لگا مجھے اُسے اتنا بن جانا چاہئے تھا۔ اگر وہ غلط اور بُرا ثابت ہوتا تو میں اُسے چھوڑ سکتی تھی۔ اگر اچھا ثابت ہوتا تو اس پر یقین کر سکتی تھی مگر اس وقت جبکہ وہ جا چکا تھا میری ہر سوچ لاحاصل تھی۔

میں پھر اپنی جگہ خاموش رہ گئی۔ خاموش اور بے صدا۔ کافی دن گزر گئے۔ میں کچھ زیادہ خالی اور کھوکھلی ہو گئی۔ کچھ اور بھی بے آب، بے نور۔ تب ایک دن اچانک وہ پھر چڑھتے آفتاب کی طرح طلوع ہوا اور پوچھنے لگا "تم کیسی ہو۔؟"

میں خوش ہو گئی مگر میں نے خوشی کو چھپا کر کہا "میں بالکل ٹھیک ہوں اور میں نے آپ کا انتظار کبھی نہیں کیا جناب۔"

وہ صبر سے بولا "انتظار میں بھی ایک لذت ہوتی ہے مگر اچھا ہی ہوا کہ تم انتظار کے کرب اور زحمت سے بچ گئیں۔"

"اور تمہارا سفر ابھی ختم نہیں ہوا؟"

"نہیں، کیونکہ تم جیسا پھر کوئی دوسرا نظر نہیں آیا۔"

"دیکھو جی،" میں نے بڑی صلاحیت اور سنجیدگی سے کہا "مجھے زیادہ مکھن تو لگاؤ مت کہ میں کوئی ڈھلوان یا پھسلوان چیز تو ہوں نہیں۔ ہاں میں ایک چٹان ضرور ہوں جو اپنی جگہ سے ذرا مشکل ہی سے ہلتی سرکتی ہے۔"

"مگر میں کوئی کوہکن نہیں ہوں۔ مجھ میں طاقت سے زیادہ محبت ہے لہٰذا میں صرف کام آ سکتا ہوں جو طاقت کو نہیں محبت کو مانتے ہیں کیونکہ طاقت تو جانوروں میں بھی ہوتی ہے مگر محبت شاید محبت کرنے والوں میں ہی ہے۔"

"کیسا کہا، کیسا کہا، محبت، محبت؟ یہ وہی جس کا ذکر کتابوں میں لکھا ہے؟"

"پتہ نہیں میں نے زیادہ کتابیں نہیں پڑھی ہیں۔"

"تو پھر تم محبت کو کس طرح جانتے ہو۔؟"

"سنو۔ محبت مجھے کہیں پڑی ہوئی نہیں ملی۔ نہ کہانی قصوں میں، بلکہ محبت تو خود میرے اندر ہے بالکل اسی طرح جس طرح پھلوں میں رس ہوتا ہے۔ پھولوں میں خوشبو اور رس میں مٹھاس۔"

"بھئی واہ،" میں نے خوش ہو کر کہا "باتیں تم بڑی اچھی کر لیتے ہو۔ باتوں سے تم سب کچھ ہو سکتے ہو۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"میرا۔؟" وہ ہنسا "میرا نام بھی تو محبت ہے لہٰذا امید کرتا ہوں کہ تم پھر مجھے چلتا کر دوگی کیونکہ تمہیں محبت پسند نہیں۔"

"ارے یہ بات نہیں۔" میں نے اس بار ذرا ملائمت سے کہا "محبت مجھے پسند کیوں نہیں۔ میں خود محبت کی چھاؤں میں پڑی ہوئی ہوں لیکن محبت سے ذرا ڈر بھی لگتا ہے۔"

"ڈر۔ ڈر کیوں کس لئے؟"

"تم نہیں جانتے جب محبت کہیں کھو جاتی ہے تو پھر کیسا گہرا سناٹا اور سنسان سونا پن خود میں پھیل جاتا ہے۔ بس اندھیرا ہی اندھیرا۔" وہ اشتیاق سے آگے کو جھکا اور بے چینی سے بولا۔ "تم نے کسی سے محبت کی ہے؟"

"واہ کیوں نہیں۔ اپنی ماں سے باپ سے، بہن بھائیوں، عزیزوں دوستوں، رشتہ داروں سے، سبھی سے تو محبت کی ہے میں نے۔"

"اوہ!" وہ سکون سے سنبھل کر پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"ان کے علاوہ کسی اور سے تو نہیں نا۔؟"

"کسی اور سے محبت کیسے کر سکتی ہوں۔ محبت تو خود بخود پیدا ہوتی ہے اور جہاں کوئی رشتہ نہ ہو وہاں محبت کس طرح مقام پا سکتی ہے۔ بھلا۔"

"کیا محبت خود ایک رشتہ نہیں بن سکتی۔؟"

اب میں ذرا چوکنی ہو گئی۔ کیونکہ میں نے سُن رکھا تھا جہاں دولت ہوتی ہے وہاں نفرت بھی محبت کے بھیس میں آتی اور سب کچھ ٹھگ لے جاتی ہے۔ دشمنی بھی دوستی کے روپ میں آتی اور بہلا پھسلا کر سب کچھ ہتھیا لیتی ہے۔ خود غرضی بھی ایسی معصوم شکل بنا کر نمودار ہوتی ہے کہ بچہ کوئی قسم کھا کر بھی اُسے خود غرضی نہیں ثابت کر سکتا۔ چنانچہ میں نے پھر تلخی سے کہا "رشتے کی بحث چھوڑیئے۔ صاف صاف بتایئے آپ چاہتے کیا ہیں۔"

"میں نے کہا نا۔ آپ کا ساتھ چاہتا ہوں۔"

"میرا ساتھ۔" میں نے جل کر کہا "تاکہ اس طرح آپ میری امارت پر ہاتھ ڈال سکیں۔ خود اپنی جیب گرم کر سکیں۔؟"

"کون کہتا ہے یہ۔"

"کسی کے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا میں خود اتنی سیانی سمجھدار کہ کسی کے کہے بتائے بغیر کچھ نہ سمجھ سکوں۔؟"

"تو پھر آپ اپنی عقل پر رہئیے۔ میں چلا۔"

وہ پھر کہیں گم ہو جانے کے لئے آگے بڑھنے لگا تو میں نے سوچا۔ ذرا اس کا امتحان بھی ہو ہی جائے کہ آزمائش شرط ٹھہری۔ میں نے قدرے ڈرتے ہوئے اور مدھم لہجے میں کہا "سنئے تو۔ مسٹر محبت اگر یہی نام ہے نا آپ کا۔"

"اب کیا سنوں۔ سننے کا [illegible] آپ نے۔"

"میں ایک شرط پر آپ کا ساتھ دے سکتی ہوں۔"

"مجھے آپ کی ہر معقول شرط منظور ہے مگر شرط کافی واہیات چیز ہی ہوتی ہے۔ ہاں؟"

"معقول نامعقول میں نہیں جانتی لیکن اگر آپ کو میری شرط منظور ہو تو . . . ."

"شرط بتائیے۔" وہ دوبارہ تکتے ہوئے بولا۔

"مان لیجئے میں مفلس اور قلاش ہوں۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں پھر؟"

"پھر کیا۔ یہ تو اور بھی خوشی کی بات ہے۔ اور بھی دلچسپی کا باعث۔"

"گویا مفلسی اور قلاشی اعزاز ہیں آپ کے پاس؟"

"ہاں ایسا آدمی ہی ہمدرد ہوتا ہے چین کی نیند سو سکتا ہے اور سکھ کی بنسری بجا سکتا ہے۔"

"معاف کیجئے مسٹر یہ گویوں کی بستی نہیں۔ یہاں سب شریف انسان رہتے ہیں۔ سمجھے؟"

"شریف کا مطلب سمجھتی ہیں آپ۔؟" اس نے گھور کر میری طرف دیکھا

"کیوں نہیں" میں نے مستحکم عزم سے کہا۔ "جو کھاتے پیتے شاد آباد ہوں۔"

"بس۔؟" وہ تمسخر سے ہنسا

"اور کیا؟" میں نے ہنوز تن کر کہا

"گویا کھانا پینا، پہننا ہی شادی اور آبادی ہے۔"

"اُف" میں نے سر تھام کر کہا۔ "ذرا سوچئے تو جس کے پاس کھانے پینے پہننے کو نہ ہو وہ اوروں کے کھانے پہننے کو تاکے گا یا نہیں۔ اور تاکنے والا بھوکا ہو تو ہو شریف نہیں ہو سکتا۔"

"خوب لاجک ہے۔ اور بھوک صرف پیٹ میں لگتی ہے آپ کو؟"

میں ہنسی "گویا کہیں اور بھی لگ سکتی ہے۔"

"یہی تو رونا ہے عقلمند صاحبہ کہ آپ دل کی، دماغ کی بھوک کو جانتی ہی نہیں، صرف پیٹ کی بھوک کو پہچانتی ہیں۔"

"کیا کہا۔ کیا کہا۔؟ دل اور دماغ کی بھوک۔؟ پاگل تو نہیں ہو۔ ہے ہیں آپ؟ پاگل خانہ جائیے سیدھے۔"

"اچھا میں چلا۔"

جب وہ دو تین قدم بڑھ گیا تو مجھ میں عجیب کھلبلی مچ گئی۔ میں نے فوراً بے ساختگی سے کہا۔ "مگر سنئے تو۔ دل اور دماغ کی بھوک کیسی ہوتی ہے ذرا بتاتے تو جائیے!"

"یہ بتائی نہیں جا سکتی۔ یہ تو صرف محسوس ہو سکتی ہے مگر افسوس آپ کے پاس کوئی حس ہی نہیں۔"

"آپ کے پاس ہے؟"

"کیا کیجئے گا پوچھ کر۔ یہ آپ کے کام شاید نہ آ سکے۔

"اجی واہ۔ میں نے آپ جیسا انوکھا آدمی آج تک نہیں دیکھا۔ جتنے آئے سبھوں نے یہی پوچھا کتنی جائیداد ہے۔ کتنا کاروبار ہے۔ کتنا نقصان یا فائدہ ہے مگر آپ عجیب ہیں جو فقط حس کی بات کرتے ہیں۔"

"اوروں کی بات مجھ سے نہ کیجئے۔ مجھ سے فقط میری بات کیجئے۔"

"اور وہ بات اتنی ہی ہے کہ اگر آپ میری دولت کے بغیر مجھے لے چلیں تب میں جاؤں۔"

"چلئے۔ فوراً چلئے، ابھی اسی وقت۔"

"اجی یوں نہیں جناب۔ اٹھائی گیروں کی طرح۔ باقاعدہ میرے لوگوں سے مانگ کر مجھے لے جائیے۔"

"میں سوچتا ہوں آپ میرے ساتھ خوش نہیں رہ سکیں گی۔"

"کیوں۔؟"

"کیونکہ میرے پاس دولت جو نہیں۔"

"اب آئے نا راستے پر۔"

"نہیں! میں تو راستہ چھوڑ رہا ہوں۔"

"کیا مطلب۔؟"

"میں اب کبھی ادھر نہ آنے کے لئے جا رہا ہوں۔"

"ہائے۔" میں نے کسی قدر افسوس سے کہا۔ "مجھے بہت دکھ ہوگا، کیونکہ آپ یاد تو بہت آئیں گے۔ باتیں اتنی اچھی کرتے ہیں کہ جی چاہتا ہے سنتے ہی رہو۔"

"مگر باتوں سے پیٹ تو نہیں بھر سکتا اور دماغ آپ کے پاس کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا مگر . . . ."

"اب اگر مگر چھوڑیئے مجھے خدا حافظ کہئے۔"

"نہیں نہیں ذرا رکئے اگر آپ پیٹ بھر روٹی کھلانے کا وعدہ کریں تو میں ضرور آپ کے پاس رہ سکتی ہوں۔ غضب کے دلچسپ ہیں آپ مگر مجھے فاقوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"سنئے جی۔ میں تو بس روکھی سوکھی کھاتا ہوں۔ ملائی، مرغن نہیں اگر آپ روکھی سوکھی کھانے کو تیار ہوں تو بے شک بندہ حاضر ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ملائی، مرغن کا انتظام خود کر لوں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"تو بات پکی ہے یا کوئی اور شرط بھی ہے آپ کی۔؟"

"فی الحال تو بس یہی اہم شرط تھی جو آپ نے قبول کر لی کہ روٹی میں نہیں کھلاؤں گی آپ کو بلکہ آپ مجھے کھلائیں گے۔"

"ملائیے ہاتھ" اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا تو مجھے اپنا نسوانی

باتھ بھی اس کی ملائمت کے مقابلے میں زیادہ سخت. اور کھردرا محسوس ہوا مگر معاہدہ طے ہو گیا اور چند باجے بجنے کے بعد ہم دونوں ساتھ ساتھ رہنے لگے.

مجھے محبت سے دلچسپی سی ہو گئی تھی مگر اپنا گھمنڈ بھی ساتھ تھا کہ جب بھی پیٹ بھر روٹی نہ ملے. محبت کو چھوڑ کر آرام سے اپنے گھر بیٹھ کر اپنا پیسہ کھاؤں گی، لیکن سچ پوچھئے تو کوئی دن ایسا نہ آیا جب محبت نے مجھے بہترین غذا نہ کھلائی ہو. میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اتنا سب کچھ اس کے پاس آیا کہاں سے. جبکہ وہ تو خود کو بے بس اور بے چارا بتلاتا تھا صرف روکھی سوکھی کھا کر گزارنے والا کیونکہ مجھے تو صرف پیٹ بھرنے سے مطلب تھا لہٰذا میں رفتہ رفتہ محبت کی جانب سے مطمئن ہونے لگی اور کچھ ہی دنوں میں محبت کے ساتھ رہ کر پھر رنگ اور روپ بن گئی.

مجھے اپنے پیسے پر ناز بہت تھا مگر ان دنوں جب میں محبت سے نہیں ملی تھی یہ اکیلا ناز ہی میری متاع تھا لیکن محبت سے ملنے کے بعد دھیرے دھیرے مجھے محسوس ہونے لگا کہ پیسہ ہی سب کچھ نہیں. محبت پیسے سے بھی بڑی چیز ہے. شادابی اور نکھار عطا کرنے والی، تب میں بتدریج پیسے کے غرور کو بھولنے لگی. اور ایک دن محبت سے بولی.

" اب میں اعتماد اور فخر کے معنی سمجھ گئی ہوں مجھے تم پر پورا اعتبار ہے. بنک جا کر میرا تمام پیسہ نکال لاؤ."

" کس لئے." محبت نے روکھائی سے پوچھا

" تاکہ تم ہم مل کر اسے اور بھی خرچ کر سکیں."

" کوئی ضرورت نہیں." محبت نے کہا کیا تمہیں کسی چیز کی کمی ہے یہاں."

" کمی تو کوئی نہیں لیکن . . . "

" پھر. جب ایسی ضرورت ہوگی دیکھا جائے گا. ابھی اپنا پیسہ بنک ہی میں پڑا رہنے دو."

میں چپ ہو گئی اور دن بڑی رعنائی کے ساتھ گزرنے لگے. راتیں عجب سہانے پن کے ساتھ گویا زندگی گلزار ہو چکی ہو. فکر تو مجھے پہلے بھی کوئی نہیں تھی مگر ماں باپ کے کھو جانے کے بعد جو ایک خلا سا مجھ میں پیدا ہو گیا تھا مجھے بھاتا نا ماند کرتا جا رہا تھا وہ محبت کے ساتھ سے یک لخت غائب ہو گیا اور اس کی جگہ جانے کیا کیا آ گیا.

میں نے پھر جی بھر کر ہنسنا مسکرانا ٹھٹھے لگانا شروع کیا اور ایک دن محبت سے بولی." تم واقعی بڑے عقلمند ہو. ہر چیز سے فوراً متاثر نہیں ہو جاتے مگر یہ تو بتاؤ میں تمہیں بہار اور کائنات کیسے لگی جبکہ ان دنوں تو میں بالکل اندھیرا اور ملال بنی ہوئی تھی؟"

" مجھے تم میں اندھیرا اور ملال نظر نہیں آیا. مجھے تو لگا تم ایسا اجالا ہو جو کبھی بجھ نہیں سکتا."

" اچھا." میں نے آنکھیں پھاڑ کر کہا " جب تم شعر و شاعری کی باتیں [illegible] کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ فقط شاعری کر رہے ہو مگر اب مجھے اصلی پتہ چل [illegible] گیا ہے کہ تم شاعر نہیں ہو، مصور نہیں ہو مگر تم کوئی ایسی [illegible] چیز ضرور ہو جس کی گرفت کبھی ڈھیلی اور کمزور نہیں پڑتی."

ہم دونوں باہنوں میں باہیں ڈالے آگے بڑھتے رہے.

میں نے اس زمانے میں اپنی پسند کے بہترین لباس پہنے اور اپنے تمام شوق پورے کئے. خوب گھومی پھری. جو جو چیز پسند آئی سب لا لا کر اپنے پاس جمع کرتی گئی. کوئی چیز ایسی نہ رہی جو میرے شوق سے بچ گئی ہو. تب میں نے محبت سے کہا." تم بڑے ہوشیار ہو. بنتے تو اس طرح تھے جیسے تمہارے پاس کچھ بھی نہیں. سچ سچ بتاؤ مجھے احمق بنا کر تمہیں کیا ملا؟"

" میرے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا مگر جب تم مجھے مل گئیں تو پھر ایسی طاقت اور امنگ مجھے ملی کہ میں خود بھی امیر ہوتا گیا. میرے پاس ہر چیز تمہارے قدم سے آئی جیسے تمہارے لئے ہی آئی ہو."

" غلط مت کہو. بتاؤ تمہارا بنک بیلنس کتنا ہے."

" ایک کوڑی بھی نہیں."

" پھر یہ سب کس طرح میرے لئے فراہم کرتے ہو.؟"

" محنت کے بل بوتے پر."

" کیسی محنت ؟"

" ملازم جو ہوں."

" مگر لوگ تو کہتے ہیں ملازم بہت معمولی آدمی ہوتے ہیں!"

" تو ہم کون سے غیر معمولی ہیں."

" دھت. اب ایسا مت کہو. تم تو اتنے اچھے ہو. اتنے اچھے جتنا اس دنیا میں اور کوئی انسان نہ ہوگا."

" اور یہ محض اس لئے کہ تم حاصل ہو گئیں."

" ورنہ ؟"

" ورنہ پتہ نہیں میں کیا ہوتا شاید یہاں وہاں بھٹکتا ہی رہتا."

" تم مجھے بہت چاہتے ہو نا؟"

" ٹھیک ہے نہیں.؟"

" اور سدا یوں ہی چاہو گے بھی.؟"

" ہمیشہ ہمیشہ اپنی موت تک."

" شش موت کا ذکر مت کرو. مجھے ڈر لگتا ہے."

" مگر مرنا تو سب کو ایک دن ہے ہی."

" تو پہلے میں مروں گی."

"میں تمہیں مرنے دوں تب نا۔"

"تو کیا تم مجھے ہمیشہ زندہ اور محفوظ رکھو گے۔؟"

"ہاں ۔"

"کیسے، کس طرح ۔؟"

"موت کو یہ بتا کر کہ میں تمہیں کتنا پیار کرتا ہوں لہٰذا وہ جب بھی آئے پہلے میرے پاس آئے۔"

"خدا کے لئے اب ایسی باتیں مت کرو۔ میں نے جب تک تمہیں نہ پہچانا تھا میں کوئی دعا نہیں مانگا کرتی تھی مگر جب سے پہچان لیا ہے میرا دل کہتا ہے خود مر جانا مگر تمہارے بغیر زندہ نہ رہنا۔"

"شکریہ۔ مگر تمہیں تو اپنی زندگی بہت پیاری تھی سب سے زیادہ۔"

"ہاں کبھی تھی۔ مگر اب تم سے بڑھ کر نہیں۔"

"سچ کہہ رہی ہو۔؟"

"ہاں ۔"

"گویا اب تم بھی مجھے اتنا ہی چاہنے لگی ہو جتنا تمہیں میں۔؟"

"کتنا۔ تم اندازہ بھی نہیں کر سکو گے کبھی۔"

"مگر میں ہمیشہ ڈرتا رہتا ہوں کہ پتہ نہیں کہ تمہارا دل کب مجھ غریب سے پھر جائے۔"

"ہٹو، ایسا کیوں سوچتے ہو۔"

"کیونکہ میرا کوئی بنک بیلنس جو نہیں۔"

"تھو۔ جیسے بنک بیلنس ہونا ضروری ہی ہے۔"

"مگر تمہارا تو ہے پھر۔؟"

"اس سے اب مجھے مطلب نہیں۔ تم جو چاہے کر لو۔ میں نے اُسے تمہیں دے دیا۔"

"مجھے نہیں چاہئے۔ بیٹی تو یہ سمجھ کر اُسے محفوظ رکھا ہوا ہے کہ اگر کبھی مجھے کچھ ہو جائے تو میرے پیچھے تمہیں پریشان نہ ہونا پڑے۔"

"اب ایسی خوفناک باتیں منہ سے نہ نکالو۔ میں ہمیشہ تمہارے لئے دعائیں کرتی رہتی ہوں۔"

"مگر میں اب تک تم سے خوفزدہ ہوں تم دراصل اتنی اچھی ہو کہ یہ ڈر برابر لگا رہتا ہے کہ تمہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے۔"

"بناؤ مت۔ ویسے نظر تو سب ہمیں لگاتے ہی رہتے ہیں۔ کون ہے جو یہ کہنے سے بچ گیا ہو کہ ہماری جوڑی کتنی مثالی جوڑی ہے۔"

"ہاں ہے تو۔"

"مگر سچ کہو۔ میرے علاوہ تمہیں کبھی کچھ اور تو نہیں چاہئے نا۔؟"

"کبھی کچھ نہیں۔"

"اور اگر کبھی ضرورت پڑ گئی تو۔؟"

"پگلی نہ بنو۔ دنیا میں اب کوئی ایسی چیز نہیں جو تم سے اہم ہو۔"

اور یہ سن کر میں اطلس و کمخواب بھول گئی۔ اپنے تمام شوق بھول گئی، اپنی بھوک تک بھول گئی۔ میں سراسر محبت بن گئی جیسے میں بہت ہلکی پھلکی ہو کر کسی اونچی سطح کی طرف اُٹھ رہی ہوں۔ جیسے میں روشنی ہی روشنی بن گئی ہوں۔ خوشبو ہی خوشبو۔ مجھے اپنا آپ بڑا لطیف محسوس ہونے لگا اور تب میری سمجھ میں آیا کہ انسان کے سارے جسم میں صرف پیٹ ہی پیٹ نہیں، ہاتھ پاؤں آنکھ ناک کان بھی اہم ہیں۔ دل و دماغ بھی جو سب سے ناگزیر ہیں۔ جو دراصل انسان کی پہچان اور مشغولی ہیں۔

اور اس احساس کے قریب پہنچ کر میں نے بہت کچھ جانا۔ میں آرام و عشرت سے سادگی اور بے نیازی کی طرف بڑھتی گئی۔ سادگی جو سچا حسن ہے جو کشش میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا اور جب میں اقرار شوخ وجود سے بردبار اور سنجیدہ ہستی بنی تو دنیا مجھے واقعی بڑی گمبھیر نظر آئی۔ گمبھیر اور لا محدود۔ سارے حقیقی جذبے ایک کے بعد ایک آکر میرے سامنے ٹھہرے اور اپنی صحیح شناخت کروانے لگے تمام رشتے محبت کے سامنے ہیچ اور حقیر محسوس ہوئے۔ پھر ایسے عہد و پیمان بھی جو ہم نے نہ کئے تھے۔ ہمارے اندر جگہ پانے اور سجنے سنورنے لگے۔ جیسے ہم لازم و ملزوم تھے اور ہمارے بغیر حیات و کائنات کا خود کوئی تصور نہ تھا۔

اسی طرح کئی سال محض چند دنوں ہی کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئے۔ جب ہم مضبوط درختوں کی طرح اپنی اپنی جگہ خوب گھنے ہو گئے۔ تب اچانک ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک لڑکی آئی اور محبت سے بولی۔ "سنا ہے تم بہت گھمنڈی ہو مگر تم کو کس بات پر گھمنڈ ہے آخر۔"

'محبت' نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ "خود اپنے آپ پر۔ مگر تم کون ہوتی ہو پوچھنے والی۔"

وہ لڑکی سکون سے مسکرائی پھر بولی۔ "میں گھمنڈی انسانوں کو چیلنج کرتی ہوں اور اگر میں تمہیں بھی توڑ دوں تو۔ کیا تم میں شرط باندھنے کی ہمت ہے۔"

"ہاہاہا" محبت نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "مجھے کوئی توڑ نہیں سکتا۔ میں اب ناقابلِ شکن، ناقابلِ شکست ہوں۔"

"تو میرا چیلنج قبول کرو۔"

"میں اس کا پابند تو نہیں مگر محض تمہیں شکست دینے کے لئے بے شک میں قبول کرتا ہوں۔"

"بعد میں پچھتاؤ گے تو نہیں۔؟"

"کبھی نہیں۔ میں نے پچھتانا آج تک نہیں جانا۔"

"تو اب جان لو گے۔"

"کوشش کر دیکھو۔"

"معاہدہ کرو۔" لڑکی بولی۔

"کیسا معاہدہ؟"

"کہ اگر تم ہار گئے تو میرے ہو جاؤ گے۔"

"نہیں نہیں۔" میں چلائی: "معاہدہ مت کرو۔ معاہدہ مت کرو۔"

'محبت' نے خفگی سے میری جانب دیکھا: "خود کو یوں چھوٹا مت ثابت کرو۔ بزدل مت بنو۔" وہ بولا: "تم لاجواب ہو۔ تمہارا جواب نہیں پیدا ہو سکتا۔ تمہارے بعد اب کوئی کشش مجھے اپنی جانب نہیں کھینچ سکتی۔ تم مطمئن رہو اور تماشہ دیکھو۔"

"پھر بھی۔ پھر بھی۔۔۔" میں نے لرز کر کہنا چاہا مگر محبت کی خفگی کے خیال سے خاموش رہ گئی۔

"تم میں ہے کیا۔" تب محبت نے تضحیک سے اس لڑکی سے کہا: "حسن نہیں، شباب نہیں، عقل و فہم نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم آخر چیلنج کس امید پر کر رہی ہو۔"

"صبر کرو۔ سمجھ جاؤ گے۔"

"سنو۔" محبت نے کہا: "میں نے حسن کو سر تا قدم دیکھا ہے۔ شباب کو شہد کی طرح جی بھر کر پی ڈالا ہے۔ عقل و فہم سے قریب تر رہا ہوں۔ اب آخر وہ کون سی کشش ہے جو مجھ کو اپنی طرف کھینچ لے۔ مانا کہ دنیا میں بہت کچھ ہے مگر میں وہ خوش نصیب ہوں جس نے صرف اپنی تمنا میں کائنات کے تمام جلوے دیکھے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم جیسی لڑکیاں تمنا یا کائنات نہیں بن سکتیں۔"

اور یہ سنکر وہ لڑکی پھر اپنی مخصوص طمانیت سے مسکرائی۔

"پہلے معاہدہ کرو کہ مُکر نہ جاؤ گے۔"

"اگر میری زبان کافی نہیں تو مجھ سے جو چاہو لکھوا لو۔"

"تو پھر لکھو کہ اگر میں ہار گیا تو ہر طرح سے ہرانے والی کا تابع ہو جاؤں گا۔۔۔"

"بے شک میں لکھتا ہوں۔"

اور 'محبت' نے لکھا۔

"میں جو ایک معزز اور شریف آدمی ہوں اقرار کرتا ہوں کہ اگر میں اپنی شرط ہار گیا، اپنی جگہ سے ہٹا لیا گیا، تو اپنا سب کچھ فاتح کو بلا تامل دے دوں گا۔ میں اس کا ہمیشہ تابع رہوں گا۔"

اور 'محبت' نے اس تحریر پر اپنے دستخط کر دیے۔

اس معاہدے کو اپنے قبضے میں کرکے لڑکی بولی: "میں جلد ہی آؤں گی تب تک میرا انتظار کرو۔" اور چلی گئی۔

"محبت، محبت!!" میں نے اس کے جانے کے بعد کہا: "یہ تم نے کیا کیا۔ تم نے معاہدہ کیوں کر لیا۔ کیا اب تم اس کے پابند نہیں ہو گئے ہو۔؟"

"پگلی۔ میں محبت ہوں۔ میں اپنے اور تمہارے سوا کبھی کسی اور کا پابند نہیں ہو سکتا مگر چونکہ یہ زندگی کا ایک بہت نیا اور انوکھا کھیل ہے لہٰذا مجھے مت روکو، منع نہ کرو مجھے ایسے ہی کھیلنے دو۔ تم دیکھ لینا میں اسے ہرا دوں گا اور تب تم مجھ پر اور بھی فخر و غرور کروگی۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔ ایسا ہی۔" میں نے سوچا اور آنے والی عجیب اور ناپسندیدہ ساعتوں کا انتظار کرنے لگی۔

پہلے میں کسی چیز کا تجزیہ کرنا نہیں جانتی تھی۔ مگر محبت کی رفاقت نے مجھے ایک نیا زاویۂ نگاہ اور انداز فکر دیا تھا جس نے مجھے ہر چیز کو دیکھنا پرکھنا سکھا دیا تھا لہٰذا میں ایک بے خوف اور ایک استوار ہستی بن چکی تھی۔ جو ڈرنا جھجکنا بھول چکی تھی۔ جو اب سب کو اپنی زد پہ لے سکتی تھی مگر جب اس لڑکی نے محبت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تو مجھے ایک عجیب سا خوف محسوس ہوا تھا جیسے اس لڑکی کی موجودگی نے محبت کو اور خود مجھے کچھ کمزور سا کر دیا ہو۔ میں نے محبت کو اس خطرناک کھیل سے روکنا چاہا مگر محبت کی عظمت اور مضبوطی کو محسوس کرکے پھر میں نے بھی اپنی کمزوری اور خوف پر ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور خود سے بولی۔ میں ایک انسان نہیں، ایک پوری کائنات ہوں۔ میرے مقابل، میرے روبرو، میرے بعد کون ٹھہر سکتا ہے بھلا۔ محبت نے مجھے ایک مکمل جہان بنا دیا ہے۔ میرا مقابلہ کون کر سکتا ہے اب۔ تب پہلی بار میں نے اپنا حسن خود علانیہ محسوس کیا۔ اپنی کشش پر بے پناہ اترائی۔ اپنے گداز بدن، سجیلے خدوخال، غزالی آنکھوں، متناسب جسم، گھنے چمکیلے بالوں، تروتازہ رخساروں اور اس علم و تجربے کو جو زندگی نے مجھے دیا، پورے غرور سے دیکھا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں کوئی کچا رنگ نہیں جو ذرا سی رگڑ سے اتر جائے، پانی سے دھل جائے۔ دھوپ سے ناپید ہو جائے بلکہ میں تو وہ پختہ اور گاڑھا رنگ ہوں جو جسے رنگ دے وہ پھر پھیکا نہیں پڑ سکتا۔ اور اس ادراک کے بعد میں بے حد آرام اور اطمینان محسوس کرنے لگی۔ ہر اندیشہ، کھٹکا، خدشہ مجھے کیڑوں، مکوڑوں اور چیونٹیوں کی طرح لگا جنہیں میں جب چاہوں پیر تلے مسل اور مار سکتی تھی۔ تبھی میری عین بے خوفی کے عالم میں وہ لڑکی پھر نمودار ہوئی اور محبت سے بولی: "آؤ میرے نزدیک آ جاؤ، میری آنکھوں میں دیکھو۔" محبت نے مسکرا کر کہا: "کیوں نہیں" اور میرے قریب سے اٹھ کر اس لڑکی کے قریب بیٹھ گیا اور اس کے پھیکے چہرے پر لگی دو خاموش آنکھوں کو گھورنے لگا۔

پل لمحوں میں بدلے، لمحے منٹوں میں، منٹ گھنٹوں میں۔ محبت پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ایک دن، دو دن، تین دن اسی عمل کے دہرانے میں گزر گئے۔ وہ لڑکی ہر شام آتی اور اپنی مرضی کے مطابق وقت گزار کر چلی جاتی۔ چوتھے دن محبت

نے خود پوچھا: "معاہدے کی میعاد تو تم نے بتائی ہی نہیں۔ تم کب تک مجھے آزمانا چاہتی ہو۔ میں اپنا کچھ وقت تو ضرور دے سکتا ہوں مگر تمام وقت نہیں۔"

"بس یہی پندرہ بیس دن۔" لڑکی بولی۔ "بس اسی مدت میں یا تو میں تمہیں جیت لوں گی یا پھر ہار جاؤں گی۔ ہارنے پر تم جو چاہو میرے ساتھ سلوک کر سکتے ہو۔"

"میں شکست خوردہ لوگوں کے ساتھ بُرا سلوک نہیں کر سکتا۔ ہار جانے پر تم خود اپنے لئے کوئی سزا تجویز کر لینا۔"

"ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا۔"

پھر چوتھا پانچواں دن بھی بخیر و خوبی گزر گیا مگر چھٹے دن میں نے محسوس کیا کہ میرا ساتھی کچھ گھبرا رہا ہے۔

"تجربہ دلچسپ ضرور ہے مگر خطرناک بھی۔" میں نے اُسے احساس دلایا

"مجھ پہ بھروسہ رکھو۔" وہ بولا: "میں شاید کسی لمحے کو برداشت نہ کر سکوں مگر میں یقیناً ہاروں گا نہیں۔"

پھر ساتواں آٹھواں اور نواں دن بھی گزر گیا۔ مجھے 'محبت' کی فتح اور اُس منحوس معاہدے کی تنسیخ کا یقین ہونے لگا تھا کہ ٹھیک دسویں دن 'محبت' نے ایک جھٹکا کھایا اور لڑکھڑا گیا وہ لڑکی کی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے جھکا اور اس نے اپنے کانپتے ہوئے لب لڑکی کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

"'محبت'، 'محبت'۔!!" میں چلائی مگر میری چیخ سے قبل ان دونوں کے لب مل چکے تھے اور وہ دونوں ایک دوسرے میں گھلنے ملنے حل ہونے لگے تھے میں یہ منظر برداشت نہ کر سکی اور اپنی آنکھیں ڈھک لیں۔ لڑکی کے چلے جانے کے بعد 'محبت' نے کچھ شرمندگی مگر ایک طرح کی اکڑ سے کہا۔ "ٹھیک ہے بوسہ میری شکست نہیں، اس بوسے میں مٹھاس نہیں تلخی اور تندی ہے۔ یہ بوسہ مجھے خود میں جذب نہیں کر سکتا۔ گم نہیں کر سکتا، گھبراؤ نہیں۔"

"'محبت'۔۔۔؟" میں نے کانپ کر کہا

"بے فکر رہو۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "میں نے اتنی دیر تک وہ ہونٹ چکھے ہیں پھر بھی مجھے ان کی طلب تک نہیں خطرناک تو دراصل طلب ہوتی ہے اور معاہدہ ختم ہونے میں اب مدت ہی کتنی ہے۔ مزید پانچ دس دن۔ اگر اسی حساب سے پانچ دس بوسے اور بھی رکھ لئے جائیں تب بھی کیا ہو سکتا ہے، میرا تمہارا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ میری تسخیر ممکن نہیں۔"

مگر میں اس رات بالکل نہ سو سکی۔ صبح تک جاگتی رہی اور بعد کے متواتر پانچ دس دن بھی صرف بوس و کنار میں ختم ہو گئے مگر ہر نئے دن کے ساتھ بوس و کنار کا وقفہ کچھ نہ کچھ بڑھتا رہا اور بیسویں دن آخری بوسہ لے کر اُس لڑکی نے کہا: "آج معاہدہ ختم، لیکن کل میں پھر آؤں گی۔ اگر کل تم مجھ سے الگ رہ گئے، تو جیت تمہاری ہوئی ورنہ۔۔۔" اس نے ایک مترنم سا قہقہہ لگایا اور ہونٹ پونچھتی ہوئی لوٹ گئی۔

"تم کیسا محسوس کر رہے ہو۔ کیسا۔؟" میں نے بے قراری سے 'محبت' سے پوچھا۔

"ہلکی سی غنودگی اور خود فراموشی۔" 'محبت' نے مخمور لہجے میں کہا

"خود فراموشی۔؟"

"ہاں۔ شاید غنودگی کی وجہ سے مگر دیکھنا کل جب میں اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھوں گا تو بالکل نارمل رہوں گا اور یوں ظاہر ہے کہ جیت میری ہی ہوگی۔"

"ہار۔ جیت۔۔۔" میں نے موہوم انداز میں کہا اور اگلی شام کا انتہائی اضطراب سے انتظار کرنے لگی۔

اضطراب جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔

اُس شام 'محبت' نے پیار سے میری طرف دیکھا اور اپنی ازلی مضبوطی سے کہا۔ "اُسے سزا دینے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

تذبذب کے باوجود میں نے 'محبت' کو سمجھایا۔ "ہارنا مت۔"

"میں 'محبت' ہوں، بزدل یا ہوس پرست نہیں۔" 'محبت' نے اپنے مخصوص غرور سے کہا۔

اور اکیسویں شام جب لڑکی آئی تو وہ یوں اٹھ کر اس کے قریب گیا جیسے تلوار اپنے دشمن کی طرف جاتی ہے وہ حسب معاہدہ اس کے پاس بیٹھ گیا اور اُسے گھورنے لگا۔

"نہیں، آج مجھے دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بس میرے قریب بیٹھے رہو اور جب وقت ہو جائے تو مجھے بغیر چھوئے اُٹھ جانا۔" لڑکی بولی۔

"ٹھیک ہے۔" 'محبت' نے کہا: "یوں ہی ہوگا۔" لیکن جیسے جیسے وقت گزرنے لگا 'محبت' میں اپنے آپ ایک ہیجان پیدا ہونے لگا۔ لیکن لڑکی اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ بے فکر انداز میں کمرے کا جائزہ لے رہی تھی کہ کچھ ہی دیر میں 'محبت' نے بے قرار ہو کر کہا: "اِدھر دیکھو، میری طرف، میری طرف۔"

لڑکی نے پھر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور کمرے کی دوسری سمت جانے لگی۔ 'محبت' نے اُسے جاتے دیکھا تو یکایک گھبرا کر کہا: "کہاں جا رہی ہو۔ رکو۔"

لڑکی کچھ نہ بولی۔ زیر لب مسکراتی ہوئی آگے بڑھتی رہی تب 'محبت' نے اپنی جگہ سے ایک جست بھری اور خود لڑکی پر جا پڑا۔ بڑی بے اختیاری اور بے بسی سے اس نے اپنے لب بڑھائے اور پوری طلب اور چاہ سے لڑکی کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ لڑکی اپنی جگہ رک گئی۔ اس نے خود کو نہیں چھڑایا بلکہ تب وہ 'محبت' سے اور لپٹ گئی۔ میں نے ایک گھٹی گھٹی ہچکی لی تو 'محبت' نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔

"ٹھہرو۔" تب لڑکی نے جرنیلی انداز میں کہا کہ "تم ہار چکے ہو۔ اب تم میرے ہو کسی اور کے نہیں۔"

میں زور سے رونے لگی۔
لڑکی شان اور تحکم سے بولی "میرا نام نشہ ہے۔ اب بتاؤ میں حسن و شباب، عقل، گھمنڈ اور کائنات پر حاوی اور غالب ہوں کہ نہیں۔"
"ہاں ہاں۔" 'محبت' نے دیوانوں کی طرح جھوم کر کہا "تم سب کچھ ہو، سب کچھ، سب پر حاوی۔ اب مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ کہیں مت جاؤ۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"
"'محبت'۔ ۔ ۔ !" میں اپنی تمام طاقت سے چلائی۔
"جانے کیوں، کس طرح۔" 'محبت' نے ہکلا کر اجنبی انداز میں کہا۔
"ان ہونٹوں کے سامنے اب سب کچھ ہیچ اور پھیکا پھیکا سا لگتا ہے۔ تمہارے ہونٹوں کی مٹھاس اور ذائقہ تک ناپسندیدہ۔" اور مجھ سے اتنا کہہ کر وہ پھر اس لڑکی کے ہونٹوں پر جھک گیا اور رہ رہ کر بے تحاشہ انہیں چومنے لگا۔ جانے کب تک وہ ایک دوسرے سے پیوست رہے۔ میں بھاگ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اکیلے کمرے میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور روتے روتے مجھے پتہ بھی نہ چلا کب اگلی صبح ہو گئی۔
صبح وہ لڑکی چلی گئی۔
'محبت' بھی اپنے کام پر چلا گیا مگر اُس شام وہ دونوں ایک ساتھ گھر میں داخل ہوئے اور ہوش کے لمحوں میں 'محبت' نے مجھ سے کہا "اتفاق کی بات ہے کہ میں ہار گیا۔ یہ لڑکی بہت طاقتور ہے۔ تجھ سے بھی طاقتور۔ دیکھنے میں کشش سے خالی مگر دراصل ازحد پُرکشش۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ رکھ لیں گے۔ میں تمہیں چھوڑوں گا تھوڑا ہی —"
اور 'محبت' کی اس بات کو سُن کر میں آنکھیں پھاڑے خلاؤں میں گھورتی رہ گئی۔
اس واقعے کے بعد زندگی میرے لئے ایک مستقل حادثہ بن گئی۔ مجھے یاد نہیں میں نے کتنے آنسو بہائے، کتنی آہیں بھریں۔ کتنے نالے بلند کئے مگر اپنے آنسوؤں کے سمندر میں اکیلی ہی ڈوبتی رہی۔ اپنی آہوں کے شعلوں میں مجھے ہی بھونتے رہے۔ میرے وجود کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے نالے صرف مجھے ہی کھوکھلا کرتے رہے۔ 'محبت' پر ان کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ہر نئے دن کے ساتھ وہ مجھے بھولتا گیا اور اُس لڑکی سے قریب ہوتا گیا۔ وہ لڑکی ہمیشہ میری حالت میرے آنسوؤں پر ہنستی رہی حتیٰ کہ برسوں کے شوق و محنت سے جمایا ہوا میرا سارا گھر اس کی تحویل میں چلا گیا۔ میری ہر پسندیدہ چیز، میرے زیورات، میرا تمام بنک بیلنس۔
میں نے گڑگڑا کر بار بار 'محبت' سے کہا۔
"وہ سب دے دو۔ اُسے سب دیدو مگر خود کو بچالو۔ خود کو میرے لئے محفوظ رکھ لو۔ میں تمہاری کائنات، تمہاری بہار ہوں۔ تم میرے بغیر زندگی نہ گزار سکو گے۔ مجھے مت بھولو 'محبت'۔" مگر اُس لڑکی کے ساتھ ہنس کر 'محبت' نے بھی پھر اجنبیت سے مجھے دیکھا اور کہا "گیٹ آؤٹ ۔ ۔ ۔"
تب 'محبت' کے ہاتھوں تراشی ہوئی میں ٹوٹ پھوٹ گئی، چکنا چور ہو گئی۔
اب لوگ کہتے ہیں میں ایک المیہ۔ ایک سانحہ ہوں اور دنیا کو میری نہیں طرب کی ضرورت ہے شاید ایسا ہی ہو مگر مایوسی غم اور اندھیرے میں بھی۔ درد و کرب میں بھی میں برابر پکارے جا رہی ہوں۔ "'محبت'! 'محبت'! 'محبت'"!!!
کیا میری آواز ایک دھوکا ہے یا 'محبت' صرف ایک نقطہ۔ ایک کہانی۔ ایک داستان؟
کوئی تو بتائے 'محبت' کہاں ہے، کیا ہے۔؟؟

بقیہ: ہریا

گی۔ ایک بڑے مزے کی بات ہے؟"
"تم میرے ساتھ چلو گی — ابھی —؟" خوشی کے مارے اس مرد کا چہرہ کھل اٹھا۔
"اور کسی نے پوچھ لیا کہ تم میرے ساتھ کیوں جا رہی ہو تو —؟"
"میں کہوں گی — تم — تم میرے —"
اور پھر وہ دونوں ہنس پڑے
جدھر اسٹیشن آیا تھا۔ اس کی دوسری جانب سے اس آدمی نے بکسا اتارا، پھر ہریا کا ہاتھ پکڑ کے اپنی طرف کھینچ لیا — کھیتوں کی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے اس آدمی نے پوچھا۔
"سچی بتاؤ — تم کس کی دلہن ہو — اتنے زیور کپڑے پہن کر تم کس کے لئے سجی تھیں؟"
"بھگوان کی سوگند —" ہریا نے اس کے سینے پر سر رکھ کر کہا "صرف تیرے لئے —" اور بکسے کا بوجھ پھر اپنے سر پر رکھ لیا۔

غزلیں

مظفر حنفی

اگر ہے نامۂ اعمال داغ دار مرا
تو یہ سمجھ کہ مکمل نہ ہے شاہ کار مرا

نہ جانے کون سی منزل یہ آگہی کی ہے
کہ میرے سر سے اُترتا نہیں خمار مرا

زبان گنگ ہے، بالفرض کچھ کہوں بھی تو
کسی کو مجھ سے عقیدت نہ اعتبار مرا

نہ مقدرت کہ سدا روشنی رکھوں گھر میں
نہ اپنے سائے پہ چلتا ہے اختیار مرا

جو آکے دشت میں دیکھا تو دشت غائب ہے
وہ میرے گھر پہ نہ کرتا ہو انتظار مرا

مجھے نہ چھیڑ کہ خاکسترِ تمنّا ہوں
اُڑا تو بیٹھنے والا نہیں غبار مرا

زمیں پاؤں تلے سے کھسک رہی ہے تو کیا
ابھی خلاء پہ تسلّط ہے برقرار مرا

درایں حصارِ بدن میری ذات ہے محصور
کوئی بچائے مجھے توڑ دے حصار مرا

یہی بہت ہے سیاق و سباق سے ہٹ کر
کہ لوگ نام تو لیتے ہیں بار بار مرا

حُسن سراپا شر آمادہ
دل بے چارہ سیدھا سادہ

اُن کا پیماں، توبۂ رنداں
اُن کا وعدہ، حشر کا وعدہ

عشق کی وسعت، کیا بتلائیں
عشق ہی منزل، عشق ہی جادہ

میخانے کی رونق ہم سے
ہم سے وقعتِ جام و بادہ

کتنے رہزن گھوم رہے ہیں
اوڑھے ہوئے رہبر کا لبادہ

دل کی نگری لوٹنے والو
بتلاؤ اب کیا ہے ارادہ

قطعہ

منزل منزل، شوق کی مستی
عزم کا پرتو، جادہ جادہ

اب تو کمندِ عزم کی زد پر
آئی خلائے دُور افتادہ

وحشتِ شوق نے ڈھونڈ لیا ہے
اپنے لئے میدانِ کشادہ

دامنِ یزداں دُور نہیں ہے
دستِ جنوں بڑھ اور زیادہ

ناز ہے ہم کو حسبِ منشار
چاند پہ پہنچا آدم زادہ

محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا

حمید الدین محمود

اپنی کھوج (۱)

ڈرامہ، فلم، نشریات، ٹیلی ویژن اور قبائلی فنون کے پچیس سال

آزادی سے پہلے نجات کا تصور ہمارے تخلیقی فنون میں تحریک کا کام کرتا رہا۔ جن جن ذرائع سے قومی جد و جہد اور مطمحِ نظر کو پیش کیا جا سکتا تھا ان کا استعمال کیا گیا۔ چنانچہ شاعری نے سیاست کو "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ دیا تو فلموں میں اس کی گونج اس گانے میں سُنی گئی۔ تھا

"دُور ہٹو اے دنیا والو، ہندستان ہمارا ہے"

مصوری نے امرتا شیرگل کے خاکوں میں ہندوستان کی بے بسی کو پیش کیا۔ تھیٹر نے "بھوکا ہے بنگال" کو احتجاج کا ایک دوسرا عنوان بنا دیا۔ گویا ایک محکوم قوم کے ہاتھ میں جو وسائل تھے وہ سارے کے سارے ایک مقصد کے لئے صرف کر دیئے گئے اور وہ مقصد تھا قومی بیداری کا فروغ۔

جب آزادی آئی اور اس کے جلو میں خون ریزی پھیلی تو سماجی نفسیات میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ آزادی کا خواب، اس کی آرزو اور اس کے لئے معرکہ آرائی کے سبب پیدا ہونے والے جذباتی محرکات قائم نہیں رہے اور نہ رہ سکتے تھے۔ ملک آزاد تھا۔ اگرچہ جہالت، غریبی اور بیماری پھر بھی قومی اثاثہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ فن کار کا حسّاس ذہن ان چیزوں سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکتا تھا اور ایسے وقت جبکہ آزادی کی نئی نئی صبح اور نئی نئی روشنی میں ہر ایک کلی کھلنے کی مشتاق تھی فن کار بجائے ایک نغمہ گو ہونے کے لئے خود ہی ساز اور آواز بن گیا۔ اور مختلف فنون جو پہلے کبھی قومی مقصد کی تبلیغ کا ذریعہ سمجھے اب آلۂ کار بن گئے سیاسی حکمتوں کے لیکن ایسا ہونا اتنا ہی درست تھا جتنا کہ ضروری بھی۔ آزادی کے بعد آزادی سے پیدا شدہ مسائل موٹے طور پر سیاسی و اقتصادی تھے لیکن پس منظر میں سماجی و ثقافتی رنگ و روپ لئے تھے ایک طرف تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا، سر چھپانے کے لئے جگہ، پیٹ بھرنے کے لئے روٹی اور زندگی کاٹنے کے لئے روزگار کے مطالبات تھے تو دوسری طرف فرد کے ارتقاء، اس کی تعمیر اور اس کے لئے معقول فضا پیدا کرنے کے تقاضے تھے۔ تیسری طرف آزادی کو سیاسی ردّ و بدل سے بڑھا کر ایک سماجی، تہذیبی اور تاریخی حقیقت بنانا تھا۔ اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ خیالات کی تشہیر کے ذرائع کو مستحکم کیا جائے اور ان شعبوں میں کام کرنے والوں کے لئے مناسب فضا پیدا کی جائے۔ تاکہ جس طرح آزادی سے قبل ان لوگوں نے ذہنوں کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی تھی۔ اسی طرح اب عوام کو نئے دور کے نئے تقاضوں سے متعارف کروائیں۔ اس بات کو حکومت نے اور خاص کر رہنمائے حکومت یعنی جواہرلال نہرو نے بہت باریکی سے محسوس کیا۔ ایک طرف تو وہ اقتصادی منصوبہ بندی، جمہوریت اور سیکولرزم کے نظریات کو سرکاری حکمتِ عملی کا حصہ بنانے میں لگے رہے اور دوسری طرف ان عزائم کی تکمیل کے لئے سماجی و ثقافتی احیاء کی کوشش بھی شروع کیں کیونکہ تمام تر سیاسی تبدیلیوں کا استحکام، سماجی ذہن اور ثقافتی ماحول کی آسودگی پر منحصر ہے۔ سماجی و ثقافتی انتشار، سیاسی انتشار کا موجب بن سکتا تھا اس لئے جواہرلال نہرو نے ایک طرف سائنسی تعلیم اور سائنسی اندازِ فکر پر زور دیا اور دوسری طرف ایسی کوششیں کرتے رہے جن کے ذریعہ ڈرامہ، فلم، نشریات، ٹیلی ویژن اور قبائلی فنون کو پروان چڑھنے کا موقع مل سکے چنانچہ اقتصادی منصوبہ بندی کے دائرے میں ایسی سکیمیں شروع کی گئیں کہ جہاں تک ان شعبوں میں حکومت کی سرپرستی کا تعلق ہے کوئی بات رہ نہ جائے۔ ہندستانی ڈرامے کے احیاء کے لئے نیشنل اسکول آف ڈراما قائم کیا گیا تاکہ ڈرامے کی باقاعدہ

تربیت دی جاسکے اور ڈرامہ لکھنے اور کرنے والوں کو ایک باعزت وسیلۂ روزگار مل سکے۔ فلم بحیثیت صنعت اور فن کے بہت زیادہ توجہ کا مستحق تھا اور ایسی توجہ جلد یا بدیر دینی ہی پڑی۔ نشریات کو ملک کے گوشے گوشے میں پہونچانے کے لئے نشریاتی سروسوں کی توسیع شروع کی گئی۔ ویسے ہی ٹیلی ویژن کی بالآخر ابتدا کردی گئی۔ قبائلی فنون کے ذریعے جن میں صحیح ہندوستانی ورثے کی حفاظت ہوسکی تھی نہ صرف دور افتادہ قبیلوں کی جغرافیائی مجبوریوں کا خاتمہ ہوا بلکہ انہیں قومی روایات کا ایک جاندار حصہ بننے کا موقع ملا اور ان میں شہریت کے جراثیم سرایت کر گئے گویا گزشتہ ۲۵ برس کے اندر جو کچھ واقع ہوا ہے وہ ان مذکورہ فنون کو نئی زندگی دینے کی کوششوں کی ایک کہانی ہے۔ ان کوششوں کا ان فنون پر اور ان کی نشوونما پر کیا اثر پڑا یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہیں۔

ڈرامہ ہندوستان کی پرانی روایات میں سے ہے بلکہ فن ڈرامہ کے تخلیقی اصولوں کو ایک مکمل فلسفے کی صورت میں ہزاروں سال پہلے بھارت ہی میں پیش کیا گیا۔ سنسکرت میں اسٹیج ایک زندہ تحریک ہے جس کے ذریعے ہمارے کلچر کا صحیح روپ ابھرتا ہے۔ جب کلاسیکی ڈرامہ پیش منظر سے ہٹ گیا تو دیہاتی کھیل نے اس کی جگہ لی۔ رام لیلا، کرشن لیلا وغیرہ کی شکل میں وہ ملک بھر کے دیہاتوں میں صدیوں پرانے گیتوں اور قصوں کو جیتا رکھ سکا۔ جب مغربی طرز کی شہری زندگی آئی تو اس کے اثر سے جو پارسی تھیٹر ملک میں مقبول ہوا، وہ موضوعاتی اعتبار سے ہم عصر تو نہ تھا لیکن دھارمک اور سماجی رجحانات سے ضرور مملو رہا۔ آزادی سے پہلے اس میں اپنے زمانے کی روح پھونکی گئی اور مہاراشٹر، جنوبی ہند اور بنگال میں تھیٹر زندگی سے قریب ہوتا گیا۔ لیکن اس تھیٹر کی تخلیق، انفرادی دلچسپی اور انفرادی اپج کی مرہونِ منت تھی اس میں تنظیم و تربیت نہ تھی۔ ایک گروہ کا رہنما چل بستا تو وہ بکھر جاتا۔ اور منتشر ہوجاتا تھا کوئی ایسا انتظام نہیں تھا کہ تھیٹر کے ساز و سامان (PROPS) بنانے والے صناع، اس کی تخلیق کرنے والے مصنف، ہدایت کار اور اداکار ایک مسلسل بہتی ہوئی نہر کے مانند ملک بھر میں رہے ہوئے ہوں لیکن تجربے نے سکھایا سیکھ لیا موقع نے بٹھایا یا نبھا دیا لیکن تربیت، تدریس اور ریاضت کا کوئی سامان نہیں تھا سنیما کی آمد نے سرپرستی کا تاج عوام کے سروں سے اٹھا کر چند دیوانوں کے سر پر رکھ دیا تھا مختصر یہ کہ تھیٹر مر رہا تھا۔ اس کے دیکھنے والے نہیں تھے اور اس کے کرنے والے بے سروسامانی کا شکار تھے۔ آزادی کے بعد وزارتِ تعلیم نے جب نیشنل اسکول آف ڈرامہ کھولا تو پہلی بار تھیٹر آرٹس اور کرافٹس کی باقاعدہ تربیت کا ایک وسیلہ نکل آیا۔ ایک سائنسی پیمانے پر اور سائنسی انداز کی تعلیم دی جانے لگی۔ اور تعلیم پانے والوں میں ایک خود اعتمادی پیدا ہوگئی۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ ملک کی صحافت نے تھیٹر پر ریویو چھاپنے شروع کئے اور اس طرح تھیٹر والوں کو اپنے موازنہ کا اور جائزہ لینے کا موقع ملا۔ یونی ورسٹیوں اور کالجوں میں نئی نسل کو ترغیب ملی اور اب وہ بیرونی ڈراموں کے تجربے اتارنے کی بجائے خود اپنے لکھے ہوئے یا ملک کی ادبیات سے حاصل کئے ہوئے خزینوں پر مبنی ڈرامے کھیلنے لگی اور اس طرح ایک نیا قومی مزاج کا تھیٹر ملک میں پیدا ہوا۔ بنگال میں اُت پل دت نے "جاترا" کو نئی زندگی دی۔ مہاراشٹر میں "تماشہ" قدم جمانے لگا۔ آندھرا میں "بھیلاٹا" زور پکڑنے لگا۔ ہندی علاقوں میں دہلی میں کئی ایک تھیٹریکل تحریکات چل پڑیں جن میں سے لائق ذکر ہندوستانی تھیٹر ہے۔ اس مرحلے پر تھیٹر کی بیداری صرف صورت و شکل اور تزئین تک محدود نہ رہی بلکہ اپنی روح اور آواز کے تعلق سے بھی وہ متفکر ہوتا گیا۔ تھیٹر کی زبان کون سی ہونی چاہئے۔ موضوع کون سا ہونا چاہئے، اس کا فارم کیا ہونا چاہئے؟ کیا اس کو قدیم ہونا چاہئے یا جدید ہی۔ کیا اس میں STRUCTURAL تبدیلیاں لائی جائیں کہ وہ اپنی مجبوریوں سے آزاد ہوسکے۔ ان سوالات کا جواب اپنے اپنے طور پر چھوٹے چھوٹے گروہ دینے لگے۔ جیسے یاترک، نسل تھیٹر گروپ اور ہندوستانی تھیٹر۔ بالآخر دیہاتی تھیٹر کو ایک مرکزی مقام حاصل ہوا کیونکہ وہ سماجی حقائق سے زیادہ قریب تھا۔

تھیٹر کے احیاء کی اس کہانی میں سنگیت ناٹک اکادمی کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا۔ نیشنل اسکول آف ڈرامہ کے مانند یہ اکاڈمی بھی آزادی کی دین ہے۔ اگرچہ اکاڈمی نے خود تخلیقی دائرہ میں تھیٹر کے لئے کچھ نہیں کیا لیکن اہم مطبوعات کے سلسلہ کے ذریعے اور انعامات اور ترغیبات کے ذریعے اس کی ہمت افزائی کی۔ ایسا ہی رول ریاستی و مرکزی ساہتیہ اکاڈمیوں نے بھی کیا۔

تاہم تھیٹر کو سب سے زیادہ تقویت ملی ٹیلی ویژن سے۔ جب ۱۹۶۵ء میں دہلی میں ٹیلی ویژن کی جنرل سروس شروع ہوئی تو اس کے لئے درکار سارا عملہ نیشنل اسکول آف ڈرامہ سے مل سکا۔ پہلے تو یہ کہ اس سے فن کاروں کا انتشار رک گیا اور دوسرے یہ کہ خود ان فن کاروں کو اپنے فن کے زندہ رکھنے کے لئے ریڈیو کے علاوہ ایک اور ذریعہ مل گیا کیونکہ ریڈیو ڈراموں کے برعکس ٹیلی ویژن ڈرامہ اسٹیج سے بہت قریب ہے۔ لیکن جو بات اس سارے فسانے میں نہیں ہے وہ یہ کہ آیا ہمارا تھیٹر ہمارے ہم عصر رجحانات کا آئینہ دار ہے۔ بہت سے لوگ تھیٹر میں TOPICALITY کو قائم رکھنے کی کوشش میں ہیں۔ لیکن جس شکل میں تھیٹر اب ہمارے سامنے ہے وہ میکانیکل زیادہ ہے اور جمالیاتی کم، کیونکہ اس پر دوسرے ذرائع ترسیل MEDIA کا گہرا اثر پڑنے لگا ہے۔ ایک ہے ناول کا جو بھارت کی تقریباً تمام زبانوں میں سوائے بنگالی کے تھیٹر سے دو قدم آگے ہے۔ دوسرے فلم کا، جو اپنی خصوصیات کے سبب تھیٹر سے جامع اور اعلیٰ ہے۔ اس لئے آزادی کے ۲۵ سال گزرنے کے باوجود ہمارے تھیٹر کی اپنی کوئی روح نہیں ہے۔ وہ ابھی اپنی ہی کھوج میں ہے۔

جہاں تک خوش کن فلموں کا تعلق ہے صورتِ حال قدرے بہتر ہے لیکن اطمینان

بخش نہیں۔ آزادی کے بعد حکومت ہند نے پاٹل کمیٹی تشکیل دی جس نے کئی ایک اداروں کے قیام کی سفارش کی اور وہ قائم بھی کیے گئے جیسے کہ فلم فنانس کارپوریشن، قومی انعامات، فلم انسٹی ٹیوٹ، سنسر بورڈ، فلم آرکائیوز، موشن پکچرز ایکسپورٹ کارپوریشن، چلڈرنس فلم سوسائٹی وغیرہ بلکہ فلم بینی کا ذوق بلند کرنے کے لیے، فلم سوسائٹیوں کی بھی ہمت افزائی کی گئی۔ لیکن اعلیٰ پائے کی فلموں کی تیاری ایسی کسی بھی ہمت افزائی کا نتیجہ نہیں رہی بلکہ انفرادی کمال کا مرہون منت رہی۔ تاہم سب سے اہم کام اس سلسلے میں فلمز ڈویژن نے کیا۔ کیونکہ آج سے دس سال قبل کوئی پرائیوٹ پروڈیوسر ڈاکومنٹری فلم بنانے پر آمادہ نہ تھا۔ اس زمانے میں فلمز ڈویژن نے نیوز ریل کی شکل میں ۲۵ سال کی تاریخ محفوظ کر لی ہے۔ اور ڈاکو منٹریوں کی شکل میں اس صنف کی فلموں کو زندہ اور قائم رکھا۔ اس کے باعث یہ ممکن ہو سکا کہ نئی قسم کی ڈاکومنٹری فلمیں اب بننے لگی ہیں اور ان میں سے ایک کو سنہ ۱۹۶۵ء میں دنیا کا اعلیٰ ترین اعزاز بھی ملا ہے اور وہ ہے مقبول فدا حسین کی "ایک فن کار کی نظر دں سے" والی ڈاکومنٹری۔

فیچر فلموں کی ان ۲۵ برسوں میں ترقی عددی ہے تخلیقی نہیں اور اگر کہیں تخلیقی ہو بھی تو اس میں حکومت کی کوششوں کو کوئی دخل نہیں۔ سنہ ۱۹۴۷ء سے لے کر سنہ ۱۹۷۱ء تک محبوب خاں، شانتا رام، بمل رائے، سہراب مودی، کیدار شرما کمال امروہوی، چیتن آنند، رمیش سہگل، ستیہ جیت رے، مرنال سین، رتوک گھٹک، تپن سنہا، واسن اور میئپن نے جو بھی اعلیٰ فلمیں بنائیں وہ ان کی اپنی کاوشوں کا نتیجہ تھیں۔ لیکن جن سرکاری اقدامات نے فلموں کو عروج پانے میں مدد دی ان میں بین قومی انعامات کی ابتدا، بین الاقوامی فلمی میلے اور ثقافتی فلمی میلے ہیں جن کے سبب اب تک گمنامی میں رہنے والے فنکار منظر عام پر آئے بعد میں حکومت نے انہیں یوم آزادی و یوم جمہوریت کے موقعوں پر قومی اعزازات دینے کا بھی سلسلہ شروع کیا۔ ایک دو فلم سازوں کو پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں بھی جگہ ملی۔

تاہم سب سے اہم بات فلموں کے ضمن میں یہ ہے کہ فلمیں اب عزت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ ان کے بارے میں ہمدردی سے غور کیا جاتا ہے۔ قومی صحافت اور قومی حکومت انہیں اب ہیچ نہیں سمجھتی بلکہ اب سیاسی جلسوں میں مجمع جمع کرنے کے لئے اور انتخابی مہمیں لڑنے کے لیے فلمی ستاروں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ فلمی ستارے اب فوجیوں کی دلجوئی کے لیے سرحدی علاقوں کو بھیجے جاتے ہیں اور شہروں میں قومی مقاصد کے لئے چندہ جمع کرنے کے لیے بھی اکٹھا کیے جاتے ہیں۔ نظریاتی تبدیلی جو ہمارے رویے میں آئی ہے یہ آزادی کے بعد کی سب سے بڑی بات ہے۔

نشریات کے ضمن میں یہ کہنا ضروری کہ چونکہ سارا نشریاتی نظام حکومت کے دائرہ اختیار میں ہے اس لئے اس کی توسیع اور ترقی حکومت کی براہ راست دلچسپی کا نتیجہ ہے اور یہ دلچسپی ایک اشد ضرورت کے سبب ہے اور وہ ہے عوام سے رابطہ رکھنے کی۔ ان کے ذہنوں کو متاثر کرنے کی۔ Qualitatively اس میں جو تبدیلیاں آئیں وہ یہ ہیں۔ راجاؤں اور نوابوں کے اجڑنے کے بعد موسیقی کے ماہرین بے سہارا ہو رہے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو نے انہیں آسرا دیا۔ ڈراموں وغیرہ کے ذریعے ملک کی بہترین صلاحیتوں کو اپنے حلقہ گرفت میں لیا۔ قومی نشریات کے ذریعے ایک مجموعی ذہنی مزاج قائم کرنے کی کوشش کی۔ نیشنل پروگراموں کے ذریعے ایک علاقے کی تخلیقات کو دوسرے علاقوں میں پہنچایا۔ خبروں کی نشریات کے ذریعہ اطلاعات کی ترسیل کا مضبوط نظام قائم کیا اور اس میں بھارتی زبانوں کو اہمیت دی۔ وودھ بھارتی کے ذریعے ہندی کی سارے ملک میں ترویج کا بندوبست کیا گیا۔ گانوں اور فلموں کی مقبولیت کو بڑھایا بھی اور اس کو اپنے لیے بھی استعمال کیا۔ چنانچہ آزادی کے بعد نشریات کی توسیع کے سبب گراموفون کی موت واقع ہو گئی۔ ہر سال ریڈیو سنگیت سمیلن کے ذریعے نئی نئی صلاحیتیں رونما ہوتی ہیں۔ قومی مباحثوں کے ذریعے اہم موضوعات لوگوں کو سہل انداز میں سننے کو ملتے ہیں۔ اخبارات میں ریڈیو خبروں کی باقاعدہ اشاعت نے اس میں بہتری پیدا کرنے میں مدد دی۔

آزادی کے وقت لگ بھگ کوئی ۲۰ ریڈیو اسٹیشن تھے اور اب دو گنے ہو گئے ہیں ریڈیو لائسنسوں کی تعداد ۷۵ لاکھ کے لگ بھگ ہو گئی ہے۔ ٹرانزسٹر کی ایجاد نے نشریات کو گھر کے قید و بند سے چھٹکارا دلایا۔

چونکہ فلم اور تھیٹر کے برعکس ریڈیو ہمیشہ سرکاری نگرانی میں رہا اس لیے ہم اس میں وہ بے رخی نہیں پاتے جو کہ فلم اور تھیٹر میں موجود ہے۔ ہندوستانی براڈ کاسٹنگ کی ایک پرچہ ہے، ایک مقصد، اور ایک باقاعدہ فلسفہ۔ شاید یہی ایک میڈیم ایسا ہے جس نے اپنے آپ کو پالیا ہے۔

ٹیلی ویژن نوزائیدہ ہے ویسے تو سنہ ۱۹۵۹ء سے دلی میں ٹی وی آیا ہے۔ لیکن اس کا مقصد تعلیم بالغان، کھیتی باڑی کی تعلیم اور تدریسی تعلیم تھا۔ سنہ ۱۹۶۵ء میں جنرل سروس شروع ہوئی تو وہ ریڈیو کی طرح ہمہ رنگ ہوا۔ اب وہ دہلی کی زندگی کا حصہ ہے۔ بہت جلد سری نگر، بمبئی، جالندھر، مدراس، کلکتہ وغیرہ میں پھیل جائے گا۔ اور تب ہی اس کے اثرات معلوم ہونے لگیں گے۔

لیکن سنہ ۱۹۶۵ء سے سنہ ۱۹۷۲ء تک کے مختصر سے عرصے میں ٹیلی ویژن نے دہلی والوں کو بہت کچھ دیا۔ اس کو جاننے کے دو طریقے ہیں۔ سنہ ۱۹۶۵ء میں مشکل ایک ہزار سیٹ تھے۔ اب ۲۶ ہزار سے اوپر ہیں۔ سنہ ۱۹۶۵ء میں کبھی ہنگری سے کبھی جرمنی سے ٹی وی سیٹ منگائے جاتے تھے۔ اب ان کی درآمد بند کر دی گئی ہے اور چار نمونے بازار میں زیر فروخت ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ Transistor Satellite کا تجربہ بھی کامیاب ہو گیا اب جب Aerial T.V. T.V. آجائے گا تب ٹیلی ویژن فلم اور ریڈیو دونوں سے زیادہ

اہم ہتھیار اور ذریعہ مواصلات بن جائے گا۔ کوئی اور میڈیم ملک کی ترقی کی ایسی آئینہ داری نہیں کرتا۔ . . . . . . سات سال کے مختصر عرصہ میں اتنی Expertise پیدا ہو چکی ہے کہ ہمارے پروگرام اب کسی بھی ملک کے پروگراموں کے مقابلے میں رکھے جا سکتے ہیں۔ اور یہ حقیقت کہ بھارت میں خود ٹی وی بننے لگے ہیں ملک کی صنعتی اور ٹکنالوجیکل ترقی کی آئینہ دار ہے۔

تاہم جس شعبے میں حکومت نے ایک غیر معمولی رول ادا کیا ہے وہ قبائلی فنون کا ہے۔ آزادی کے بعد ملک کے دور افتادہ قبیلوں کو قومی دھارے کا حصہ بنانا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ اگرچہ وہ میدانی علاقوں کی طرح ترقی یافتہ نہیں تھے لیکن ان کی فنی روایات میں بڑی جان تھی۔ حکومت نے دستکار کرافٹس مین کے مقابلوں کے ذریعے، کوآپریٹوز کے ذریعے، خاص ترغیبات کے ذریعے، سیلز ایمپوریم کے ذریعے، ہینڈلوم اور ہینڈی کرافٹس بورڈز کے ذریعے، قبائلی ڈیزائن کی تخلیق آج کو ساری دنیا کے آگے پیش کر دیا۔ ہمارے قبائلی آرٹ میں ایک جان ہے۔ پہلے لباس ہو یا استعمال کی کوئی چیز، اس کا Design Concept بیرونی ہوتا تھا۔ لیکن آج کل آپ دیکھیں گے کہ بُش شرٹ شرٹ، عورتوں کے لباس، زیورات، اور آرائشی سامان تمام ہی دیہاتی یا قبائلی ڈیزائن کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ دیہات کے بوریا بننے والے دری بنانے والے، لکڑی کا کام کرنے والے کسی ادارے میں تعلیم نہیں پاتے بلکہ صدیوں سے نسلاً بعد نسل انہوں نے ان فنی روایات کو محفوظ رکھا ہے۔ اب پہلی بار بھارت کی اصلی روایات دنیا میں پھیل رہی ہیں۔ احمد آباد میں ایک نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ڈیزائن کھولا گیا ہے جہاں ہندوستانی مزاج کی اصل کے مطابق ڈیزائن فلاسفی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ڈیزائن: زندگی اور رہن سہن کے ہر شعبے پر چھا دی ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر حکومت نے ہماری عوامی دستکاریوں اور قبائلی فنون پر توجہ نہ دی ہوتی تو انڈسٹریلزیشن کے چکر میں ہمارا سارا تمدنی ورثہ ختم ہو جاتا اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان

مذکورہ شعبوں میں ہم نے اپنی اور اپنے ماضی کی کھوج دوبارہ شروع کر دی ہے اور یہ زندہ اور آزاد دماغ کی سب سے پہلی نشانی ہے۔ ●●

بقیہ: ساہتیہ اکاڈمی

(۳) تین مغل شاعر - رالف رسل اور خورشید الاسلام
(میر - سودا - میر حسن)

اکاڈمی نے ہسٹریز آف لٹریچر کے تحت ملک کی ۱۶ مختلف زبانوں کی ادبی تاریخ مرتب کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اب تک آسامی، بنگالی، کنڑ، ملیالم، اڑیا تیلگو اور سندھی زبان میں یہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ بقیہ زبانوں کی کتابیں زیر طبع ہیں۔ اُمید ہے کہ اردو ادب کی تاریخ بھی بہت جلد منظرِ عام پر آئے گی۔

اکاڈمی نے ببلیو گرافی آف انڈین لٹریچر (بیسویں صدی) کی طباعت کا بھی انتظام کیا ہے۔ اس عظیم کام کی ذمہ داری نیشنل لائبریری کلکتہ کو سونپ دی گئی ہے۔ ابھی تک اس کی ۳ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی جلد میں آسامی، بنگالی انگریزی اور گجراتی کتابوں کی ببلیوگرافی (کتابیات) ہے۔ دوسری میں ہندی کنڑ، کشمیری اور ملیالم اور تیسری میں مراٹھی، اُڑیا، پنجابی، اور سنسکرت زبان کی ببلیوگرافی ہے۔ چوتھی میں سندھی، تامل، تیلگو اور اُردو کتابوں کی ببلیوگرافی ہوگی۔ یہ ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہیں۔

ساہتیہ اکاڈمی کا مرکزی دفتر نئی دہلی میں ہے۔ کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں اس کی شاخیں ہیں۔ نئی دہلی کے دفتر میں عوام کے لئے مطالعے کی سہولت بھی ہے۔ یہاں انگریزی اور دیگر زبانوں کی ۳۱ ہزار کتابیں ہیں۔ مدراس اور کلکتہ کے دفتروں میں عوام کے لئے اس قسم کی سہولتیں نہیں ہیں۔ بہتر ہوگا کہ اکاڈمی ان شہروں میں بھی دہلی کی طرح ریڈنگ روم کی سہولتیں فراہم کرے۔

آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو زبان کی ڈکشنریاں اور لغات ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔ لغات زبان کی بنیاد ہوتی ہیں۔ نور اللغات جو اُردو کا معیاری لغت ہے ایک عرصے سے ناپید ہے۔ اس کا اب تک کوئی جدید ایڈیشن نہیں نکلا۔ ایک زبان کا ادب دوسری زبان میں منتقل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ کام صرف لغات اور فرہنگ کی ہی مدد سے ہو سکتا ہے۔ تقسیم ہند سے قبل انجمن ترقی اُردو نے "اصطلاحات پیشہ وراں" کے نام سے ۸ کتابیں شائع کی تھیں۔ یہ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔ انجمن ترقی اُردو کی شائع کردہ کتابوں کا کچھ اسٹاک بابائے اُردو عبدالحق پاکستان لے گئے۔ اور باقی بڑا حصہ دلی میں جلا ڈالا گیا۔ اب یہ کتابیں دیکھنے کو بھی نظر نہیں آتیں۔ اگر ساہتیہ اکاڈمی کی اُردو مشاورتی کمیٹی نور اللغات اور اصطلاحات پیشہ وراں کے جدید ایڈیشن نکلوانے کی کوشش کرے تو یہ کام واقعی کارآمد اور پائیدار ہوگا۔ اُردو زبان کی جڑیں مضبوط ہوں گی اور یہ پھلے پھولے گی۔ ●●

شہباز حسین

اپنی کھوج (۲)

مصوری سنگتراشی۔ رقص موسیقی اور علاقائی زبانوں کے پچیس سال

غلامی میں زندگی ایک جوئے کم آب اور آزادی میں بحر بیکراں بن جاتی ہے غلامی میں محکوم حاکم کی آنکھ سے دیکھتے اور اس کے دماغ سے سوچتے ہیں احساس کمتری، انتشار و انفعال قومی مزاج بن جاتا ہے اور ذہنی اور تخلیقی صلاحتیں. فعّال اور حرکی نہیں رہ جاتیں. پھر حاکموں کی نقالی شروع ہوجاتی ہے یا ماضی پرستی اور دونوں باتیں صحت مند نہیں ہوتیں۔

کسی بھی فن کی ترقی خلاء میں نہیں ہوسکتی۔اس کے لے مناسب ماحول و ذہن و فضا اور ایک ایسے معاشرے کی ضرورت ہوتی ہے جو نہ صرف دادِ تحسین دے بلکہ قدردانی اور سرپرستی بھی کرے۔فنونِ لطیفہ کی تخلیق بڑے اعلیٰ ذہن کرتے ہیں لیکن جب گھٹن، بے بسی اور بے چارگی پورے ماحول پر حاوی ہو تو جو بھی فن تخلیق ہوگا اس کا آئینہ دار ہوگا.

بیسویں صدی کی ابتداء سے جب قومی بیداری شروع ہوئی اور آزادی کی جدوجہد نے زور پکڑا تو زندگی کے ہر شعبے میں بیداری پیدا ہوئی۔ مصوری میں قدیم فنِ مصوری کی تجدید کی کوششیں شروع کی گئیں۔ اجنتا کے غاروں میں بنی ہوئی تصویروں کی نقلیں اتاری گئیں اور پُرانی روحانی قدروں کے احیاء پر بہت زور دیا گیا۔ راگ راگنیوں، موسموں اور دیوی دیوتاؤں کی تصویریں اتاری جانے لگیں۔ اس تحریک کے علمبرداروں میں ای بی ہیول اور ابنندرناتھ ٹیگور تھے۔اس تحریک کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس نے ہندوستان کے جذبہ اعتماد کو اُبھارا اور ملک کے ثقافتی ورثے کی اہمیت کا احساس پیدا کردیا۔ مگر اس کے نتائج اچھے نہیں نکلے۔کلکتہ گروپ اور بمبئی میں پروفیسر سولومن کے زیرِ اثر کام کرنے والے مصوروں نے اپنے بزرگوں کی قدامت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ امرتا شیر گل پر البتہ مغربی اور ہندوستانی دونوں اثرات تھے اور انہوں نے اپنی تخلیقوں میں ان دونوں کا امتزاج پیدا کرنے کی امکانی کوشش کی لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ پھر بھی ان کی تصویروں نے ہندوستانی مصوروں کو بے حد متاثر کیا اور تجربے اور تجرید کی منزل تک پہنچنے میں شیر گل نے بہتوں کی راہنمائی کی۔

آزادی نے بڑے پیمانے پر ہمارے مصوروں کو اس کا موقع عطا کیا کہ وہ دُوسرے ملکوں میں جائیں اور وہاں کا فن اور فن کار دونوں سے واقفیت حاصل کریں۔ تبادلے میں بہت سے دُوسرے ملکوں کے فن کار ہندوستان آئے اور باہمی تبادلہ خیالات نے فکر وعمل کی بہت سی نئی راہیں کھول دیں۔ اس سے ہمارے یہاں یہ ہوا کہ مصوری کا جدید دور ایک دم سے آگیا۔ مغربی ملکوں کی طرح نہیں جہاں تجربات کے بعد زینہ بہ زینہ ترقی کی منزلیں طے کی گئی تھیں اس کا نقصان یہ ہوا کہ ماضی سے ہمارا رشتہ تقریباً ٹوٹ گیا اور بعض ناقدین فن کی رائے میں جدید مصوری کا ہمارے ماضی سے کوئی رشتہ نہیں رہا اور جو نئے نئے تجربات کئے جارہے ہیں۔ ان میں مقامی عناصر کا کوئی دخل نہیں ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستانی مصور تجربات کے دور سے ہی گزر رہے ہیں۔ ابھی انہیں اپنی منزل نہیں ملی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ملک میں آرٹ کے قدردانوں اور سرپرستوں کی بڑی کمی ہے۔ ایک بڑا چھوٹا سا اوپری طبقہ ہے جو آرٹ کی سرپرستی کرتا ہے۔ اسی کی وجہ سے مصور وہی چیزیں بناتے ہیں جو بازار میں بک سکتی ہیں۔ باہر کے خریداروں کے لئے انہیں اکثر تانترک یا جنسی موضوعات کا سہارا لینا پڑتا ہے اور اندرون ملک کے لئے نیم تجریدیت کا۔ مصوری بڑا مہنگا شوق ہے۔ اور بڑی مشق اور ریاضت چاہتا ہے مناسب ہمت افزائی کی کمی فن کے ارتقاء میں ایک زبردست رکاوٹ ہے۔ ملت کلا

اکاڈمی نے مصوروں کی ہمت افزائی اور بھلائی کے لئے مفید اقدام کئے ہیں۔ مگر مرکزی اکاڈمی یا ریاستی اکاڈمیاں بہرحال محدود وسائل رکھتی ہیں اور سبھوں کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتیں۔

لیکن صورت حال اتنی مایوس کن بھی نہیں ہے۔ آج کے دور میں فن آفاقی ہوتا جا رہا ہے اور بہرحال میں مقامی اثرات یا روایات سے اس کا رشتہ جدا ہو کر ضروری بھی نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے فن کار بھی ابھر رہے ہیں جو ہندوستانی قدروں کے امین اور روایات کے آئینہ دار ہیں۔ جیمنی، ٹھاکری، گیتوندے، ایم ایف حسین، غلام رسول سنتوش، ہلیب اشہ، ستیش گجرال، بیرن ڈے، رام کمار، بھادو اس، اور بہت سے دوسرے جو ہونے طور پر اظہار پرست اور تجریدیت کے دو خانوں میں بانٹے جا سکتے ہیں ہماری مصوری کی روایات کو آگے بڑھانے میں لگے ہوئے ہیں۔

شنکر پلئی کی طرف سے ہر سال بچوں کے لئے مصوری کا جو عالمی مقابلہ منعقد کیا جاتا ہے اس نے مصوری کو مقبول بنانے میں بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔ جس کثیر تعداد میں بچے اس مقابلے میں شریک ہوتے ہیں اس سے اس فن کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مجسمہ سازی یا سنگ تراشی ہمارا بڑا قدیم فن ہے۔ قدیم مندروں اور عمارتوں میں سنگ تراشی کے بڑے نادر نمونے ملتے ہیں لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ یہ فن بھی زوال پذیر ہو گیا۔ برطانوی دور میں ہنری مور کے اثرات کی وجہ سے رائل اکاڈمی کی ہی نقالی ہوتی رہی۔

آزادی کے بعد اس فن کا بھی احیاء ہوا مگر چونکہ یہ مصوری سے زیادہ مشکل اور مہنگا شوق تھا لہٰذا کم لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ مجسمہ سازی صرف سنگ تراشی نہیں ہے بلکہ لکڑی اور ٹیراکوٹا اور بعض دوسری دھاتوں کے مجسمے بھی بننے لگے ہیں۔ مصوری کے برعکس یہ سہ ابعادی فن ہے لہٰذا کم فن کار اس کی طرف توجہ کر رہے ہیں۔ پھر بھی شنکھو چودھری، پردوش داس گپتا اور چنتامنی کار نے اپنی تخلیقوں سے اس فن کو جلا بخشی ہے۔

فارغ البال طبقے کے علاوہ خود سرکاری ادارے بھی مصوری اور سنگ تراشی کی بڑی سرپرستی کرتے ہیں اور حکومت اپنی عمارات کی آرائش و زیبائش کے لئے بھی مصوری و سنگ تراشی کے نمونے خریدتی ہے۔ بڑھتی ہوئی خوشحالی اور خوش ذوقی کی وجہ سے مصوری و سنگ تراشی دونوں کے سرپرستوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔

رقص و موسیقی کے معاملے میں صورت حال کچھ دوسری رہی ہے۔ دونوں فنون ہمارے قدیم ترین فنون ہیں اور ان کی تمام تر تفصیلات اور جزئیات مختلف عالموں نے طے کر رکھی ہیں۔ لہٰذا مسئلہ صرف یہ کہ کا ہی رہا کہ یہ فنون کس حد تک انحطاط کا شکار رہے اور ان کو خالص اور فن کارانہ بنانے کے لئے کیا صورتیں اپنائی جائیں۔ جہاں تک موسیقی کا تعلق ہے آزادی سے قبل چند گھرانے ممتاز تھے اور چند رجواڑے ان کے سرپرست اور قدردان تھے۔ ان راجاؤں نے ہماری کلاسیکی موسیقی کو زندہ رکھنے میں بڑا قابل قدر حصہ لیا ہے۔ موسیقی کے احیاء میں پنڈت بھات کھنڈے اور پنڈت پلسکر نے بھی بڑی نمایاں خدمات انجام دیں اور اپنے شاگردوں کی مدد سے جگہ جگہ موسیقی کے اسکول کھولے اور اس فن کو معیار عطا کیا اور مقبول بنایا۔

آزادی کے بعد کلاسیکی موسیقی کو زندہ رکھنے اور مقبول بنانے میں آل انڈیا ریڈیو نے بیش قیمت حصہ لیا ہے۔ گراموفون کمپنیوں نے بھی ہمارے موسیقاروں کو سہارا دیا ہے مگر ریڈیو کی وجہ سے نہ صرف کلاکاروں کو معاشی آسودگی حاصل ہوئی بلکہ سرپرستوں اور قدردانوں کا ایک بہت وسیع حلقہ ہاتھ آگیا ہے۔

آزادی کے بعد اپنے ثقافتی ورثے کی بازیافت کے عمل میں رقص اور موسیقی کو بھی نمایاں جگہ ملی ہے اور گانا یا ناچنا غیر شریفانہ پیشہ نہیں رہ گیا۔ کلاسیکی رقص اور موسیقی کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور بنگال اور جنوبی ہند کی طرح شمالی ہند کے گھروں میں بھی کلاسیکی رقص و موسیقی کی تعلیم دینے کا رواج بڑھ رہا ہے۔ متعدد یونیورسٹیوں میں میوزک کالج کھولے گئے ہیں جہاں بطور مضمون ان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ موسیقی کی کانفرنسوں یا کلاسیکی رقص کے شو میں شرکت اب لازمۂ تہذیب ہے۔

حکومت نے بھی فن کاروں کی سرپرستی کی ہے اور ہر سال ممتاز فن کاروں کو صدر جمہوریہ ہند اعزاز عطا کرتے ہیں۔

آزادی کے بعد روی شنکر کی سرکردگی میں آل انڈیا ریڈیو نے ہندوستانی سازوں کا آرکسٹرا تیار کرنے کی قابل قدر کوشش کی جس میں کامیابی بھی حاصل ہوئی — بحیثیت مجموعی ہماری کلاسیکی موسیقی کی مقبولیت میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔ ہندوستانی کلاسیکی رقص کا بھی احیا ہوا ہے۔ بھرت ناٹیم، کتھاکلی اور کتھک کے متعدد فن کار آزادی کے بعد ابھرے ہیں جنہوں نے ہند اور بیرون ہند میں اپنے کمال فن کی داد دی ہے۔ اچھن مہاراج، لچھو مہاراج اور برجو مہاراج کی بدولت کتھک درباری اور تفریحی ناچ کی بجائے ایک فن بنا۔ یامنی کرشنا مورتی، کملا لکشمن، روشن و جیت دار، بالا سرسوتی، رکمنی دیوی، مرنالنی سارابھائی، اور اندرانی رحمان نے بھرت ناٹیم کو فن کی بلندیوں پر پہنچایا۔ کتھاکلی صرف رقص نہیں بلکہ ایک ڈانس ڈرامہ ہے جو کیرالا میں بے حد مقبول ہے۔ رنگ برنگے چہرے لگائے اور لباس پہنے ہوئے رقاص عام طور سے سنسکرت ایپک کے واقعات کو ڈرامے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

آزادی کے بعد مغربی طرز کے بیلے کا بھی تجربہ کیا گیا جو کامیاب تو ہوا مگر مقبول نہ ہو سکا۔ اودے شنکر نے اس سلسلے میں بڑی قابل قدر کوششیں کیں

اور کلپنا نام سے ایک پوری فلم بنائی مگر اس وقت ملک اس تجربے کے لئے تیار نہ تھا اس لئے یہ فلم زیادہ مقبول نہ ہوئی۔ بعد میں بعض دوسرے فن کار رقص بھی پیش کئے ہیں اور اب بھی ان کا سلسلہ جاری ہے اور ان کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

آزادی کے بعد قبائلی اور عوامی رقص کی مقبولیت بہت بڑھی ہے ہر سال یوم جمہوریہ کے موقع پر بہترین قبائلی رقص کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ یوم جمہوریہ کی پریڈ میں عوامی رقاص بھی شامل ہوتے ہیں۔ ریاستوں میں کلچرل پروگراموں کے موقع پر عوامی رقص کے بڑے اچھے نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

اس طرح ہماری تہذیبی زندگی میں ایک نیا ولولہ اور ایک نیا جوش پیدا ہوا ہے جو ایک خوش آئند مستقبل کا غماز ہے۔

آزادی کے بعد غیر ممالک میں ہندوستانی فن کاروں کے جانے سے ہندوستانی رقص، موسیقی اور آلات موسیقی کو غیر ملکوں میں بھی مقبولیت حاصل ہوئی کچھ غیر ملکی سازوں کا ہندوستان میں بھی رواج ہوا ہے۔ اس طرح تہذیبی لین دین کے میدان میں ایک نیا آغاز ہوا جو آگے چل کر ممکن ہے بعض اہم تبدیلیوں کا باعث بنے۔

آزادی کے بعد ہی علاقائی زبانوں کو ان کا صحیح مقام ملا ہے۔ ماہرین تعلیم نے محسوس کر لیا تھا کہ بچے کی ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہونا بے حد ضروری ہے تاکہ بچے کی صحیح ذہنی نشو ونما ہو سکے اس لئے دستور میں یہ ضمانت دی گئی ہے کہ بچے کی ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں دی جائے گی۔

ہمارے ملک میں متعدد علاقائی زبانیں ہیں جو کسی نہ کسی ریاست کی سرکاری زبان ہیں۔ آزادی کے بعد انگریزی کا عمل دخل کم ہوا۔ تعلیم اور انتظامیہ میں علاقائی زبانوں کا رواج بڑھا۔ تعلیم میں بے پناہ پھیلاؤ آیا۔ نئے تعلیم یافتہ بچوں نے چونکہ مادری یا علاقائی زبان کے توسط سے پڑھا تھا اس لئے لازمی طور سے انہیں اس زبان میں کتاب یا رسالوں کی ضرورت محسوس ہوئی تعلیم بالغان میں اضافہ ہوا۔ اب بہت سی ریاستوں میں بی اے کی سطح تک علاقائی زبان ذریعہ تعلیم ہے۔ لہذا مختلف زبانوں کی کتابوں، اخباروں اور رسالوں کی مانگ میں بے حد اضافہ ہوا ہے جس کا اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہوگا

زبان	اخبارات و رسائل کی مجموعی تعداد	سال	مجموعی تعداد اشاعت
تامل	۵۲۱	۱۹۷۰	۳۳ لاکھ ۸۳ ہزار
ملیالم	۴۳۲	"	۲۲ لاکھ ۹۵ ہزار
گجراتی	۵۰۷	"	۱۹ لاکھ ۲۴ ہزار
مراٹھی	۶۸۰	"	۱۹ لاکھ ۲۰ ہزار
اردو	۸۹۸	۱۹۷۰	۱۴ لاکھ ۵۵ ہزار
بنگلہ	۷۰۷	"	۱۳ لاکھ ۸۸ ہزار
تلگو	۳۴۴	"	۱۰ لاکھ ۷۵ ہزار
کنڑ	۲۴۷	"	۸ لاکھ ۴۴ ہزار
پنجابی	۲۳۶	"	۳ لاکھ [illegible] ہزار
اڑیہ	۱۰۳	"	۲ لاکھ ۴۴ ہزار
سندھی	۷۲	"	۱ لاکھ ۲۹ ہزار
آسامی	۳۸	"	۱ لاکھ ۹ ہزار

ملیالم کا کثیر الاشاعت ہفتہ وار ملیالم منورما ہے جو کوٹا یام سے نکلتا ہے اور ہر ہفتے ۱۰۴۲۷۲۰ کی تعداد میں شائع ہوتا ہے۔ اس طرح گجراتی کا ماہنامہ چین کلیات ۱۰۰۲۱۷، تامل کا ہفتہ وار کومدم ۳۰۸۴۸۲۸، اردو کا ماہنامہ شمع ۱۲۱۴۴۸۰، بنگلہ کا روزانہ امرت بازار پتریکا ۲۴۸۵۴۷، مراٹھی کا لوک ستا ۱۵۲۸۸۰، تلگو کا آندھرا پربھا السٹریٹڈ ویکلی ۱۲۶۴۱۷، کنڑ کا ہفتہ وار سدھا ۸۲۲۹۶ اور پنجابی کا اجیت ۵۶۵۰۱ کی تعداد میں شائع ہوتا ہے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علاقائی زبانوں کو کتنا فروغ حاصل ہوا ہے حکومت ہند اور سرکاری ریاستوں نے قومی علاقائی زبانوں کے فروغ کے لئے متعدد اقدامات کئے ہیں۔ حکومت ہند نے ہر علاقائی زبان کی ترقی کے لئے ایک گرانٹ منظور کیا ہے تاکہ یونی ورسٹی کی سطح کی کتابوں کی تیاری کے علاوہ، ڈکشنری، انسائیکلو پیڈیا اور حوالے کی مستند کتابیں شائع ہوں۔ اس سرمایہ سے مختلف ریاستوں میں گرنتھ اکادمیاں قائم کی گئی ہیں۔ اردو کے لئے مرکز میں ترقی اردو بورڈ قائم کیا گیا ہے۔ یہ ادارے بڑے پیمانے پر معیاری اور مستند کتابوں کا ترجمہ کرا رہے ہیں یا تصنیف کرا رہے ہیں۔ یونی ورسٹیوں میں علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کی وجہ سے علاقائی زبانوں کی کتابوں کی مانگ میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے ساتھ ہی ساتھ انتظامیہ اور عدلیہ میں بھی علاقائی زبانوں کو جگہ مل رہی ہے۔

ابھی ملک کی تقریباً ایک تہائی آبادی خواندہ ہے۔ خواندگی میں اضافے کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کو مزید فروغ حاصل ہوگا۔ اور ان زبانوں کو ان کا وہ منصب حاصل ہوگا جن کی وہ صحیح معنوں میں حق دار ہیں۔

نئی کتابیں

ارمغانِ مالک ، مرتبہ: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

ضخامت: ۲۳۰، صفحات، دو جلدیں، کتابت و طباعت عمدہ

قیمت: فی جلد تیس روپے

پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دلی، علمی مجلس، چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ، دلی

جناب مالک رام صاحب اپنے علمی اور تحقیقی کارناموں کی وجہ سے اتنے متعارف ہو چکے ہیں کہ ان کے تعارف کرانے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہ جاتی وہ اُردو ادب میں جدید طرز کی علمی اور ادبی تحقیق کے علمبرداروں میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ وہ ہمہ گیر ذوق رکھتے ہیں اور متنوع موضوعات پر خامہ فرسائی فرماتے ہیں جن کے مطالعہ سے ان کے وسیع مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔ موصوف تقریباً چالیس برس سے تاریخ ادب اور خاص طور پر غالبیات کے میدان میں دادِ تحقیق دے رہے ہیں۔ موصوف نے غالب اور ان کی گوناگوں شخصیت کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ کرکے اس موضوع میں ہماری دلچسپی کو آگے بڑھایا ہے۔ اس بنا پر غالب پر تحقیق کرنے والوں کے حلقے میں انہیں خصوصی امتیاز حاصل ہے۔ غالب کے علاوہ اسلامی علوم پر بھی انہیں اچھی خاصی دسترس حاصل ہے۔ اسلام میں عورت کے مرتبے پر ان کی تصنیف مقبولِ خاص و عام ہو چکی ہے۔ ان کا مطالعہ ہمہ گیر، بہت وسیع اور عمیق ہے۔ عربی زبان سے واقفیت کی وجہ سے تفسیر و حدیث کا مطالعہ بھی گہرا ہے۔ ان کا حافظہ غیر معمولی اور ذاتی کتب خانہ وسیع ہے۔ اس عمر میں بھی رات گئے تک علمی مشاغل میں منہمک رہتے ہیں۔ اپنی عرق ریزی اور دیدہ وری کے سہارے انہوں نے علم و تحقیق کی جو خدمت کی ہے اس کی ضیاء سے کتنے ذہن منور ہیں۔ مجملاً [illegible] کی جس قدر بھی تعریف کی جائے وہ کم [illegible] ہے کہ وہ انسان دوست ہیں اور ان میں علم و انکسار بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ وہ ہر نوجوان لکھنے والے کی ہمت افزائی فرماتے ہیں اور علمی معاملات میں مشورہ طلب کرنے والوں کو اپنی جچی تلی رائے سے مستفید کرتے ہیں۔ ان کی دوسری خوبی ذہنی دیانت داری بھی ہے۔ یہ ایک ایسا وصف ہے جو اب رفتہ رفتہ اٹھتا جا رہا ہے۔

جناب مالک رام کے دوستوں نے یہ محسوس کیا کہ جو گہری محبت اور عقیدت وہ اس پیر جوان صفت سے رکھتے ہیں اور جو خدمت انہوں نے علم و ادب کی کی ہے، اس کی علامت کے طور پر ایک یادگار صحیفہ مرتب کرکے ان کی پینسٹھویں سالگرہ کے موقع پر ان کی نذر کریں۔ لہٰذا موصوف کو تین جلدیں دو اردو میں اور ایک انگریزی میں پیش کی گئیں۔ مندرجہ تبصرہ اردو کی دونوں جلدیں ہیں جن میں وہ مضامین شامل ہیں جو ان کے عقیدت مندوں نے سپردِ قلم کئے ہیں۔

مضامین کی ترتیب اس طرح ہے: تذکرہ اور مقالات: تذکرہ کے تحت پانچ مضامین ہیں جو ان کی سوانح عمری اور تصانیف سے متعلق ہیں۔ ارمغان مالک (نظم) از عرش ملسیانی، ذکرِ مالک، از علی جواد زیدی، نگارشاتِ مالک رام، از عرش ملسیانی، مالک رام: میرا دوست اور انسان دوست، از پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر لاہور، میرا مالک رام از جناب دوارکا داس شعلہ، دلی

مقالات متنوع موضوعات پر ہیں اور مستند عالموں نے سپردِ قلم کئے ہیں ان مضامین کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ تاریخ مرثیہ کا ایک باب عہد محمد شاہ: سید مسعود حسن رضوی ادیب
۲۔ چند الفاظ و طرقِ استعمال: جناب قاضی عبدالودود
۳۔ [illegible] کا سالک غالب: ڈاکٹر سید عابد حسین
۴۔ [illegible] کے اشارے: پروفیسر محمد زبیر صدیقی
۵۔ [illegible] لہجہ: مولانا امتیاز علی خاں عرشی

۶۔	جینے کا سلیقہ	پروفیسر خواجہ غلام السیدین (مرحوم)
۷۔	غالب کی تخیلی فکر	پروفیسر یوسف حسین خاں
۸۔	علم تاریخ میں مسلمانوں کا حصہ	پروفیسر محمد حمید اللہ
۹۔	اقبال کے اقتصادی تاثرات	مولانا عبدالسلام خاں
۱۰۔	رادھا کرشنن اور اقبال مماثلت اور مطابقت افکار	پروفیسر یوسف سلیم چشتی
۱۱۔	اقبال اور کارل مارکس	جناب جگن ناتھ آزاد
۱۲۔	غالب اور اقبال	پروفیسر اسلوب احمد انصاری
۱۳۔	تصوف و فلسفہ (در زبان فارسی)	آقای [illegible]
۱۴۔	فارسی کی قدیم فرہنگوں میں ہندستانی عنصر	پروفیسر نذیر احمد
۱۵۔	دو ہند ایرانی مصوتے	ڈاکٹر شوکت سبزواری
۱۶۔	سید انشاء کی ایک نادر تصنیف	پروفیسر مختار الدین احمد
۱۷۔	تفسیر کا قرآنی اور غیر قرآنی طریق	جناب ضیاء الحسن فاروقی
۱۸۔	الفارابی کا نظام فکر	ڈاکٹر نصیر احمد
۱۹۔	اُردو اور ہندی عروض	پروفیسر گیان چند
۲۰۔	مغل مصوری کا شاہکار "تیموریہ گھرانا"	محمد عبدالرحمٰن چغتائی
۲۱۔	درگاہ خواجہ امین۔ بیجاپور	ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی
۲۲۔	دیوان بیرم خاں	پروفیسر سید امیر حسن عابدی
۲۳۔	اردو مصوتوں کی نئی درجہ بندی	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
۲۴۔	پنجابی زبان اور ادب کا جائزہ	ڈاکٹر وحید قریشی
۲۵۔	جذباتی ہم آہنگی کے کچھ تاریخی واقعات	مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن
۲۶۔	غالب کی ایک غزل کا جائزہ	شمس الرحمٰن فاروقی
۲۷۔	رسالہ الغفران اور رسالہ التوابع والزوابع	مولانا سعید احمد اکبر آبادی

فی الواقع ان مقالات میں سے ہر ایک مقالہ مطالعہ طلب ہے۔ ان کے مصنفین نے بڑی دیدہ وری اور عرق ریزی سے اپنے مقالے ترتیب دیے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر تحقیقی ہیں علمی کم ہیں ان میں سے چند کا بالخصوص ذکر کیا جاتا ہے۔ جناب خواجہ غلام السیدین کے مقالے سے نہ صرف مالک رام صاحب کے علمی کارناموں، ان کی مذہبی رواداری، انسان دوستی پر بلکہ دورِ حاضر کے علمی ماحول، اور علمی اداروں کی کوتاہیوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ مقالہ بعنوان "جینے کا سلیقہ" ہے۔ سیدین صاحب نے یونیورسٹیوں کے طلبا اور اساتذہ کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں ان کے فرائض منصبی یاد دلائے ہیں۔ چونکہ سیدین صاحب وزارتِ تعلیم میں کافی دنوں تک سیکریٹری کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے اور اس وجہ سے انہیں ہندوستانی تعلیمی اداروں کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع بے حد ملے [illegible] فرماتے ہیں اگر اساتذہ ہی علمی ذوق، جستجو اور [illegible] سے عاری ہوں گے تو وہ اپنے طالب علموں میں علمی ذوق کیسے پیدا کر سکیں گے [illegible] کے بجائے سیاست کے اکھاڑے بنتی جا رہی ہیں [illegible] ہیں تاہم علم دوست اور صاحب فکر و نظر اساتذہ کی کمی ہے [illegible] کا فقدان ہے، قابلیت اور شخصیت کے معیار [illegible] مذہب، زبان اور صوبوں کے تنگ تعصب کے زیر اثر ہوتا ہے [illegible] درس گاہیں جو دنیا کا امن، شانتی، دیانت [illegible] کے ایک غلط اور گھٹیا تصور کو عام کرنے کا [illegible] ہے۔ طلبا میں علمی ذوق کے بجائے ڈگریاں حاصل کرنے کی [illegible] کالجوں میں طلبا کی تربیت کے بجائے انہیں جائز اور ناجائز طریقے [illegible] دے کر وہاں کے ارباب اقتدار اپنی جان چھڑاتے ہیں [illegible] طلبہ میں علمی، ادبی، اخلاقی اور جمالیاتی اقدار کا فقدان ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہمارے نئے ناقدین میں خاصے ممتاز ہیں۔ صوتیات اور لسانیات کی زندہ آگہی کی روشنی میں انہوں نے اردو زبان کے صوتیاتی نظام سے بڑے ہی استدلالی انداز میں بحث کی ہے۔ اردو لسانیات کے لئے یہ ایک فال نیک ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے اقبال اور غالب کے ذہنی اور ادبی رشتوں سے بحث کی ہے اور یہاں بھی ان کے نقطہ نظر کی وہ معروضیت موجود ہے جس کے لئے وہ اردو ناقدین میں مشہور ہیں۔ غالب اور اقبال کے حسی پیکروں کے تجزیے کے بعد انہوں نے جو نتائج اخذ کئے ہیں ان میں روشنی بھی ہے اور بصیرت بھی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے بہت سے چونکا دینے والے مضامین کے ذریعہ گذشتہ برسوں میں بہتوں کو چونکا دیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے غالب کی ایک غزل کا تجزیہ کیا ہے اور اس میں تجزیہ کا جو انداز اختیار کیا ہے وہ I. A. Richards کی عملی تنقید کی یاد دلاتا ہے۔ ادبی تخلیقات کے اس طرح کے تجزیے کا رجحان اُردو کے لئے ایک فال نیک ہے۔ ویسے ارمغان مالک کے مشمولہ تمام مضامین بصیرت افروز اور تحقیقی اعتبار سے اعلیٰ معیار کے ہیں [illegible] محققوں اور طالب علموں کے لئے بہت مفید ثابت ہوں گے اور [illegible] سے ان کے ذہن روشن ہوں گے۔ مالک رام صاحب کی سوانح عمری سے متعلق مضامین غریب طلبا کے لئے مشعلِ راہ و ہدایت کا کام دیں گے۔ تحصیل علم کے لئے پیسے کی نہیں بلکہ خالص ذوق، ہمت و استقلال کی بے حد ضرورت ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ کسی علم دوست بزرگ کی رہنمائی اور دست گیری بھی۔

(محمد عمر)

کتاب جشن مالک رام (انگریزی) مولفہ علی جواد زیدی

شائع کردہ [illegible] مالک رام کیثر صفحات ۲۹۳ کتابت طباعت دیدہ زیب

اس کتاب کے پہلے تین مضامین کا موضوع وہی ہے جو اردو کتاب میں ہے۔ [illegible] کے دوسرے قلمدان جنہوں نے اس کتاب کے لیے [illegible] ہیں حسب ذیل ہیں

[illegible] ڈاکٹر [illegible] نے جو آکسفورڈ یونیورسٹی کے ادارہ [illegible] کے ڈائرکٹر ہیں یہودی قانون شرع کے مسائل پر مضمون لکھا ہے۔

[illegible] فان گرونے باؤم نے جو کیلی فورنیا یونیورسٹی کے [illegible] کے ڈائرکٹر ہیں، اسلام میں اجنبی اور دوسری ماورائی [illegible] کے بارے میں مقالہ لکھا ہے۔

[illegible] جو کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے [illegible] کی تاریخ کے ماہر، سورۃ الضحیٰ کی [illegible] کے بارے میں بحث کی ہے۔

[illegible] نے جو پنسلوینیا یونیورسٹی میں سنسکرت [illegible] کے پروفیسر ہیں ہندو مذہب اور قانون کی تعریف پر لکھا ہے۔

[illegible] نے، جو اسکندریہ میں [illegible] کے [illegible] کے بارے میں لکھا ہے۔

[illegible] نے جو لوو (فرانس) میں [illegible] کے پروفیسر ہیں، اسلامیت کے بارے میں اپنا [illegible]

[illegible]

ڈاکٹر [illegible] یونیورسٹی میں اسلامی [illegible] کے پروفیسر ہیں [illegible] دیا ہے۔

[illegible] ڈاکٹر [illegible] نے قدیم [illegible] ادب میں [illegible] کے [illegible] ہے

ڈاکٹر [illegible] اور [illegible] کے [illegible] لکھا ہے

ڈاکٹر بشیر احمد ڈار [illegible] لاہور کی اقبال اکیڈمی کے سابق سکریٹری ہیں، اقبال [illegible] پر مقالہ لکھا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر اور صدر شعبۂ انگریزی اسلوب احمد انصاری صاحب نے شیکسپیئر کے ڈرامے "کوریولینس اور [illegible]" میں اخلاقی پیچیدگیوں کے بارے میں لکھا ہے جبکہ آثار قدیمہ میں فارسی اور عربی کتبات کے ماہر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے تیرہویں سے پندرھویں صدی تک سندھ اور مشرقی وسطیٰ کے درمیانی تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب غالبیات کے ساتھ تقریباً ان تمام موضوعات کا احاطہ کرتی ہے جن سے جناب مالک رام صاحب کو دلچسپی ہے

(معصوم حسینی)

"پہلی آواز اور دوسرے افسانے" رتن سنگھ

نصرت پبلشرز۔ وکٹوریہ اسٹریٹ۔ لکھنؤ ۳ قیمت: ۴ روپے

رتن سنگھ کے افسانے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اردو افسانہ بالغ ہو چکا ہے اور اس میں کوئی جمود نہیں۔ وہ نہایت ایمانداری کے ساتھ انہیں طبقوں کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں جنہیں انہوں نے قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے ان کے افسانوں میں [illegible] بھی رچتا ہے اور اگر دا [illegible] بھی یہ بات دل سے محسوس کی جاتی ہے اور سچے انداز میں کہی جاتی ہے۔ [illegible] گویا وہ سرت چندر اور پریم چند کی روایات کو تازہ کر گئے ہیں لیکن زیر نظر مجموعے میں ایک معنوی اور فکری وحدت بھی ہے یعنی ان کے بیشتر افسانے انسانی مجبوریوں کے بارے میں ہیں اور ان کچلے ہوئے طبقے کی عکاسی کرتے ہیں جس کے حوصلے اور امنگیں گھٹ گھٹ کر رہ جاتی ہیں یا [illegible] گھٹ کر کبھی کبھار اسے خوشی اور فارغ البالی کا کوئی نایاب لمحہ میسر ہوتا ہے تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا کیا جائے۔

رتن سنگھ دراصل کلاسیکل ٹریجڈی کے ماہر ہیں جس کا مقصد محض رونا رلانا اور یاس اور محرومی کی فضا پیدا کرنا نہیں بلکہ زندگی کے دکھوں کے مکمل ادراک کے بعد اس پر فتح پانا ہے۔

"مریم" کا بچہ جس کا دنیا میں کوئی نہیں اور جس کے علاج سے ڈاکٹر ڈیسوس [illegible] اس لیے اچھا ہوتا ہے کہ ایک کمسن لڑکی اس پر ترس کھا کر اس سے بے تکلف ہو جاتی ہے۔ انسانی رشتوں سے محرومی کا علاج "باپ" میں بھی موجود ہے جس میں ایک لاولد بوڑھا لوگوں کو اپنے خیالی بیٹے کے بارے میں نت نئی کہانیاں سنایا کرتا ہے یہی رشتے بھکاری حال بیٹوں کی زندگی کا سہارا بنتے ہیں یہی رشتہ "آخری مے" کی مرتی ہوئی ہیروئن کی تسکین کا باعث ہوتا ہے جبکہ اس کا بچھڑا ہوا شوہر جس سے اسے اپنے خیال میں نفرت تھی، اس کی پیشانی پر [illegible] ہے اور اسے ان [illegible] کا احساس حاصل ہو جاتا ہے جس سے وہ زندگی بھر محروم رہی۔ یہی وہ رشتے ہیں جن کے باعث باوری کی زندگی کا سارا کھیل [illegible] دیتی ہیں۔ وہ کھیل جو اس کی جان لے کر رہا۔ لیکن جان جانے کا کیا غم، خوشی تو اس کی ہے کہ باوری کی بات رہ گئی اور فن کی جیت ہو گئی۔

رتن سنگھ نے کچھ علامتی اور تجریدی تجربے بھی کیے ہیں جن کی مثالیں "[illegible]" اور "کیامت" ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی ان کے فن میں ترقی کے کافی روشن امکانات ہیں۔ ہمیں رتن سنگھ سے بڑی توقعات ہیں۔

(معصوم حسینی)

ہندوستان کے

ہمدرد



تصویرِ مستقبل

کیا اس [illegible] بچے کے چہرے پر مسکراہٹ اسی طرح کھیلتی رہے گی۔ یا گردش زمانہ اس کی امنگوں اور حوصلوں کو پامال کردے گی۔ اس شمارے میں ڈاکٹر خلیق احمد نقوی پروفیسر اور صدر شعبۂ اقتصادیات، دہلی یونیورسٹی کا مضمون "غریبی کا مسئلہ" ملاحظہ فرمائیے۔



دنیا کو ہندوستان کا سب سے کارآمد تحفہ

سب سے پہلے انسان گنتی کے لئے پتھر کے ٹکڑوں کا سہارا لیتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے ہاتھ کی انگلیوں کی مدد سے گننا شروع کیا۔ لیکن اس طرح وہ دس سے آگے نہیں گن سکا۔

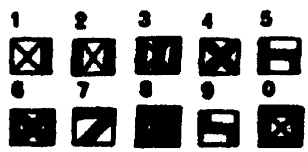
ہندوستان نے ہی سب سے پہلے ریاضی کی دس علامتوں کے ذریعے انسان کو گننا سکھایا اور اسے انگلیوں کے سہارے گننے سے نجات دلائی۔ اسی لئے ان علامتوں کا نام 'ہندسے' مشہور ہوا۔ ان ہندسوں میں سب سے کارآمد تحفہ تھا صفر — جس نے گنتی کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

ان دس ہندسوں کی علامتیں پوجا میں استعمال ہونے والے یجنیہ کنڈ کی چوکور ساخت سے لی گئی ہیں۔ ہر علامت کی قدر گنتی میں اس کے مقام پر منحصر ہے۔ ان کے ذریعے سب کچھ گنا جا سکتا تھا۔

۲۳۲-۲۷۳ قبل مسیح کے دوران سمراٹ اشوک کے عہد میں یہ ہندسے خوب رائج تھے۔ اس کے ایک ہزار سال بعد محمد ابن موسیٰ الخوارزمی نے بغداد میں ان ہندسوں کو مقبول بنایا۔ سرزمین عرب میں عرصے تک استعمال ہونے کے بعد یہ ہندسے یورپ کے علم میں آئے ... گنتی کو سادہ اور آسان بنا کر ان ہندسوں نے بے شمار کا بھی شمار کر ڈالا۔

اس کے ساتھ ہی انسان اپنی مختلف ضروریات کے مطابق ہندسوں اور ریاضی کے دوسرے مسائل حل کرنے کے نت نئے طریقے کی کوشش کرتا رہا۔ دور حاضر کی ترقی پذیر [illegible] کمپیوٹر نے ہمیں اس قابل بنایا ہے کہ ہم اعداد و شمار کے مشکل ترین سوالوں کو لمحوں میں حل کر سکتے ہیں۔ اسی طرح زندگی کے ان مسائل کو حل کیا جا رہا ہے۔ جن کا پہلے کوئی حل نہیں تھا۔ ہندوستان میں بنے آئی۔ بی۔ ایم کمپیوٹر ملک کی اقتصادی قوت کو لاکھوں گنا بڑھانے میں مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔

آج انسانی زندگی کے ہر شعبے میں، تعمیر اور تشکیل کے ہر منصوبے میں — ترقی کی بلند ترین منزلوں کو چھونے کے لئے انسان کمپیوٹر استعمال کر رہا ہے۔



mcm/ibm/120/u

Vol. [illegible] No. [illegible] AJKAL (MONTHLY) August 1972
PUBLISHED BY THE DIRECTOR, PUBLICATIONS DIVISION, PATIALA HOUSE, NEW DELHI-1
PRINTED BY INDIAN PRINTING WORKS, RANI JHANSI ROAD NEW DELHI-55.
REGD. NO. D 509

آہنگ

۶۰ پیسے

قرۃ العین حیدر۔ پدھیو
علی جواد زیدی۔ وحید اخ
اقبال متین۔ شہباز حسی





پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم (۱۹۱۲-۱۹۷۲)

اردو کا مقبولِ عام مصوّر ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر
مہدی عباس حسینی
(ٹیلیفون ۳۸۷۰۶۹)

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جنوری ۱۹۷۳ء
پوش ماگھ شک سن ۱۸۹۴

سالانہ چندہ

ایک سال : ۷ روپے
۲ سال : ۱۲ روپے
۳ سال : ۱۷ روپے

سرورق : جیون اڈجہ

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱

ترتیب

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :
ایڈیٹر "آجکل" (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱

اداریہ

پروفیسر احتشام حسین

یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو پروفیسر احتشام حسین کا انتقال ہوگیا۔ احتشام صاحب اردو ادب میں سائنٹیفک تنقید کے بانی، اپنی تحریر میں نہایت غیر جذباتی اور اپنی زندگی میں سراسر جذبہ تھے۔ اور شاید اسی لیے وہ نہ صرف ایک عظیم ناقد تھے بلکہ ایک اچھے انسان بھی۔ اپنی سوانح، شخصیت اور اندازِ فکر کے بارے میں وہ "ساحل اور سمندر" میں فرماتے ہیں:

"۱۹۳۰ء میں تعلیم کیلئے میں الٰہ آباد پہنچا۔ الٰہ آباد اس وقت انگریزی حکومت کے خلاف تحریکِ سول نافرمانی کا مرکز تھا۔ میں بھی فطری طور پر قومی آزادی کے جذبے سے معمور ہوگیا۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران میں میں نے لکھنا شروع کیا۔ افسانے، ڈرامے، نظمیں، تنقیدی مقالات، علمی مضامین، سب کچھ۔ پڑھنے کا یہ حال کہ کبھی کسی خاص ترتیب یا خیال سے نہیں پڑھتا تھا۔ لیکن ادب، تاریخ، فلسفہ، سیاست، نفسیات اور جنسیات سبھی سے دلچسپی لیتا تھا تاکہ میں زندگی کے مسائل کو پوری طرح سمجھ سکوں۔ آخرکار میرا سارا وقت تنقید سے دلچسپی لینے اور تنقیدی مضامین لکھنے میں صرف ہونے لگا۔ ۱۹۳۶ء میں میرے خیالات ایک نئے سانچے میں ڈھلنے لگے۔"

اس نئے سانچے کی تفصیل یہ ہے۔

"میرا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی ملک اور قوم کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی جڑیں اس کے سماجی نظام میں پیوست ہوتی ہیں اور ان کو اس سے الگ کرکے دیکھنا کبھی صحیح نتائج تک نہیں پہنچا سکتا۔ میں نے اپنی تمام تحریروں میں یہ بات ظاہر کی ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ ایسا آئینہ نہیں جس میں صرف زندگی کے ٹھہرے ہوئے نقش دیکھے جائیں بلکہ ادب متحرک ہے [illegible] زندگی [illegible] حاصل کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ میرا خیال [illegible] بدی نہیں ہے بلکہ حالات نے ایسا بنا دیے ہیں [illegible] آسودہ حال زندگی بسر کرنے کا موقع دیں [illegible] ہے۔ انسان دوستی پر مبنی بین الاقوامیت [illegible] دنیا قبول کرتی ہے اور ہر قوم کی شخصیت [illegible] اصل منزل ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ دائمی امن [illegible] ترقی کی جانب بڑھ سکتا ہے۔ دنیا کے بہتے [illegible] جانب رہنمائی کر رہے ہیں۔"

اردو کے بارے میں احتشام صاحب نے فرمایا:

"میں جس زبان میں لکھتا ہوں وہ اردو ہے [illegible] کی ابتدا تک ملک کی عام زبان کی حیثیت حاصل تھی لیکن حالات [illegible] قدر تیزی سے بدلے ہیں اور فرقہ وارانہ سیاست نے وہ [illegible] کہ ہندوستان میں اس کی زندگی مشکل ہو رہی ہے تاہم یہ کہہ سکتا ہوں [illegible] ادب موجود ہے اور اب بھی پیدا ہو رہا ہے۔ اور میں اس کی [illegible] کی کوشش کرتا رہوں گا۔"

یہ اقتباسات نہ صرف احتشام صاحب کی شخصیت کے [illegible] ہیں بلکہ ان کے طرزِ تحریر کا بھی اچھا نمونہ ہیں۔ جس کی جڑیں [illegible] احمد خاں اور حالی کے سیدھے، سچے، کھرے، مدلل اور معرا اسلوب سے ملی ہیں۔ یہ طرز شاید ان لوگوں کو ملتفت نہ کرے گا جو محمد حسین آزاد اور [illegible] شبلی اور چٹخارے دار زبان کے دلدادہ ہیں لیکن دراصل [illegible] ترسیل و ابلاغ کی زبان ہے اور اسی طرز سے جو مشکل خیالات کو آسان لفظوں میں واضح کرتا ہے اردو نثر کا مستقبل وابستہ ہے۔

احتشام صاحب محض قلم کے بادشاہ نہیں تھے۔ وہ اردو اور انگریزی دونوں میں ایک کامیاب مقرر اور اپنے استاد ڈاکٹر سید اعجاز حسین کی طرح ایک [illegible] معلم تھے۔ انہوں نے لکھنؤ اور الٰہ آباد کے ہزاروں طالب علموں کو جن میں ڈاکٹر محمد حسن سے لے کر راقم الحروف تک شامل تھے اپنی مثال سے یہ سکھایا کہ تعلیم کا مقصد امتحان پاس کرنا یا ڈگریاں جمع کرنا نہیں بلکہ ذہن کی کشادگی، ذوق کی تربیت، کیرکٹر کی تشکیل اور نتیجتاً ایک اچھا شہری بنانا ہے۔ احتشام صاحب نے کبھی یہ فکر نہیں کی کہ وہ بھی [illegible] یا ڈی لٹ کرلیں لیکن وہ پڑھتے سوچتے اور لکھتے رہے۔ دوسرے [illegible] رہے۔ انہوں نے کوئی ایک درجن بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں [illegible] ان کے اعلیٰ مقام کی ضامن ہیں۔

قرۃ العین حیدر
[illegible]

کارِ جہاں دراز

باب ۷

غدر ۱۸۵۷ء

مزاجِ دہر تباہ ہو چکا۔ رات کے آسمان پر سرخ مریخ دہک کے انگارہ ہوگیا۔ بعذاذ دونوں وقت ملتے ایک دُمدار تارہ خلقت کو نظر آتا ہے۔ گاؤں گاؤں چپاتی بٹی۔ راتوں کے سناٹے میں ایک پُراسرار فقیر بھیانک آواز میں صدا لگاتا پھرتا تھا۔

منکہ میر احمد علی ترمذی ابن حضرت اخوند امام بخش ترمذی نہٹوری میرٹھ چھاؤنی میں تعینات تھا۔ جب کمان افسر نے حکم دانتوں سے کارتوس کاٹنے کا دیا، سپاہیوں نے انکار کیا۔ بغاوت شروع ہوئی۔ کچھ دیر بعد اتفاقیہ تو پخانے کا خلاصی لین میں سے گزرا اور بولا آج پریڈ کے میدان میں تہ ٹھہرنا، ہمیں حکم مل چکا ہے کہ باغیوں کو توپ سے اڑا دیں۔

دوسرے روز ایک صوبیدار نے انگریز افسر سے چغلی کی۔ فلاں فلاں مفسدین ہیں ان کو قید کیجئے۔ کمان افسر نے ستر سواروں کو جیل خانے بھجوا دیا۔ بعد ازاں ان کو میدان میں لاتے پابجولاں بازار میں سے گزارا۔ بالاخانوں پر سے اسباب نشاط نے غیرت دلائی کہ چوڑیاں پہن لو۔

دوسرے دن ۱۵ ماہِ رمضان مبارک بعد نمازِ ظہر اس رسالے کے سپاہی مسلح ہو کر جیل خانے پہنچے بنگلوں میں آگ لگائی۔ شدید نقصان جانی مالی انگریزوں کا ہوا۔

ہم بھی اس معرکے میں شریک تھے کیونکہ دین خطرے میں تھا۔

آدھی رات کو دلی مارچ کیا۔ ۱۶ تاریخ ماہِ رمضان مطابق ۱۱ مئی ہمارے ایک سوار نے ثمن برج کے جھروکے کے نیچے پہنچ کر میر فتح علی خاں داروغۂ تختِ شاہی سے بات کرنا چاہی۔ میر صاحب اس وقت کنارِ جمنا حضرتِ خداوندی کے سامنے نماز پڑھتے تھے۔ سلام پھیر کے انہوں نے استفسار کیا "کیا کام ہے"؟ سوار نے کہا "فوج لایا ہوں۔ فوراً جہاں پناہ سے عرض کیجئے کہ ہم نے صاحبان کو میرٹھ میں قتل کیا اب اسی ارادے سے دلی آئے ہیں"۔

بعد اس کے جو کچھ ہوا سارے عالم کو معلوم ہے۔

ہم اس معرکے میں جا بجا لڑے۔ باڑھ بندوق کی گراب توپ کا سرسو پڑنے لگا۔ ہم نے اپنے مورثِ اعلیٰ کے فرزند ملک ابراہیم فاتحِ لشکرِ شہاب الدین محمد غوری کو یاد کیا اور نعرۂ تکبیر اور نعرۂ حیدری بلند کر کے دشمنوں پر جا پڑے۔ متعدد فرنگیوں کو تلوار کے گھاٹ اتارا[1]۔

بہت جلد غدر سارے دوآبے میں پھیلا۔ خاص ہمارے وطن قصبہ نہٹور ضلع بجنور میں ایک خفیہ جماعت قائم ہوئی یہ بارہ ٹوپی والے کہلائے۔ ان میں سید کرامت حسین، سید الطاف حسین، سید عنایت حسین، میراں امتیاز علی اور نواب رحمت خان وغیرہ شامل تھے انہوں نے سرکاری چوکیوں پر شبخون مارے۔ سارے ضلع میں باغیوں نے مورچے کئے اور توپ کو آگ دی۔ تفصیل جنگِ بجنور کی جو ہمارے برادرِ بزرگ بندے علی صاحب تحصیلدار کے دوست سید احمد دہلوی نے کہ اس وقت بجنور میں صدر امین تھے، رقم کی ہے، حالاتِ چشم دید بیان کئے ہیں۔ واقعات صحیح ہیں لیکن اندازِ بیان میں رویئے کا فرق ہے۔ سید موصوف روشن دماغ عالم فاضل انسان ہیں۔ قوم کا شدید درد دل میں رکھتے ہیں۔ خیال ان کا یہ ہے کہ اس دورِ نکبت و ادبار میں حکومتِ انگلیشیہ سے وفاداری مسلم قوم کے حق میں عین مناسب ہے۔

جس وقت ہنگامے کا بجنور میں آغاز ہوا صاحب لوگ حسبِ معمول اپنی میم صاحبان اور بابا لوگ کو نینی تال اور کوہ منصوری بھیجنے والے تھے کہ یہ شہر انہوں نے کوہ ہمالہ کی چوٹیوں پر بطرز قصبہ جات ملک اسکاٹ لینڈ آباد کئے ہیں۔ سول لائنز بجنور میں صرف بیس عدد انگریز موجود تھا۔ مسٹر الگزنڈر شیکسپیر کلکٹر ضلع، جارج پامر جنٹ مجسٹریٹ، ڈاکٹر بیٹ سول سرجن۔ جانسن صاحب، مرفی صاحب وغیرہ۔ نیٹو افسروں میں بابو

---

[1] میر احمد علی "ترک سواران راجہ گراس رائے" میں شامل ہوگئے تھے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ راجہ کون تھا اور اس کی ریاست کا کیا نام تھا۔ ق۔ ح

تحصیلدار چرن انگریزی نویس کلکٹری ڈاکٹر تا راچند مین اسسٹنٹ سرجن
اور ہمارے سید احمد دہلوی صدر امین۔

سید موصوف فرماتے ہیں "میرٹھ میں فساد اور نمک حرامی دسویں مئی ۱۸۵۷ء کو ہوئی اس کی خبر گیارہویں تاریخ تک بجنور پہنچی بارہویں تاریخ کو یہ خبر مشہور ہوئی اور رفتہ رفتہ اس کے آثار نمودار ہوتے گئے یعنی کنارگنگا جمنا راہ لٹنے لگی اور آمد و رفت مسافروں کی بند ہو گئی۔ ۱۸ مئی کو ایک کمپنی تلنگوں کی جو سہارنپور سے مراد آباد جاتی تھی بجنور پہنچی۔ ۱۸ مئی ۱۸۵۷ء کو مراد آباد کا جیل خانہ ٹوٹا۔

"قیدی جیل سے نکل آئے سب کے سب دریا کی طرف تھے اور بھاگے جانے تھے۔ کلکٹر خزانے پر آیا۔ محمد صدر امین نے اپنے ہاتھ سے ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ کنوئیں میں ڈال دیا۔

ہزار ہا گوجر گنگا وار اور گنگا پار کے لوٹ مار مچاتے پھر رہے تھے۔ اسی روز شام کو نا محمود خاں[1] مع ساٹھ ستر پٹھان بندوقچی کے بجنور پہنچا۔ اس رات بجنور میں بڑا اندیشہ رہا۔ جناب شیکسپیر صاحب دام اقبالہ اور جناب مسٹر جارج پامر جو اخلاق و عنایت ہمارے حال پر فرماتے تھے ان اخلاقوں اور عنایتوں نے ہمارے دل میں ایسی محبت ان صاحبوں کی ڈالی تھی کہ محبت کے سبب ان صاحبوں کی نسبت جو وہم دل میں آتا تھا بُرا ہی بُرا دکھائی دیتا تھا۔"

تلنگے اب نگینے سے دھام پور پہنچے۔ وہاں ہر سکھ رائے رہیا کے ہاں اس دن برات تھی۔ اس نے برات کا کھانا اور بہت اچھی اچھی مٹھائی تلنگوں کو دی۔ اس لئے انہوں نے وہاں کچھ فساد نہیں کیا اور مراد آباد چلے گئے۔ گوجر جاٹوں، میواتیوں اور بنجاروں کی شورش کے سبب ضلع میں زیادہ تر غدر رہا۔ اور بجنور پر بھی ڈاکہ آنا مشہور تھا۔

"جو رئیسان ضلع حکومت کی کمک کو بلائے گئے تھے۔ ان میں سے چودھری رندھیر سنگھ رئیس ہلدور اور چودھری پرتاپ سنگھ رئیس تاجپور مع سپاہیوں کے احاطہ کوٹھی کلکٹر صاحب میں مقیم ہو گئے۔ دیہات لٹتے رہے۔ مختلف پرگنوں پر ڈاکے پڑے۔ باغیوں نے جگہ جگہ لام باندھے۔ ۲ جون کو کپتان گف صاحب مع سواروں کے میرٹھ سے خزانہ لینے آئے۔ اور پچاس ہزار روپیہ کنوئیں سے نکالا۔ سوار کم تھے اور ڈاکے والوں کے غول کے غول جمع تھے۔ مگر صاحب موصوف بہ کمال بہادری خزانہ ہاتھیوں پر لدوا کر براہ گھاٹ دارانگر میرٹھ چلے گئے۔ ۱۳ مئی تک سب اضلاع روہیل کھنڈ بگڑ چکے تھے۔"

اس پُر خطر وقت میں سید احمد [illegible]
پر پہرہ دیتے۔ کہاں پہنچے رہتیا [illegible]
باغیوں نے انگریزوں کو زندہ چھوڑ دیا۔

"اب اس وقت اور کوئی مصلحت [illegible]
نا محمود خاں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے [illegible]
صاحب میم لوگ مع سواروں کے ہاتھیوں پر [illegible]
"سمجھو اس بات کو کہ وہ سب تنگ [illegible]
سے نا محمود خاں کے پاس بھاگ آئے۔ [illegible]
وہاں پہنچ کر بگڑ گئے۔"

نواب محمود خاں نے صبح ہوتے ہوتے "خلق خدا کی، ملک [illegible] کا، حکم نواب محمود خاں کا" کی منادی پھرادی اور ضلع کا بندوبست شروع کیا۔ انہوں نے سید احمد اور دوسرے ملکی افسروں سے [illegible] حسب سابق اپنے فرائض انجام دیتے رہیں۔ سید احمد کو آزاد حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دی اور جاگیر پیش کی مگر سید موصوف نے [illegible] کر دیا اور نواب سے کہا "خدا کی قسم نواب میں صرف تمہاری [illegible] کے لئے کہتا ہوں کہ تم اس ارادے کو دل سے نکال دو [illegible] کی عمل داری نہیں جائے گی۔"

اسی وقت منیر خاں جہادی نے نگینے سے بجنور پہنچ کر انگریزوں کو شہر سے زندہ نکل جانے کے جرم میں سید احمد خاں کو واجب القتل ٹھہرایا۔ پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر مدارس پر الزام لگایا کہ عیسائی کتب ہر جگہ بٹھاتا پھرتا تھا۔ منیر خاں نے سید احمد سے [illegible] بحث مباحثہ کیا پھر دلی چلا گیا۔

جون کے مہینے میں بریلی کی باغی فوج کی کمان [illegible] خاں نے سنبھالی۔ حافظ رحمت خاں کے پوتے خان بہادر خاں کو بہادر شاہ ظفر کی طرف سے صوبہ کٹھیر کا وائسرائے مقرر کیا گیا۔ [illegible] نے راجپوتوں کا تعاون حاصل کیا۔ خوشحال رام [illegible] حکومت کا [illegible] مقرر ہوا۔

اب انگریزوں نے پٹھانوں اور راجپوتوں کی آزاد مشترکہ حکومت ختم کروانے کے لئے ہندو بغاوت کا انتظام کیا اور پچاس ہزار روپے [illegible] مقصد کے لئے کپتان گودانی کو دیا گیا۔ وہ ناکام رہا مگر بجنور [illegible] کے وفادار ہندو چودھری نواب محمود خاں کے خلاف [illegible]

سید احمد خاں لکھتے ہیں:

"قلقلہ ہوا کہ بہادر خاں نے فرمان [illegible]
دلی سے حاصل کیا۔ نا محمود خاں کو بڑا تردد ہوا کہ ایسا نہ [illegible]

---

[1] نواب نجیب الدولہ کے پڑپوتے نواب محمود خاں

...بادشاہ کو کہیں!

...کے زمیندار نواب ماندے خاں اور احمد اللہ ... سے مطالبہ ... کے آدمی چودھری امراؤ سنگھ سے مطالبہ ... نوری ... گئے نواب ... شیر کوٹ پہنچ گئے۔ ... بجنور آئے ... ناصر ... الملک ... محمود خاں بہادر مظفر جنگ انگریزوں ... زور شور کا اعلان کروا دیں!

... احمد اللہ خاں نے امراؤ سنگھ سے ... کر ... ایک لاکھ کر دیا۔ اب باقاعدہ جنگ شروع ہوئی۔ احمد اللہ ... نے ... پر آگ لگا دی۔ ماندے خاں اور دوسروں نے ... سے ... امراؤ سنگھ نکل بھاگے۔ گڑھی فتح ہوئی۔ ... چودھریوں نے مل کر احمد اللہ سے گڑھی چھیننے کا ارادہ کیا۔

... پور میں چودھری صاحبان توپیں لے کر جمع ہوئے۔ دیہہ بدیہہ گنواروں ... ڈھول واسطے جمع ہونے اور لام بندی بجنے لگا۔

سید احمد خاں ... فرماتے ہیں کہ اب تک بجنور میں تنازع ... مذہبی تکرار نہ تھی۔ چودھریوں کے ہاں مسلمان اور مسلمان زمینداروں کے ہاں ہندو ملازم تھے۔ مگر اب باقاعدہ ہندو اور مسلم ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ شیر کوٹ کا مندر مسمار ہوا۔ کئی مسجدیں شہید ہوئیں۔ افواہ پھیلی کہ احمد اللہ خاں نے محمدی جھنڈا کھڑا کیا ہے۔

شیر کوٹ کی دوسری لڑائی میں احمد اللہ کی سپاہ مغلوب ہوئی۔ اس کے بعد ہلدور کے چودھریوں نے بجنور پر چڑھائی کر دی۔ نواب محمود خاں کو بھاگ کر نجیب آباد جانا پڑا۔ چودھریوں نے کلکٹر کی کوٹھی پر قبضہ کر لیا جس میں اس وقت تک نواب محمود خاں فروکش تھے۔ گنواروں نے خوب سول لائنز کی کوٹھیاں لوٹیں۔

اب ڈونڈی پٹی "خلق خدا کی ملک بادشاہ کا حکم چودھری نین سنگھ بجنور والے اور ہلدور کے چودھریوں کا۔" ہندو مسلمانوں نے ایک دوسرے کے محلے لوٹنے شروع کئے۔

"مذہبی عداوت کا جو بیج شیر کوٹ میں بو یا گیا تھا۔ بہت بلند ہو گیا۔ چودھری ... امراؤ سنگھ اس بات کے درپے تھے کہ ہندو مسلمانوں کی تکرار نہ بڑھے۔ مگر وہ گنوار چودھریوں کی حیثیت کب سمجھتے تھے۔"

نواب محمود خاں نے پھر بجنور پر فوج کشی کا بندوبست کیا۔ ... پڑا کر نواب چڑھ آیا۔ چودھری جودھ سنگھ جو کنویں ... کوشش کرنے کو بیٹھے تھے۔ ایسے بے اوسان گھر پہنچے کہ

سب کی جان ہوا ہو گئی۔[1] سید احمد خاں، سید تراب علی اور پنڈت رادھا کشن جو اب تک اپنے اپنے مکانوں میں دروازے بند کئے بیٹھے تھے۔ ان کو یقین ہو گیا کہ نواب ان کی جان نہیں بخشے گا۔ چنانچہ یہ تینوں چودھری نین سنگھ کے آدمیوں کے ساتھ ہلدور پہنچے اور وہاں سے انہوں نے اور چودھری صاحبان ہلدور نے میرٹھ عرضیاں بھیجیں کہ فوج انگریزی بجنور بھیجی جائے۔ وہاں سے مسٹر ولسن جج و اسپیشل کمشنر کا جو خط آیا وہ قابلِ غور ہے۔

"رفعت و عوالی مرتبت گرامی قدر چودھری امراؤ سنگھ سلمہ الرحمٰن۔ اس قدر ظلم یعنی غارت گری جان و مال و قتل عزیزان تمہارا پٹھان لوگ نہ کرتے تو تم سب رؤسا ہنود یک دل ہو کر کیوں ان کو نکالتے۔ اب تم سب ہنود نے اتفاق کر کے اس ظالم نواب کو نکال دیا۔ اب بفضلِ خدا سب تکالیف تمہاری جلد رفع ہو جاتی ہیں۔ شیکسپیر صاحب بھی بہاڑ سے بلا لئے گئے ہیں اور ہم تھوڑی فوج معتبر لے کر عنقریب آویں گے۔ حال لگانے توپ کا آپ کے مکان پر بہ نسبت بھانجہ نواب ظالم جو آپ نے لکھا ہے۔ سوا اہلِ ہند جنہوں نے توپ نہیں دیکھی۔ وہ توپ سے بہت ڈرتے ہیں۔ اگر یہ پٹھان لوگ تم اہلِ ہنود پر توپ لگا دیں تو یہ تدبیر کرنی چاہیئے کہ ـــــ" وغیرہ وغیرہ۔

سید احمد خاں اور محمد رحمت خاں ڈپٹی کلکٹر ہلدور سے بجنور آئے اور ضلع کا انتظام بحکم ولسن صاحب اپنے ہاتھ میں لیا۔ "جب ضلع ہمارے سپرد ہوا میری رائے یہ تھی کہ پرانے الفاظ منادی کے یعنی خلق خدا کی ملک بادشاہ کا حکم کمپنی بہادر کا" بدلے جاویں اور پکارا جاوے کہ ملک ملکہ وکٹوریہ شاہ لندن کا۔ تاکہ عوام الناس بغیر شک کے یہ بات سمجھیں کہ درحقیقت ملک کس کا ہے اور ہمارا بادشاہ کون ہے۔ لیکن بلا اجازت حکام، اس باب میں رائے دینی دوسرے وقت پر موقوف رکھی۔"

محمد رحمت خاں و سید احمد خاں نے ۱۶ اگست کی رپورٹ میں مسٹر جارج پامر کو مطلع کیا کہ سوا پرگنہ نجیب آباد سب طرف امن ہے قصبہ نہٹور اور سیوہارہ وغیرہ میں کچھ لوگ بہ ارادۂ فساد جمع ہوئے تھے ان کو متفرق کرنے کے لئے تدبیریں کی گئی ہیں۔" محمود خاں جنگ کی تیاری میں مصروف تھے کہ محرم آ گیا جس میں مزید فساد ہونا لازمی تھا۔ سنہ رجمنٹ مظفر نگر پہنچنے والی تھی۔

نگینے میں بشنوئیوں اور مسلمانوں میں جنگ ہوئی۔ احمد اللہ خاں نے

---

[1] مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاریؒ کا معتقد فرقہ۔ مخدومؒ کی مجسم ہستی کے نام سے پرستش کرتا ہے۔

یکم محرم، ۲۲ اگست توپ نکالی۔ محمدی جھنڈا کھڑا کیا۔ نگینہ پہنچ کر بشنوئی سرائے پر توپ لگا دی۔ بشنوئی مکان جلا دیئے گئے۔ سید تراب علی تحصیلدار کے قتل کا حکم دیا۔ مگر چونکہ سب پٹھان سید کا قتل برا سمجھتے تھے۔ اس لئے ان کی جان بخشی ہو گئی۔ ۲۶ اگست کو احمد اللہ خاں، ماڑے خاں وغیرہ نے ہلدور پر چڑھائی کے ارادے سے نہٹور کو کوچ کیا۔ ۲۷ کو چودھری رندھیر سنگھ وغیرہ نقارہ بجاتے، نشان اڑاتے، توپ اور جزائیل کے ساتھ مقابلے کو روانہ ہوئے۔ نہٹور سے احمد اللہ خاں کا لشکر چلا۔ بان ندی پر مقابلہ ہوا۔ چودھری صاحبان پسپا ہو کر ہلدور میں داخل ہوئے جہاں خندق کھدی تھی۔ دمدمہ بنا تھا۔ "یہ توپیں لارڈ لیک نے نواب احمد بخش والیٔ فیروزپور جھرکہ کو دی تھیں اور چودھریوں نے نیلام شمس الدین خاں کے وقت خرید لی تھیں۔" اب نواب کی توپ نے گولہ باری شروع کی۔ ہلدور میں زبردست آگ لگی۔ اس کے بعد احمد اللہ خاں بجنور آگئے۔

احمد اللہ اور ماڑے خاں کا ارادہ تھا کہ ہلدور فتح کر کے تاجپور پر چڑھائی ہوگی۔ نہٹور میں منادی ہو گئی تھی کہ ہلدور اور تاجپور کی لوٹ معاف ہے۔ دوسرے روز ہلدور میں قتل عام ہوا —— سارا ہلدور جل گیا۔ "پھوس کا نام ہلدور سے جاتا رہا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی چڑیا ایک پھوس کا تنکا اپنا گھونسلہ بنانے کو قرض مانگتی تو بھی نہ ملتا۔"

اس وقت سید احمد دہلوی اور سید تراب علی ہلدور میں چودھریوں کی حویلی کے اندر پناہ گزیں تھے۔ ۲۹ کی رات بدقت تمام پیادہ پا وہاں سے نکلے اور باغیوں کی پرسش جھیلتے موت کے منہ سے بچتے میرٹھ پہنچے۔ ۳۰ اگست کو احمد اللہ خاں نے ہلدور پر حملہ کر دیا۔ لیکن جب گڑھی فتح نہ کر سکے تو نہٹور پہنچے۔ یکم ستمبر کو نہٹور سے بجنور کوچ کیا۔

ہلدور کے دوسرے معرکے کے بعد تمام ضلع پر نواب محمود خاں کا تسلط قائم ہو گیا۔ کچہری کی نئی مہر پر بنیدحن پر "واللہ ملک السموات" بڑھایا گیا۔ سنہ عیسوی کے بجائے سنہ ہجری اور ضلع بجنور کے بجائے حکومت نجیب آباد لکھا گیا۔ نواب کے معتمد سعد اللہ خاں تحصیلدار نگینہ نواب کی طرف سے چودھریوں سے صلح صفائی کرنے کی غرض سے نہٹور گئے۔ مگر چودھریوں نے صلح نہ کی۔ ۱۸ ستمبر کو ہلدور کے چودھری نواب سے پھر لڑے اور پھر ہار گئے۔ اب سعد اللہ خاں نے ان کو لکھا۔ غور فرمائیے کہ قدیم وضعداری اور اخلاق کا کیا عالم ہے:

"چودھری صاحب مشفق و مہرباں دوستاں سلمہ اللہ تعالیٰ بعد سلام شوق واضح ہو خط تمہارا پہنچا۔ حال دریافت ہوا۔ ہم کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے ایام کچھ برے آگئے ہیں۔ ورنہ ہرگز تم سے ایسی بات ظہور میں نہ آتی کہ تم مجھ سے اندیشہ کرتے ہو۔ اور میں تم کو اپنے فرزند سے کمتر نہیں جانتا جبکہ تم میرے کہنے سے باہر ہو تو پھر کیا علاج کروں [illegible] تم میرے پاس نگینہ چلے آؤ۔ اور اگر ایسی ہی لیت و لعل [illegible] اور برباد ہو جاؤ گے۔ جب تم مجھ کو اپنا مربی جانتے ہو تو پھر [illegible] وغیرہ وغیرہ

صلح صفائی کی اس کوشش کے بعد نواب محمود خاں کا بڑا [illegible] خاں مع ماڑے خاں لشکر کے نہٹور روانہ ہوا تا کہ اگر چودھری [illegible] حاضر نہ ہوں تو ہلدور پھر تباہ کر دیا جائے۔ اب نہٹور کے [illegible] وغیرہ کے ذریعے چودھری رندھیر سنگھ کو پیغام بھیجا گیا۔ اور وہ [illegible] پر راضی ہوئے۔ ۲۵ ستمبر کو انہوں نے نہٹور میں نواب غضنفر علی خاں سے ملاقات کی۔ ایک پیش قبض اور پچاس روپے نذر دیئے۔ غضنفر علی خاں نے ایک دوشالہ بطور خلعت دیا۔ پھر چودھری امراؤ سنگھ بھی نجیب آباد گئے۔ نواب محمود خاں کو اشرفیاں نذر کیں۔ نواب نے دوشالہ عطا کیا۔

چودھری امراؤ سنگھ شیرکوٹ سے نجیب آباد روانہ ہوئے ہیں کہ غضنفر علی خاں اور ماڑے خاں نے دوبارہ ہندوؤں کا قتل عام شروع کر دیا۔ ہلدور پر حملہ کیا گیا۔ ہلدور کی تیسری لڑائی میں گڑھی فتح ہو گئی۔ ۲ نومبر کو احمد اللہ خاں کا لشکر حویلی میں داخل ہوا۔ چودھری رندھیر سنگھ کو گرفتار کر کے نجیب آباد لے گئے۔ چودھریوں کے مکانات جلا دیئے گئے۔ ہلدور میں الو بولنے لگا۔

۱۰ نومبر کو ہلدور روانگی کے وقت نواب ماڑے خاں نے چودھری پرتاپ سنگھ رئیس تاجپور کو خط لکھا

"چودھری صاحب مشفق و مہربان کرم فرمائے۔ بہرحال نیاز منداں چودھری پرتاپ سنگھ سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام شوق اینکہ ارادہ لشکر اینجانب بطرف تاجپور است۔ کہ آں صاحب تدبیر رسد وغیرہ سازند چناں نشود کہ بہ کسے ہیچ تکلیف مردمان لشکر را شود باقی خیریت است

فقط رقیمہ الشوق

ماڑے خاں از مقام چاندپور"

یہ پروانہ ملتے ہی بے چارہ چودھری ڈر کر گڑھ مکتیسر چلا گیا۔

اب احمد اللہ خاں تحصیلدار ان ضلع کے نام پروانے جاری کیا کہ معافیات عہد انگریزی میں ضبط ہو کر جمع مقرر ہو گئی ہیں۔ وارثان کو معاف و بحال رکھی جائیں گی۔

۱۶ فروری ۱۸۵۸ء کو شیکسپیر و پامر صاحبان رڑکی پہنچے۔ چودھریان ضلع بجنور نے جو گنگا پار پناہ گزین ہو چکے تھے۔ ان سے رڑکی جا کر

[illegible] جنگ میں انگریز سرکار روہیلکھنڈ پر حملے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ بجنور میں نواب مظفر علی خان اور مادھو خاں کے مابین نئی مقبوضات کے بارے میں جھگڑے شروع ہو گئے۔

فتح لکھنؤ کے بعد سر کولن کیمپ بل نے فوج روہیلکھنڈ بھیجی جو جنرل [illegible] کی قیادت میں گویا اور سکھ فوج نے ۱۴ اپریل کو گنگا پار کر کے نواب محمود خاں کے لشکر کو شکست دی۔ نواب کے سپاہی منتشر ہو کر جنگلوں میں جا چھپے۔ جب انگریزی فوج مالن ندی پر پہنچی تو نواب کی طرف سے تین توپ کی آواز آئی مگر نجیب آباد خالی ہو چکا تھا۔ شہر میں آگ لگا دی گئی۔ سید احمد خاں لکھتے ہیں: "نہایت افسوس ہے کہ ہمارے حکام کو اس طرح سے شہر کا جلانا منظور نہ تھا۔ شاید اتفاقیہ آگ لگی۔"

نواب محمود خاں کا محل بارود سے اڑا دیا گیا۔ ۲۳ کو نواب کے بھائی جلال الدین خاں اور سعد اللہ خاں کو بحکم جنرل جونز گولی مار دی گئی۔ سارے خاں، احمد اللہ خاں، دلیل سنگھ گوجر اور دوسرے باغیوں نے آخری مورچہ نگینہ میں لگایا۔ اس میں بھی سرکار کو فتح و نصرت حاصل ہوئی۔ بشیکپیر [illegible] صاحبان مع توپخانے غنیمت نگینہ بفتح و فیروزی بجنور میں داخل ہوئے۔ پھر انگریزی لشکر نے مراد آباد کوچ کیا۔ ۲۹ تاریخ سے سید احمد نے کچہری صدر امینی کھول دی۔ انتظام ضلع حیرت انگیز سرعت سے درست ہو گیا۔ جنگل کی راہیں صاف ہو گئیں، تجارت جاری ہو گئی۔

گیارہ ماہ تک روہیلکھنڈ آزاد رہا۔ جب مئی ۱۸۵۸ء میں انگریزی افواج چاروں طرف سے روہیلکھنڈ میں داخل ہوئیں۔ اس وقت خان بہادر خاں کے غازیوں اور ہائی لینڈرز کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ ادھر سے فیض آباد کے مولوی احمد اللہ، شہزادہ فیروز بخت اور ملکہ حضرت محل کی افواج نے شاہجہاں پور پر حملہ کیا مگر بریگیڈیر جونز ظفرمند رہا۔ مولوی احمد اللہ شہید ہوئے۔ نواب محمود خاں کو کالے پانی کی سزا ہوئی۔ مگر انہوں نے جیل میں انتقال کیا۔ بوڑھے خان بہادر خاں بریلی میں تختہ دار پر چڑھے۔ فرخ سیر کا نواسہ فیروز بخت مراد آباد میں خستہ حال خاک چھانتا فقیروں کے بھیس میں لڑتا پھرا۔ آخر شکست کھا کر ایران چلا گیا اور سنتے ہیں وہاں سے زار روس کی عملداری میں پناہ لی۔ میں میر احمد علی یہ سب واقعات دہراتا ہوں تو دل خون ہوتا ہے۔

ہم اس جنگ میں کیوں ناکام رہے؟ مراد آباد برطانیہ کے وفادار نواب رامپور کے زیر اثر تھا۔ بجنور میں ہندو مسلم خانہ جنگی ہوئی۔

یادوں کے چراغ

نازش پرتاب گڈھی

پرتاب گڈھ (اتر پردیش)

وقت آیا ہے تو بیٹھوں مری تنہائی ہے ۔ شہر میں ورنہ ہزاروں سے شناسائی ہے
میرے رستے میں عجب منزل عمر آئی ہے ۔ زندگی اپنی وفاؤں سے بھی شرمائی ہے
سینہ و دل کی اک اک چوٹ ابھر آئی ہے ۔ ہے تنہائی کہ چلتی ہوئی پروائی ہے
میں اڑا پھرتا ہوں سوکھے ہوئے پتے کی طرح ۔ دشت احساس سے وہ تیز ہوا آئی ہے
بجھ میں گم ہے مرے ماحول کا ہنگامہ بھی ۔ مژدہ اے درد! کہ تنہائی ہی تنہائی ہے
تلخئ عہد گزشتہ سے بچا کر نظریں ۔ یاد احباب دبے پاؤں چلی آئی ہے
اجنبی شہر میں لگتی ہے نئی چیز مجھے ۔ ورنہ تنہائی سے مدت کی شناسائی ہے
چارہ گر آئے تو یہ سوچنے لگتا ہوں میں ۔ یہ بھی شاید مرے زخموں کا تماشائی ہے
آنے والا نہ ہو کوئی بھی مگر چونک پڑوں ۔ سادگی نے مری کیا سخت سزا پائی ہے
کب دیا ہوں حد در و دیوار سے دکھ سکھ اپنا ۔ مجھ کو بے رحمئ حالات کہاں لائی ہے
تلخئ شدت احساس بھلا ہو تیرا ۔ اب یہ سودا سے خلل ہے نہ تنہائی ہے
سخت نالاں ہوں خیالات کی یکسوئی سے ۔ دل میں ہر لمحے کی تصویر اتر آئی ہے
دل کی آواز بھی اب دل سے ہم آہنگ نہیں ۔ میری قسمت میں عجب طرح کی تنہائی ہے
جہاں رہتا بھی ہوں اور جس سے برگشتہ بھی ۔ رات رہ رہ کے اسی شہر[1] کی یاد آئی ہے
میرے خوابوں نے کبھی ساتھ مرا چھوڑا نہیں ۔ دھوپ دیواروں سے آنگن میں اتر آئی ہے
تو انہیں عام سے اشعار سمجھ کر نہ گزر ۔ ان میں پوشیدہ مری روح کی گہرائی ہے

دن میں جاگ اٹھتے ہیں یادوں کے چراغ اے نازش
یہ بھی ماحول کا انداز مسیحائی ہے

[1] اپنے شہر پرتاب گڈھ کی طرف اشارہ ہے

(گو سارے ہنود انگریز کے حمایتی نہ تھے۔ بجنور کے راجپوت باغیوں میں ہمارے راجے بھوپ سنگھ پیش پیش تھے) لیکن وہ بھی بیشتر قائدین کے ذاتی مقاصد جداگانہ تھے۔ کچھ اپنا تاج و تخت واپس حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کوئی آپس میں متفق نہ تھا۔ ادبار نے عقلیں سب کی زائل کر دی تھیں۔ جنگ تھا، با دانایان فرنگ۔

آپس کی پھوٹ ہندوستان کا پرانا خاصا ہے۔ اس پھوٹ نے اس سرزمین فردوس نشان کو ہمیشہ تباہ و برباد کیا۔ کجا ست فکر جیکے ورائے بہینے؟

(مسلسل)

وحید اختر
آشنہ منزل، سول لائنز علی گڑھ (یوپی)

گم گشتگی

میں تنہا ہوں، انسانوں کے اس جنگل میں
یہ چہرہ چہرہ کھوج رہا ہوں
وہ آنکھیں، وہ عارض و لب، وہ خال و خط
کھوئے ہیں کہاں
کون پتہ ان کا دے گا
جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے
وہ دشنام طراز ہیں، جان کے بھی انجان بنے
پھرتے ہیں
اپنے غم میں مصلحتوں کے ہاتھوں مجبور و معذور
اس کا پتہ اس کی خیریت جان کے بھی انجان سے ہیں
اس کے عارض و لب میں کوئی رنگ نہیں اب،
دیکھ چکے ہیں
پھر بھی مجھ سے رنگ کی باتیں کرتے ہیں

کون کسی کا دکھ سہتا ہے، کون کسی کو اپناتا ہے
میں نے اسے چاہا تھا، لیکن
آج میں اس سے ہو کے جدا شکوہ سنج تنہائی
ہوں
نشۂ غم میں بھول چکا ہوں
وہ ہو دور مگر اس کا غم دور نہیں ہے

میں نے اس کے لفظوں میں اپنے ہی معانی
ڈھونڈے ہیں
میں نے اپنے لفظوں سے اس کے چہرے کو
ڈھانپ دیا ہے
میں نے غزلوں نظموں میں اس کا وہ پیکر ڈھالا ہے
جو میرا اپنا پیکر ہے
اور وہ مجھ سے یہ کہتی ہے
"تم نے مجھ کو یاد کیا ہوتا تو میں آبھی جاتی
تم تو اپنی شخصیت کو کھوج رہے تھے۔
تم تو اپنی ہی تکمیل کے خواہاں تھے
تم نے مجھے چاہا بھی نہیں، پایا بھی نہیں،
ڈھونڈا بھی نہیں
تم نے مجھے کھویا بھی نہیں
تم نے خود کو چاہا تھا، ڈھونڈا تھا، خود کو
پایا تھا۔
اور اب، اپنے غم کے ہاتھوں خود کو بھی کھو جاتے ہو"

میں تنہا ہوں انسانوں کے اس جنگل میں،
خود میں اپنے ساتھ نہیں ہوں

کاش مجھے کوئی سمجھا دے
یہ میرا غم ہے، اس کا غم کس نے سمجھا

غزل

عشق میں خود کو کھویا ہم نے، خود کو کھو کر پانے کو
خواب تمنا دیکھا تھا، خوابوں کا بوجھ اٹھانے کو

اب ہم دونوں لمحۂ دید کے شکوہ سنج برابر ہیں
کہتے جاؤ ہے وہ نظریں اٹھی تھیں مجھے اپنانے کو

لاکھ تمناؤں کا میلا راکھ کے ڈھیر لگا جاتا ہے
ایک تمنا بہت ہے صدیوں دل کی آگ جلانے کو

اُن کی شکل ہے لمحۂ پراں، ٹھہر گئی تو تصویر تھی
آنکھ سے اوجھل ہو کے تشنۂ خواب ہے نیند اڑانے کو

اک گُلِ افسردہ نے دامن تھاما بکھرے تنکوں کو
ہم تو ہمرہ موجِ صبا آئے تھے پھول کھلانے کو

سختیٔ دوراں کی راہوں میں اک اک ساتھی چھوٹ گیا
ہم تنِ تنہا دشت جنوں میں رہ گئے خاک اڑانے کو

دلبر دل زدگاں سے پہلے دل کی بات سمجھ لیتا
ہیں کہتے نادان وحید آن کو تھے چلے سمجھانے کو

[illegible] حسین
[illegible] اردو
[illegible] ڈائرکٹریٹ ۔ ویسٹ بلاک
آر کے پورم ۔ نئی دہلی

ہند میں اُردو آزادی کے بعد

اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی میل جول کی پیداوار ہے۔ جب فارسی ، عربی اور ترکی بولنے والے مسلمان ہندوستان آئے اور یہیں بس گئے تو سماجی اور انتظامی ضرورتوں کے تحت ایک ایسی زبان وجود میں آگئی جو باہر سے آنے والوں اور مقامی باشندوں کے درمیان گفتگو کا ذریعہ بن گئی۔ اس طرح اس زبان کی داغ بیل پڑی جو اُردو کے نام سے آج کروڑوں ہندوستانیوں کی زبان ہے۔

یوں تو اس زبان کا ڈھانچہ کھڑی بولی کا ہے جو دہلی اور مضافات دہلی کی زبان ہے مگر اس کی ابتدائی نشو و نما دکن میں ہوئی جہاں اسے سرکاری سرپرستی بھی حاصل رہی لہٰذا شروع میں اس زبان کو دکنی ، بعد میں ریختہ ، ہندی اور ہندوی بھی کہا گیا۔ دکن کے بعد شمالی ہندوستان میں اُردو کو مقبولیت حاصل ہوئی اور عوام کے ساتھ ساتھ خواص نے بھی اسے اپنایا۔ جگہ جگہ اُردو کے مشاعرے ہونے لگے اور اُردو نظم و نثر کو ہمہ گیر مقبولیت حاصل ہوئی ۔ اس طرح اُردو لاہور سے لے کر کلکتہ تک یعنی شمالی اور مشرقی ہندوستان کے ایک بڑے حصے کی زبان بن گئی ۔

تقسیم ملک سے پہلے اُردو پنجاب ، دہلی ، یو۔پی ، بہار اور حیدرآباد دکن کی کثیر آبادی کی زبان تھی۔ ان کے علاوہ ملک کے مختلف حصّوں میں اُردو کے بڑے بڑے مراکز تھے جیسے بھوپال ، رام پور ، کلکتہ وغیرہ تقسیم ملک نے صرف پنجاب کو متاثر کیا۔ اُردو کے تمام دیگر مراکز اور علاقے بجنسہٖ برقرار رہے ۔

ہندوستان میں لسانی بنیادوں پر صوبوں کی تشکیل ہوئی اور چونکہ اُردو کسی علاقے کی اکثریت کی زبان نہیں ہے لہٰذا جموں و کشمیر کے علاوہ اُردو کسی ریاست کی سرکاری زبان نہیں ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سرکاری زبان نہ ہونے کی وجہ سے اُردو کا چلن ختم ہو جائے گا یا اس کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ ہندوستان کی تقریباً ہر ریاست دو لسانی ہے یعنی ہر ریاست میں ایک سے زیادہ زبانیں بولنے والے آباد ہیں۔ ریاستوں کی تنظیم نو سے متعلق سر فضل علی کی قیادت میں جو کمیشن بنایا گیا تھا اس نے لسانی اقلیتوں کے مسائل کو پیش نظر رکھا تھا اور اپنی سفارشات میں تفصیل سے ان باتوں کا ذکر کیا تھا کہ کس طرح لسانی اقلیتوں کی مشکلات کو دور کیا جا سکتا ہے انہیں سفارشات کی روشنی میں حکومت ہند نے ایک لسانی کمشنر مقرر کیا ہے جو براہ راست صدر جمہوریۂ ہند کو جواب دہ ہے۔ یہ کمشنر مختلف ریاستوں کا دورہ کرتا ہے اور لسانی اقلیتوں سے رابطہ قائم کر کے ان کی مشکلات معلوم کرتا ہے اور پھر متعلقہ ریاستی حکومتوں سے رجوع کر کے ان مشکلات کو دور کرنے کی تدابیر کرتا ہے ۔ اس کی تفصیلی رپورٹ ہر سال پارلیمنٹ میں پیش کی جاتی ہے جہاں اس پر بحث ہوتی ہے ۔ اس طرح حکومت نے لسانی اقلیتوں کی تعلیمی مشکلات کو دور کرنے کے لئے ایک بہت بڑا دفتر قائم کر رکھا ہے ۔ اس کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں ایک سہ لسانی فارمولا طے کیا گیا ہے جس کو تمام ریاستوں کی حکومتوں نے منظور کیا ہے۔ اس فارمولے کے تحت ایک طالب علم کو اپنے علاقے کی زبان ، کوئی بین اقوامی زبان اور ایک علاقائی زبان پڑھنا ضروری ہے۔ یعنی بہار کے ایک طالب علم کو علاقے کی زبان ہندی ، بین اقوامی زبان انگریزی اور ایک علاقائی زبان ، بنگلہ ، اُردو ، اُڑیا وغیرہ میں سے کوئی ایک زبان پڑھنا ضروری ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ اس حق کو بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ بچوں کو ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جائے۔ بچوں کی مادری زبان وہی تسلیم کی جائے جو اُن کے والدین یا سرپرست بتاتے ہیں۔ اس مقصد کے تحت اسکولوں میں ایک رجسٹر رکھا گیا ہے جس میں والدین اپنے بچوں کی مادری زبان کا اندراج کراتے ہیں۔ کسی ایک کلاس میں دس یا پورے اسکول میں چالیس بچے اُردو پڑھنے کے خواہاں ہوں تو وہاں اُردو کی تعلیم کا انتظام کر دیا جاتا ہے اگر کوئی اسکول یا ادارہ چاہے تو مقررہ تعداد سے کم بچوں کے لئے بھی اُردو کی تعلیم کا انتظام کر سکتا ہے۔ جن اسکولوں میں اُردو پڑھنے والے طلباء کی اکثریت ہے وہاں ذریعہ تعلیم بھی اُردو ہے یعنی تمام مضامین اُردو کے ذریعے پڑھائے جاتے ہیں۔ جہاں ایسی صورت نہیں ہے وہاں اُردو بطور زبان پڑھائی جاتی ہے۔

حکومت ہند کے لسانی کمشنر کی بارھویں رپورٹ کے مطابق مختلف ریاستوں میں پرائمری اور ثانوی مدارج میں اُردو پڑھنے یا اُردو ذریعہ تعلیم سے پڑھنے والے بچوں کی تعداد بارہ لاکھ کے قریب ہے

(اس میں اُردو کے خاص علاقوں ، دہلی ، پنجاب ، بہار ، جموں و کشمیر ، مغربی بنگال

ہیں پرائمری و ثانوی مدارس میں اُردو پڑھنے یا اُردو کے ذریعے تعلیم پانے والے طالب علم شامل نہیں۔ اندازہ ہے کہ مجموعی تعداد ۳۵ لاکھ سے کم نہ ہوگی۔)

ہر ریاست کے بہت سے ابتدائی مڈل اور ثانوی اسکولوں میں اُردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔ ان اسکولوں میں جہاں ذریعۂ تعلیم اُردو نہیں ہے اُردو کے طالب علموں کو اس کی سہولت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے جوابات اُردو میں لکھ سکتے ہیں۔ سرکاری اسکولوں کے علاوہ مسلمانوں کے ایسے بہت سے اسکول ہیں جو تعلیمی ادارے ہیں اور جنہیں سرکار سے امداد ملتی ہے۔ تعلیمی اداروں کو ۹۵ فی صد مدد دی جاتی ہے اور خرچ کا صرف ۵ فی صد متعلقہ اداروں کو پورا کرنا ہوتا ہے۔

یونی ورسٹی کی سطح پر بی اے تک اُردو بطور ایک مضمون پڑھی جا سکتی ہے بعض ریاستوں میں (جیسے بہار) بی اے کی سطح تک اُردو بحیثیت ایک زبان لازمی طور سے پڑھائی جاتی ہے۔ تاریخ، معاشیات، سیاسیات وغیرہ کے جوابات اُردو کے طالب علم اُردو میں لکھ سکتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ سائنس کی تعلیم زیادہ تر یونی ورسٹیوں میں انگریزی کے ذریعے دی جاتی ہے۔ ہندوستان میں اس وقت ۹۶ یونی ورسٹیاں ہیں جن میں ۳۱ یونی ورسٹیوں میں ایم اے اُردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔ پٹنہ، کلکتہ، الہ آباد علی گڑھ، آگرہ وغیرہ چند یونی ورسٹیوں میں آزادی سے پہلے ایم اے اُردو کی تعلیم کا انتظام تھا مگر اس میں وسعت آزادی کے بعد ہوا ہے۔ آزادی کے بعد ملک میں تعلیم کو بہت فروغ حاصل ہوا ہے جس کے نتیجے میں ہزاروں اسکول اور کالج کھلے ہیں۔ اب کانپور، مگدھ، بہار، دہلی، گورکھپور، بنارس، جموں، سری نگر، ساگر، میسور، وکرم، ناگپور، دلنگیشور جیسی یونی ورسٹیوں میں ایم اے اُردو کے شعبے کھل گئے ہیں۔ وزارت تعلیم حکومت ہند کے ایک ادارے یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کے مطابق گزشتہ سال ان یونی ورسٹیوں میں تقریباً ۴½ سو طلبا ایم اے اُردو کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ تقریباً ۲۵۰ اساتذہ (پروفیسر، ریڈر، لیکچرر) اُردو کی تدریس میں مصروف تھے۔ ۱۴۱ اسکالر پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریوں کے لئے ریسرچ کر رہے ہیں۔ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن مختلف یونیورسٹیوں کے اُردو شعبوں کو کتابوں کی خریداری، پی ایچ ڈی کے طلبا کو اسکالرشپ، اور کتابوں کی اشاعت کے لئے امداد بھی دیتا ہے۔ بعض یونی ورسٹیوں میں غیر اُردو والوں کو اُردو پڑھانے کے سرٹیفکیٹ کورس بھی ہیں۔ یونی ورسٹیوں کے اپنے علمی اور تحقیقی مجلے بھی شائع ہوتے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) جیسی تعلیمی درس گاہوں میں اُردو کا چلن عام ہے۔

ملہ ایسے طالب علموں کے لیے جن کی مادری زبان اُردو ہے اور جو اُردو بطور مضمون پڑھنا چاہتے ہیں۔

اخبارات و رسائل

پریس رجسٹرار آف انڈیا کی رپورٹ کے مطابق

اس وقت ہندوستان سے اُردو کے ۸۹۸ اخبارات اور رسائل شائع ہوتے ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے سب سے پہلے نمبر پر ہندی، دوسرے نمبر پر انگریزی کے اخبارات و رسائل ہیں۔ اُردو کا نمبر تیسرا ہے۔ ان ۸۹۸ اخبارات میں ۴۴ اخبارات روزانہ ہیں، جو ہندوستان کے تقریباً بڑے شہروں سے شائع ہوتے ہیں۔ جیسے کلکتہ سے عصر جدید، آزاد ہند، روزانہ ہند، غازی، پٹنہ سے صدائے عام، ساتھی اور سنگم، بنارس سے آزاد، کان پور سے سیاست جدید اور پیغام، لکھنؤ سے قومی آواز، دہلی سے ملاپ، پرتاپ، تیج، الجمعیۃ (جمعیت العلمائے ہند کا ترجمان) دعوت (جماعت اسلامی کا ترجمان) ملک و ملت، جالندھر سے ہند سماچار، پردیپ، حیدرآباد سے سیاست رہنمائے دکن، بنگلور سے پاسبان، سالار، بمبئی سے ہندوستان، انقلاب جمہوریت، آج، اُردو ٹائمز، بھوپال سے ندیم، مدراس سے مسلمان وغیرہ۔ یہ فہرست مکمل نہیں ہے صرف مثال کے طور پر چند نام گنائے گئے ہیں۔

ان کے علاوہ بہت سے مشہور ہفتہ وار ہیں۔ بلٹز (بمبئی) کا اُردو ایڈیشن ۱۶ ہزار کے قریب شائع ہوتا ہے۔ ادبی ماہناموں میں آج کل (دہلی) شب خون (الہ آباد) کتاب (لکھنؤ) اور شاعر (بمبئی) کو شہرت حاصل ہے مشہور سہ ماہی ادبی رسالہ سوغات بنگلور سے پھر شائع ہونے لگا ہے۔ مقبول فلمی ماہنامہ شمع ۷۳ ہزار کے قریب شائع ہوتا ہے شمع پبلیکیشنز کی طرف سے اُردو ڈائجسٹ شبستان، بچوں کا رسالہ کھلونا اور عورتوں کا ماہنامہ بانو بھی شائع ہوتا ہے۔ ماہنامہ بیسویں صدی کی اشاعت ۲۳ ہزار کے قریب ہے۔ مولانا عبدالوحید صدیقی کا ڈائجسٹ، ہما، ہدیٰ اور واقعات بھی ہزاروں کی تعداد میں چھپتے ہیں۔ دینی رسالوں میں معارف (اعظم گڑھ)، برہان (دہلی)، آستانہ (دہلی)، الفرقان، دارالعلوم (دیوبند) اسلامک ریویو (حیدرآباد) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کی مجموعی اشاعت ۱۴،۶۶ لاکھ کے قریب ہے۔ اگر ایک اخبار اور رسالہ کو اوسطاً پانچ آدمی پڑھتے ہیں تو تقریباً ۷۳ لاکھ افراد ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔

مادری زبان

۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں جن لوگوں نے اپنی مادری زبان اُردو لکھوائی ہے اُن کی تعداد ۲ کروڑ ۸۰ لاکھ ہے۔ اس کے برعکس پاکستان میں ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق صرف ۳۲۹۸۲۰۳ لوگوں نے اپنی مادری زبان اُردو لکھوائی ہے، جس کی تفصیل نیچے درج ہے۔

ملہ یہ اعداد و شمار دسمبر ۱۹۸۰ء کے ہیں

ریاستیں	اعداد و شمار
آندھرا پردیش	۳,۲۹۹,۸۵۴
آسام	۶,۳۲۵
بہار	۴,۹۹۲,۳۸۴
گجرات	۵۸۱,۵۰۰
ہریانہ	۱۹۵,۸۳۶
ہماچل پردیش	۱۰,۱۲۱
جموں و کشمیر	۱۲,۷۴۰
کیرالہ	۱۱,۳۷۴
مدھیہ پردیش	۹۸۸,۲۷۵
مہاراشٹر	۳,۶۹۱,۸۹۸
منی پور	۳۱۱
میگھالیہ	۱,۴۱۰
میسور	۲,۶۳۶,۶۸۸
ناگالینڈ	۲۵۲
اڑیسہ	۲۸۶,۵۴۱
پنجاب	۲۹,۰۰۳
راجستھان	۶۵۰,۹۴۷
تامل ناڈو	۷۵۹,۶۰۷
تری پورہ	۶۷
اتر پردیش	۹,۲۷۳,۰۸۹
مغربی بنگال	۹۵۰,۳۶۳

مرکزی نظم و نسق والے علاقے

جزائر انڈمان و نکوبار	۲,۴۸۸
ارونا چل پردیش	۳۳۰
چنڈی گڑھ	۱,۷۰۳
دادر اور نگر حویلی	۱۳۴
دہلی	۲۳۱,۱۲۷
گوا، دمن اور دیو	۱۹,۲۰۵
لکادیپ، منی کوے اور امین دیوی جزائر	۳۲
پانڈی چری	۳,۳۶۲

کل: ۲۸,۶۰۷,۸۷۴

یہ تعداد اُن لوگوں کی ہے جن کی مادری زبان اردو ہے۔ اس کے علاوہ لاکھوں کی تعداد میں ایسے لوگ ہیں جن کی مادری زبان تو علاقائی زبان ہے مگر وہ اردو بولتے سمجھتے اور پڑھتے ہیں۔ ۱۹۷۱ کی مردم شماری کے اردو زبان بولنے والوں کی تعداد کے حالات ابھی نہیں شائع ہوئے ہیں۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہ تعداد ۳ کروڑ ریکارڈ کی گئی۔

ان کروڑوں افراد میں ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی سبھی شامل ہیں۔ اتنی بڑی آبادی کے لئے رسائل و اخبارات کے علاوہ بے شمار کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں۔ ماہنامہ آج کل دہلی کے اُردو نمبر (اگست ۱۹۶۸ء) کے مطابق ۱۹۴۷ء کے بعد اُردو میں لگ بھگ دس ہزار کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں نظموں اور غزلوں کے مجموعے، افسانے، ناول، ڈرامے، تحقیق و تنقید، مذہبی اور بچوں کی کتابیں اور درسی کتابیں بھی شامل ہیں۔ اس طرح ہر روز اردو کی دو کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ملک میں خواندگی کے اوسط ۳۳ فی صدی کے پیش نظر یہ تعداد حوصلہ افزا کہی جا سکتی ہے۔"

کتب خانے

ہندوستان میں اردو کی بڑی بڑی لائبریریاں قائم ہیں۔ خدا بخش لائبریری (پٹنہ) اور گورنمنٹ اردو لائبریری (پٹنہ) میں اردو کے نوادر جمع ہیں۔ مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ)، رضا لائبریری رام پور اور سالار جنگ میوزیم (حیدرآباد) بھی اُردو کے قدیم و جدید ادب کے بیش بہا ذخیرے سے مالا مال ہے۔ حکومت ہند کے ایک اندازے کے مطابق اس وقت ملک میں چھوٹی بڑی ۲۸ ہزار لائبریریاں ہیں جن میں صرف اردو کی ۳ ہزار لائبریریاں ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بقیہ لائبریریوں میں اُردو کی کتابیں نہیں ہیں۔

اردو ملک کے کروڑوں افراد کی زبان ہے۔ ملک کی بے شمار ادبی اور ثقافتی انجمنیں، مکتب اور مدرسے، اسکول اور کالج، رسائل و اخبارات اپنے طور پر اردو کی ترویج و اشاعت میں لگے ہوئے ہیں۔ ملک کے دستور نے ہر اقلیت کو اس کا حق دیا ہے کہ وہ اپنے تعلیمی اور مذہبی ادارے قائم کرے اور چلائے۔ حکومت ہر طرح اس کو امداد دے گی۔

مندرجہ بالا کوششوں سے قطع نظر حکومت ہند اور مختلف ریاستوں نے اُردو کی ترویج و ترقی کے لئے کیا کیا اقدامات کئے ہیں، ان کا اجمالی ذکر بھی ضروری ہے۔

حکومت ہند: دستور کے آٹھویں شیڈول میں تمام علاقائی زبانوں کو شامل کیا گیا ہے۔ ہر ریاست کی علاقائی زبان جیسے گجراتی، مراٹھی، بنگالی، ملیالم، کنڑ وغیرہ کے ساتھ ساتھ اس شیڈول میں اُردو بھی شامل ہے اس طرح دستوری طور پر اُردو کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اپنے متعدد اعلانات کے ذریعہ

حکومتِ ہند نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اُردو ملک کی ایک قومی اور علاقائی زبان ہے جو کسی ایک علاقے کی بجائے ملک کے بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ حکومت اُردو کی ترقی کے لیے وہ تمام اقدامات کرے گی جو وہ ہندوستان کی دوسری قومی زبانوں کے لیے کرتی ہے۔ چونکہ دستور کے مطابق تعلیم ریاستوں کے دائرہ کار میں ہے، لہٰذا حکومتِ ہند وقتاً فوقتاً ریاستی حکومتوں کی توجہ اُردو والوں کے مسائل کی طرف مبذول کراتی رہتی ہے اور خود بھی ایسے اقدامات کرتی ہے جن سے اس زبان کو بڑھاوا ملے۔

ترقی اُردو بورڈ: ۱۹۶۹ء میں حکومتِ ہند کی وزارتِ تعلیم نے ایک کروڑ روپے کے سرمائے سے ایک ترقی اُردو بورڈ قائم کیا ہے۔ اور بی اے، بی ایس سی کی نصاب کی کتابوں کے ترجمے کا کام اس کے سپرد کیا ہے۔ اس بورڈ نے تقریباً چھ سو کتابوں کا انتخاب کیا ہے جو ترجمے اور تالیف کے لیے ماہرین کے سپرد کر دی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تقریباً ایک لاکھ علمی اور سائنسی اصطلاحوں کا بھی اُردو میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بورڈ ایک انگریزی اُردو لغت اور ایک اُردو اُردو لغت ۵ جلدوں میں، ایک قاموس (انسائیکلوپیڈیا) اور ایک ببلیوگرافی بھی شائع کرے گا۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ بڑی تعداد میں درسی اور نصابی کتابیں تیار ہو جائیں، تاکہ یونیورسٹی کی سطح پر اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا جا سکے۔ اس وقت تک بورڈ کی ۶ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ۱۲ کتابیں پریس جا چکی ہیں۔ اصطلاح سازی کا تقریباً آدھا کام مکمل ہو چکا ہے۔ ان کاموں کے لیے مختلف علوم کے ماہرین کی کمیٹیاں مقرر کی گئی ہیں۔ اس طرح علمی اور سائنسی سطح پر اُردو کے فروغ کے امکانات بڑے روشن ہو گئے ہیں۔

ترقی اُردو بورڈ اسکول کی درسی کتابیں اور بچوں کی معلوماتی کتابیں بھی بڑی تعداد میں شائع کر رہا ہے۔ اُردو کی تعلیم سے متعلق تمام مسائل کا جائزہ لینے کے لیے حکومتِ ہند نے حال میں ایک اُردو کمیٹی مقرر کی ہے جس کے چیئرمین مرکزی ریاستی وزیر برائے اطلاعات و نشریات جناب اندر کمار گجرال اور جوائنٹ سکریٹری اُردو کے مشہور ادیب علی جواد زیدی صاحب ہیں۔

نیشنل بک ٹرسٹ: حکومت کا قائم کردہ ایک دوسرا ادارہ نیشنل بک ٹرسٹ بھی بڑی تعداد میں اُردو کتابیں شائع کر رہا ہے چنانچہ ترقی اُردو بورڈ کی کتابیں شائع کرنے کا کام بھی اسے سونپا گیا ہے۔ یہ ادارہ ملک کی تمام علاقائی زبانوں میں کتابیں شائع کرتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ہمارے مختلف لسانی علاقوں کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع ملے۔ وہ ایک دوسرے کو زیادہ سمجھ سکیں اور ملک میں قومی یکجہتی پیدا ہو۔ یہ ادارہ منافع کے لیے کتابیں شائع نہیں کرتا [illegible] ہوتی ہے۔ اس ادارے کے تحت بچوں کے لیے [illegible] کتابیں شائع ہوتی ہیں جن میں اُردو کی بہت سی کتابیں ہیں۔

ساہتیہ اکادمی: ہندوستانی زبانوں کو فروغ دینے [illegible] کے ادیبوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے اور ان کی [illegible] ایک دوسرے سے روشناس کرانے میں حکومتِ ہند کا یہ ادارہ [illegible] گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ ہر سال ہر زبان کی سب سے [illegible] اور عمدہ تصنیف پر ۵ ہزار کا گراں قدر انعام دیا جاتا ہے۔ اُردو میں اب تک یہ انعام ظفر حسین خاں، ڈاکٹر عابد حسین، خواجہ احمد فاروقی، جگر مراد آبادی، سید مسعود حسن رضوی، فراق گورکھپوری، امتیاز علی عرشی، اختر الایمان، خواجہ غلام السیدین، آنند نرائن مُلا، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، مخدوم محی الدین، حیات اللہ انصاری اور رشید احمد صدیقی (۱۹۷۱) کو دیا جا چکا ہے۔

یہ ادارہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں کلاسیکی ادب کے تراجم بھی شائع کرتا ہے۔ اُردو میں بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں۔

دیگر انعامات: بچوں اور نو خواندہ افراد کے لیے کتابیں لکھوانے کے لیے ہر سال انعامی مقابلے منعقد کیے جاتے ہیں۔ وزارتِ تعلیم کے ذریعے یونسکو کے تحت ہر دو سال پر اور وزارتِ اجتماعی ترقی اور امدادِ باہمی اور وزارتِ تعلیم کی طرف سے ہر سال ایک انعامی مقابلہ ہوتا ہے جس میں دیئے ہوئے موضوعات پر کتابیں لکھوائی جاتی ہیں۔ مصنفوں کو ایک ایک ہزار روپے کا انعام دیا جاتا ہے اور کتاب کی کافی جلدیں حکومت خرید لیتی ہے۔

مالی امداد: اس کے علاوہ حکومتِ ہند متعدد علمی و ادبی اداروں کو مالی امداد دیتی رہتی ہے۔ جن اداروں کو امداد ملتی ہے ان میں اسلامک کلچرل بورڈ حیدرآباد، ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد، ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ اور انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ شامل ہیں۔ انجمن ترقی اُردو کو نئی دہلی میں اُردو گھر کی تعمیر کے لیے ۴ لاکھ روپے کا عطیہ دیا گیا ہے۔ غالب صدی تقریبات (۱۹۶۹ء) کے موقع پر حکومتِ ہند نے گراں قدر عطیات دیئے۔ لاکھوں روپے سے تعمیر کردہ "ایوانِ غالب" نئی دہلی، غالب جیسے شاعر کی شایانِ شان یادگار ہے۔ اس میں ایک لائبریری اور آڈیٹوریم [illegible]

وظیفے: حکومتِ ہند نے ممتاز ادیبوں اور شعراء کو وظیفے بھی دیئے [illegible] ہیں۔ اب تک ڈیڑھ سو ادیبوں و شعراء کو وظیفے دیئے گئے ہیں جن [illegible]

(مرحوم) ، جوش ملسیانی ، تلوک چند محروم (مرحوم) ، یگانہ چنگیزی (مرحوم) ، قاضی عبدالغفار (مرحوم) ، نقش صدیقی (مرحوم) ، سراج لکھنوی (مرحوم) ، دیوان سنگھ مفتوں ، عبدالماجد دریا بادی ، اعجاز صدیقی ، بسمل سعیدی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند

(۱) آل انڈیا ریڈیو۔ اس وزارت کے تحت کام کرنے والے متعدد اداروں نے اردو کی ترویج و ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کی ایکسٹرنل سروسز سے روزانہ نو گھنٹے اردو میں پروگرام نشر ہوتا ہے اس کے علاوہ دوسری سروسز سے بھی اردو کے پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ تقریباً تمام اہم اسٹیشنوں سے اردو کے پروگرام بڑی باقاعدگی سے نشر ہوتے ہیں۔ اردو کے ادباء و شعراء کو عوام سے روشناس کرانے میں ریڈیو نے بڑا کام کیا ہے۔ اردو میں خبریں اور تبصرے اردو جاننے والوں کو حالات حاضرہ سے باخبر رکھتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں ایک ایکٹ کے ڈراموں کا آغاز اور فروغ آل انڈیا ریڈیو کا ہی مرہون منت ہے۔ بڑے بڑے کل ہند مشاعرے ریڈیو کے ذریعہ ہی ملک کے گوشے گوشے میں سننے والوں تک ان کے محبوب شعراء کی آواز پہنچاتے ہیں۔ اردو کو غیر اردو والوں میں مقبول بنانے میں بھی ریڈیو کا حصہ کچھ کم نہیں۔

(۲) پریس انفارمیشن بیورو : اس ادارے کی طرف سے خبریں، تبصرے، خصوصی فیچر وغیرہ اردو اخبارات اور رسائل کو مفت مہیا کیے جاتے ہیں۔ اس طرح وہ چھوٹے اخبارات جو ترجمے اور بلاک وغیرہ پر خرچ نہیں کر سکتے، انہیں پی۔ آئی۔ بی سے فراہم کردہ مواد سے بڑی مدد ملتی ہے۔

(۳) ڈی اے وی پی یہ ادارہ اخبارات کو حکومت کے اشتہار فراہم کرتا ہے۔ حکومت ہند کی یہ واضح پالیسی ہے کہ چھوٹے اخبارات کو زیادہ تعداد میں اشتہار فراہم کیے جائیں۔ اس طرح یہ ادارہ اردو کے چھوٹے اخبارات کو اشتہار فراہم کر کے انہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں مدد دیتا ہے۔

۴۔ پبلیکیشنز ڈویژن۔ یہ ادارہ معلوماتی کتابوں کے علاوہ ایسے موضوعات پر کتابیں شائع کرتا ہے جس سے مفاہمت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی میں مدد ملے۔ بچوں کے لیے بھی کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ اردو کا مشہور و مقبول ماہنامہ "آج کل" بھی اسی ادارہ کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔

۵۔ فلمز ڈویژن۔ یہ ادارہ سب زبانوں میں ڈاکومنٹری اور نیوز ریل تیار کرتا ہے جن میں اردو بھی شامل ہے۔ ہر ہفتہ ایک نیوز ریل تیار کی جاتی ہے۔

ریاستی حکومتیں

یوپی اور بہار میں اردو اکادمیاں قائم ہوئی ہیں جو اردو کی کتابوں پر انعامات، مصنفوں کو مالی امداد اور کتابوں کی اشاعت میں امداد دیتی ہیں۔ یوپی اکادمی ایک اردو یونی ورسٹی کے قیام پر بھی غور کر رہی ہے۔ بعض دوسری ریاستیں بھی مثلاً کشمیر، پنجاب، مہاراشٹر، ہریانہ وغیرہ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو انعام دیتی ہیں۔

متعدد ریاستی حکومتیں اردو کے رسائل شائع کرتی ہیں۔ حکومت بہار کی طرف سے پندرہ روزہ "بہار کی خبریں"، حکومت اتر پردیش کی طرف سے "نیا دور" (ماہنامہ)، حکومت آندھرا پردیش کی طرف سے "آندھرا پردیش" (ماہنامہ)، جموں و کشمیر کی طرف سے دو ماہی "شیرازہ" شائع ہوتا ہے۔

جموں و کشمیر: اس ریاست کی سرکاری زبان اردو ہے اور پرائمری سے لے کر یونی ورسٹی کی سطح تک تعلیم مفت ہے۔ ریاست کی کلچرل اکادمی کے تحت اردو کی بہت سی گراں قدر کتابیں شائع ہوئی ہیں اور متعدد ادباء و شعراء کو انعامات سے نوازا گیا ہے۔ ادیب و شاعر قوم کا سرمایۂ افتخار ہیں اور ان کی مدد اور سرپرستی حکومت کا فریضہ ہے۔

اس طرح مرکزی حکومت کے ساتھ ساتھ ریاستی حکومتیں بھی اردو کی ترقی اور بقا کے لیے کوشاں ہیں کیونکہ اردو ہمارا قومی سرمایہ ہے۔ یہ ہماری ایک نہایت اہم قومی زبان ہے، جس نے آزادی کی جدوجہد کے زمانے میں لاکھوں دلوں کو گرمایا ہے۔ اس زبان میں ہندی کی مٹھاس اور لوچ ہے، فارسی کی شیرینی اور عربی کا زور۔ یہ کروڑوں ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کے آپسی میل ملاپ اور بھائی چارہ کی علامت ہے۔ اس میں گیتا بھی ہے، قرآن بھی ہے، انجیل بھی ہے اور گرو گرنتھ صاحب بھی۔ اس زبان کی ساخت اور مزاج سیکولر ہے۔ اردو کا شاعر و ادیب کبھی ماضی پرست اور احیاء پسند نہیں رہا۔ اس نے شریعت سے زیادہ طریقت کا ساتھ دیا ہے۔ تصوف اردو شاعری کا محبوب موضوع رہا ہے۔ جدید خیالات و افکار کو ہندوستان میں روشناس کرانے میں اردو نے بڑا قابل قدر حصہ لیا۔ راجہ رام موہن رائے کی اصلاحی کوششیں ہوں یا سرسید احمد کی، مولانا ابوالکلام آزاد کی شعلہ بیانی ہو یا عطاء اللہ شاہ بخاری کی آتش نوائی، چکبست کا ہوم رول کا نعرہ ہو یا جوش کا نعرۂ انقلاب، یہ سب اردو کی دین ہے۔

اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور یہیں پھل پھول رہی ہے۔ اس کا مستقبل بڑا روشن اور تابناک ہے۔

جواب طلب امور کے لیے مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک ٹکٹ ضرور بھیجیں۔

فروغِ اُردو کمیٹی

(علی جواد زیدی سے انٹرویو)

زیدی صاحب : مرکزی حکومت نے اُردو کو فروغ دینے کے سلسلے میں ایک کمیٹی کی تشکیل کا فیصلہ کیوں کیا؟

آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ حکومت کی یہ مسلسل پالیسی رہی ہے کہ آئینِ ہند میں مندرج ہر اہم زبان کو خاطر خواہ ترقی کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ اس سلسلے میں اردو کی ترقی و توسیع کے مسائل بھی برابر زیرِ غور آتے رہے ہیں۔ ریاستی اور مرکزی حکومتوں نے مختلف اقدامات کیے ہیں۔ لیکن زبانیں متحرک اکائیاں ہیں اور ان کے مسائل بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اُردو بولنے والے طول و عرضِ ملک میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے کچھ مسئلے تو مشترک ہیں لیکن کچھ مقامی اور علاقائی بھی ہیں۔ ان تمام مسئلوں پر ابھی تک جامع طور سے نگاہ نہیں ڈالی گئی تاکہ مسئلے کے تمام پہلو ابھر کر سامنے آجائیں اور ان کی روشنی میں فیصلے کیے جا سکیں۔ ویسے ریاستوں کی لسانی تنظیم کے ساتھ مختلف علاقوں میں لسانی اقلیتوں کے جو مسائل ابھرے ہیں ان پر غور و خوض کرنے کے لیے اور شکایات کے ازالے کے لیے اقلیتی زبانوں کے مرکزی کمشنر کا ادارہ قائم کیا جا چکا ہے اور کمشنر کی سالانہ رپورٹ پارلیمنٹ میں بھی پیش کی جاتی ہے اور اس پر آزادانہ بحث و مباحثہ ہوتا ہے ان میں اُردو کے مسائل بھی وقتاً فوقتاً زیرِ غور آتے رہتے ہیں۔ اس اعلیٰ اختیارات والی کمیٹی کے قیام سے موجودہ اور سابقہ اعداد و شمار اور حالات و کوائف کی روشنی میں پورا مسئلہ زیرِ غور آئے گا اور تعلیمی، صحافتی، ادبی اور انتظامی میدانوں میں فروغِ اُردو کے امکانات و اسباب پر عمیق نگاہ سے غور و خوض کر کے حکومت کے سامنے سفارشات کی جا سکیں گی۔ کمیٹی مشہور ادیبوں، تعلیمی ماہرین، صحافیوں کے علاوہ وزرا اور اعلیٰ حکام پر مشتمل ہے اور ملک کے ارباب تعلیم و صحافت و ثقافت سے تبادلۂ خیال کر کے جن نتائج پر پہنچے گی وہ یقیناً اُردو کے فروغ کے ضامن ہوں گے۔

کمیٹی کا طریقِ کار کیا ہے؟

کمیٹی اول تو مختلف ریاستوں میں جا کر وہاں کے اہلِ [illegible] اُردو اداروں، ادیبوں، صحافیوں، ماہرینِ تعلیم، سیاسی [illegible] لوگوں سے گفتگو کرتی ہے، اور ان کے خیالات و مطالبات معلوم کرتی ہے۔ ابھی تک یہ کمیٹی چھ جگہوں پر جا کر کوئی دو سو حضرات کو [illegible] علاوہ اس کے کمیٹی نے رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے اشتہارات بھی [illegible] کیے، جن کے جواب میں اب تک کوئی دو سو شکایت نامے، میمورینڈم اور تجویزیں موصول ہو چکی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہم نے ریاستی حکومتوں اور تعلیمی اداروں سے متعلقہ اعداد و شمار بھی مانگے ہیں تاکہ اُردو کی ترقی و تنزل کا جائزہ لیا جا سکے۔ پھر لسانی اقلیتوں کے مرکزی کمشنر کی اب تک شائع شدہ بارہ رپورٹوں کا تجزیہ بھی کیا جا رہا ہے۔ ہم نے تعلیمی، ادبی، صحافتی اور انتظامی امور کے لیے چار سب کمیٹیاں بھی قائم کی ہیں۔ ان کمیٹیوں نے اپنے موضوعات سے متعلق مزید اشخاص کو انٹرویو کیا ہے۔ یہ سب کمیٹیاں پہلے ابتدائی مواد تیار کریں گی جن پر پوری کمیٹی غور کرے گی۔ صحافتی اور ادبی کمیٹیاں اپنے مسودات مکمل کر چکی ہیں۔ تعلیمی کمیٹی نے بھی ایک جزوی مسودہ تیار کر لیا ہے۔ اس ابتدائی مواد اور دوسری شہادتوں اور مطالبات کی روشنی میں کمیٹی اپنی رپورٹ اور سفارشات تیار کرے گی۔

کمیٹی کن مرکزوں کا دورہ کر چکی ہے اور کہاں کہاں جانے والی ہے؟

ابھی تک کمیٹی کے اجلاس دہلی میں اور دیگر اجلاس بمبئی، حیدرآباد، سری نگر، اور لکھنؤ میں ہو چکے ہیں۔ ابھی پٹنہ، چنڈی گڑھ اور بھوپال جانے کا خیال ہے۔

ابھی تک کیا صورتِ حال واضح ہوئی ہے؟

میں اس بارے میں ابھی تک کچھ کہنے کا مجاز نہیں۔

اس رپورٹ کا انجام کیا ہوگا؟

آپ تو ابھی سے انجام کی باتیں کرنے لگے جبکہ کمیٹی کو ملک کے ہر گوشے سے مزید مطالبات موصول ہو رہے ہیں کہ ہم بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ابھی تو رپورٹ تیار ہوگی۔ رپورٹ میں واضح اور اہم سفارشیں ہوں گی چونکہ کمیٹی ذی اقتدار افراد پر مشتمل ہے۔ اور متعلقہ حکومتوں سے گفتگو کی جا چکی ہے اس لیے توقع ہے کہ اس کی سفارشات پر تیزی سے عمل ہو سکے گا اور فروغِ اُردو کی نئی صورتیں نکل سکیں گی تاکہ یہ زبان دوسری اہم زبانوں کے شانہ بشانہ ترقی کر سکے۔

ترقی اُردو بورڈ

(پروفیسر محمد مجیب سے انٹرویو)

مجیب صاحب ترقی اُردو بورڈ کیوں اور کب قائم کیا گیا؟

حکومت ہند ایک عرصہ سے غور کر رہی تھی کہ ملک کی مختلف زبانوں کو کس طرح ترقی دی جائے تاکہ وہ یونیورسٹی کی سطح پر ذریعۂ تعلیم بن سکیں اور جدید علوم و فنون کی کتابیں علاقائی زبانوں میں دستیاب ہو سکیں۔ چنانچہ حکومت ہند نے ہر علاقائی زبان کی ترقی کے لئے ایک کروڑ کی رقم مخصوص کی۔ دیگر زبانوں کی ترقی کے لئے یہ روپیہ متعلقہ ریاستوں کو دیا گیا۔ پھر اُردو کا سوال اٹھا۔ حکومت جموں و کشمیر سے رجوع کیا گیا کیونکہ اُردو وہاں کی سرکاری زبان ہے لیکن بعض دشواریوں کے پیش نظر حکومت جموں کشمیر نے معذوری ظاہر کی لہٰذا ۲۳ اپریل ۱۹۶۹ء کو ڈاکٹر راؤ نے جو اس وقت وزیر تعلیم تھے، اُردو علاقوں کے یونیورسٹیوں کے شعبۂ اُردو کے سربراہوں اور اُردو کے ممتاز افراد کی ایک میٹنگ بلائی ان حضرات نے یہ مشورہ دیا کہ خود مرکز میں یہ ترقی اُردو بورڈ قائم کیا جائے۔

بورڈ کی سرگرمیاں کیا ہیں؟

یہ بورڈ پرائمری سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک کی کتابیں ترجمہ کرا رہا ہے یا لکھوا رہا ہے۔ اب تک مختلف علوم و فنون کی ۵۰۰ کتابیں مترجمین اور مصنفین کو دی جا چکی ہیں۔ ان میں نصاب کے علاوہ ایسی کتابیں بھی شامل ہیں جو اُردو کے عام قاری کے لئے ہوں گی۔ بچوں کے لئے بھی بہت سی مفید اور معلوماتی کتابیں لکھیں یا ترجمہ کی جا رہی ہیں۔ ان کے علاوہ پانچ جلدوں میں ایک اُردو اُردو لغت اور ایک جامع انگریزی اُردو لغت بھی تیار کیا جائیگا۔ یہ کام انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ کے سپرد کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک ببلیوگرافی بھی تیار ہو گی جس میں اُردو کی تمام شائع شدہ کتابوں کا ذکر ہوگا۔ علاوہ ازیں ایک اُردو انسائیکلو پیڈیا تیار ہو رہا ہے۔ جو حیدرآباد کا آزاد ریسرچ انسٹیٹیوٹ تیار کرے گا۔

کیا لغت کے حروف مختلف صاحبوں کو بانٹ دیئے جائیں گے؟

یہ فیصلہ جنرل ایڈیٹر کرے گا۔ جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے۔ شروع سے کوئی ۲۶ پینل بنا دیئے گئے ہیں جو مختلف مضامین کے بارے میں یہ طے کرتے ہیں کہ کون کون سی کتابیں ترجمہ ہونی چاہئیں۔ مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ یہ پینل بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک لاکھ فنی اصطلاحوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ جن کے اُردو متبادل تیار کئے جا رہے ہیں۔ اب تک ۵۰ ہزار اصطلاحوں کو اردو کا جامہ پہنایا جا چکا ہے۔ امید ہے یہ کام ۱۹۷۳ء کے آخر تک مکمل ہو جائے گا کیونکہ اصطلاحات وضع کرنے والی کمیٹیاں اپنا کام سرگرمی سے کر رہی ہیں۔

اب تک ۹ کتابیں تین بچوں کے لئے کچھوا اور خرگوش از ڈاکٹر ذاکر حسین، ہم سب کے باپو۔ سلطانہ آصف فیضی اور ہمارا جسم۔ محمد اکرام اور تین دیگر کتابیں تاریخ فلسفۂ اسلام۔ ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین۔ تاریخ تمدن ہند از پروفیسر محمد مجیب اور ہمارا قدیم سرمایہ از سخی حسن نقوی شائع ہو چکی ہیں۔ بارہ کتابیں پریس میں ہیں اور جلد ہی شائع ہو جائیں گی۔

معلوم ہوا ہے کہ بورڈ نے ان ترجموں کی اشاعت کا کام نیشنل بک ٹرسٹ کو دے دیا ہے۔ کیا مکتبہ جامعہ، مسلم یونیورسٹی پریس یا ایسا کوئی ادارہ انجام نہیں دے سکتا تھا؟

ہاں یہ سوال پہلے بھی اٹھا تھا۔ دراصل کام بہت بڑا ہے۔ لہٰذا یہ کام نہ صرف نیشنل بک ٹرسٹ بلکہ نیشنل کاؤنسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اور پبلیکیشنز بک ٹرسٹ کو بھی دیا گیا ہے۔ سرکاری طور پر براہ راست اشاعت میں کئی طرح کی دشواریاں تھیں۔ اس کے باوجود ہم دوسرے ناشروں سے رابطہ پیدا کر رہے ہیں اور سائنسی موضوعات کی کئی کتابیں ٹائپ میں شائع کرانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ضروری اقدامات کئے جا رہے ہیں۔

کیا بورڈ کے سامنے کوئی ٹائم ٹیبل ہے کہ یہ کام کب تک ختم ہو جانے چاہییں۔ میرا اشارہ انسائیکلوپیڈیا اور ڈکشنری کی طرف ہے۔

دیکھئے جہاں تک ترجموں کا تعلق ہے کسی حد تک ایک ٹائم ٹیبل رکھا جا سکتا ہے۔ اور رکھا گیا بھی ہے لیکن ڈکشنری اور انسائیکلو پیڈیا کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے یہ کام پانچ برسوں میں ختم ہو جائے ممکن ہے نہ ختم ہو سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم یہ ایک کروڑ روپے خرچ نہ کر سکیں کیونکہ جب تک کام سے تشفی نہ ہو روپیہ کیسے خرچ کیا جا سکتا ہے۔

کیا بورڈ کو اور حکومت ہند کو یہ یقین اور اعتماد ہے کہ مستقبل میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کے طالب علم برابر داخل ہوتے رہیں گے۔ اور ان کتابوں کا فائدہ اٹھاتے رہیں گے؟

...ب ہمیں اس سوال میں نہیں پڑنا چاہیے کیونکہ یہ تو اس قسم کی بحث ہوگی
...ب علم نہیں لہٰذا کتابیں کیوں لکھی جائیں اور چونکہ کتابیں نہیں
...ب علم پڑھیں تو کیسے پڑھیں۔ ہمیں یقین ہے کہ مستقبل میں صرف
طالب علم ہوں گے بلکہ ان کے علاوہ اور بھی اُردو داں ہوں
...کتابوں کا فائدہ اٹھائیں گے۔ دراصل ان موضوعات پر اُردو
...ب نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اگر کتابیں چھپیں گی تو ضرور ان کا خیر مقدم
...گا۔ مجھے یاد ہے کہ مکتبۂ جامعہ نے اب سے بہت پہلے ڈاکٹر عابد حسین
...اب نفسیات بعنوان "شباب" شائع کی تھی جو بہت شوق سے
...اس کے علاوہ ایک دوسرا اہم مقصد یہ ہے کہ اُردو داں طبقہ جدید علوم
...سے واقف ہو۔ اُردو میں علمی کتابیں کمیاب ہیں اور اس وقت اُردو
...ے بڑی تعداد میں سارے ہندوستان میں موجود ہیں۔

یہ کتابیں تمام تر تکنیکی موضوعات پر ہیں؟

...ی ان میں تاریخ و فلسفہ کی کتابیں بھی ہیں اور نفسیات اور اقتصادیات
...کی بھی۔ مجھے تو یہ بھی یقین ہے کہ اگر ہماری کتابیں اچھی ہوں گی تو
...طبقہ بھی ان کو پڑھے گا کیونکہ اُردو اور ہندی بہت قریبی زبانیں ہیں،
...خط کا فرق ہے

ترقی اُردو بورڈ اور ایسے کام کرنے والے دوسرے اداروں
کے درمیان کیا تعلقات ہوں گے مثلاً نیشنل بک ٹرسٹ،
ساہتیہ اکیڈمی

ساہتیہ اکیڈمی تو صرف ادبی کتابیں چھاپتی ہے اور نیشنل بک ٹرسٹ قومی
اہمیت کی کتابیں۔ ہمارا میدان دوسرا ہے۔ پھر بھی یہ کوشش کی جاتی ہے کہ جو کام
ایک ادارہ کر رہا ہے یا کر چکا ہے، وہ دوسرا ادارہ نہ کرے۔

کیا ترقی اُردو بورڈ اور اُردو کمیٹی کے قیام کے پیش نظر آپ
یہ کہہ سکتے ہیں کہ حکومت بہر حال اُردو کو اس کا جائز مقام
دلانے کی کوشش کر رہی ہے؟

مجھے حکومت سے شکایت نہیں۔ گلہ تو اپنوں سے ہے۔ اُردو داں طبقوں
سے جو اُردو کی طرف سے غفلت برتتے رہے ہیں۔

••

مداری

اگر وہ مجھے پیچھے سے پکار لیتا — ابا
تو میں کیا یہیں پل بھر کو اس کے لئے ٹھہر سکتا تھا؟
آنسو مٹی میں گرے کہ دامن میں جذب ہو۔ پلکوں سے چھوٹنے کے بعد یہ فکر بیکار ہوتی ہے۔

کیسی کیسی راحتیں تیج کر عمر کی کشتی میں ڈولتے ہم کتنی مسافتیں طے کر لیتے ہیں۔ دیلٹ کر دیکھنے کی فرصت ہے نہ یاد ہی کر لینے کا یارا۔

آج کوئی دامن پکڑ کر پوچھتا بھی تو نہیں جو شرم سے گردن جھک جائے اور کہتے ہیں گردن اٹھا کر چلتا ہوں۔ سر افراز سربلند۔ لیکن سچ پوچھو تو ہم کہاں کہاں جا کر اس بیسوا زندگی سے مصالحت کر لیتے ہیں۔

راحت کی عمر ہوگی چودہ برس۔ بالی سی عمر گڑیاں کھیلنے کے دن۔ کچھ سمجھے بغیر تیند کے آغوش میں اپنا آپا تیج دینے کی راحتیں اور یہ لڑکی مجھے اس منزل پر ملی جہاں ابھی ابھی میری مسیں بھیگی تھیں اور اس کے لئے نعمت پر چڑھ کر کچے شہتوتوں سے اس کا دامن بھر دینا میرے لئے فخر کی بات ہوتا۔

اللہ کچی کچی املیاں۔ راحت کا جی میرے ہوتے بھلا یوں ترس سکتا تھا۔

پتھر اچھال کر درخت پر سے سارا اور ہری املیاں میں نے اس کے دامن میں بکھیر دیں۔

اور ہم نے کتنی ہی کچر کچر چبا کر تھوک ڈالیں۔

برسات سے جل تھل ہوتے ہوئے میدان میں ایک دوسرے کو پکڑنے کے لئے بھاگنا اور پھر ایک دوسرے کی دسترس سے نکلنے کے لئے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں اتر جانا — پانی کے چھینٹے اڑا کر کھیلنا اور پھر خود بخود سے ایک دوسرے کے گیلے کپڑوں میں سے چھنتے ہوئے بدن کو جھانکنا۔

پھر ہاتھ بڑھا کر اس کی لمبی لمبی گھنی سیاہ اور بھیگی زلفوں کو اپنے ہاتھ پر لپیٹ لینا۔

وہ گر رہی تھی اور جب میں نے اس کو پہلی بار سنبھالا تھا تو جسم کے کتنے ہی خطوط کتنے ہی زاویے، کتنے ہی قوسیں میری آنکھوں میں بس کر رہ گئی تھیں۔

سنبھلنے کے لئے مجھ سے چمٹی ہوئی جب وہ کنارے تک پہنچی تو گویا وہ بھی بہت دور نکل آئی تھی۔ میں بھی بہت دور اس سے لے آیا تھا اور اب میں اسے راحت کے بجائے رات پکارنے لگا تھا۔

اب میں اس کی گڑیوں کے گھروندوں تک جا پہنچا تھا۔ اس کی ان پٹاریوں تک جا پہنچا تھا جن میں جانے کیا الم غلم وہ سو سو جتن سے چھپائے رکھتی تھی۔

پھر جیسے سب کو چھوڑ کر اس نے گھروندوں میں . . . مجھے بسا لیا۔ ان پٹاریوں میں مجھے چھپا لیا۔

کرکٹ کا بلا گھما کر جب میں نے گیند پر بہت زور سے ہٹ لگائی تو یہ گیند مٹی کے اس گھروندے کو توڑ کر نکل گئی جو راحت نے بڑے چاؤ سے بنایا تھا۔

لیکن اس نے کوئی پروا نہیں کی نہ ہی میرا دل دکھا۔

میں ڈر کر اس کے قریب گیا۔ گیند کو میں نے پرے پھینک دیا تو ہم دونوں مل کر دوسرا گھروندا بنانے میں منہمک ہو گئے۔

گھروندے بناتے، مجھے ان میں بساتے، پٹاریوں میں پہلے میرے تحفے پھر جیسے خود مجھے چھپاتے میری چونکی گیند کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ہلکان ہوتے جب وہ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں اتر گئی تو میں نے گرا گرا کر سنبھالتے ہوئے کنارے پر لا کر اس سے پوچھا ایک بالکل نیا کھیل کھیلو گی۔

اور وہ شرما گئی۔

پھر میں نے زیادہ چاؤ سے شہتوت اس کے دامن میں بکھیر دیئے۔

کچی کچی املیوں کی پھنکیں اس کے منہ میں ٹھونسیں تو اس نے زیادہ مزے لے کر کچر کچر چبا ڈالیں ہم نے یہ نیا کھیل جاری رکھا۔ اس کی آنکھوں کے راستے میں اس کے دل میں اترتا گیا۔ پھر اس کے بدن ہی کا ایک حصہ ہو کر رہ گیا۔ کہتے ہیں حوا آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی تھی۔ اتنی چھوٹی سی عمر کے مختصر سی پونجی لے کر وہ جتنی تیزی سے میری زندگی میں

داخل ہوئی اتنی ہی تیزی سے اپنا سب کچھ مجھ پر نچھاور کرکے مجھ سے جدا بھی ہوگئی۔

جب وہ اپنا سب کچھ مجھ پر لٹا رہی تھی، اسی وقت نہ ہی میں نے جنم جنم کے بیتے اس کا ہو رہنے کی قسمیں کھائیں نہ اس کا ہاتھ تھام کر اس کو یقین دلایا کہ اب اسی طرح اس کے قدم بہ قدم زندگی کا سفر پورا کروں گا۔

ہمارے بنگلے کے پیچھے ایک عالیشان محل تھا جس کے احاطے میں ایک خوبصورت سا چمن تھا جو اپنی رعنائی آہستہ آہستہ کھو رہا تھا۔ اس محل کے ایک حصے میں راحت اور اس کی ماں رہتے تھے۔ بنگلے کا تین چوتھائی حصہ مقفل تھا احاطے کے باغ میں جو بیرونی کمرے بنے ہوئے تھے ان میں ایک مالی ایک مالن اور اس کے بچے رہتے تھے۔ چمن کی دیکھ بھال اور راحت اور اس کی ماں کے احکام کی تعمیل ان پر فرض تھی۔ اس کی ماں اسی بڑے گھرانے کی پروردہ تھی۔ گھر کی بیگم صاحبہ کو خوش کرنا۔ اپنی سیدھی سیدھی باتوں سے ان کا دل بہلانا۔ اداس ہوں تو ہنسانا۔ ہنس رہی ہوں تو قہقہے لگوانا۔ قہقہے لگا چکیں تو عمر بھر خوش رہنے کی دعائیں مانگنا۔ بس یہی کچھ اس کے فرائض تھے لیکن اب وہ بیگم صاحبہ رہ گئی تھیں نہ ان کو ہنسانے کے جتن کرنے والے مداحت کی بھی اتنی دبی ہوئی دعاؤں میں تاثیر ڈھونڈتی رہ گئی اور آہستہ آہستہ جاگیریں ضبط ہو گئیں۔

راحت کی ماں نے بھی اچھے دن دیکھے تھے ان کے میاں صاحب کے مصاحب تھے اور یہ تھیں بیگم صاحبہ کی منہ چڑھی۔ راحت کے ابا کو اللہ کو پیارے ہوئے کوئی تین سال ہو گئے تھے صاحب اور بیگم صاحبہ کے وہ دن نہ رہے تھے کہ انہیں خوش رہنے کی دعائیں دی جا سکیں۔

راحت کی ماں کو ماہ بماہ پنشن برابر ملتی تھی۔ جاگیرات کی ضبطی کے بعد حکومت نے ان وظائف کو یک لخت مسدود نہیں کیا تھا جو پہلے ہی سے منظور تھے سو انہیں ماہ بماہ پنشن مل جاتی۔ اس کے علاوہ ضلع بھر میں راحت ہیر آئیل بہت مرغوب ہو گیا تھا۔ راحت کی ماں نے اپنی لاڈلی ہی کے نام سے جب یہ چھوٹا سا کاروبار شروع کیا تو اسے کافی منافع ہوا۔ اور واقعی ضلع بھر میں راحت ہیر آئیل گھر گھر میں تھا۔ ہمارے گھر نہ صرف امی وہی لگاتی تھیں بلکہ تحفے کے طور پر ہمارے چند رشتہ داروں کو جب انہوں نے شیشیاں بھجوائیں تو پھر ہر ماہ بھجوانے کا انتظام بھی انہیں کرنا پڑا۔

راحت کی ماں کہتی تھیں کہ شیشیوں کے لیبل پر جس لڑکی کی تصویر ہے وہ راحت ہی کی ہے۔

یہ دعویٰ نہ کبھی میری سمجھ میں آیا نہ ہی میں نے کبھی اس کو سمجھنے کی کوشش کی۔

ہیر آئیل کی تصویر میں اگر کوئی چیز راحت سے مشابہہ تھی تو بس وہی لمبی لمبی زلفیں تھیں۔ چہرہ تو بالکل جدا تھا۔ ادھیڑ عمر کی بھرپور عورت کا لیکن

مجھے ان تصویروں سے بھلا لینا دینا ہی کیا تھا [illegible]

گھنی زلفوں میں منہ چھپا کر جو راحت ہیر آئیل سے [illegible]

"تم خدا کے لئے یہ تیل مت لگایا کرو راحت۔ تمہا[illegible]

منہ چھپاتا ہوں تو تمہارا یہ تیل میرے گالوں [illegible]

لگ جاتا ہے۔ سوچو تو بھلا اگر میرے چہرے پر [illegible]

— پھر تو تم ہی دور دور میرے قریب نہیں آؤ گی تب میں [illegible]

گا — بن رات کا چند اکیس بجایا ہے اور اس کی زلفوں میں منہ چھپا کر [illegible]

بن بن کر اسے ڈرانا۔ گدگداتا اور وہ اپنے لمبے لمبے بالوں سے میرے [illegible]

ہاتھ ملا کر انہیں زنجیر کر دیتی۔

کیسے کیسے کھیل اس مختصر مدت میں ہم نے جانے [illegible] اپنا دامن [illegible]

وہ میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی اور میں نے بغیچے کے سبھی شاداب [illegible]

پھول توڑ ڈالے اور اس کا دامن بھر دیا۔ ان پھولوں کا اس نے جب [illegible]

مجھے پہنانا چاہا تو میں نے جھپٹ کر اس سے ہار چھین لیا اور اس کی لمبی سیاہ راتوں جیسی زلفوں میں گوندکر جیسے ستارے ٹانک دیئے۔

پھر انہی سیاہ راتوں میں چھپ چھپ کر انہیں ستاروں کی [illegible] میں ہم کتنی ہی بار اس کا ہو گیا اور وہ میری — ایک دن اس نے [illegible] جھکا کر مجھ سے کہا۔

"مجھے اُبکائیاں سی آتی ہیں۔ میرا جی اوبتا رہتا ہے۔ مجھے وہ کچی املیاں توڑ دو نا۔" اس سے پہلے کہ میں پتھر کے گرلدے ہوئے املی کے درخت پر دے مارتا میں نے راحت کا کرتا اٹھا کر اس کے پیٹ کو سہلایا۔ پھر جھک کر [illegible] پیٹ کو چومنے لگا۔

اس نے حیران ہو کر پوچھا "یہ کیا کرتے ہو؟"

میں نے خوشی خوشی اس کی آنکھوں میں اترتے ہوئے کہا۔ "اس میں میرا بچہ ہے پگلی!"

اس کی آنکھیں پل بھر کو جگنوؤں کی طرح چمک اٹھیں پھر صرف اس کی زلفوں کی سیاہ رات رہ گئی اور آنکھوں کے جگنو جانے کہاں جا چھپے۔

میں ابھی خوش ہی تھا کہ وہ اس قدر اداس ہو گئی۔

میرے سینے پر سر رکھ کر جب وہ سسکنے لگی تو سسکتے سسکتے اس نے پوچھا "اب کیا ہوگا"

اور میں سوچنے لگا واقعی اب کیا ہوگا۔ میں تو اس قدر خوش ہو رہا تھا۔

راحت کی آنکھوں میں بھی جگنو چمک اٹھے تھے۔ لیکن [illegible] ہونے کی بات ہی نہ تھی۔

میں نے اس کو دلاسا دیا۔ جھوٹ موٹ [illegible]

جب وہ کچھ مسکرا سکی تو اس کا گدگدا کر [illegible]

[illegible] یا جناب کے بعد دونوں تک ایک دوسرے [illegible] میں اس کا دامن قہقہوں سے بھر سکوں گا [illegible] سے اب نہ میری الماری کے شکر پر بچے لوز لانا [illegible] میں جھوٹی ہوتی نہیں کچر کچر کر کھوکتی رہے گی۔

[illegible] میدان میں جل تھل ہوں گے۔ جو مجھے ذ بہتے پھرے [illegible] وہ ہرنی کی طرح بھی رہے گی۔ خوبیاں کیں [illegible] پر ہوا سے ملکو سے کھاتا رہا جائے گا۔ مینڈک [illegible] آکیلا گھر سے نکلوں گا تو راحت قدم قدم پر راستہ [illegible] ہنستی دوڑتی۔ اچھلتی بھاگتی کبھی میری باہوں میں جھولتی میرے دونوں ہاتھوں کو اپنی زلفوں سے زنجیر کرتی، قہقہے لگاتی۔ پھر وہ ایک دم ٹھٹک کر رک جاتی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں میں جگنو دم بھر کو جھلکیں گے۔ پھر وہ گردن جھکا کر اداس ہو جائے گی، پھر وہ سسکے گی میں اپنے تصورات کی دنیا میں اس کو کب تک اٹھائے اٹھائے پھروں گا۔ ایک دن، دو دن پھر میں بھی شہر چلا جاؤں گا۔

دو دن گزر گئے، راحت نہیں آئی جب میں سرشام اپنے مخصوص راستوں سے ہو کر اس کے گھر پہنچا تو اس کے باغیچے کے پھول رو رہے تھے۔ کانٹے ہنس رہے تھے۔ عمارت کے اس حصے میں جہاں وہ رہتی تھی، مالن دیا جلا کر رکھ رہی تھی مالی نے مجھے بتایا راحت بی بی بہت بیمار ہو گئی تھی اس کی ماں بہت پریشان تھی اس کو علاج کے لئے شہر لے گئے ہیں۔

میں لوٹنے لگا تو راحت جیسے کرتہ اٹھائے اپنا ننگا پیٹ میرے سامنے کھڑی تھی۔

" اس کو چومو اس میں تمہارا بچہ ہے۔"

راحت کی ماں امی کی بڑی چہیتی تھی، اس کی خوش طبعی، اس کے آداب و تمیز، اس کے رکھ رکھاؤ کی امی دلدادہ تھیں مجھے یقین تھا کہ اس نے امی سے کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہوگا۔ میں نے کرید کرید کر امی سے پوچھنا چاہا لیکن انہیں تو اس کا بھی علم نہ تھا کہ راحت اور اس کی ماں شہر چلے گئے ہیں۔ بمشکل آٹھ دن گزرے ہوں گے کہ راحت کی شادی کے دعوت نامے ہمیں ملے۔ امی نے ٹیلیگرام کے ذریعے راحت کی امی کو مبارکباد دی اور انہیں ٹیک تحائف بھیجیں میں پچھلے سے اس کے باغیچے میں پہنچ کر بہت سا وقت وہاں گزار آیا۔ کالج کھل گئے تو میں بھی داخلے کے لے شہر چلا گیا کیونکہ ہائی اسکول میں پاس کر چکا تھا۔

پھر کچھ دن بعد ابا کا تبادلہ اس ضلع سے ہو گیا اور اس طرح راحت سے [illegible] ملنے کی تمنا بھی [illegible]

ہو گی اور اس سے پہلے کہ یہ تمنا حسرت بن کر دل میں جا گزیں ہو جاتی اپنی موت آپ مر گئی اور وہ بھی اس طرح کہ مجھے کچھ پتہ نہ چلا۔

میں بات کو بھول بھال گیا۔ عمر کی اس منزل میں جبکہ کالی راتیں جگمگاتے دنوں سے زیادہ پیاری ہوتی تھیں میں راحت کی سیاہ زلفوں میں اپنے ہاتھوں کو کب تک زنجیر رکھ سکتا تھا ــ کالج کے دن رات ہما ہمی چہل پہل گہما گہمی۔

ہاں ایک ننھی سی یاد تھی جو دل کے کسی تاریک گوشے میں چھپ کر سہمی سہمی بیٹھ گئی تھی۔ لرزاں لرزاں، ہراساں ہراساں سپیرے کی پٹاری میں چھپی ایسی ناگن کی مانند جس کا زہر چھین لیا گیا ہو۔ پھن کھول کر سر نکال لیتا تو آگے بڑھ کر تڑپا نا بس میں نہیں۔

اور یہ بے ضرر ناگن کبھی کبھی اپنا پھن پٹاری سے باہر اس وقت نکال لیتی ہے جب میرے خاندان میں کسی کو پہلی کا بچہ ہوتا ہے۔ اور پھر خود ہی اپنا سر اندر کر کے چھپ رہتی ہے اور وقت اس پٹاری کا منہ پل بھر میں ڈھنک دیتا۔ راحت مجھے اس وقت بھی یاد نہیں آئی جب میں نے اپنی دلہن کا گھونگھٹ اٹھا۔ میں تو پلکیں جھپکا کر چودھویں کی اس چاندنی کا ہو رہا تھا جو میرے اطراف پھیل گئی تھی۔

ایک دن جب میری بیوی نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ کر نیچی نیچی نظروں سے مجھے بتایا کہ جی اچھا نہیں ہے وہ مضمحل مضمحل سی ہے۔ اسے ابکائیاں سی آتی ہیں۔ تو جھٹ کسی لڑکی نے کرتا پیٹ پر سے اٹھا کر مجھ سے کہا اسے چومو اس میں تمہارا بچہ ہے۔"

مجھے راحت سے جدا ہونے کے بعد پہلی بار ایسا محسوس ہوا کہ مداری کی پٹاری میں چھپی ہوئی بے ضرر ناگن تھی اس طرح لہرا کر میرے سامنے آئی ہے کہ مجھے ڈس لے گی۔ پتہ نہیں کس نے اس کو اس کا زہر لوٹا دیا تھا۔

میں نے اپنی بیوی کے گال چوم لئے، اس کا پیٹ نہ چوم سکا۔

تب میں نے اس ناگن کا سر کچل دینا چاہا۔ لیکن وہ بہت تیزی سے اپنی پٹاری میں جا چھپی۔ جب میں نے پہلی بار اپنے ننھے کو چوما تو اس ناگن نے لہرا کر پھر ایک بار سر نکالنے کی کوشش کی لیکن میں نے پٹاری کا منہ مضبوطی سے بند کر دیا۔

پھر آہستہ آہستہ یہ ناگن مر گئی اور میں بھول گیا کہ کوئی خالی پٹاری میں نے اپنے دل میں چھپا رکھی ہے۔

آج پھر سے میلے میں جب میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ گھوم رہا تھا تو کسی عورت نے مجھے سلام کیا۔ کچھ ہی دور پردہ کسی دکان پر کھڑی اپنے بچوں کو کھلونے دلا رہی تھی۔ میری بیوی کسی سہیلی سے جو اسے ابھی ابھی ملی تھی بڑی پیاری پیاری باتیں کرنے میں مگن تھی۔ آیا میرے بچوں کو

پاس ہی کی ایک دکان سے کپڑے دلا رہی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے بھرپور عورت کی طرف دیکھا وہ بھی مجھ کو دیکھ رہی تھی۔

کسی اضطراب کا اظہار کئے بغیر ٹہلا ہال خراماں جب میں اس کے قریب پہنچا تو کوئی مانوس سا چہرہ اپنی چھب دکھلا کر سامنے آتے آتے چھپ گیا پھر کسی لڑکی نے اپنا دامن پھیلا کر آہستہ سے کہا اسے بچے پکے شہتوتوں سے بھر دو اور جب میں نے دامن بھر دیا تو اس نے سارے شہتوت میرے قدموں میں ڈال دیئے اور اپنی سیاہ لمبی رات جیسی زلفوں سے میرے دونوں ہاتھ جوڑ کر زنجیر کر لئے۔ "اوہ۔! راحت"

وہ میرے پہچان لینے سے خوش ہو گئی۔

"لیکن رات تمہاری زلفیں۔" بے اختیار میری زبان سے نکلا

اس نے دھیرج سے کہا۔" بے چاند کے کالی رات بھیانک لگتی تھی مجھے"۔ وہ راحت ہیر آئیل کے لیبل کی اس بھرپور عورت سے بہت مشابہ ہو گئی تھی جس کو کبھی اس کی ماں راحت ہی کی تصویر کہا کرتی تھی اور آج اس کی وہی سیاہ زلفیں نہ رہی تھیں جو اس تصویر سے کبھی اس کی وجہ مشابہت تھیں

میں نے حال احوال پوچھا۔

اس نے کوئی شکایت نہیں کی۔

پاس کھڑے ہوئے سات آٹھ سالہ بچے کی بانہہ پکڑ کر میرے مقابل کرتے ہوئے پوچھا۔ "اس کو پہچانتے ہیں آپ؟"

البم میں محفوظ اپنے بچپن کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی جسے دیکھ کر میری بیوی نے کہا تھا اس وقت بھی تم اتنے ہی شریر رہے ہو گے جتنے آج ہو۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور بس اس کو دیکھتا رہ گیا۔ راحت نے پھر پوچھا۔ "نہیں پہچانا آپ نے؟"

میں نے کہا "یہ تو میں ہوں راحت"!

تو اس نے نظریں جھکا لیں اور بچے کو چمٹا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا انہیں سلام کرو۔ ننھا سا سر خم ہوا۔ ننھا سا ہاتھ پیشانی تک اٹھا۔

اور میں نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی

میری بیوی اپنی سہیلی سے رخصت ہو کر میرے پاس آ گئی تھی۔ میں نے راحت کا تعارف اس سے کرایا۔ "ابا کے زمانۂ ملازمت میں یہ اور ہم ایک ہی محلے پر رہتے۔ امی میں اور ان کی والدہ میں بڑا بہناپا تھا۔"

دونوں جانب سے ہاتھ اٹھے۔

میری نظریں خود ہی اس بچے پر اٹھی رہیں۔

میری بیوی نے بھی جب اس کو دیکھا تو اس کی نظریں اسی کے چہرے

پھر ہم ا[illegible] ہو کر رہ گئیں اس نے [illegible]

بچے کو دیکھ کر قریب کرتے ہوئے [illegible]

میں نے اس کی بالوں سے [illegible]

جب ہم جدا ہونے لگے تو میں نے [illegible]

ڈال لی اس نے نظریں چاہنے کر کا [illegible]

جب ہم آگے بڑھ گئے تو میں نے کسی [illegible]

کی کوشش کی وہ مجھے نظر آ گیا۔ اور ایسے میں [illegible]

لگتا آتا۔" تو میں کہا میں پل بھر کو اس کے [illegible]

راحت کی آنکھیں لیکن میرے پیچھے پیچھے [illegible]

میری بیوی نے کہا۔ وہ بچہ واقعی کتنا پیارا ہے۔ آپ کے بچپن کی وہ شریر سی تصویر ہے نا۔ ہو بہو اسی طرح"

"اچھا؟" میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے [illegible] کیا۔ تم نے وہیں بتایا ہوتا۔"

وہ ہنس پڑی۔ کہنے لگی "بھلا ایسی بات میں وہاں [illegible]

مجھے یوں لگا جیسے میری بیوی میرے دل میں چھپی ہوئی [illegible] کھول رہی ہے اور میں جھپٹ کر اس کا ہاتھ تھام رہا ہوں کہ [illegible] ہے ڈس لے گی۔

لیکن پٹاری کھلی تو خالی تھی۔

اس میلے میں، اس چہل پہل میں، اس گہما گہمی میں کوئی بھی تو نہیں تھا جو میری خاموش پکار سنتا کہ میں خالی پٹاریوں کا مداری [illegible] جو میرا تماشا دیکھے۔

آئندہ شمارے کے چند متوقع مضامین

کارِ جہاں دراز ہے۔ قرۃ العین حیدر

غالبیات: قاضی عبدالودود۔ مالک رام۔ [illegible] اسعد احمد انصاری۔ ظ۔ انصاری۔ تارا چرن رستوگی۔ [illegible]

مضامین: مسعود حسن رضوی ادیب۔

منشاء الرحمٰن خاں منشا۔

سمیع الحق۔

افسانے: رضیہ سجاد ظہیر۔ صالحہ عابد حسین۔ [illegible]

نظم و غزل: حرمت الاکرام۔ [illegible]

نقش بندی۔ [illegible]

[illegible] ہاشمی
[illegible]
[illegible]

انقلابِ آزادی اور اردو شعراء

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے پہلے اردو شاعری حسن و عشق، اخلاقیات اور سماجیات وغیرہ کے میدان میں خاصی ترقی کر چکی تھی۔ متقدمین میں ولی اور سراج اور متوسطین میں میر، سودا، درد، نظیر اور ذوق جیسے مختلف اصنافِ سخن کے بادشاہوں کا ظہور ہو چکا تھا۔ اگرچہ اس وقت تک چند شعراء نے واسوخت، تشبیب، قصائد، ہجویات اور شہر آشوب میں حکمرانِ وقت پر اشارتاً، کنایۃً میں اور بعض اوقات کھلم کھلا بھی تنقید کی تھی لیکن بالعموم اردو شاعری ہنوز سیاست سے بے بہرہ تھی۔ چند شعراء ایسے تھے جنہیں اٹھارویں صدی کے ثلث آخری میں انگریزوں کی بدنیتی کا اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ملکی حکمراں اب کٹھ پتلی بن کر رہ گئے ہیں۔ اور انگریزوں کی مکمل اجارہ داری ہندوستان کی معیشت کے ساتھ ساتھ سیاست پر بھی قائم ہو چکی ہے۔ ذیل کے اشعار سے ان باتوں کی تصدیق ہوتی ہے۔

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی
(مصحفی)

[illegible]
[illegible]

[illegible] اب فرنگی ہیں مختار
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

کی ان کے خلاف بڑھتی ہوئی نفرت کا بھی اندازہ ہو سکے۔

واجد علی شاہ اختر نواب اودھ لکھنؤ سے نکالے جانے پر فرماتے ہیں:

شب اندوہ میں رو رو کے بسر کرتے ہیں
دن کو کس رنج و تردد میں بسر کرتے ہیں
نالہ و آہ غرض آٹھ پہر کرتے ہیں
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

گردشِ چرخ نے یہ بات بھی سنوائی ہے
اپنے مالک کو یہ نوکر کہے سودائی ہے
اب تو درپیش ہیں بادیہ پیمائی ہے
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

خاک سے پاک کیا جس کو وہی ہے دشمن
بعد مردن نہ ملے اس کو خدا چاہے کفن
اسی مردود کے باعث سے چھٹا اپنا وطن
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

سارے اب شہر سے ہوتا ہے یہ اختر رخصت
آگے بس اب نہیں کہنے کی ہے مجھ کو فرصت
ہو نہ برباد مرے ملک کی یا رب خلقت
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

اس کے بعد مثنوی "حزنِ اختر" میں انہوں نے قید و بند کی تمام تفصیلات کا ذکر کیا ہے۔ دورِ سوم کے انگریزی عہدہ داروں کی بداخلاقیاں اور بدزبانیاں بھی اس مثنوی میں مرقوم ہیں۔

بہادر شاہ ظفر نے اپنی مشہور نظم "بیانِ درد" میں دلی کی خستہ حالی کا تذکرہ کیا ہے:

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایا ہند تبہ ہوئی، کہوں کیا کہ ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے
سبھی جادہ ماتم سخت ہے کہو کیسی گردشِ بخت ہے
[illegible] ہے نہ [illegible] ہے، [illegible] شاہ [illegible] ہے

اس کے بعد سرسید، محمد حسین آزاد اور حالی کا دور آتا ہے جس میں اہل التذکرہ دل بالخصوص نے عمومًا تمام اہلِ ہند کو اور حالی نے بالخصوص مسلمانوں کو جگانے کی کوشش کی۔ آزاد نے نظم کو اور سرسید نے نثر کو اس مقصد کے لئے اپنایا۔ ساتھ ہی ساتھ ان دونوں نے اتحاد و ملت کو بڑی اہمیت دی۔ ان کا خیال تھا اور صحیح خیال تھا کہ حبِ وطن میں کسی بھی مذہب کا پیرو دوسرے مذہب کے پیرو سے پیچھے نہ تھا۔ اگرچہ حالی و آزاد دونوں ہی سرکاری خطاب یافتہ یعنی شمس العلماء تھے لیکن حبِ وطن ان کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔ گو انگریزوں کی Divide And Rule کی پالیسی سے حالی بھی قدرے متاثر ہو گئے تھے لیکن آزاد کا حبِ وطن مذہب اور جغرافیائی حدود کا پابند نہ تھا۔ آزاد کی یہ تلقین تھی کہ وطن کی خاطر اپنی جان کو بھی بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ غالبًا یہ شدید جذبہ ان کو ورثے میں ملا تھا۔ کیونکہ ان کے والد مولوی محمد باقر کو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لینے کے جرم میں گولی مار دی گئی تھی۔

۹ مئی ۱۸۵۷ء کو ہندوستانی سپاہیوں نے سب سے پہلے میرٹھ میں بغاوت کی اور یہی جنگِ آزادی کی ابتدا تھی۔ جیسے ہی میرٹھ میں غدر کی خبر پھیلی، پورے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف آگ بھڑک اٹھی۔ خوش بختی کی بات یہ تھی کہ اس وقت ہندوستان میں مکمل فرقہ وارانہ یکجہتی پائی جاتی تھی۔ غالبًا اس کا سبب یہ تھا کہ تمام ہندوستانیوں کے پاس سب سے اہم مسئلہ انگریزوں سے نجات حاصل کرنا تھا۔ ہندوستانی ہر انگریز کو اپنا دشمن اور ہر ہندوستانی کو برادرِ عزیز سمجھتے تھے۔

فیض آباد میں جب مولوی احمد اللہ شاہ کو گرفتار کرکے سولی پر چڑھانے کے لئے لیجانے لگے تو صوبہ دار دلیپ سنگھ نے تمام انگریزی افسروں کو قید کرکے نہ صرف احمد اللہ شاہ کو آزاد کیا بلکہ فیض آباد کی بھی آزادی کا اعلان کر دیا۔

محمد حسین آزاد نے دلی اخبار میں اپنی مشہور نظم "فتحِ افواجِ مشرق" شائع کروادی۔ اس کے چند چیدہ اشعار اس طرح ہیں۔

ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قومِ نصاریٰ
تھی صاحبِ اقبال و جہاں بخش و جہاندار

کام آئے نہ علم و ہنر و حکمت و فطرت
پورب کے تلنگوں نے لیا سب کو وہیں مار

حکّامِ نصاریٰ کا یہ ہیں دانش و بینش
مٹ جائے نشاں خلق میں اس طرح سے یکبار

آزاد نے "محبتِ وطن" میں مختلف ممالک کی مثالیں دے کر یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ وطن کی محبت کا جذبہ نہایت ہی اعلیٰ ہے۔ نظم کے آخری حصے میں انہوں نے خود انگریزوں کی مثال [illegible] حبّ الوطنی نے ہی تمام ہندوستان کو ان کا غلام بنا دیا [illegible] محبّ الوطنی کے فوائد بھی بیان کئے ہیں ؎

اے آفتابِ حبِّ وطن! تو کدھر ہے آج
تو ہے کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہے آج
تجھ بن سب اہلِ ہند ہیں [illegible]
اور دل کے شوق سینوں میں [illegible]

حبِّ وطن کی جنس کا ہے قحط سال کیوں
سیر اس جنس آج کو ہے یہ اس کا کال کیوں
بن تیرے ملکِ ہند کے گھر بے چراغ ہیں
جلتے عوض چراغوں کے سینوں میں داغ ہیں

کب تک شبِ سیاہ میں عالم تباہ ہو
اے آفتاب! ادھر بھی کرم کی نگاہ ہو
تا ہو وطن میں اپنے زر و مال کا وفور
اور مملکت میں دولت و اقبال کا ظہور

غالب نے بھی اگرچہ نمونہ زنداں کا لکھا لیکن کوئی [illegible] پیغامِ عمل پیش نہیں کیا۔

داغ نے بھی فغانِ دہلی، اور شہر آشوب لکھا ہے، یہ دونوں نظمیں مرثیے زبان و ادب کے شہ پارے ہیں، لیکن ان میں بھی کوئی پیغامِ عمل نہیں پایا جاتا۔

منیر ۱ غدر میں جن رہنمایانِ ملت کو گرفتار کرکے قتل یا حبسِ دوام یا عبور دریائے شور کی سزا دی گئی تھی ان میں اثر صہبائی اور منیر شکوہ آبادی کے نام بھی شامل ہیں۔ ویسے تو منیر ایک قصیدہ گو شاعر تھے اور ان کی تمام نظمیں اور غزلیں قصیدوں کی طرح طویل ہوا کرتی تھیں لیکن مصائب و آلام نے ان کے اشعار میں بے انتہا کرب پیدا کر دیا ہے۔ منیر کا دیوان نایاب ہے لیکن ایک نسخہ رام پور ٹرسٹ لائبریری میں محفوظ رہ گیا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

نکل کر ہند سے آنا ہوا جب اس جزیرے میں
اسیروں کی سیہ بختی سے کالا ہو گیا پانی

پڑے ہیں ٹھوکروں میں کاسۂ سر بادشاہوں کے
الٰہی روئے کس کا سر پکڑ کر تیغِ سلطانی

(فریادِ زنداں)

کالے پانی سے ہوئے ہیں رخصت ∴ اشکِ جاری ہیں [illegible]
ہے ارادہ کہ سفر شعر کریں ∴ تا کہ [illegible]
بسکہ بہوں تباہ ہوں زنداں میں ∴ بھولی [illegible]

[illegible] شعرا [illegible] کے معیار سے ہیں جو نسبتاً
[illegible] لیکن ان [illegible] مرثیہ [illegible] کوشش کی ہے۔
[illegible] حکومت سے آگاہ کرنے اور اتحاد ملت اور بہتر
[illegible] ذاتی یا شہرت کے اعتبار سے اس مضمون میں
[illegible] شاعری کے مقابلے میں جچی نہیں کہی جا سکتے
[illegible] اظہار فکر اور جرات اظہار کے لحاظ سے یہ چیزیں قابل قدر
[illegible] یا حکمرانوں کی تعریف کرنا بہت آسان
ہے۔ [illegible] حاکم کے سامنے اس کے ظلم کے خلاف آواز اٹھانا نہایت ہی
جرأت [illegible] کارنامہ ہے۔ شعرائے اردو قابل صد ہزار داد و تحسین ہیں کہ
ظلم کے خلاف اپنا نعرہ بلند کرنے میں وہ کبھی کسی سے پیچھے نہ رہے:

ہر ایک شہر کا پیر و جوان قتل ہوا
ہر اک قبیلہ و ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک اہل زباں خوش بیان قتل ہوا
غرض خلاصہ یہ ہے اک جہان قتل ہوا
گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

(ہنگامۂ دار و گیر، مسدس ظہیر دہلوی)

حالی جدید شاعری کے اولین معماروں میں ہیں۔ وہ ایک اچھے نقاد اور اعلیٰ شاعر اور معلم الاخلاق تھے۔ سرسید کے ساتھ نے ان کے دل میں بھی قومی درد کو ابھارا۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ حب وطن اور قوم کی دیرینہ عظمت کا مظہر ہے۔

اے وطن! اے مرے بہشت بریں:
کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
کیا زمانے کو تو عزیز نہیں
اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں

(حالی۔ مثنوی حب وطن)

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

داغ کھائے کا بیٹے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز

(دہلی مرحوم — حالی)

حالی کا زمانہ باغیانہ شاعری کا دور تھا۔ حالی کے ہم عصر اور ہم خیال شعراء میں اسمٰعیل میرٹھی اور اکبر الٰہ آبادی تھے۔ جو حالی ہی کی طرح ملازم سرکار تھے۔ ان کے علاوہ شبلی نعمانی بھی تھے جنہوں نے ملازمت تج دی تھی۔ یہ تمام شعراء ایک دوسرے سے متاثر تھے۔ ان شعراء کی دلیری و جرات اس لئے بھی قابل ذکر ہے کہ یہ حضرات کسی نہ کسی اعتبار سے ملازمت سرکار سے منسلک تھے۔

اسمٰعیل میرٹھی اور حالی قدرے نرم خو تھے لیکن حب وطن اور مخالفت انگریز میں وہ دوسروں سے کم نہ تھے۔ انہوں نے "انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی" کا تقابل کیا اور "اتحاد" کی اہمیت بتائی۔ انہوں نے ایک ایسے زمانے کا یقینی تصور پیش کیا جس میں حالات از سر نو بہتر ہوں گے۔ یہ لوگ اگرچہ سرکار سے منسلک تھے لیکن ان کے ذہن آزاد تھے۔ انہوں نے ملک و ملت کو کورانہ انگریز پرستی کے خطرناک نتائج سے بھی آگاہ کیا تھا۔

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر ؛ تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر
جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر ہو ؛ بھلی اس محل سے جہاں کچھ خطر ہو

(آزادی غنیمت ہے — اسمٰعیل میرٹھی)

علامہ شبلی ایک مشہور عالم، مصنف اور شاعر تھے۔ انہوں نے مختلف ممالک کی سیر بھی کی تھی۔ دیگر ممالک کی سیاست و حکومت سے وہ خوب واقف تھے۔ علامہ شبلی آزادی سے کم کسی بھی تجویز کو انگریزوں کی ایک نئی چال سمجھتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے مسلم لیگ، ہوم رول، سلف گورنمنٹ غرض ہر تجویز کا مضحکہ اڑایا ہے۔ علامہ شبلی کا مطمح نظر محض یہ تھا کہ انگریزوں کی غلامی سے مکمل نجات حاصل ہو:

ہے جنوں خیز یہ ہنگامۂ عبرت کیسا ؛ قوم کا حال ہے مخلت لی بدولت کیسا
ہے عجب سیر اگر دیدۂ بینا دیکھے ؛ دیکھنا ہو جسے عبرت کا تماشا دیکھے

خوں غلط ہے کچھ مباحث ملکی نہیں ہیں یہ
اک طفل ہے سیاست ہندوستاں ابھی

علامہ شبلی نے ایک تمثیلی نظم "پہلی جنگ عظیم اور ہندوستانی" لکھی ہے۔ جس میں اختصار، حسن بیان اور سادگی کے علاوہ عبرت آمیز درس بھی ہے۔ اس نظم میں ایک جرمن ایک ہندوستانی سے کہتا ہے کہ اگرچہ برطانیہ

وقت وسس لاکھ نے ملکن ہاسے لئے فرانس اور برطانیہ کو فتح کرنا دشوار تھی۔ ہے اس کے جواب میں ہندوستانی کہتا ہے کہ تعداد کے اعتبار سے ہم ہر شخص کے لئے ہیں اس لئے ناقابل شکست ہیں۔ اس تعلق سے اس جرمن کا جواب علامہ شبلی کی زبانی سنیے۔

سنتا ہاوہ غرور سے میرا کلام اور ؛ پھر وہ کہا جو لائق بالطبع بھی نہیں
اس ہاونگ پہ کون نہ مر جائے لنحدا ؛ لڑتے بھی اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

درگا سہائے سرور جہاں آبادی کا کلام غالب و اقبال کے کلام سے متاثر ہے۔ غالب کا اثر ان کی عشقیہ شاعری پر اور اقبال کا اثر ان کی سیاسی نظموں پر واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے چونکہ سرور انگریزی ادب سے بھی خاصی واقفیت رکھتے تھے اسی لئے ان کی قومی و وطنی نظموں میں انگریزی نقلیہ کا اثر نمایاں ہے۔ سرور کی دو نظمیں "عروس حب وطن" اور "گلزار وطن" میں حسن بیان کے ساتھ ساتھ جذبات کی شدت بھی پائی جاتی ہے۔

تقسیم بنگال کے بارے میں فرماتے ہیں۔

کرزن بیداد خو، اہل پولس، حکام وقت
تو ہوا آہ اف نہ کس کس کی جفاؤں کا شکار
کرکے دو ٹکڑے کلیجے کے ترے یہ آہ کون
چلدیا تجھ کو تڑپتا چھوڑ کر بیگانہ وار
آہ اے بنگال! آلام و مصائب کے شکار
آہ اے کرزن کی پالیسی کے صید بے قرار

اکبر الہ آبادی شاعر بھی تھے اور ایک عظیم مصلح قوم بھی۔ حکومت انگریزی کے ایک اعلیٰ عہدے پر رہنے کے باوجود انہیں حکومت و انگریز دونوں سے ہی شدید نفرت رہی۔ قوم کی خستہ حالی اور عمومی پستی کو دیکھ کر اکبر محض اس کے ماتم پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ لائحہ عمل بھی پیش کرتے ہیں چونکہ وہ وقت ایسا تھا کہ قوم کی عقلیں ماؤف ہو چکی تھیں۔ اسی لئے اکبر نے اصلاح قوم کے لئے طنزیہ یا مزاحیہ انداز اختیار کیا۔ حالات کے مناسبت سے ان کا یہ طریقہ کار نہایت ہی کامیاب تھا۔

بہت ہی عمدہ ہے اے ہمنشیں برٹش راج
کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے
جو چاہے کھول لے دروازۂ عدالت کو
کہ تیل بیچ میں ہے ڈھیلی اس کی چول بھی ہے
چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی
کہ محو دید ہے خاطر اگر ملول بھی ہے

جب [illegible]
تو بہلا کیا ہے جو ساتھ [illegible]

مولانا حسرت موہانی اپنی تربیت کے بدولت شاعر [illegible] برسوں کا [illegible] سے رہا۔ انگریزوں نے انہیں [illegible] بھیج دیا تھا۔ ان کا شمار آزادی کے معماروں میں ہوتا ہے [illegible] انہیں سخت نفرت تھی۔ مولانا کو اشتعال میں [illegible] پہنچنے کی [illegible] انہی تکالیف کے باوجود مولانا نے اپنے حالات زندگی کو [illegible] انداز میں بیان کیا ہے۔

ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

جو چاہے سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو، کی ہو جو شکایت بھی

اے شوق کی بیباکی وہ کیا تری خواہش تھی
جس پر انہیں غصہ ہے انکار بھی حیرت بھی

ہر چند ہے دل شیدا حریت کامل کا
منظور دعا لیکن ہے قید محبت بھی

رسم وفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے
حب وطن محو خواب دیکھئے کب تک رہے

تا بہ کجا ہو دراز سلسلہ ہائے فریب
ضبط کی لوگوں میں تاب، دیکھئے کب تک رہے

پردۂ اصلاح میں کوشش تخریب کا
خلق خدا پر عذاب، دیکھئے کب تک رہے

دولت ہندوستاں قبضۂ اغیار میں
بے عدد و بے حساب، دیکھئے کب تک رہے

حسرت آزاد پر جور غلامان وقت
از رہ بغض و عتاب، دیکھئے کب تک رہے

پنڈت برج نرائن چکبست نے سوز و گداز، حریت اور وطن کی محبت کے مضامین بڑے ہی حسین انداز میں بیان کئے ہیں چکبست کو قومی شاعر بھی کہا جاتا ہے بیسویں صدی کے اوائل میں ان کی ملاقات دادا بھائی نوروجی اور گوپال کرشن گوکھلے سے ہوئی۔ اس وقت قومی تحریک عام ہو چکی تھی چکبست بھی اس تحریک سے متاثر تھے۔ اور ان کی مشہور نظم "خاک ہند" کا ہر بند حب وطن سے معمور ہے۔

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیضِ قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عز و شاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

اے صورِ حبِ قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے
اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے
حبِ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

چکبست نے ایک اور نظم ہوم رول کی مانگ اور اس کی حمایت میں بھی لکھی
جس کے اس مسدس کے بند اس بیت پر ختم ہوتے ہیں۔
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

مولانا ظفر علی خاں قومی شاعری کے دوسرے برجِ مستحکم تھے۔ مولانا جوش و خروش، طنز و حاضر جوابی اور ولولہ انگیزی میں چکبست سے بہت آگے تھے۔ چکبست نے پچھلی تاریخ یاد دلا کر قوم کو ابھارنے کی کوشش کی اور مولانا نے حال کے واقعات کو سامنے رکھ کر قوم کو اپنا چولا بدلنے پر مجبور کیا۔ حسرت کی طرح ظفر علی خاں کو بھی جرمِ سیاست میں قیدِ فرنگ برداشت کرنی پڑی۔ پنجاب کے مارشل لاء کا مولانا نے اس طرح تذکرہ کیا ہے۔

حکومت جن دنوں پنجاب میں تھی مارشل لاء کی
تو قابل دید تھے اوڈوائر کی غضبناکی
ہمارے بالعقل کی دھجیاں اڑتی تھیں گردوں پر
ہمارے ٹانگ کے تسمے بھرلاتے تھے جوزا کی
یہ صورت تھی ہماری خواہ ہندو خواہ مسلم تھے
یہ حالت تھی جنابِ جامعِ پنجم کی رعایا کی

"پٹیل کا پیغام" جذبات سے پُر ایک نظم ہے جس میں گاندھی جی کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔
بھسمتے جلا ہے گاندھی کی لگائی ہوئی آگ
کون اٹھتے ہے یہ کہہ کے نہ اس آگ سے کھیں

ڈیڑھ سو سال سے انگریز شتربان رہا
اب ہم اس اونٹ کی خود ہاتھ میں تھامیں گے نکیل

"انقلابِ ہند" نامی ایک دوسری نظم کا تو ہر شعر منتخب معلوم ہوتا ہے:
کر رہا ہے قصرِ آزادی کی بنیاد استوار
فطرتِ طفل و زنِ پیر و جواں کا انقلاب

صبر والے چھا رہے ہیں جبر کی اقلیم پر
ہو گیا فرسودہ شمشیر و سناں کا انقلاب

تلوک چند محروم نے چکبست کی "خاکِ ہند" پر تضمین لکھی۔ جلیانوالا باغ کے حادثے سے متاثر ہو کر "شکوۂ صیاد" لکھا اور ایک نظم "مقاومتِ مجہول" طنز کے انداز میں لکھی ہے۔
یہ نہیں ہے شانِ وفا صنم، کہ کریں بجوشش مقابلہ
تری سختیوں سے کریں گے ہم، بخدا خموش مقابلہ

ایک مخمس "پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر" بھی لکھا ہے۔ اس کا آخری بند اس طرح ہے۔
دیکھ لینا خونِ ناحق رنگ اک دن لائے گا
خود غرض ظالم کئے پر اپنے خود پچھتائے گا
راہ پر دورِ زماں آخر کبھی تو آئے گا
آسماں اس خاک کی تقدیر کو چمکائے گا
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اردو شاعری پر طاری شدہ یاسیت اور قنوطیت کو دور کر کے اردو شاعری کو حیاتِ نو بخشی ہے۔ اقبال نہ صرف ایک شاعر تھے بلکہ ایک سیاسی مفکر، مبصر، ناقد، مصلحِ قوم اور بہت کچھ . . . . سلطنتِ مغلیہ کے زوال تک اردو شاعری کی دنیا عشق و عاشقی تک محدود تھی۔ غدر کے بعد اردو شاعری محض ذریعۂ ماتم بن کر رہ گئی تھی۔ علامہ اقبال وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ملت کو جھنجھوڑ کر اس کا ماضی یاد دلایا، پھر اس پر حال کو روشن کیا۔ اس کے بعد بھی بیدار نہ ہونے والی قوموں کو ان کے بھیانک مستقبل سے آگاہ کیا اور بیدار ہو جانے والی قوموں کے لیے شاندار مستقبل کی نویدِ مسرت سنائی۔ اقبال اپنی قوم سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ ان کے لیے عشقِ وطن کی حدود میں بند ہو جانا ممکن تھا نہ مناسب۔ ان کی ابتدائی دور کی شاعری جو وطن پر مرکوز ہے وہ کسی بھی صفِ اول کی قومی شاعری سے کم نہیں۔ اس مختصر سے دورِ اولیں میں اقبال نے

جو زبان استعمال کی ہے وہ نہایت ہی شیریں و شگفتہ ہے۔
ترانۂ ہندی، بچوں کا گیت، ہمالہ، نیا شوالہ ان نظموں کا ہر شعر
ملک و قوم کی محبت میں ڈوبا ہوا ہے
ان کے علاوہ "تصویرِ درد"، "جذبۂ حریت"، "شعاعِ امید" وغیرہ اقبال
کی مشہور نظمیں ہیں جن میں انہوں نے ملت کو غنودگی سے بیدار کرنے کی کامیاب
کوشش کی ہے

دکھا دوں گا میں اے ہندوستاں رنگِ وفا سب کو
کہ اپنی زندگی کو تجھ پہ قرباں کر کے چھوڑوں گا

اقبال نے "جلیاں والا باغ" پر بھی لکھا ہے گو اس میں چار ہی مصرعے ہیں۔
لیکن ہر مصرع خوب ہے

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ
غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

مولانا محمد علی جوہر ہندوستان کی ان مایہ ناز ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے ہندوستان کی آزادی کی خاطر اپنی جان و مال کو قربان کر دیا مولانا ایک سیاسی لیڈر تھے۔ اسی لئے لازماً ان کی شاعری میں ہر جگہ سیاست کا رنگ جھلکتا ہے۔ مولانا کی ہستی پر ان کا وطن، اور ان کی قوم قیامت تک فخر کرے گی۔ یہی وہ مولانا ہیں جنہوں نے جیل سے رہائی پر اپنا استقبال کرنے والے جلوس سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔ "میں جیل سے واپسی کا ٹکٹ لے کر آیا ہوں۔"

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی
حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانا!
اب بھی احساس ہو اس کا تو ابھرنا ہے یہی
نقدِ جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر
کام کرنے کا یہی ہے تمہیں کرنا ہے یہی

سرکش نہیں، باغی نہیں، غدار نہیں ہم
پر ہم پہ تقاضائے وفا اور ہی کچھ ہے
یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہوگی
پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے

نہیں پالا پڑا قاتل تجھے [illegible] جاں [illegible]
ذرا ہم بھی تو دیکھیں تیری جلادی کہاں تک ہے
تجھے ہے قوت بازو پہ [illegible]
لگا دے زور تو سارا تری [illegible]

احمق پھپھوندوی ان عظیم شعراء کرام کے درمیان ایک [illegible]
جس کی شاعری سیدھی سادی اور عوام کے دل پر اچھا اثر کرتی ہے

یہ قتل و خوں یہ جنگ و جدل یہ جور و ستم یہ بغض و حسد
باقی ہی رہیں گے ملک میں سب [illegible]
ہر سو ہے بپا ہنگامۂ خوں، ہر سمت ہے [illegible]
اڈوائر و ڈائر کے دم سے قائم ہے نشانِ چنگیزی
شدھی ہے کہیں تبلیغ کہیں ناقوس کہیں تکبیر کہیں
یہ بیچ نہ ہوں تو مشکل ہے دم بھر کے لئے [illegible]

ہند کا آزاد ہو جانا کوئی آساں نہیں
دیکھنا تم کو ابھی کیا کیا دکھایا جائے گا
انتہائی بربریت سے لیا جائے گا کام
بند کر کے تم کو جیلوں میں سڑایا جائے گا
گرم لوہے سے تمہارے جسم داغے جائیں گے
تم کو کوڑے مار کر الو بنایا جائے گا
جائدادیں سب تمہاری ضبط کر لی جائیں گی
بال بچوں پر تمہارے ظلم ڈھایا جائے گا
باوجود اس کے بھی تم قائم رہے ضد پر اگر
بے تامل تم کو پھانسی پر چڑھایا جائے گا
اس طرح بھی تم اگر لائے نہ ابرو پر شکن
سر تمہارے پاؤں پر آخر جھکایا جائے گا

شبیر حسن خاں جوش وہ شاعرِ انقلاب ہیں جنہوں نے آزادی [illegible] انگریزوں کے تسلط پر بہت کچھ لکھا ہے اور بسا اوقات حکومت کے [illegible] لہجہ کا بھی استعمال کیا ہے۔

قسم اس روح کی جو عرش کو رفعت سکھاتی ہے
کہ راتوں کو مرے کانوں میں یہ آواز آتی ہے
"اٹھو، [illegible]
[illegible]

[illegible] ۔ ان کی مشہور نظموں میں سے ہے جس کا [illegible]

[illegible] کیا ہے

[illegible] ہاتھ کی آج رہی ہیں تکبیریں

[illegible] اور ٹوٹ رہی ہیں زنجیریں

کیا ان کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے

اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں

[illegible] اٹھا چھٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے

[illegible] دیواریں [illegible] کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں :

جوشؔ کی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" بہت مشہور ہوئی اس نظم میں [illegible] سے دردو سے لے کر جلیاں والا باغ کے حادثے تک کے تمام واقعات کو واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء خواہ کتنا ہی برا کیوں نہ ہو۔ ہماری آزادی کی راہ میں اسے ایک منزل کی حیثیت حاصل ہے اس ایکٹ کے پاس ہونے کے بعد ہی مختلف صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام بھی انہی دنوں ہوا۔ اس انجمن سے [illegible] شعراء مارکسی خیالات سے متاثر تھے ان میں مجازؔ، مخدومؔ، [illegible] جعفری، [illegible] سلام مچھلی شہری جاں نثار اخترؔ، فیضؔ، ن۔م راشدؔ، [illegible] رکھتے ہیں۔

ان شاعروں نے معاشی، معاشرتی اور ثقافتی تصورات کے پس منظر میں آزادی کے نغمے گائے۔ ملاحظہ ہو :

چل دی نوجوان ہند نے تقدیر [illegible] کی

مجاہد کی نظر سے [illegible] کی

کہو ہندوستاں کی [illegible] ہے

(آزادیٔ وطن ۔ مخدومؔ)

[illegible]

[illegible] کا [illegible] نام گرانی [illegible]

[illegible] ہے ہمیشہ تو نہیں [illegible]

[illegible] ۔ فیضؔ)

[illegible] کی [illegible]

[illegible] کے [illegible]

([illegible] سیم [illegible])

نئی تقدیر تیرے ہاتھ میں ہے ٭ تری تقدیر تیرے ہاتھ میں ہے

[illegible] جانا نہ [illegible] کپاتا ٭ مسافر راستے میں [illegible]

(منزلیں ـــــ علی جواد زیدی)

مری صدا ہے گل شمع شام آزادی

سنا رہا ہوں دلوں کو پیام آزادی

لہو وطن کے شہیدوں کا رنگ لایا ہے

[illegible] زمانے میں نام آزادی

ہمارے سینے میں شعلے بھڑک رہے ہیں فراقؔ

ہماری سانس سے روشن ہے نام آزادی

(آزادی ۔ فراقؔ)

جھکا نہ فرقِ آسماں، اٹھی وہ تیغ بے نیام

ہم اپنے ملک و قوم کو، رکھیں گے کیا سدا غلام

جوانیوں کا سر داس قدر ابھی لہو نہیں :

(ابھی نہیں ـــ جاں نثار اخترؔ)

مجھے نفرت نہیں ہے عشقیہ اشعار سے لیکن

ابھی ان کو غلام آباد میں [illegible] نہیں سکتا

مجھے نفرت نہیں ہے حسنِ جنت زار سے لیکن

ابھی دوزخ میں اس جنت سے دل بہلا نہیں سکتا

ابھی ہندوستاں کو آتشیں نغمے سنانے دو

ابھی چنگاریوں سے اک گلِ رنگیں بنانے دو

(غزل ۔ سلام مچھلی شہری)

اٹھتی ہے نقابِ رخ لیلائے حقیقت

تاریکیٔ اوہام کہن کل نہ رہے گی

[illegible] فضا عشرتِ صد شام غریباں

یہ کیفیتِ صبح وطن کل نہ رہے گی

(بشارت ـــ سکندر علی وجدؔ)

اجرت اشتہار

	ایک ماہ	چھ ماہ کے لئے
پورا صفحہ	۳۵ روپے	۱۰۰ روپے
آدھا صفحہ	۲۵ روپے	۵۵ روپے
[illegible]	۳۵ روپے	[illegible] روپے

[illegible] فی صد زائد

[illegible] اور [illegible] کے لئے ۲۵ فی صد زائد

تفصیلات کے لئے : پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱

عورتوں کے لئے ایک نیا موقع

ایک نئی بچت اسکیم جس کا افتتاح پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی نے کیا تھا آپ کو ایک موزوں ذہنی کام مہیا کرتی ہے۔ "مہیلا پردھان" نامی اس اسکیم کے ذریعہ آپ



- اپنے کنبے کی آمدنی بڑھا سکتی ہیں۔
- اپنے فالتو وقت کا سود مند استعمال کر سکتی ہیں۔
- سماجی میل جول کا دائرہ وسیع کر سکتی ہیں۔
- قومی خدمت انجام دے سکتی ہیں۔

مہیلا بچت پردھان کی حیثیت میں آپ کا کام ہوگا

اپنے علاقے کی گھریلو عورتوں سے ملنا
انھیں باقاعدہ بچت کرنے پر آمادہ کرنا
ہر مہینے ان کی بچت کی رقوم اکٹھی کرنا
اور انھیں مقررہ ڈاک خانہ میں جمع کرا دینا۔

اس طرح آپ جو رقم اکٹھی کریں گی اس پر آپ کو 2 فیصد کمیشن ملے گا۔

ملک بھر کے شہروں اور بڑے بڑے قصبوں میں مہیلا بچت پردھان کی ضرورت ہے۔

تفصیلات کے لئے
حسب ذیل پتہ پر لکھیے:
نیشنل سیونگز کمشنر
پوسٹ بکس 96
ناگپور



فضل امام رضوی
[illegible] (یوپی)

قومی شاعر
اقبال سہیل

جدید تحقیق و تلاش نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ اردو شاعری شروع سے ہی جذبۂ وطنیت سے سرشار رہی ہے۔ اقبال احمد سہیل نے بھی اس سلسلہ میں اپنے پیش رو شعراء کی تقلید کی ہے لیکن تقلیدی عناصر کے ماسوا ان کے یہاں جو کنایات و اشارات، سیاسی شعور اور ارضی معنویت ملتی ہے وہ جوہر اور حسرت جیسے باکمال شعرا اور محبانِ وطن کے کلام میں بھی نہیں تھا۔ جوہر و حسرت نے جس سیاسی شعور کی داغ بیل ڈالی تھی، اس کے نقوش زیادہ واضح نہیں تھے، لیکن سہیل میں انتہائی جامعیت اور تفکر کے ساتھ سیاسی شعور سے بھرپور شعری رجحانات پائے جاتے ہیں۔

سیاسی شعور کی پختگی اور فکر و نظر کی گیرائی پیدا کرنے میں سہیل کے خاندانی پس منظر اور ماحول کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کے باہمت اور بہادر سپاہی کنور سنگھ کو جو صوبۂ بہار کے مشہور باغی تھے جب انگریزوں کے مقابلے میں ناکامی ہوئی اور اُن کی جان پر بن آئی تو سہیل کے مورثِ اعلیٰ حسن خاں نے اس پروانۂ آزادی کو باعزت طور پر پناہ دی اور عرصۂ دراز تک وہ اس خاندان کے مہمان کی حیثیت سے مقیم رہے۔ یہی نہیں بلکہ سہیل کے پردادا ضیاء الدین خاں کے چھوٹے بھائی نذیر علی خاں سرکار اودھ میں فوجی ملازم تھے اور ایک بھائی حکومت برطانیہ کی فوج میں بھی افسر تھے۔ لیکن جب مادرِ ہند کے لائق فرزندوں نے دلیری سے کام لے کر ترانۂ حریت گایا تو سہیل کے اجداد بھی جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہو کر جنگِ آزادی میں انتہائی جوش و خروش کے ساتھ شریک ہو گئے اور بڑے ہی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

سہیل کے جذبۂ آزادی کو علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں حسرت موہانی کے فیض صحبت سے اور بھی تقویت پہنچی۔ گو کہ حسرت سے سہیل کے تعلقات کی ابتدا ۱۹۰۱ء میں ہو چکی تھی مگر یہ رسمی تھی۔ علی گڑھ میں یہ رسمی تعلقات حقیقی طور پر استوار ہو گئے کیونکہ نظریاتی اعتبار سے بھی دونوں میں کافی طور پر مماثلت پائی جاتی تھی۔ اور سہیل بھی حسرت ہی کی طرح ولولہ، حریت، جوش و ہمت اور انگریز دشمنی میں مشہور ہوئے۔ سہیل کا جذبۂ وطنیت اس قدر پاکیزہ اور منفرد تھا کہ وہ کسی ہیرو پرستی کے قائل نہ تھے اسی لئے وہ کسی دُنیاوی شخصیت سے غلط طریقہ پر متاثر نہیں ہوئے، جس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی شاعری رئیس شہر کی قصیدہ خوانی کی علت سے محفوظ رہ گئی۔ جناب افتخار اعظمی نے "افکارِ سہیل" میں سہیل کا یہ قول نقل کیا ہے:

"میں کسی پیکر کو نہیں پوجتا، بلکہ اُن روحانی اور اخلاقی اوصاف کے آگے سر جھکا دیتا ہوں، جو قدرت نے ایک شخص کو ودیعت کئے ہیں"

سہیل نے فرقہ پرستی کی بھڑکتی ہوئی آگ میں ہندو مسلم اتحاد کی پُر خلوص دعوت دی ہے۔ اپنی غزلوں میں انگریزوں کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" پالیسی کو انہوں نے انتہائی رمزیت اور تہہ داری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

خدا سمجھے بُتِ سحر آفریں سے ؛ گریباں کو لڑایا آستیں سے

ان کا یقین تھا کہ مستحکم اتحاد اور پائیدار ارتباط تہذیبی لین دین سے قائم کیا جا سکتا ہے:

مل جل کے برنگ شیر و شکر دونوں کے نکھرتے ہیں جوہر
دریاؤں کے سنگم سے بڑھ کر تہذیب کا سنگم ہوتا ہے

سہیل کے ہم عصروں میں چند لوگ جاگیرداری ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے تھے اور نتیجے کے طور انگریزوں کو آقا و مولا سمجھ کر ان کی نظرِ عنایت پر جی رہے تھے۔ سہیل جیسا خوددار شاعر اس طرح کی غلامانہ پست ذہنیت کے بارے میں کہتا ہے:

ننگ ہے بے عمل قبولِ بہشت ؛ یہ تو صدقہ ہوا صلہ نہ ہوا
عشق اور حسن سے سوالِ کرم ؛ یہ تو غیرت کا اقتضا نہ ہوا

سہیل جس زمانے میں اسمبلی کے ممبر تھے اس وقت ایوان کی لمبی لمبی تقاریر سن کر اوب جاتے تھے کیونکہ ان کا نظریۂ حیات عمل پیہم تھا اور اسی پختہ اعتقاد نے انہیں ایک باعمل شاعر بنا دیا۔ چنانچہ وہ تقریر کے بجائے عمل کی ترغیب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

جہاں میں عمل کی عمل داریاں ہیں ؛ سخن پروری کا زمانہ نہیں
پھر موجِ زندگی میں نہیں شورشِ عمل ؛ پھر کوئی سنگِ راہ مقابل نہیں رہا

حاصل سعی ہے سرگشتۂ حرماں ہونا
یعنی ہر گام پہ منزل کا گریزاں ہونا

جواد : یہ صدائیں آرہی ہیں آبشاروں سے
چٹانیں چور ہو جائیں جو ہو عزم سفر پیدا

اہل وطن کو سعیِ پیہم اور عمل کی راہ دکھانے کے بعد سہیل تعمیرِ ہستی راز بھی بتلاتے ہیں ۔

اپنی ہستی کی آپ کر تعمیر
وہ بھی کیا بندہ جو خدا نہ ہوا

سہیل کی وطن پروری مذہب کی طرح سچی اور پکی تھی اُن کا اعلان تھا کہ عہدِ غلامی میں نماز جیسی خلوص نیت والی عبادت بھی رائیگاں ہو جاتی ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں جن سے اُن کے اس جذبے کی تصدیق ہو جاتی ہے :

غلامی میں دفا بے سُود سجدہ رائیگاں میرا
نہ خود میری جبیں میری نہ اُن کا آستاں میرا
خیال اُن کے سخن میرا ، زباں ان کی دہن میرا
بہار اُن کی چمن میرا ، گُل اُن کے گلستاں میرا

قفس میں دیتے ہو کیا طعنِ شکستِ پروازی
فضا کھلی ہوئی ہوتی تو امتحاں ہوتا

قیدِ غلامی و حیات ننگ ہے ننگِ کائنات
لعنتِ بندگی کے ساتھ صورتِ زندگی نہ دیکھ

لیکن یہ قیدِ غلامی ننگِ حیات و کائنات ہے سہیل کو کم ہمتی اور پست حوصلگی سے دور رکھتی ہے کیونکہ ان کا یقین سعیِ پیہم اور عمل پیہم میں ہے ۔ وہ پرچم آزادی کو ہمیشہ سر بلند رکھنے کی تعلیم دیتے ہیں ۔

یہ گردن دوش پر ہے پرچم ملت ہے ہاتھوں میں
یہ ہمت دے مجھے کہ یہ کبھی جھکنے نہ دوں یارب

سہیل کا ایمان تھا کہ اگر اہل ملک کے دل ، دردِ وطن سے آشنا ہو جائیں تو اجنبی ہم پر حکمرانی نہیں کر سکتے ۔ اُن کی نظم "صدائے سروش" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

دلِ قوم درد آشنائے وطن ہو
تو کیوں غیر فرماں روائے وطن ہو

جیوں تو کلاہِ وطن زیبِ سر ہو
[illegible]
وہی سر ہے جو قوم پہ ہو تصدق
وہی جان ہے جو فدائے وطن ہو
انھوں کے قاتل [illegible]
[illegible]

سہیل نے اپنی نظموں میں ملک کے نوجوانوں سے زیادہ وطن کی وابستگی کا مطالبہ [illegible] نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

زندگی کا مدعا یہ ہے ملے حریانِ وطن
جان جائے پر نہ جائے حرمتِ شانِ وطن
غیر اگر دے گنجِ قاروں تو بھی [illegible]
چاہیئے اتنی تو غیرت اے گدایانِ وطن
غیر کے آگے سرِ اہلِ وفا جھکتا نہیں :
ہاں جھکا سکتا ہے اس کو بارِ احسانِ وطن
تنگ ہے وہ عالمِ انسانیت کے واسطے
مل کے غیروں سے کریں جو وجہ حرمانِ وطن
اُٹھ چکے اب تو مجاہد جنگِ حق کے واسطے
سر فدائے قوم و ملت دل ہے قربانِ وطن

سہیل تقسیم ہند کے بھی خلاف تھے وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ آزادی جو بیش بہا قربانیوں اور عظیم مشترکہ کاوشوں سے عالمِ وجود میں آئی ہے اُس کا شیرازہ مفاد پرستی اور عارضی اقتدار کے لئے منتشر ہو جائے ۔ کہتے ہیں ۔

مل جل کے کرو تعمیرِ وطن ایسا نہ ہو طعنے دیں دشمن
ساجھے کی ہنڈیا تھی ہند یا چوراہے پہ آخر پھوٹ گئی

در حقیقت سہیل ایک سچے محبِ وطن شاعر تھے ان کے آبا و اجداد نے ملک و قوم کی خدمت بزورِ شمشیر کی تھی سہیل نے نوکِ قلم سے شمشیر و سناں کا کام لیا تھا

یحییٰ اعظمی

یحییٰ اعظمی اعظم گڑھ کے شمال مغربی سمت میں بسے ہوئے ایک قصبے بہارج گنج میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی ضیاء اللہ صاحب مڈل اسکول میں صدر مدرس تھے۔ فارسی کا بہترین ذوق رکھتے تھے اور اپنی زبان دانی کے لئے سارے ضلع میں مشہور تھے۔

یحییٰ اعظمی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد کے سایۂ عاطفت میں حاصل کی اور بالکل شروع میں ہی فارسی میں اچھی استعداد پیدا کر لی۔ ان کی درسی کتابوں میں گلستاں، بوستاں، انوار سہیلی اور قرآن السعدین شامل تھیں۔ مشرقی علوم کی تحصیل کے بعد انہوں نے شہر جا کر انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا مگر صحت کی خرابی یا ورنا مساعد حالات نے اس خواہش کو پورا نہ ہونے دیا۔ مجبوراً وہ معاش کی بیڑیوں میں پڑ کر مڈل اسکول میں مدرس ہو گئے۔ اسی زمانے میں پورے ضلع میں تحریک خلافت کا زور ہوا اور ضلع کے سیکڑوں محبان وطن کی مانند یحییٰ اعظمی نے بھی اسکول کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور تحریک کے مختلف پروگراموں میں شریک ہونے لگے۔ اسی شرکت کی بدولت وہ شہر میں آگئے اور اپنے دو مخلص کرم فرماؤں مولانا اقبال احمد خاں سہیل اور حکیم محمد اسحاق کی وساطت سے دارالمصنفین میں ان کی آمد و رفت ہو گئی اور علامہ شبلی سے عقیدت کی بدولت اور علمی شغف کی بناء پر وہ شبلی اکیڈمی میں ۱۹۲۵ء میں ملازم ہو گئے۔ یہاں آ کر مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی کی سرپرستی میں ایک طرف ان کے ذوق شعر و ادب کو جلا ملی اور دوسری جانب اس ادارے کی مرکزی حیثیت نے ملک کے بیشتر رہنماؤں اور اہل علم سے فیضیاب ہونے کا موقع دیا۔

ان کی شخصیت کی خصوصیات نے یہیں نشوونما پائی۔ یہاں رہ کر انہوں نے پہلے اعلیٰ قابلیت اور پھر انٹر کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ اگرچہ اس ادارہ میں ان کا کام حساب کتاب کا رکھنا تھا مگر ان کا مشغلہ شعر و شاعری تھا۔ ۱۹۳۱ء میں ان کی پہلی نظم "معارف" میں شائع ہوئی۔ اور اس وقت سے لے کر ۱۹۷۲ء تک ان کی شاعری کا سلسلہ بے پناہ موضوعات اور عنوانات پر جاری رہا۔ دارالمصنفین میں رہ کر انہوں نے بڑی صاف نفیس اور قابل رشک حد تک نفاست کی زندگی گزاری۔ ۱۹۵۸ء میں ان کی شاعرانہ خدمات کی بدولت حکومت ہند نے ان کے لئے قومی وظیفہ کی منظوری دی جو تاحیات قائم رہا ۲۲ فروری ۱۹۷۲ء کو ایک ہفتہ کی بیماری میں داعی اجل کو لبیک کہا اور شہر کے عام قبرستان میں محو خواب ہیں۔

ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہوئے جن میں صرف انتخاب تھا پہلا مجموعہ "نوائے حیات" ۱۹۴۶ء میں حالی پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہوا اور پھر اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۰ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔ اگرچہ دونوں کی اشاعت میں چار سال کا فاصلہ تھا مگر دونوں نسخوں میں کافی تبدیلی کر دی گئی تھی۔

اس مجموعہ کی دوسری اشاعت اور مقبولیت کے بعد آزاد ہندوستان کا ایک نیا رخ ابھرا تھا اور شاعر نے بھی اپنے خیالات و جذبات کو ایک نیا آہنگ دیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۹ء میں ان کا دوسرا انتخاب "نوائے عصر" کے نام سے شائع ہوا جس کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

> اس کی بیشتر نظمیں آزاد ہندوستان اور عصر حاضر سے متعلق اور ملک کی تعمیری کوششوں اور اس کے شاندار مظاہر کی آئینہ دار ہیں۔ ان نظموں میں میں نے مستقبل کے ہندوستان کے تصور اور ملک کے خشک تعمیری اور ترقیاتی مسائل و مظاہر کو شعر و ادب کی زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور مجھے مسرت ہے کہ یہ ملک کے مشہور علمی اور ادبی رسائل میں شائع ہو کر سند قبول حاصل کر چکی ہیں۔

یحییٰ اعظمی کی زبان و دل کی آواز ایک ہی تھی۔ ان کا سینہ مادر وطن کے احترام سے پُر تھا۔ لہٰذا انہوں نے جس آہنگ وطن کے گیت گائے ہیں وہ اوروں سے مختلف ہے۔ ملاحظہ ہوں ایک شعر کے دو بند:

تجھ پہ صدقے اے وطن عالم تمام
کس قدر پیاری ہیں تیری صبح و شام
تیرے پھولوں سے معطر ہیں مشام
خوش نما ہے تیرے دریا کا خرام
اے وطن تجھ کو ہزاروں آفریں

صبح تیری روشن و خندہ جبیں
شام تیری رشکِ زلفِ عنبریں
چاندنی راتیں از سر تا پا حسیں
شاعروں کے واسطے وجد آفریں
اے وطن تجھ کو ہزاروں آفریں

۱۹۳۷ء میں آزادی کی دیوی نے اپنی ہلکی سی جھلک دکھائی صوبوں میں قومی وزارتیں بنیں اور شاعر کا قلم وجد میں آگیا۔

عروسِ ملک مژدہ پھر ترا عہدِ شباب آیا
مبارک خاکِ پاکِ ہند دورِ انقلاب آیا
فضائے ہند ہے پُر شور آزادی کے نغموں سے
کہ مطرب لے کے پھر اس بزم میں چنگ و رباب آیا
یہ آواز آ رہی ہے خاکِ گلگون پشاور سے
شہیدانِ وطن کے خون کا یومِ الحساب آیا
نہ پوچھو مشہدِ ستلج کے خاکستر کی اب عظمت
کہ اک اک ذرہ اس کا رشکِ صد آفتاب آیا
نکل آ جلد اے مہرِ سعادت بطنِ گیتی سے
کہ اب اس دورِ ظلمت کا لبِ بام آفتاب آیا

مگر یہ تاریکی ابھی چھٹنے نہ پائی تھی۔ سحرِ آزادی کو کچھ اور انتظار تھا۔ وزارتیں ٹوٹ گئیں لیکن ۱۹۴۲ء کے ہنگاموں کے بعد بالآخر طلوعِ سحر ہو ہی گیا اور شاعر یحییٰ اعظمی نے پھر اسی جوش و خروش سے اس کا استقبال کیا۔

"صبحِ آزادی کا طلوع" عنوان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہیں اک سحرِ تازہ کے آثار ہویدا
ہونے کو ہے اب ظلمتِ گیتی کا ازالہ
پڑنے کو ہے جمہوریتِ ہند کی بنیاد
ایوانِ حکومت کی بنا ہے تہ و بالا
انگریز کی قسمت میں ہے اب ہند سے چلنا
افرنگ کو ہے دیکھنا اب دیس نکالا
لہرائے گا آزادی کشور کا پھریرا
اب ساحلِ مدراس سے تا کوہ ہمالہ

جنگِ آزادی کا یہ پرچم ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کا پیغام بن کر آیا۔
شاعر نے اسی پرچم کو ان الفاظ میں سلامی دی۔

رخِ مادرِ وطن کا جس نے ہے پھر سنوارا
مشرق کو جس نے بخشا ہے اوج پھر دوبارا
ہر نقشِ زندگی کا جس نے ہے پھر ابھارا

ہر سو ضیا دیا ہے جس نے [illegible]
اے دوستو یہ [illegible]
قومی نشاں ہمارا قومی [illegible]

اس پرچم کا مقصد اب اور زیادہ [illegible]
اس کا نیا نام تھا چنانچہ شاعر اس مقصد کی نشاندہی [illegible]

دنیا کے اور جھنڈے ہیں جنگ کی نشانی
اور اپنا یہ ترنگا ہے صلح کی کہانی
ہے نیلا سبز اس کا تمثیلِ [illegible]
اور رنگِ زعفرانی پیغامِ شادمانی
ہے صبح طرب سفیدی ہے [illegible]
قومی نشاں ہمارا قومی [illegible]

یحییٰ اعظمی نے ان تمام موضوعات پر قلم اٹھایا جو وطن کی سیاسی [illegible] تمدنی، اخلاقی، معاشی اور مذہبی زندگی کا جزو تھے۔ سیاسی رہنماؤں [illegible] ملک کے ہر طبقہ اور مذہب کے لوگ شریک تھے۔ تحریکِ خلافت [illegible] زمانے میں متعدد پلیٹ فارم پر آنے والے تمام اکابرین سے متعلق [illegible] نے اشعار لکھے۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ظفر علی خاں، [illegible] عالمِ اسلام کے ہمدرد رہنماؤں کو انہوں نے اپنی شاعری کا عنوان بنایا [illegible] وہ خود تحریک کے حامیوں میں تھے۔ جلسوں میں شرکت کرتے۔ آزادی [illegible] وطن کے سربراہ مہاتما گاندھی کا ایثارِ نفس، جذبۂ آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے بے مثال قربانی کا جذبہ شاعر کو متاثر کئے بغیر نہ رہا۔ [illegible] میں فسادکی بھیانک آگ پھیلی تو گاندھی جی نوا کھالی چل پڑے۔ شاعر نے [illegible] مسلمانوں کا محسنِ اعظم کے عنوان سے نظم لکھی جس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

ہے اس دنیا کے ذرہ ذرہ پر تیرا کرم گاندھی
غنیمت ہے جہانِ عصرِ نو میں تیرا دم گاندھی
نہ بھولے گی تجھے انسانیت اے محترم گاندھی
کہاں قسمت کہ آنکھیں چوم لیں تیرے قدم گاندھی
کہ تو نے چہرۂ مظلوم [illegible]
انہیں تسکین دی ہے جو [illegible]

اور پھر جب اپنے ہی وطن کی ایک فرد نے مہاتما گاندھی کی [illegible] تو شاعر کا دل روئے بغیر رہ نہ سکا اور اس طرح مرثیہ خواں ہوا۔

بزم دعا ہے دیر سے سونی پڑی ہوئی
روحانیت کا انجمن آرا نہیں رہا
اس بیسویں صدی میں مثالِ [illegible]
جس نے زمانہ اپنا گزارا نہیں رہا

تھی جو تمہید ... قوم ہمیں
تم ہی وہ ... حق جس عنت آرا نہیں
وہ ... راہ جس میں تجھے وحشت کے نیزے
وہ جس کو تھا تمام ہند پیارا نہیں

... کے بعد وطن کے مایہ ناز فرزند جواہرلال تھے۔ یحییٰ اعظمی ... کے بیٹے پنڈت لال سے شیدائی تھے۔ شاعر نے زندہ باد جواہرلال ... اپنی عقیدت ان اشعار میں ظاہر کی۔

... تصویر زندہ باد ؛ بازوئے قوم و ملک کی شمشیر زندہ باد
... وطن ہے پھر اٹھے گا تراجواب ؛ ہندوستاں کے سب سے بڑے پیر زندہ باد
... ہجوم میں اس عزم و شان سے ؛ تراجہاد و کوشش تعمیر زندہ باد
قائم تجھی سے ہند میں ہے شانِ نرم و رزم ؛ اے سر تروش و صاحب تدبیر زندہ باد

گاندھی نہیں تو ان کے مظاہر ابھی تو ہیں
کیا غم ہمیں کہ زندہ جواہر ابھی تو ہیں

اور جب اس بطلِ جلیل کی آنکھیں بند ہوئیں تو شاعر بے اختیار رو پڑا جذبۂ دل نے یوں ماتم کیا:

افسوس کہ رخصت ... وطن سے ؛ جمہور کا وہ رہبر محبوب دل آرام
تیار نہ تھی اس ... کے لئے قوم ؛ ہم اور سنیں آہ تری موت کا پیغام
... جس پہ شعف آہ گلوں سے ؛ شعلوں سے ہے وابستہ وہ بالائے گل اندام
ہے صبح وطن آج ترے غم میں سیہ پوش
آتش سے نظر شام وطن شعلہ در آغوش

... اعظمی نے ان تمام مسلم رہنماؤں کی شان میں نظمیں لکھیں جو بے درپے جنگ آزادی میں شریک تھے، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، آصف علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمان اور رفیع احمد قدوائی ان کے سیاسی زعما میں تھے۔ ان لوگوں میں مولانا ابوالکلام آزاد سیاسی حیثیت سے ان کے پیر و مرشد تھے۔ مولانا پر ان کی ان گنت نظمیں مل سکتی ہیں۔ "ملتِ اسلام کا مفکرِ اعظم" کے عنوان سے ان کی ایک طویل نظم کے چند اشعار پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں:

کرتا ہے اَوج سلطنت اس کے قدم کا استلام ؛ آنکھ جو ہو تو دیکھئے مرتبۂ ابوالکلام
اس کی فراست آج ہے بحث و نظر سے ماوریٰ ؛ ہاتھ میں جس کے ہے سپرد مجلس قوم کی زمام
جانِ وطن سے آج تک حق تو یہ ہے نہیں اٹھا ؛ ایسا ادیب حق نگار ایسا خطیب خوش کلام
... جسے حریم عشق جانتے ہیں اس کی شان کیا ؛ سرخوشی نشاط میں گزری ہوں جن کی صبح و شام
... سے سیہ ملت دیں سے بے خبر ؛ جان سکیں گے آہ کیا مرتبۂ ابوالکلام

روز ازل سے ہر نفس جس کا ہے حریت نواز
اس کو سمجھ سکے گی خاک پستی فطرت غلام

دار المصنفین ایسی مرکزی جگہ تھی جہاں قوم کے سیاسی اور مذہبی رہنما اکثر و بیشتر آتے رہے۔ محققین، ماہرین تعلیم اور اہل ذوق یہاں آتے اور یہاں کے لوگ ... استقبال کرتے۔ انہیں آنے والوں میں ذاکر حسین صاحب کی شخصیت بھی تھی۔ یوں تو وہ بارہا تشریف لائے تھے مگر نائب صدارت کے دور میں دار المصنفین کی گولڈن جوبلی کی تقریب کی ... شاعر نے اپنے ممدوح کی مناسب مدح کی:

تری ذات گرامی ... قوم و ملت کا ؛ ہے تمام اعتبار وجلۂ گنگ و جمن تجھ سے
ترو ہستی ہے لعل شب چراغ محفل ملت ؛ ہے خاک ہند ... اے بھارت زمین تجھ سے
ترے مقدم سے سر بر آسماں ہے منزل شبلی ؛ ... جلوہ ... منزل شبلی

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی جب مشرقی اضلاع کے دورے پر گئیں تو اپنے دادا موتی لال نہرو اور باپ جواہرلال نہرو کی روایت باقی رکھتے ہوئے شبلی منزل میں بھی تشریف لائیں۔ یحییٰ اعظمی نے بھی اس موقع پر اپنی روایت برقرار رکھی اور اندرا جی کے وہ تمام محاسن گنائے جو انہوں نے تھوڑی سی مدت میں حاصل کر لئے تھے:

بجا ہے گر ... آج اعظم گڑھ کا ذرہ ذرہ ؛ ہے آنا آپ کا گویا جواہرلال کا آنا
ملا سب کو نوید کامرانی کا ... پروانہ ؛ چمک اٹھے نہ کیوں علم و دانش کا یہ کاشانہ
کہ ہے اب آپ کے فیض قدم سے یہ چمن تازہ ؛ خود آ کر آپ نے کی باپ کی رسم کہن تازہ

ان پچاس برسوں میں ملک و قوم سے متعلق کم ایسے واقعات ہوں گے جن پر یحییٰ اعظمی نے صدق دلی سے نہ لکھا ہو۔ ان کے کلام کی زیادہ مثالیں صرف وطن اور اس کے زعما خصوصی سے متعلق پیش کی گئی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ شاعر نے اور اصناف سخن اور دیگر موضوعات کو نظر انداز کر دیا۔ ان کے مجموعوں میں غزل کے خوبصورت اشعار بھی ہیں اور منظر نگاری اور قدرتی شاعری کے بہترین نمونے بھی ملیں گے۔

ابھی حالیہ جنگ میں ہندوستان کی پوزیشن سے متعلق انہوں نے متعدد نظمیں لکھیں جس میں ہندوستانی فوج اور سپہ سالاروں کی بے مثال جانبازی کی داد دی ہے اور ملک و قوم کی باگ ڈور سنبھالنے والی وزیر اعظم اندرا گاندھی سے متعلق ذیل کا قطعہ لکھا جو ابھی تک شائع نہ ہو سکا۔

فتح مندی کی نوید ابدی تجھ کو ملی ؛ تیرے قدموں پہ جھکا لشکر جرار غنیم
کارنامہ یہ نہیں ترے جواں مردوں کا ؛ اندرا تیری فراست کی ہے یہ فتح عظیم
ترے کردار کی ملتی نہیں دنیا میں نظیر ؛ ہے جو تاریخ میں بے مثل ترا عزم صمیم
کیوں نہ ہے فخر سے اب ملک کا بچہ بچہ
نام نامی ترا اے ہند کی خاتون زعیم

یحییٰ اعظمی نے اپنے ادب کو زندگی سے الگ نہیں سمجھا۔ چنانچہ وطن دوستی ان کی شاعری کا اول و آخر مقصد تھا۔ یوں تو ہزاروں شاعر آزادی کے پرستار ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے مگر یحییٰ اعظمی کی مثال کم ملے گی۔ اور ان کا کلام تاریخ آزادی میں ایک ممتاز مقام کا مستحق رہے گا۔

[illegible] اللہ خاں
ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی گورکھپور (یوپی)

رام پرساد بسمل

ہندوستان کی جنگ آزادی کے شہیدوں میں رام پرساد بسمل ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ کاکوری ڈکیتی کیس میں ماخوذ ہوئے تھے۔ اور انھیں دار و رسن کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ پھانسی کی کوٹھری کے اندر موت کے سائے میں انہوں نے اپنی سوانح عمری لکھی۔ اسے انہوں نے ایک جیل کے وارڈر کے ہاتھ گورکھپور کے مشہور کانگریسی رہنما اور ہندی اخبار "سودیش" کے ایڈیٹر شری دسرتھ پرساد دویدی کے پاس بھجوا دیا۔ پوری سوانح عمری تین قسطوں میں باہر آئی۔ آخری قسط بسمل کے پھانسی پانے کے ایک دن پہلے باہر آئی تھی۔ دویدی جی نے ان کاغذات کو گنیش شنکر ودیارتھی کے پاس بھیج دیا۔ اور انھیں کے زیر اہتمام "کاکوری کا شہید" کے عنوان سے یہ سوانح عمری شائع ہوئی۔ شائع ہوتے ہی انگریزی سرکار نے اسے ضبط کر لیا۔ اتفاق سے اس کا ایک نسخہ شری جابر مل شرما کے کتب خانے میں محفوظ رہ گیا۔ اسی کی مدد سے شری بنارسی داس چترویدی نے "امر شہید" کے نام سے اپنے مقدمے کے ساتھ اسے دوبارہ شائع کیا۔ یہاں اسی سوانح عمری کی مدد سے رام پرساد بسمل کے حالات پیش کئے جاتے ہیں۔

رام پرساد کا آبائی وطن تومار دھار تھا جو گوالیار میں چمبل ندی کے کنارے واقع ہے۔ لیکن ان کے بزرگ ترک وطن کر کے شاہجہاں پور میں آباد ہو گئے۔ وہ لکھتے ہیں "میرے دادا شری نرائن لال جی کا جنم بھی تومار دھار میں ہوا تھا۔ وہ خاندانی جھگڑے اور بھابھی کی بد اخلاقی سے پریشان ہو کر پیدائشی مقام کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور ادھر ادھر بھٹکتے رہے۔ آخر میں اپنی بیوی اور دو لڑکوں کے ساتھ شاہجہاں پور پہنچے۔ انھیں دونوں لڑکوں میں بڑے لڑکے شری مرلی دھر جی میرے والد تھے۔ شاہجہاں پور میں ان کے [illegible] پڑے۔ ان کے والد میونسپلٹی میں ۱۵ روپے پر ملازم [illegible] سنہ ۱۸۹۷ء) میں رام پرساد بسمل کی پیدائش ہوئی۔

طالب علمی کے زمانے سے ہی رام پرساد انقلابی ذہن [illegible] کی طرف پوری توجہ نہ دے سکے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم [illegible] کی اور ہندی سے ان کے والد نے روشناس کرایا۔ انہیں کے الفاظ [illegible] کا ہوا تو والد صاحب نے خود ہی مجھے ہندی الفاظ سے روشناس کرایا۔ اور ایک [illegible] کے مدرسے میں اردو پڑھنے کے لئے بھیجا۔ جب میں نے اردو کا چوتھا درجہ پاس کیا اور پانچویں میں میرا داخلہ ہوا تو اس وقت میری عمر تقریباً ۱۴ سال کی تھی۔" رام پرساد نے نویں درجہ تک تعلیم پائی۔ اسی تعلیمی دور میں وہ چند بری عادتوں کے بھی شکار ہو گئے۔ وہ اپنے والد کے صندوق سے روپیہ چرانے لگے۔ ان پیسوں سے وہ ناول خریدتے اور پڑھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ سگریٹ اور بھنگ کے بھی عادی ہو گئے۔ "میں سگریٹ پینے لگا تھا۔ کبھی کبھی بھانگ بھی چڑھا لیتا تھا۔ میں ایک دن بھانگ چڑھا کر والد صاحب کے صندوق سے روپیہ نکالنے گیا۔ نشے کی حالت میں ہوش نہ رہنے کی وجہ سے صندوق کھولنے کی آواز دب نہ سکی۔ ماں کو شبہ ہو گیا اور انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔"

اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں رام پرساد بسمل آریہ سماج تحریک کے حامیوں میں سے تھے۔ اور اس کے جلسے اور جلوس میں پابندی کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ "میں تھوڑے دنوں میں کٹر آریہ سماجی بن گیا۔ آریہ سماج کے جلوس میں جاتا اور آریہ سماج کے مہاتماؤں کی سیوا کرتا۔ انھیں مہاتماؤں میں ان کے استاد شری ۱۰۸ سوامی رام دیوجی تھے۔ رام پرساد ان سے بے حد متاثر تھے لکھتے ہیں: "اپنی ماں کے علاوہ جو کچھ میں نے زندگی میں حاصل کیا یا تعلیم پائی وہ محترم شری ۱۰۸ سوامی رام دیوجی کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔ آپ کا نام شری برج لال چوپڑا ہے۔"

اپنے انقلابی ذہن کی بنا پر وہ ہر تحریک کو لبیک کہتے تھے مگر کوئی تحریک ایسی نہیں تھی جو ان کے ذہن کو پوری طرح سے مطمئن کر سکتی۔ شاہجہاں پور میں شری رام باجپئی نے سیوا سمیتی کی بنیاد ڈالی۔ اس میں بھی انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا مگر دراصل رام پرساد کی انقلابی زندگی کا آغاز کانگریس کے لکھنؤ اجلاس (دسمبر ۱۹۱۶ء) میں شرکت کے بعد ہوا۔ وہ اس وقت نویں درجہ کے طالب علم تھے۔ لکھنؤ کر انہیں معلوم ہوا کہ ایک ایسی خفیہ تنظیم بھی کام کر رہی ہے جو مطالبات کے ذریعہ نہیں بلکہ بغاوت کے ذریعہ آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے۔ یہ راستہ پر خطر تھا۔ مگر آزادی کی لگن نے انھیں خطرات سے بے نیاز کر دیا۔ اپنے ایک دوست کی مدد سے وہ اس خفیہ تنظیم کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اس کی تنظیم میں دل و جان سے لگ گئے۔ یہ تنظیم [illegible] سے دور جا رہی تھی۔ روپے کی کمی کی بنا پر بہت سے کام رک پڑے تھے۔ روپیہ اکٹھا کرنے کے لئے ان لوگوں نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا "امریکہ کو آزادی کیسے ملی"

[illegible] ساتھ ہی ایک کتاب بھی [illegible]، [illegible]
[illegible] کتاب بھی پنڈت گیندالال جی کے گرفتار ہونے کا ردعمل
[illegible] جاری تھی کبھی گرفتار ہوتے۔ روپوں
[illegible] کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ ہم نے تین رائفلیں
[illegible] بندوق، ڈبل بیرل بندوق۔ تین ٹوپی دار ریوالور
اور پانچ [illegible] رائفل خریدی۔ مگر اس کے باوجود جو ہتھیار تنظیم کے لئے ضروری
[illegible] وہ میسر نہ تھے۔ اسلحہ خریدنے کے لئے پیسوں کی ضرورت تھی اور پیسے
[illegible] کتاب بیچ کر پیسہ جمع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب سامنے ایک ہی راستہ بچ گیا
تھا۔ کسی بھی قیمت پر روپیہ کی فراہمی اور اسکا ایک ہی ذریعہ نظر آیا۔ ڈاکہ۔ اس وقت
تنظیم کی حالت بہت خراب تھی روپیہ کا انتظام کرنا بہت ضروری تھا۔ لیکن وہ کیسے ہو۔
وہن کوئی دیتا نہ تھا۔ قرض ملنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اور کوئی ذریعہ نظر نہ آیا۔ آخر
ڈاکہ ڈالنا طے پایا۔ لیکن کسی کی ذاتی ملکیت پر ڈاکہ ڈالنا ہمیں پسند نہیں تھا سوچا
اگر لوٹنا ہی ہے تو سرکاری مال کیوں نہ لوٹا جائے۔ انہوں نے ایک منصوبہ بنایا
اور کاکوری میں ایک مسافر ٹرین سے سرکاری خزانہ لوٹ لیا۔ بسمل ہی کی زبانی اس
ڈاکہ کی تفصیلات سنئے۔ "ہم نے زنجیر کھینچ کر گاڑی روک لی اور ٹرین کو گھیر لیا۔
مسافروں سے یہ کہہ دیا گیا کہ سب گاڑی میں چڑھ جائیں۔ اس لئے کہ زیادہ تر مسافر
گاڑی رکنے کی وجہ سے ٹرین کے باہر آ گئے تھے۔ گاڑی کا گارڈ بھی ڈبے میں چڑھنا
چاہتا تھا۔ مگر ہم لوگوں نے اسے زمین پر لیٹ جانے کا حکم دیا۔ تاکہ بغیر گارڈ
کے گاڑی نہ جا سکے۔ دو آدمی کو لائن کے نزدیک پگڈنڈی پر کھڑا کر دیا گیا کہ وہ گھاس
اور جھاڑیوں میں کھڑے ہو کر گاڑی پر گولی چلاتے رہیں۔ ایک آدمی گاڑی سے اترا۔
اس کے پاس بھی ایک پستول تھا۔ اور انہیں کے پستول سے ایک آدمی زخمی ہو گیا میں نے
اس کا انتظام کر دیا تھا کہ اگر کوئی بندوق لیکر سامنے نہ آتے یا مقابلے میں گولی نہ چلے
تب تک کسی آدمی پر فائر نہ ہونے پائے۔ میں کسی آدمی کے قتل کے بعد اس کو خطرناک ڈکیتی
کیس بننے نہیں دینا چاہتا تھا" یہ یقیناً ایک کامیاب ڈاکہ تھا۔ اور اس طرح ان لوگوں کے
ہاتھ بہت سا روپیہ آیا۔ اس کو دوسری جگہ منتقل کرنے کا انتظام اس طرح کیا گیا۔

صندوق کو توڑ کر تین تین تھیلیاں بنالی گئیں اور پھر راستے میں ان تھیلوں
سے روپیہ نکال کر ایک جگہ باندھ لیا گیا۔ اور لکھنؤ پہنچے۔ کسی نے راستے میں پوچھا تک
نہیں کہ تم لوگ کون ہو۔ اور کہاں سے آئے ہو۔ اور اس طرح سے دس آدمیوں نے
ایک گاڑی کو لوٹ لیا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس گاڑی میں چودہ آدمی ایسے تھے
جن کے پاس بندوق یا رائفلیں تھیں۔ کاکوری میں ٹرین سے سرکاری خزانہ لوٹے جانے
کے بعد پولیس چوکنی ہو گئی۔ بڑے زوروں کے ساتھ جانچ پڑتال شروع ہو گئی۔
خفیہ پولیس کے افسران سرگرم عمل ہو گئے۔ اور آخر کار اپنے مقصد میں کامیاب ہو بھی
گئے۔ رام پرساد بسمل کی گرفتاری عمل میں آئی۔ "صبح چار بجے میں جاگا۔ ضروری حوائج سے فارغ
ہو چکا تھا کہ باہر دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ
پولیس آگئی۔ میں فوراً دروازہ کھول کر باہر آیا۔ ایک پولیس افسر نے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
میں گرفتار ہو گیا" ۔ ادھر ان کے خفیہ ساتھی بھی گرفتار ہو چکے تھے۔ جیل میں سب لوگوں کو الگ
الگ رکھا گیا۔ اس دوران خفیہ پولیس اس بات کے لئے کوشاں رہی کہ بسمل کو سرکاری
گواہ بنالیں۔ بسمل کو سرکاری گواہ بنانے میں تو ناکام رہے لیکن ان کے ایک ساتھی بنارسی
داس کو سرکاری گواہ بنانے میں وہ کامیاب ہو گئے۔

سرکاری طور پر دکھاوے کے لئے شناختیں کرائی گئیں اور یہ سب کام ایک
ہندوستانی مجسٹریٹ کی عدالت میں ہوتا رہا۔ مگر بعد میں یہ مقدمہ سیشن کو سپرد
کر دیا گیا۔ جب تک یہ معاملہ عدالت میں آئے اس وقت تک دائے بریلی میں بنواری لال بھی
گرفتار ہو چکے تھے۔ بسمل نے ہرکرن ناتھ کو بلایا اور کہا کہ یہ سب کام چھوڑ کر جائیں اور
بنواری لال سے ملیں۔ کیونکہ بسمل یہ سمجھ چکے تھے کہ اگر ہم لوگوں نے کوئی قانونی قدم نہ اٹھایا
تو دامودر سیٹھ کی طرح جیل ہی میں سزا دیئے جائیں گے۔

جیل میں بسمل اپنے آپ کو بالکل اکیلا محسوس کرنے لگے اور کبھی کبھی یہ اکیلا پن ان
کو جیل میں یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا تھا کہ " ایک بار یہ خیال بھی آیا کہ سرکار سے سمجھوتہ کر لیا جائے
خفیہ پولیس کے کپتان اور سپرنٹنڈنٹ سے بات چیت شروع ہوئی مگر یہ سوچ کر کہ اس سے انقلابی
تحریک کی عزت ختم ہو جائے گی۔ یہ خیال ترک کر دیا گیا" اور اس وقت تک ان لوگوں پر
باقاعدہ مقدمہ تیار ہو چکا تھا۔ مسٹر ہارٹن کاکوری کیس کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے
۲۶ ستمبر ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ ۴۰ آدمیوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ خفیہ پولیس کے افسران نے
بنارس ہندو یونیورسٹی کے ایک طالب علم کے کمرے سے دو رائفلیں بھی برآمد کر لی تھیں۔
گرفتار ہونے والوں میں رام کرشن کھتری، پردیش کمار چٹرجی، یوگیش چندر چٹرجی بھی
شامل تھے۔ اور بعد میں اشفاق اللہ بھی گرفتار ہو گئے۔ ۴۰ سے زائد گرفتاریاں عمل میں
آئیں۔ مگر مقدمہ صرف ۲۸ آدمیوں پر چلایا گیا۔

رام پرساد اپنے دوستوں میں اگر کسی سے متاثر تھے تو وہ اشفاق اللہ تھے بسمل اشفاق اللہ
کو اپنے چھوٹے بھائی کی طرح مانتے تھے۔ حالانکہ وہ بڑی حد تک آریہ سماجی تھے۔
"تھوڑے دنوں میں ہی تم میرے چھوٹے بھائی کی طرح ہو گئے۔ سبھوں کو تعجب ہوا کہ
میں ایک کٹر آریہ سماجی اور تم ایک مسلمان دونوں کا کیا میل۔ میں مسلمانوں کی شدھی کرتا
تھا۔ کچھ ہمارے ساتھی تم سے مسلمان ہونے کی وجہ سے نفرت بھی کرتے تھے۔ مگر تم میرے
ساتھ آریہ سماج مندر میں آتے جاتے تھے۔ کیونکہ تمہارا دل بالکل صاف تھا۔ تمہاری
صاف گوئی نے میرا دل جیت لیا تھا۔ کبھی کبھی دوستوں کی محفل میں بات چھڑتی کہ
کہیں مسلمان پر اعتبار کر کے دھوکہ نہ کھا جائیں۔ مگر جیت تمہاری ہوئی۔ ہم لوگوں
نے ایک ہی تھالی میں کھانا کھایا۔ میرے دل سے یہ خیال نکل گیا کہ میں ہندو ہوں اور
تم مسلمان۔ مجھے تم پر اٹوٹ اعتبار تھا۔ تم بھی میری طرح کٹر انقلابی تھے تمہارا دلی
بات کا صرف یہی کام تھا کہ تم زیادہ سے زیادہ مسلمان نوجوانوں کو انقلابی تنظیم

میں ہجرت کرو۔ اور وہ انقلاب میں حصہ لیں۔ گرفتار ہو جانے کے بعد تمہارے خیالات میں کوئی فرق نہ آیا۔" اور اسی طرح کے خیالات سے بسمل کی سوانح عمری بھری پڑی ہے۔ پھانسی سے تین دن پہلے بسمل نے جو صفحات قلمبند کئے ان میں بھی وہ اشفاق اللہ کو نہیں بھولے۔

وہ صفحات جو پھانسی پانے کے تین دن پہلے لکھے گئے وہ ایک دستاویز کی سی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ایک انقلابی ذہن کے آئینہ دار بھی ہیں۔ بسمل کے سامنے زندگی کے صرف تین دن تھے اور تین دن کے بعد پھانسی کا پھندہ منتظر تھا۔ بسمل پھانسی پانے کے تین دن پہلے لکھتے ہیں: "آج ۱۶ دسمبر ۱۹۲۷ء کو یہ آخری لائن لکھ رہا ہوں جب کہ ۱۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو سوموار کے ۶ بجے صبح کو اس جسم کو پھانسی پر لٹکا دینے کی تاریخ طے ہو چکی ہے۔

۶ اپریل ۱۹۲۷ء کو سیشن جج نے فیصلہ سنایا تھا۔ اور ۱۸ جولائی کو اودھ چیف کورٹ میں ہم لوگوں نے اپیل کی مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ جتنے لوگوں کو سزائیں ہوئی تھیں ان میں ایک آدھ آدمی کی سزائیں بڑھیں کم نہیں ہوئیں۔ میں نے ایک خط جو گورنر کے نام تھا اس میں کہا تھا کہ میں آئندہ کسی انقلابی تحریک یا کام میں حصہ نہیں لوں گا۔ مگر چیف کورٹ اس کو نہیں مانی۔ چیف کورٹ نے یہ درخواست رد کر دی تو پھر گورنر اور وائسرائے کے پاس رحم کی درخواست کی کہ "رام پرساد بسمل، راجندر ناتھ لاہری، روشن سنگھ اور اشفاق اللہ کو پھانسی کی سزا بدل کر اور دوسری سزا دینے کی سفارش کی گئی تھی۔ کونسل کے چنے ہوئے ممبروں نے دستخط کر کے ایک درخواست دی۔ میرے والد نے ڈھائی سو سے زیادہ آنریری مجسٹریٹ اور زمینداروں کے دستخط کروانے کے بعد ایک الگ درخواست دی۔ مگر سرکار نے ایک نہ سنی۔ اس وقت لیجسلیٹو اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے ۷۸ ممبروں نے دستخط کر کے وائسرائے کے پاس رحم کی درخواست کی کہ "کاکوری کیس میں موت کی سزا کو بدل کر دوسری سزا دی جائے کیونکہ سیشن جج نے یہ سفارش کی تھی کہ اگر یہ لوگ افسوس کریں تو سرکار سزا کم کر دے۔ جب ان کی موت کی سزائیں ہوئی تھیں مجرموں نے افسوس ظاہر کیا۔ مگر وائسرائے نے ایک نہ سنی۔

اسی وقت مدن موہن مالویہ جی اور اسمبلی کے کچھ ممبروں نے وائسرائے سے مل کر یہ کوشش کی کہ سزائیں کم ہو جائیں مگر کوشش کارگر نہ ہوئی۔ حالانکہ اشفاق اللہ تو انگریزی سرکار سے رحم کی درخواست کرنے پر راضی ہی نہیں تھے۔ ان کا تو یہ اعتبار تھا کہ خداوند کریم کے علاوہ کسی دوسرے سے کچھ نہیں مانگنا چاہئے۔ مگر میرے ضد کرنے پر وہ اس کے لئے تیار ہو گئے۔ اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ کیونکہ ان کو اس فیصلے سے میں نے ڈگمگایا تھا۔ میں نے اس بھول کی معافی ایک خط میں (وہ دوسرے جیل میں تھے) اشفاق سے مانگی تھی۔ خدا جانے وہ ان تک پہنچا کہ نہیں۔ آخر میں میں نے سوچا کہ جیل سے نکل بھاگوں مگر باہر سے کوئی مدد نہیں ملی۔ مجھے باہر سے ایک ریوالور تک دستیاب نہ ہو سکا۔"

وہ آخر میں کہتے ہیں کہ "میں جان دینے میں ہچکچاتا نہیں۔ کیونکہ میں نے اپنا کام کر دیا ہے مگر یہ افسوس ضرور ہے کہ جس کے لئے کام کرو وہ بھلائی کرو وہی برے برے نام دیتے ہیں۔ اب میرے ہم وطنوں سے گزارش ہے کہ جو کچھ کریں سب مل کر کریں۔

اور سب [illegible] کے لئے [illegible] [illegible] ختم ہو جاتی ہے۔ وہ ۱۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو [illegible] گئے۔ ان کے پاؤں میں [illegible] نہیں تھی۔ [illegible] تھے کہ یہ میرا اعتبار ہے کہ [illegible] کسی عزیز کے گھر میں جنم لوں گا کیونکہ میرا مقصد [illegible] پورا کرے۔ ساری دنیا میں جمہوری حکومت قائم ہو۔"

غزل

ذکیہ انجم

شعبۂ اردو، ماتا سندری کالج، نئی دہلی

روش روش ہے جہانِ تازہ، قدم قدم موجِ زندگی ہے
مگر مسرت جو اجنبی تھی، ہجومِ گل میں بھی اجنبی ہے

قریب رہ کر ہے دور کوئی، ہم ایسی قربت کو کیا کریں گے
وہ چاند نکلا ہوا ہے لیکن، کبھی کبھی دل کی چاندنی ہے

ہر ایک جادے کے پیچ و خم سے، ہر ایک منزل کے بام و در سے
مجھے جنوں کی صبا خرامی جہان بھر میں لئے پھری ہے

ہزار جلوے ہیں، لاکھوں لیکن، ہے دل کی بستی اداس پھر بھی
کوئی کرن تو کہیں سے پھوٹے کہ تیرگی مجھ کو ڈس رہی ہے

چمکتے تاروں سے پوچھتی ہے، پلک پلک جھلملاتی شبنم
یہ کس مقامِ سفر پہ انجم حیات آ کر ٹھہر گئی ہے

اقدامِ قتل

"لیکن اگر نہ دیا تو —" میری پشت سے نکل کر اس نے سوالیہ انداز میں آنکھیں اٹھا کر پوچھا۔

"نہ کیوں دیں گے۔ کیا کوئی قرض لیے جا رہے ہیں۔ آج ۲۴ دن ہو گئے ہیں دوڑتے ہوئے اور وہ روز کل پرسوں کہہ دیتے ہیں۔ آج ساری بات صاف کر لوں گا۔"

میرے ساتھ چلتا ہوا شخص عجیب مضحکہ خیز انداز میں مجھے دیکھنے لگا تو میں نے نظر انداز کر کے پھر کہا۔

"تم بلاوجہ گھبراتے ہو بس وہاں خاموش رہنا یعنی ان کو احساس ہی نہیں کہ کون کن حالات میں آپ کے پاس بھاگا ہوا آ رہا ہے۔ ایک مضمون کا ۱۵ روپیہ دیں گے اور دو مہینے دوڑائیں گے۔ بے حس۔"

میرا ساتھی میری بڑبڑاہٹ سے اکتا کر ہواؤں کو چیرتا ہوا جنگل میں دیکھنے لگا اور مجھے ایسا لگا جیسے میرے سامنے قدم زرد سوکھے ہوئے پتوں پر پڑ رہے ہوں اور چاروں طرف شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ یا بالکل سناٹا ہو۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں بہت وزنی ہوتا جا رہا ہوں پھیلتا جا رہا ہوں۔ اس کھنڈر کی طرح بھاری بھرکم۔ جس کا خاکہ ہی مسمار ہو چکا ہو۔ اور وہ مکڑیوں کے جالوں، اور چمگادڑوں کی بیٹ سے اپنے وزن کا احساس کر رہا ہو۔

پھر مجھے لگا جیسے میرے جسم سے بہت سی خستہ، بکھوری اینٹیں نکل نکل کر فضا میں بکھر رہی ہوں اور سلگتی ہوئی شہتیروں میں آگ لگی ہو۔

میرا ساتھی راہ کی جھاڑیوں سے الجھنے لگا تو میں نے اسے کھینچ لینا چاہا۔ لیکن اس کے انکار پہ شرمندہ ہو کر سوچنے لگا۔

نہ جانے یہ کب کیسے میرے ساتھ ہوا تھا کہ میرے سارے گناہوں سے بھی واقف ہے۔ رات کو پورا کرتا ہے۔ اس نے تو اکثر میری مرضی کے خلاف بھی عمل کیا ہے۔ لیکن میں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا ہوں۔ شاید احساس کمتری کی وجہ سے کہ میں خود تو بوڑھے کا دانت ہوں نہ جانے کب گر پڑوں۔ اگر یہی شخص مجھے راکھ اور چونے سے سنبھال نہ لے تو —؟؟

میں شاید کسی بھرے پرے۔ ویران جنگل کا ققنس ہوں۔ میری چاروں طرف بہت سے دیمک لگے ہوئے پر جمع ہیں اور درختوں کے آپسی سنگھرش سے لمحہ بہ لمحہ خستہ تر ہوتا رہتا ہوں (جیسے ملک کا فور فتح دکن کے بعد بیٹھا دن رات اپنی آنکھوں سے گرد، سنگ ریزے یا صاف کرتا رہتا تھا) میں نے پلٹ کر دیکھا میرا ساتھی کچھ سوچ رہا تھا۔ اس لئے میں بھی سوچنے لگا۔

تین مضمون کے ۴۵ روپے۔ پانچ روپے پہلے کے باقی۔ کل پچاس۔ پچاس۔ پچاس۔ یہ پچاس میں کیا ہوگا —؟ اچھا بہت ضروری خرچ جوڑ لو۔ ۲۰ کمرے کا (آج تک کمرے کا کرایہ ادا نہیں کیا) ۲۷ قرض (قرض بھی وقت پر دے دیتا ہوں) ۴۵ کھانے کا بل۔ (کھانے کے بغیر کیا ہوگا؟) اور چیزیں چھوڑ دو۔ اس کا ٹوٹل — ۲۰ اور ۲۰ چالیس۔ سات سینتالیس ۴۷ اور ۴۵ چالیس چالیس۔ اسی اور سات پانچ بارہ۔ اسی دس نوے اور دو۔ بانوے۔ اب بتائیے۔ اور اگر آپ کے خیال کے مطابق واقعی آج بھی وہاں سے نہ ملا تو — "ارے پیسے نہ دیں گے کوئی بھیک مانگ رہے ہیں۔ ہونہہ۔ نہ دیں گے۔" میری آنکھوں میں ہلکا ہلکا پانی سا آ رہا تھا۔ "کب۔ کہیے کب آئیے —؟" جاؤں گا تو پہلے یہی کہیں گے۔

"جی چلا آ رہا ہوں۔ آپ نے اس وقت آنے کو کہا تھا نا —؟" میں بالکل خشک لہجہ میں کہوں گا۔ تیوریاں بھی چڑھا لوں گا۔

"ہاں۔ اچھا۔ جی آپ کا انتظام ہو رہا ہے۔ کچھ زبانی یاد ہے۔ کتنا ہے آپ کا۔" وہ کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک طرف کو جھکتے ہوئے کہیں گے۔

"جی۔ ۴۵ اس بار کا ہے اور پانچ پہلے کا —" میں بغیر بے چینی یا خوشی ظاہر کیے ہوئے کہوں گا۔

"یعنی پچاس —" "شکا جی ذرا آپ سے پچاس روپے کا واؤچر بھروا لو۔"

یکدم میرے ساتھی نے مجھے چونکا دیا۔ "ذرا دیکھ کے۔ ابھی ٹکرا گئے ہوتے۔ کیا سوچ رہے ہو —" میرے ساتھی نے چمکا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ سوچنا کیا ہے۔ اگر آج بھی انہوں نے ٹال دیا تو بہت برا ہوگا۔ کوئی بھیک تھوڑی مانگتا ہوں۔ ارے مضمون لکھا ہے۔ پیسہ دیجیے۔ ۲۴ دن سے دوڑا رہے ہیں —" میں نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

ذرا خیال ہے کہ آپ وہاں صرف خاموش رہیے گا۔ اس نے منہ بنا کر کہا میں ہی ان سے تفصیل سے بات کروں گا۔ اگر انہوں نے کہہ دیا کہ جائیے دو مہینے بعد آئیے گا تو آپ ان کا کیا کریں گے اور پھر بعد میں جب آپ مضمون کے لیے پوچھیں گے تو کہہ دیں گے کہ جانیے یہ مضمون نہیں شائع ہو سکے گا۔ کوئی آپ کا قرض تھوڑا ہے انہوں نے جو آپ کا مضمون شائع کریں۔ یا ان کو مضمون نگار نہ ملیں گے۔ ذرا سوچ سمجھ کر بات کیا کرو۔ اس نے نرمی سے میرے ہاتھوں کو سہلایا۔

تم خود سوچو۔ اگر آج بھی انہوں نے پیسہ نہ دیا تو کیا ہوگا؟ میرا تو دماغ خراب ہوا جا رہا ہے۔ مجھے خود اپنے لہجہ میں بڑی بے چارگی محسوس ہوئی۔

اول تو آج انہوں نے وعدہ کیا ہے — دیں گے ہی۔ اور اگر نہ دیا تو کل پرسوں کبھی تو دیں گے۔ کہتا ہوا وہ مجھے لے کر آفس میں داخل ہو گیا۔

میں جب اپنے ذہنی جسم کو کھینچتا ہوا چلمن ہٹا کر اندر داخل ہوا تو ایسا لگا جیسے کسی کوری صراحی میں آ گیا ہوں بھیگی بھیگی سردی سی صراحی۔

وہ جھک کر ایک کرسی میں بیٹھ گیا۔

منیجر صاحب نے اس کے سلام کا جواب دے کر پھر سر جھکا لیا تھا۔ ابھی میں نے سلام نہیں کیا تھا اور اب اس کے فرمانبردارانہ سلام کے بعد میرا دل بھی نہیں چاہتا تھا کہ انہیں سلام کروں۔

خاموش بیٹھے بیٹھے مجھے غصہ آنے لگا تھا یعنی کوئی بات ہی نہیں کہ دو بجے دھوپ میں دوڑا چلا آ رہا ہوں۔ دینا ہو تو دیجیے۔ یہ کیا کہ کچھ پتہ ہی نہیں کہ دیں گے یا نہیں دیں گے

میرا ساتھی چپ چاپ بیٹھا پن سے دانت کرید رہا تھا۔ اور منیجر صاحب شاید اخبار کے پتے درست کر رہے تھے۔

میں نے بدبدا کر اس سے بات کرنی چاہی تو اس نے آنکھ سے اشارہ کر کے ہونٹوں پہ انگلی رکھ لی اور آہستہ سے کہا: ”ابھی خود ہی متوجہ ہوں گے۔“

جب خاصی دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد میری آنکھوں میں پنکھے کی سرسراہٹ سے نیند تیرنے لگی تو میں نے بھاری سا سر اٹھا کر خشک لہجہ میں پوچھ ہی لیا۔

کیا ہوا صاحب۔ آج آپ نے بلایا تھا۔!

انہوں نے سر اٹھا کر چشمہ کے اوپر سے دیکھا۔ بیٹھیے تو سہی۔ بس ابھی بتاتا ہوں۔

کیا بتائیے گا۔ ۴۴ دن سے تو دوڑ رہا ہوں۔ آپ کو پرچہ میں لکھ بھی دیا تھا کہ بہت سخت ضرورت ہے۔ لیکن آپ۔ (میں نے محسوس کیا کہ میرے لہجہ میں بہت خشکی آ گئی ہے اور ٹھہر گیا) اور اچانک میرا ساتھی بول اٹھا۔

لیکن آپ شاید اس خط کو بھول گئے، منیجر صاحب۔ بہت سخت ضرورت ہے۔ ورنہ میں اس طرح دوڑ دوڑ کر آپ کو پریشان نہ کرتا۔

اس کے لہجہ کی گڑگڑاہٹ اور خوشامد سے میں غصہ میں کپکپانے لگا۔

اور کھول اٹھا۔ تم خود ذلیل ہو تو مجھے کیوں ذلیل کرتے ہو [illegible] کیا ہے کہ ہم نے انہیں۔ کمینہ کہیں کا۔! میں نے اس کی [illegible] ہاتھ بڑھانا چاہا لیکن منیجر صاحب اس سے کہہ رہے تھے۔

نہیں نہیں ایسی تو پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ [illegible] کل ہاتھ بالکل خالی ہو گیا ہے۔ نہ کہیں سے منی آرڈر آ رہا ہے [illegible] اکاؤنٹنٹ صاحب بیمار پڑے ہیں۔

چہ چہ۔ ہونہہ۔!

میں کھول رہا تھا اور وہ چہرے پر غم طاری کیے ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا۔

اب پرسوں آپ کے جانے کے بعد میں نے ایک دکان سے قرض لینا چاہا تھا لیکن انہوں نے بھی انکار کر دیا۔ منیجر صاحب پیڈ پر کچھ لکھ رہے تھے اور بول بھی رہے تھے۔

اور میرے سارے جسم میں آگ لگ رہی تھی۔ کیا بیوقوف بنا رہے ہیں۔ غصہ سے مجبور ہو کر میں نے کہنا چاہا۔

دیکھیے میں . . .

لیکن اس نے درمیان سے ہی بات اچک لی۔

. . . بہت پریشان ہوں منیجر صاحب۔ کہیں سے کچھ انتظام کیجیے۔ بس آپ کا ہی سہارا ہے ورنہ

— منیجر صاحب اٹھ کر تھوکنے چلے گئے۔

میں غصہ کی زیادتی سے روہانسا ہو گیا۔ جی چاہا کہ ابھی یہیں اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ذلیل شخص کا گلا گھونٹ دوں۔ لیکن منیجر صاحب کہنے لگے۔

دیکھیے میں ایک جگہ فون کر لوں تو بتاتا ہوں۔

ان کے جاتے ہی میں نے اپنے ساتھی کو کرسی پر سے اٹھا کر ڈانٹنا شروع کیا۔

کیا تم واقعی اتنے ذلیل ہو۔ آج اپنے سے نفرت ہونے لگی ہے کہ کیوں تمہیں اتنے دن ساتھی بنائے رہا۔ ذلیل، بے حس، سور۔ اب آپ ہرگز نہ بولیے گا۔

اسی وقت منیجر صاحب داخل ہوئے اور کہنے لگے۔

بھئی ایک دکان پر فون کیا تھا۔

لیکن میں نے ان کی بات کاٹ دی: مجھے ان سب سے کیا مطلب اس وقت آپ کہیں سے پچاس روپے کا انتظام کر دیجیے ورنہ

لیکن منیجر صاحب بولتے رہے۔ اس نے کہا کہ آج تو چیک جمع ہو چکا ہے اور دکان کا سارا پیسہ بھی چیک جا چکا ہے اور کل اتوار ہے [illegible] پرسوں ہی ہو سکے گا۔ اب آپ ایسا کیجیے کہ پرسوں اسی وقت آ جائیے۔

[illegible] زور سے واقف بیٹھے تو آنکھوں میں درد ہونے لگا۔ میرا ساتھی
[illegible] خاموشی اور پاس سے منیجر صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ اور میں پوری طرح
[illegible]

منیجر صاحب آپ کو احساس نہیں ہے۔ میں پرسوں تو . . .
کہ اچانک ہی وہ میری پشت سے نکل کر بول پڑا۔
میں پرسوں پھر اسی وقت آجاؤں گا۔ منیجر صاحب لیکن دیکھئے کہیں
سے ضرور انتظام کر لیجئے گا۔ نہیں تو . . .

اور میں جھلا کر اسے کمرے سے باہر کھینچ لایا۔
میری آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ تمتما رہا تھا۔
میں نے تمہیں بولنے سے منع کیا تھا تو کیوں بولے۔ تم کو میرے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کا کون سا حق تھا۔ میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے پھپھکار کے کہا۔ لہجہ کی درندگی سے اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور وہ پیچھے کی سمت سمٹتا جا رہا تھا۔
تم ہوتے کون ہو بولنے والے۔ کمینہ۔ ذلیل۔ غصہ سے میں لرزنے لگا۔

اور اس کی طرف لپکتے ہوئے میں نے کہا
آج۔ آج میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔
وہ خاموشی سے نظریں جھکائے میرے انگوٹھے کو دیکھ رہا تھا۔
اس کی خاموشی پر میرا غصہ اور تیز ہوا تو دونوں ہاتھوں کا پھندا بنا کر میں نے اس کی گردن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر نہ معلوم کیا سوچ کر (شاید غصہ کی زیادتی میں) بغیر نتیجہ کی پرواہ کئے میں نے اپنی جیب سے چاقو نکال لیا اور جب اس کے سینہ میں عین دل کے مقام پر چاقو مارنا چاہا تو میرا ہاتھ اس کے سینے تک پہونچ کر جھکتا چلا گیا۔
میرے ساتھی کی بڑی بڑی چمکیلی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی بڑی حسرت سے میرے جھکتے ہوئے ہاتھ میں چمکتے ہوئے چاقو کو دیکھ رہی تھیں۔
میں کھڑا سنسنا رہا تھا۔
پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میں خاموشی سے اس کا سرد ہاتھ اپنی گرم بغل میں دبا کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔
●●

عزیز جاوید
۱۶۶۸ ے کمرہ نمبر ۱۲ مولانا آزاد روڈ بمبئی ۸

متاعِ یک عمر

نہ فکرِ فردا نہ رنجِ امروز . . .
شفیق ماں کی عظیم شفقت . . .
عزیز بہنوں کا پیار میری مسرتوں کا علم کشا تھا
چراغِ شب لوریاں سناتا
سحر محبت سے گدگداتی
مجھے محلّے کی ہر گلی پیار سے بلاتی . . .
حبیبِ جاں تھا وہ عہدِ طفلی
کریم تر تھا وہ عہدِ طفلی
اور اب مری عمر کی یہ چوتھی دہائی مجھ کو
سلگتے صحرا میں چھوڑ کر مجھ سے کہہ رہی ہے
"اگر کوئی تجھ سے یہ کہے اے شکستہ پیکر
حبیبِ جاں تھا جو عہد تیرا
کریم تر تھا جو عہد تیرا
اسے میں لوٹا رہا ہوں لیکن
عوض میں اس کے
تو اپنے یہ تجربوں کی زنبیل مجھ کو دیدے
تو اس سے کہنا
خدائے عصر و زماں سلامت
متاعِ یک عمر بے بہا ہے"

(ہیزلٹ سے ماخوذ)

شانتی رنجن بھٹاچاریہ
[illegible] کلکتہ ۴۰

راجا رام موہن رائے اور اردو

راجا رام موہن رائے نہ صرف ایک عالم تھے بلکہ وہ اپنے عہد کے لاثانی فنکار، عالم و مفکر تھے۔ آپ سنسکرت، عربی، فارسی، فرینچ، لاطن، انگریزی، گریک، بنگلہ اور اردو کے علاوہ ہبرو (عبرانی) زبان سے بھی واقف تھے جہاں تک ہمیں علم ہے انہوں نے سنسکرت، عربی، فارسی، انگریزی اور بنگلہ کے علاوہ اردو میں بھی مضامین اور کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے قومی، سیاسی، مذہبی، سماجی اور معاشی خیالات و خدمات نیز انگریزی و بنگلہ زبان کی تخلیقات پر آج تک کئی حضرات نے روشنی ڈالی ہے لیکن ان کی عربی، فارسی و اردو خدمات کے سلسلہ میں زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ اور خاص کر اردو خدمات پر تو کسی نے نظر ہی نہیں ڈالی ہے۔ لہٰذا اس مضمون میں ان کی عربی، فارسی و اردو خدمات پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مراۃ الاخبار

رام موہن رائے اپنے دور کے سب سے عظیم ہندوستانی ہونے کے علاوہ ہندوستانی صحافت کے پہلے رہنما بھی ہیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد جدید پریس و اخبارات نے جنم لیا۔ انگریزوں سے قبل قلمی اخبارات تھے جن میں مختلف مقامات کی خبریں ہوتی تھیں مغل دور میں شہنشاہ، صوبے اور بڑے شہروں یا دیگر اہم مقامات کی خبریں حاصل کرنے اور ان خبروں کو دربار تک پہنچانے کے لئے چند ملازم رکھتے تھے جن کو "واقعہ نویس" کہا جاتا تھا۔ یہ واقعہ نویس خبروں کو تحریر کرکے دربار تک روانہ کرتے تھے۔ صرف شاہ دہلی ہی نہیں بلکہ دیگر کئی راجے اور بڑے زمیندار یا نواب بھی اپنے علاقوں میں واقعہ نویس رکھا کرتے تھے اور یہ واقعہ نویس ان دنوں کی سرکاری زبان یعنی فارسی میں خبریں لکھ کر ارسال کرتے تھے۔ وہ کاغذات جن میں یہ خبریں ہوتی تھیں، اخبار کہلاتے تھے۔

بہر حال انگریزی عہد میں جب جدید پریس [illegible] ہونے لگے اور فارسی میں سب سے قبل اخبار [illegible] موہن رائے کے سر ہے اس اخبار کا نام "مراۃ الاخبار" [illegible] کا پہلا شمارہ ۱۲ اپریل ۱۸۲۲ء بروز جمعہ کلکتہ سے شائع ہوا۔ [illegible] کے دنیا کے کسی بھی کتب خانہ میں "مراۃ الاخبار" [illegible] ہے جس کی وجہ سے ہم یہ جاننے سے قاصر ہیں کہ رام موہن [illegible] تھا۔ وہ خبروں کو کیوں کر ترتیب دیتے تھے۔ ان کے مضامین [illegible] کیسے ہوتے تھے۔ انگریزی اخبار "کلکتہ جرنل" میں ہمیں [illegible] دیسی زبانوں کے اخبارات کے مضامین ملتے ہیں جو کہ ترجمے ہیں [illegible] کے ایسے ہی مضامین سے ہمیں "مراۃ الاخبار" اور رام موہن رائے کی صحافت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ رام موہن رائے نے اپنے اخبار کے اغراض و مقاصد کے سلسلہ میں لکھا تھا۔ (۱)

"میرا اخبار نکالنے کا مقصد یہ ہے کہ میں پبلک کے سامنے ایسے مضامین رکھوں جن سے ان کی معلومات میں اضافہ ہو اور ان میں علم کی روشنی پھیلے اور اس کی بہتر اصلاح جہاں تک میرے امکان میں ہو میں کروں۔"

۴ اپریل ۱۸۲۳ء کو اخبارات کی آزادی کے خلاف حکومت وقت نے قانون پاس کیا۔ رام موہن رائے پہلے صحافی تھے جنہوں نے پریس کی آزادی کے لئے آواز بلند کی۔ انہوں نے اس قانون کے خلاف پرزور احتجاج کیا اور جب کمپنی کی حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی تو انہوں نے انگلستان کے دروازے تک کھٹکھٹائے۔ لیکن رام موہن اپنے مقصد میں ان دنوں کامیاب نہیں ہوئے اس لئے انہوں نے لکھا کہ (۲) "حق کی آواز بلند کرنے کے لئے جو باتیں اور جس زبان کو اختیار کرنے کی ضرورت پیش آئے گی وہ زبان، وہ انداز بیان، وہ الفاظ حکومت کو کھٹکے گی اور ظاہر ہے کہ وہ ناراض ہو کر لائسنس ضبط کرے گی پھر لائسنس لینے کی محنت کیوں کی جائے۔ اس لئے میں کچھ کہنے سے بہتر خاموش رہنا ہی عقلمندی خیال کرتے ہوئے اخبار بند کرتا ہوں۔

رموز سلطنت خویش خسرواں دانند ۔ گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش
(مصلحت ملک)

تحفۃ الموحدین

تحفۃ الموحدین رام موہن کی واحد تصنیف ہے جس سے ان کی فارسی و عربی زبان دانی کا ہم قیاس کر سکتے ہیں یہ رسالہ فارسی میں ہے اور اس کا مقدمہ عربی میں۔ رام موہن نے یہ رسالہ مرشد آباد کے قیام کے دوران تحریر کیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد کالج لائبریری کلکتہ [illegible] میں محفوظ ہے اور مطبوعہ نسخے کئی نامور کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں [illegible] کوئی ایڈیشن رام موہن رائے کی زندگی میں اور موت کے بعد بھی شائع [illegible]

(۱) تاریخ صحافت اردو۔ از امداد صابری جلد اول
(۲) ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں۔ از محمد عتیق صدیقی

[illegible] ہے۔ ان اُردو خطوں کے سوا [illegible] اُن کے نام کے گئے۔ ہیلنٹ باقی [illegible] رام موہن رائے یہاں درج [illegible] [illegible] تاریخ ۱۵ [illegible]

اُردو خدمات

رام موہن [illegible] کا بنا یا لیکن وجہ سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ [illegible] صرف بنگالی، فارسی، انگریزی اور [illegible] زبانوں میں لکھتے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں ہے۔ راجہ جی کے عہد کے رام موہن رائے کے وقت تک فارسی ہندوستان کی سرکاری زبان تھی۔ آخر کار [illegible] میں بنگالی زبان نے فارسی کو [illegible] سے نکال باہر کیا۔

جب عدالت سے فارسی کو ختم کرنے کا سوال [illegible] لوگوں نے آواز بلند کی کہ فارسی کے بجائے اُردو کو عدالتی زبان قرار دیا جائے جس کی وجہ سے کہیں کہیں اُردو کو مقام ملا تھا۔ اس سلسلہ میں کئی خطوط اس دور کے بنگلہ اخبار سماچار درپن میں شائع ہوئے — جن میں [illegible] اُردو کو بہتر قرار دیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عدالت کے لوگ اُردو کو فارسی کا بدل سمجھتے تھے [illegible] کے لحاظ سے بلکہ چونکہ اُردو بھی فارسی [illegible] وکلا کی عدالتی اُردو عوام میں مقبول نہیں ہو سکی۔ چونکہ یہ اُردو برائے نام ہی اُردو تھی اور وہ حقیقی معنوں میں فارسی ہی رہی ہے۔

انیسویں صدی کے انگریز عالموں نے بھی اُردو کو ہندوستان کی قبول ترین زبان اور رابطے کی زبان تسلیم کیا ہے۔ جہاں ایسے دور میں جب کہ فارسی و عربی صرف عالموں کی زبان تھی اور عوام میں اُردو کی مقبولیت فارسی سے بہت زیادہ تھی۔ راجہ رام موہن رائے جیسا ایک سماجی کارکن، ایک مصلح جس کو اپنے خیالات کا عوام میں پرچار کرنا تھا کیونکر اُردو سے دور رہتا۔

جس طرح سنسکرت صرف عالموں کی زبان ہونے کی وجہ سے رام موہن نے سنسکرت کے بجائے بنگلہ زبان کو اپنایا۔ بالکل اسی طرح عربی و فارسی محض عالموں کی زبان ہونے کی وجہ سے انہوں نے اُردو کو اپنایا۔

اُردو کے نامور فرانسیسی پروفیسر گارساں دتاسی سے رام موہن کی خط و کتابت تھی۔ دتاسی نے اپنی تصنیف "تاریخ ادبیات ہندوستانی" میں لکھا کہ "رام موہن نے اُردو میں بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں"۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ [illegible] رام موہن نے اُردو میں مضامین لکھے ہیں۔ گارساں دتاسی یہ بھی لکھتے ہیں کہ رام موہن نے ویدانت کو اُردو میں مختصر کیا ہے۔ نواب سید نصیر حسین خیال مرحوم نے بھی لکھا ہے کہ رام موہن رائے نے وید کے بارے میں کئی مضامین اُردو میں شائع کئے تھے اور ویدانت کو مختصر کر کے اسے بھی اُردو میں شائع کیا تھا۔ گارساں دتاسی کی ایک اور تصنیف "اُردو زبان کے قواعد" ۱۸۲۹ء میں فرانس سے شائع ہوئی۔ اس کے دوسرے حصے میں اُردو اور ہندی کے جملہ ۱۸ خطوط ہیں۔ یہ حصہ ضمیمے کے طور پر ۱۸۳۳ء میں شائع ہوا۔ ان خطوط میں راجہ رام موہن رائے کا ایک اُردو خط بھی شامل ہے۔ فرانس دیکھنے کی آرزو رام موہن کے دل میں ایک عرصے سے تھی ۱۸۳۲ء کے آخر میں آپ فرانس گئے بھی تھے اُردو خط سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے گارساں دتاسی سے ملاقات کی تھی۔ یہ خط انگلستان میں قیام کے دوران فرانس جانے سے قبل رام موہن رائے نے دتاسی کو لکھا تھا خط حسب ذیل ہے۔

"جناب فضیلت مآب زاد مجدھم و ستر فیہم[1]

رقعۂ مبارک پہنچا۔ بندہ کو مسرور و معزز کیا۔ خدا بر علی الاطلاق آپ کو اس یاد آوری کے ساتھ سلامت رکھے تین مہینے سے بندہ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ انشاء اللہ[2] عنقریب پارس میں مشرف خدمت ہوگا۔ آپ کی توجہ سے جناب ز[illegible] صاحب کی ملاقات حاصل کرے گا۔ آپ کے وعدہ مراعات سے بندہ کمترین ممنون ہوا۔ اداے شکر تہہ دل سے کرتا ہوں۔ زیادہ حد ادب

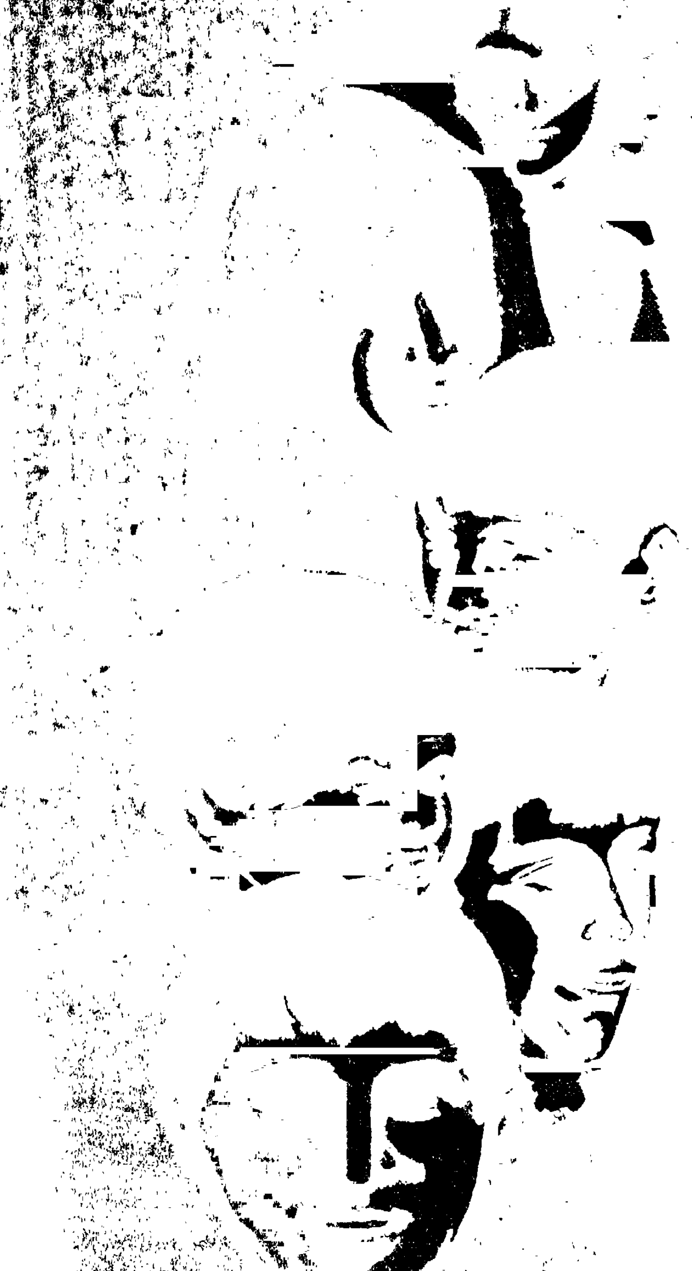
حرر فی التاریخ یکم اگست ۱۸۳۱ء[3] خادمکم و ممنونکم۔ رام موہن

غالب نے اُردو میں کوئی فسانہ یا مضمون نہیں لکھا لیکن اس کے باوجود غالب کو اُردو نثر نگاری میں بلند، باعزت اور خاص الخاص مقام حاصل ہے اور اس کی وجہ وہ خطوط ہیں جو انہوں نے اُردو میں اپنے دوست احباب، شاگردوں اور معاصرین کے نام لکھے ہیں بے شک غالب کے خطوط نے اُردو نثر نویسی کو سادگی عطا کی اور مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ ان کے خطوط کی اہمیت مسلم ہے لیکن راجہ رام موہن رائے کے اس خط کی جو اوپر نقل کیا گیا ہے اہمیت بھی کم نہیں کیونکہ یہ خط گواہ ہے کہ رام موہن رائے اُردو کے اولین خطوط لکھنے والوں میں سے ہیں

۱۔ "آج کل" کے جون ۱۹۵۶ء کے شمارے میں جناب مختار الدین احمد صاحب کے مضمون "راجہ رام موہن رائے کا ایک اُردو رقعہ" میں یہ خط پہلے بھی شائع ہو چکا ہے۔ (ادارہ)

۲۔ مختار الدین احمد صاحب کے مضمون میں "انشاء اللہ تعالیٰ" درج ہے۔ (ادارہ)

۳۔ مختار الدین احمد صاحب کے مضمون میں شیزی (M' Che zy) صاحب درج ہے۔ اور "حرر فی التاریخ یکم اگست ۱۸۳۱ء" کے بعد یہ فقرہ ہے "جناب شفقت فرمائے گرامی قدر فارس صاحب کے حوالے کیا گیا" مختار الدین صاحب نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ اس خط کے قاصد فارس صاحب ایک انگریز مستشرق تھے جنہوں نے "قصہ حاتم طائی" کا ترجمہ شائع کیا تھا لیکن شیزی صاحب کے بارے میں مزید معلومات دستیاب نہیں خط کے لفافے پر پتا یوں درج تھا "جناب فضیلت مآب جامع علوم عربی و ہندی مولوی گارسین دتاسی زاد مجدہم۔ دارالسلطنۃ پارس۔ فرانس"۔ (ادارہ)



کیا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ زیادہ بچے ہوں تو مستقبل میں آمدنی بھی زیادہ ہوگی؟

اکثر کہا جاتا ہے کہ ہر بچہ اپنے ساتھ دو ہاتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ آدمی کھاتا پیتا تو ساری عمر ہے لیکن خوراک پیدا کرنے کا کام زندگی کے کچھ حصے میں ہی کر سکتا ہے۔
نئے طریقوں سے ہم پیداوار بڑھا سکتے ہیں لیکن ان طریقوں کے استعمال کے لئے بہتر تعلیم اور مہارت کی ضرورت ہے۔
ایک تعلیم یافتہ شخص زندگی میں بالآخر زیادہ کامیاب رہتا ہے۔
اگر آپ کے زیادہ بچے ہوں گے تو آپ کو انھیں اچھی تعلیم اور بہتر خوراک دینے میں دقت پیش آئے گی۔
محدود تعداد میں پڑھے لکھے اور صحت مند بچے زیادہ تعداد میں ان پڑھ اور کمزور بچوں کی نسبت زیادہ کما سکیں گے۔

غزلیات

[illegible]

[illegible] بی چاوں [illegible] پنجاب

[illegible] سے اور کیا نکلا
بڑی تلاش کے بعد ایک نقش پا نکلا

رُکے تو چاند بہت دُور تھا تصور سے
چلے تو چار ہی قدموں کا فاصلہ نکلا

مرو کے پھول تو مرجھا گئے بہاروں میں
جنوں کا زخم خزاں میں ہرا بھرا نکلا

سفرِ شباب کا صد درجہ مختصر تھا، مگر
بہت طویل سرابوں کا سلسلہ نکلا

رہِ شعور میں پلکوں سے خار کس نے چنے
مرا ہی شوقِ سفر تھا، جو رہ نما نکلا

وصالِ یار تو قسمت کی بات ہے بے شک
خیالِ یار بھی ہم سے بہت خفا نکلا

سیاہ راتیں تو دے اُٹھے لہو کے چراغ
ربابِ عشق سے وہ شعلۂ نوا نکلا

جعفر عسکری

بمکان پروفیسر احتشام حسین (مرحوم) نوراللہ روڈ۔ الہ آباد

فضا میں نقش بنا گیا تھا پچھلے پہر
ترا خیال ستارہ بنا تھا پچھلے پہر

پڑا ہوا تھا جو مقتول بے کفن اس پر
لباسِ مجرم کا پردہ پڑا تھا پچھلے پہر

کوئی تو خواب میں آ کے گیا تھا تم جیسا
مجھے گمان سا یہ ہوا تھا پچھلے پہر

ہر ایک راستہ ویراں تھا دشتِ دل کی طرح
فسادِ خوف کا برپا ہوا تھا پچھلے پہر

[illegible]
[illegible] تھا پچھلے پہر

وشوا ناتھ درد

پوسٹ بکس ۵۶۸ ، نئی دہلی - ۵

اگر کچھ موڑ رستے میں نہ آتے
تو ممکن تھا تجھے ہم بھول جاتے

متاعِ ہوش کی بازی لگا کر
بساطِ عشق پر ہم ہار جاتے

کہاں ماضی کہاں امروز و فردا
کہاں سے داستاں اپنی سناتے

غرورِ ضبط سے پہلو بچا کر
تمہیں کو دوستو ہم آزماتے

اگر ہوتا نہ کچھ خود پر بھروسہ
تمہیں اے دردؔ ہم محرم بناتے

مجیب بستوی

سرایداں بازار بستی اُتر پردیش

میرے مرنے کے جو کرتے رہے ساماں کتنے
آج وہ بھی نظر آتے ہیں پریشاں کتنے

آپ ہی کیجئے خود اپنے رویے پہ نظر
آپ نے ہم سے کئے وعدہ و پیماں کتنے

آہ گلچیں ترے دل میں ہے مروت کہ نہیں
تو نے تاراج کئے صحنِ گلستاں کتنے

ایک لمحے کے لئے جن کو نہیں ہے آرام
ایسے دنیا میں نظر آتے ہیں انساں کتنے

ڈوبنے والا سفینہ تھا مرا ڈوب گیا
دیکھتے تھے لبِ ساحل سے نگہباں کتنے

وادیٔ عشق میں رکھئے نہ قدم آپ مجیبؔ
ہوئے گمراہ یہاں صاحبِ ایماں کتنے

نئی کتابیں

حرفِ نیم شب

۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو نوجوان شاعروں کا ایک پورا قافلہ تھا جو اس تحریک کے زیرِ اثر آگیا۔ ان میں ایسے شاعر کم تھے جنہوں نے اس تحریک کے بنیادی مقاصد کو تفصیلات کی حد تک جان کر اس کا ساتھ دیا ہو، مارکسزم پر عقیدہ رکھنے والے، گاندھی ازم کے پیرو، تحریکِ آزادیٔ وطن کے سپاہی یا پھر صرف نئے رجحانات کو فروغ دینے اور فرسودگی اور رسمیت کے عناصر کو شعر و ادب سے خارج کرنے کے حامی شعراء، یہ سبھی ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے۔ شمیم کرہانی اس گروہ کے ان شاعروں میں ہیں جو تحریک آزادیٔ وطن کی حمایت کی راہ سے اس پلیٹ فارم پر پہنچے تھے چنانچہ ان کی چالیس سالہ شاعری کا توجہ سے جائزہ لیا جائے تو یہ جنگِ آزادی کے مختلف مراحل کی نشاندہی کرتی نظر آئے گی۔ اس ضمن میں ان کی نظمیں خصوصیت سے قابلِ توجہ ہیں لیکن ان کا یہ ذہنی پس منظر ان کی غزلوں میں بھی قدم قدم پر اپنی جھلکیاں دکھاتا ہے "حرفِ نیم شب" ان کی تازہ غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ان کی غزلوں کے یہ شعر دیکھیے اور اس کسک کو محسوس کیجیے جو آزادیٔ وطن کے ۲۵ سال بعد شاعر کے نہاں خانۂ دل کے کسی نامعلوم گوشے میں جگہ بناتی جا رہی ہے:

اور بڑھے گا دردِ دل رات جو بھیگ جائے گی
دیکھ نہ وقت کی طرف، وقت بھی چارہ گر نہیں

ہم تو خزاں کی دھوپ میں خونِ جگر چھڑک چلے
موسمِ گل کی چاندنی کس کو ملے خبر نہیں

رفوگرانِ چمن کی رفوگری دیکھو
کہ چاک چاک ہے پیراہنِ چمن سارا

کہتے ہو کہ انسان کی تقدیر بدل دی
تاریخ تو ماتھے پہ شکن لے کے چلی ہے

کتاب کے حرفِ آغاز میں شمیم صاحب نے [illegible]
ڈالتے ہوئے کہا ہے "ایسی داخلیت [illegible]
خاص قسم کا انشراحِ قلب و نظر پیدا کرے [illegible]
غزل دونوں میں داخلیت اور خارجیت کے امتزاج [illegible]
ہے"۔ ان کا یہ اندازِ نظر انہیں ان [illegible]
ہے جو صرف خارجی مظاہر کی ترجمانی کو شاعری کا اصل [illegible]
دیتے رہے ہیں۔ ان کی شاعری کو واقعات کا بے کیف بیان [illegible]
نے روکا وہ غالباً ان کا یہی اندازِ نظر ہے۔ ان کے ایسے اشعار بھی جو
اپنا ایک واضح سیاسی پس منظر رکھتے ہیں، جذبے کی چاشنی سے خالی نہیں
اور یہ ان کی شاعری کا ایک قابلِ قدر وصف ہے۔ اپنی داخلی کیفیات سے
دستبردار نہ ہونے کی اسی روش ہی نے انہیں یہ ذہنی [illegible]
مندی بھی بخشی ہے کہ خارجی حالات کی ناسازگاری کے سامنے سپر نہ
ڈال جائے اور اپنی دنیا آپ تخلیق کرنے کے عقیدے کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔

ظلمت گہہِ دوراں میں صبحِ چمنِ دل ہوں
روکو نہ سفر میرا میں قسمتِ منزل ہوں

جگر کے داغ کوئی کم ہیں روشنی کے لیے
میں جاگتا ہوں ستاروں سے کہہ دو سو جائیں

ظلمتِ وقت سے کہو حسرتِ دل نکال لے
ظلمتِ وقت کے لیے آج کی رات اور ہے

دوائے دل کے لیے اپنے پاس آیا ہوں
کہ میرے درد کا درماں ہے کون میرے سوا

شمیم صاحب کی غزلوں کا ایک اور وصف ان کا موضوعاتی تنوع ہے، حیاتِ انسانی کے مختلف پہلو، مختلف تصویریں ان کی غزل کے آئینے میں اپنی جھلکیاں دکھاتی نظر آتی ہیں۔ یہ پہلو، یہ تصویریں ایسی ہیں جو عام لگا ہوں کے سامنے آکر بھی خود کو پوری طرح بے نقاب نہیں کرتیں۔ شمیم صاحب نے انہیں بے نقاب دیکھا ہے لیکن ان کی [illegible] فریضہ ادا کرتے ہوئے ان کے خط و خال پر ابہام کا ایک [illegible] باقی رکھنا ضروری سمجھا ہے۔ غالب کی یہ [illegible] عبارت [illegible] کی اس تہ داری سے جس سے شمیم صاحب کی غزل [illegible] اچھی غزل کی خصوصیت سمجھا گیا ہے۔ شمیم صاحب کا [illegible]

[illegible] ہے کہ وہ اس بیرونی آرائش میں خود بھی ذہنی اور [illegible] ہے اس کے تمام پردوں پر ان کی واقفیت [illegible] رقت بھی ہے۔ وہ عشق حسن کو پردہ در پردہ دیکھ [illegible] کر نہیں رہ جاتے بلکہ حسن کی نظر پس پردہ کی [illegible] بھی رہنا چاہنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

کبھی تھے محو نظارہ کہ عام تھا جلوہ
جگہ بھی سر منزل بھی نظر تنہا
نظارہ آرزو سے جھکے جھکے گدگدائے جا
الٹ دیے گئے نقاب اہل حرم آہستہ آہستہ
حسن سے بڑھی کی فکر و نظر کی پختگی
عشق سے جذبات کو گہرائیاں ملتی گئیں

حسن و عشق کے معاملات سے اردو کی غزلیہ شاعری کو خاص شغف رہا ہے۔ شمیم صاحب کی غزلیں گواہی دے رہی ہیں کہ وہ بھی اس وادی کے با خبر مسافر ہیں۔ حسن سے خواہ وہ کسی صورت میں جلوہ نما ہو، انہیں ایک والہانہ لگاؤ ہے اور حسن اور اس کے مختلف مظاہر سے اس لگاؤ کا دوسرا نام عشق ہے۔ شمیم صاحب کی غزلوں میں عشقیہ جذبات کی ترجمانی بھی بڑے متنوع اور گوناگوں انداز میں ہوئی ہے کہیں ان جذبات کی بیداری کا سبب حسن کی دوری ہے تو کہیں اس کی قربت کبھی کسی کی بے رخی نے ان کے دل کے تاروں کو جھنجھنا دیا ہے تو کبھی کسی کی نگاہ لطف ان کے ساز احساس کی مضراب بن گئی ہے گویا شاعر کسی خاص کیفیت یا جذبے کا اسیر نہیں، غم ہو یا نشاط، امید کے لمحے ہوں یا مایوسی کی گھڑیاں، سبھی حالتوں میں اپنی فنکارانہ ذمہ داری سے عہدہ بر آ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

شمیم صاحب کے اسلوب میں روایت کا رچاؤ ہے لیکن اس کھردرے پن سے بھی وہ گریزاں نظر نہیں آتے جو [illegible] یات کی راہ سے شاعر کے کلام میں در آتا ہے۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ ان کے کلام میں زبان و بیان کی خامیاں کم ہی تلاش کی جا سکتی ہیں۔

حرف نیم شب ۲۲/۱۶ سائز کے ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت، طباعت روشن ہے اور قیمت چھ روپے ہے۔ ملنے کا پتہ یہ ہے۔ مکتبہ ارباب فکر [illegible] کوچہ میر عاشق، چاوڑی بازار، دہلی ۶

نقوشِ جاوید

[illegible] کا ایک مردم خیز مقام ہے جہاں ادبا کے علاوہ بہت سے [illegible] شعرا بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب بیان کے ۶۴

[illegible] شعراء کے تذکرہ اور انتخاب کلام پر مشتمل ہے۔ کتاب کے مرتب حافظ محمد ہارون صاحب [illegible] خود بھی ایک نوجوان شاعر ہیں جن کا تعارف کتاب کے شروع میں حنیف [illegible] پیش کیا ہے۔ [illegible] ترتیب [illegible] ان کی محنت اور جانفشانی کو [illegible] تذکرے اور منتخب کلام کے علاوہ [illegible] شاعروں کی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

کتاب کے پیش لفظ میں [illegible] موجودہ شعراء کے کلام پر [illegible] اکتفا کیا گیا ہے۔ [illegible] بالخصوص جب [illegible] شعراء کا [illegible] کتاب میں اس اصول کی پابندی [illegible] کی گئی ہے۔ اور اکثر شعراء کے کلام کی [illegible] قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ ترتیب میں پہلا نام [illegible] صاحب [illegible] کا ہے جن کے تذکرے میں [illegible] بھی نظر آتا ہے۔ مختصر یوں کہہ لیجئے کہ آپ شعری و ادبی میدان میں اقبال، جگر، اور جوش اور [illegible] کے مرتبے اور [illegible] اس قسم کی [illegible] نے کتاب کے درجہ اعتبار کو صدمہ پہنچایا۔ تاہم اس کی یہ افادیت اپنی جگہ مسلم ہے [illegible] شہر کے [illegible] معاصر شعراء کا منتخب کلام اور مختصر سوانحی حالات اس میں یکجا ہو گئے ہیں۔ کتاب کی قیمت [illegible] پچاس پیسے ہے۔ [illegible] پتوں سے طلب کی جا سکتی ہے جن میں سے پہلا یہ ہے۔

یوسفی کتب خانہ، بازار نخاسہ، سہارنپور (یوپی)

خونِ جگر

جناب عاقل [illegible] کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں غزلوں اور نظموں کے علاوہ قطعات اور رباعیات بھی شامل ہیں۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر منوہر سہائے انور، انقر [illegible] مرحوم اور حیرت بدایونی صاحب کی آرا عاقل صاحب کے کلام کے بارے میں درج ہیں، اور آئینہ افکار کے عنوان سے خود عاقل صاحب نے بھی اپنی شاعری کے بارے میں کچھ امور کی وضاحت کی ہے جس میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے تین استادوں سے فیض حاصل کیا ہے۔ ابتدا میں انہوں نے انقر [illegible] صاحب کی شاگردی اختیار کی، پھر کچھ مدت تک جناب منور لکھنوی کو اپنا کلام دکھلاتے رہے اور آجکل ڈاکٹر منوہر سہائے انور سے اصلاح لے رہے ہیں۔ حصول فن کے لئے عاقل صاحب کی یہ لگن قابل داد ہے اور [illegible] ان کے کلام میں زبان و بیان کی پختگی نظر آتی ہے [illegible] کا ثمرہ سمجھنا چاہئے۔ شاعری کے روایتی اسالیب پر ان کی نظر ہے۔ [illegible] بڑی بات ہے لیکن ان اسالیب کی ترویج کی طرف ان کا دھیان نہیں جاتا اور یہ ایک جوان العمر شاعر کے لئے کوئی اچھا شگون نہیں۔ ذاتی احساس کی گرمی بھی

[illegible] کلام میں کم سے کم ہے۔ ہر رنگ کے اشعار جن میں اچھے اشعار بھی ہیں ان کے ہاں مل جائیں گے لیکن خود ان کا اپنا کوئی رنگ ان اشعار میں مشکل ہی سے نظر آئے گا۔

کتاب کی قیمت چار روپے پچاس پیسے ہے۔ انڈین بکڈپو۔ مال روڈ شملہ کے علاوہ ملنے کے اور بھی کئی پتے درج ہیں۔

یہ ایک تبسم۔۔۔۔۔

یہ جناب برق آشیانوی کے سترہ ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اپنے موضوعات کی کھوج میں مصنف کو دوڑ دھوپ کر کے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں پڑی ہے۔ اپنے گرد و پیش کے ماحول ہی میں انھیں ایسے عنوانات مل گئے ہیں جو ان کے مزاح نگار قلم کا ہدف بن سکیں۔ کتاب کے دیباچہ نگار جناب بھارت چند کھنہ نے اس پر زور دیا ہے کہ یہ مضامین مزاح کے ساتھ ساتھ گہرے سماجی طنز کے بھی حامل ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان مضامین کی خوبی ان کے ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز ہی میں مضمر ہے۔ طنزیہ تحریر میں دو دھاری تلوار کی سی جو کاٹ ہونی چاہیئے۔ وہ اِن مضامین میں کم سے کم نظر آئے گی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان مضامین کی خوبی ان کے ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز میں مضمر ہے طنزیہ تحریر میں دو دھاری تلوار کی سی جو کاٹ ہونی چاہیئے وہ ان مضامین میں کم سے کم نظر آئے گی لیکن شگفتگیِ خیال کے عنصر سے یہ مضامین مملو ہیں۔ اور انھیں ایک تبسم زیر لب کے ساتھ بڑی دلچسپی سے پڑھا جا سکتا ہے۔

کتاب کا نام جوش ملیح آبادی کی ایک مشہور رباعی سے مستعار ہے۔ یہ رباعی کتاب کے شروع میں درج کی گئی ہے لیکن اس کا دوسرا مصرعہ غلط لکھا گیا ہے۔ مصرعہ لفظ "کیوں" سے نہیں،، بس" سے شروع ہونا چاہیئے۔

کتاب کا گیٹ اپ خوشنما ہے۔ تین روپے میں اس پتے سے طلب کی جا سکتی ہے۔

زندہ دلانِ حیدر آباد۔ ۲۷، مجرد گاہ۔

معظم جاہی مارکیٹ حیدر آباد ۱

سنگریزے

جناب حیرت گرگی کا مجموعۂ کلام ہے۔ جیسا کہ کتاب کے دیباچہ نگاروں نے کہا ہے حیرت صاحب کا شمار اپنے علاقے کے کہنہ مشق شاعروں میں ہوتا ہے۔ اور ان کا کلام [illegible] میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگرچہ [illegible] کو ذہن میں رکھ کر حیرت صاحب کے کلام کو دیکھا [illegible] کا حامل نظر آئے گا۔ زبان و بیان کی صحت و [illegible] اور [illegible] مناسبات کا خیال یہ سب باتیں جنہیں اچھی [illegible]

[illegible]

کی خصوصیات میں گنا جاتا ہے۔ ان [illegible] غزلیہ شاعری، شاعر نے ان سب [illegible] ملتی ہے۔ ذاتی تجربے کی راہ سے کلام [illegible] کیفیات کی گرمی سے تنو پانے والی [illegible] صاحب کا کلام بڑی حد تک خالی [illegible] خیالی سے موزوں الفاظ کا جامہ پہنا سکتے ہیں [illegible] کی جانی چاہیئے۔ بالخصوص اس لئے کہ [illegible] علاقے میں رہتے ہوئے حاصل کی ہے [illegible] دور ہے لیکن مروجہ اسالیب بیان پر [illegible] اپنے انفرادی کردار کے اظہار کا وسیلہ بنا سکتے [illegible] غالب تذکرہ ہوتا۔ کتاب کے ایک دیباچہ نگار عبد [illegible] طور پر انھیں اشتراکیت کا مؤید اور حامی بیان کیا [illegible] ان کے کلام میں ملتی ہیں لیکن اس سلسلے کے اشعار [illegible] ہوتا ہے کہ اشتراکیت کی تائید و حمایت کا میلان بھی ان کے ہاں تقلیدی نوعیت [illegible] اور ان کی شخصیت کا حصہ نہیں بن سکا ہے۔

کتاب کی قیمت تین روپے پچاس پیسے [illegible] کے یہ دو پتے ہیں:

۱۔ سکریٹری اردو ادبی کمیٹی پانگاری۔ [illegible]

۲۔ سکریٹری اردو ادبی کمیٹی شانتا [illegible] اسٹریٹ [illegible]

شخصیتیں

دور آفریدی صاحب ایک [illegible] جانے پہچانے جاتے ہیں اب انہوں نے خاکہ نگاری کی [illegible] خاکہ نگاری کا چلن اردو میں زیادہ پرانا نہیں [illegible] میں ہی اس زبان میں کئی ایسے خاکہ نگار [illegible] مرزا فرحت اللہ بیگ [illegible] شاہد احمد دہلوی، سعادت [illegible] ادیبوں کے نام اس سلسلے میں [illegible] نگاری کا جو معیار [illegible] کیا جائے تو [illegible] اکتسابات کے [illegible] ہے اس لئے [illegible]

[illegible]

[illegible] باہر رہتے ہوئے اپنے منظر کے [illegible] شخصیت
[illegible] حالات [illegible] کی ابتدائی [illegible] کے ماحول پر [illegible] روشنی ڈالتے [illegible] تذکرے کا عنصر بھی آمیز ہو گیا ہے۔ عندلیب [illegible] شاد عارفی اور [illegible] کے خاکے ہیں اس طرح [illegible] طریقہ خاص کام لیا ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہو کہ ان [illegible] سے گہرا تعلق [illegible] صاحب بھی رامپور [illegible] ان کے بارے میں ان کی معلومات کا دائرہ وسیع [illegible]

[illegible] مضمون خود ودود آفریدی صاحب کے بارے میں [illegible] خود نوشت تذکرہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ انہوں [illegible] ابتدائی حالات کا ذکر کیا ہے اور پھر اپنی زندگی کے کچھ تجربات بیان کئے ہیں جو مختلف مقامات سے وابستہ ہیں۔ کتابت و طباعت کے لحاظ سے کتاب معیاری ہے۔ قیمت تین روپیہ ہے۔ خود مصنف کے پتے سے طلب کی جا سکتی ہے۔ جو یہ ہے ودود آفریدی۔ اردو ریسرچ اکاڈمی گھیر عثمان خاں۔ رامپور۔ (یوپی)

بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اردو شعرا

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، یہ بنگال کے ان اردو شاعروں کا تذکرہ ہے جو موجودہ صدی کے آغاز سے [illegible] ہیں۔ کتاب کے مرتب مشتاق احمد صاحب ہیں جو کلکتہ کے ایک [illegible] نگار ہیں اور تحقیقی مشاغل سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ [illegible] ہوتا ہے جس میں کتاب کی افادیت اور اہمیت پر روشنی [illegible] کا ذکر کیا گیا ہے جو کتاب کی ترتیب اور تدوین کے سلسلے میں مرتب کو پیش آئیں۔ ان مشکلات پر انہوں نے جس طرح قابو پایا اس کی [illegible] کتاب کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے ایک دو جگہ یہ خیال ظاہر [illegible] علاقائی [illegible] تذکرے اس ناانصافی کی تلافی کر سکتے ہیں [illegible] انتخاب علاقوں کے شاعروں [illegible] تذکروں کی افادیت کا منکر نہیں [illegible] اور حقیقت کی بنا [illegible] احمد صاحب کی اس شکایت [illegible] اور رضا علی وحشت کلکتوی [illegible] کے کس حد تک [illegible] کتابی شکل [illegible] بنگال گزٹ [illegible] کے باوجود کیا اندازہ کا

کوئی طالب علم ایسا ہے جو شاد اور وحشت کے نام، کام اور ان کی شاعری سے ان کے مقام سے ناواقف ہو؟ اور اگر وحشت کا تذکرہ زیر تبصرہ کتاب میں بھی شامل نہ ہوتا تو کیا ان کے شاعرانہ مرتبے میں کوئی کمی آجاتی؟ البتہ اس سے اس کتاب کے درجۂ اعتبار کو ضرور ضعف پہنچتا۔ یہی حال ان دوسرے ادبی تذکروں کا ہے جو ایسے اہم شاعروں کے ذکر سے خالی ہیں۔ ایسا کر کے مرتبین نے ان شاعروں کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی، خود اپنے کار منصبی کے ساتھ انصاف برتنے میں ناکام رہے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں وحشت کلکتوی سے بجی بابا دی تک ۱۸۲ شعراء اور شاعرات کے سوانحی حالات اور کلام کا انتخاب درج کیا گیا ہے۔ اور ان میں سے ۱۰۳ کی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ اس سے کتاب کی جامعیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ناموں کی فہرست شعراء کی تاریخ پیدائش کے اعتبار سے ترتیب دی گئی ہے۔ لیکن جیسا کہ مرتب نے اعتراف کیا ہے، یہ التزام برقرار نہیں رہ سکا ہے کیونکہ بہت سے شعرا کی تاریخ پیدائش انھیں معلوم نہ ہو سکی اور بعض کی بعد از وقت معلوم ہوئی جب کتاب کا بیشتر حصہ ترتیب پا چکا تھا۔ اگر ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے رکھی جاتی تو اس دشواری پر قابو پایا جا سکتا تھا۔ اب صورت یہ ہے کہ ترتیب میں کسی اصول کی کارفرمائی نظر نہیں آتی۔ شعراء کے حالات میں بھی عدم توازن نظر آتا ہے۔ بعض شاعروں کے حالات بہت تفصیل سے قلم بند کئے گئے ہیں۔ بعض کے سرسری انداز میں اختصار کے ساتھ۔ "عرضِ مصنف" میں اس طریق کار کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ سب سے تفصیلی تعارف خود مرتب کا ہے جو کتاب کے تعارف کے ذیل میں حرمت الاکرام صاحب نے لکھا ہے۔ کتاب کے ابتدائی صفحات میں مرتب کی تصویر بھی بہت نمایاں طور پر شائع کی گئی ہے۔ کتاب کا ایک کمزور پہلو وہ تنقیدی آرا ہیں، جو بعض شاعروں کے کلام پر ان کے تذکرے کے ذیل ہی میں ظاہر کر دی گئی ہیں۔ یہ آرا کس قسم کی ہیں؟ اس کا اندازہ مندرجۂ ذیل ایک رائے سے ہو سکتا ہے جو رضا علی وحشت کے بارے میں ظاہر کی گئی ہے۔

"اگر وحشت صاحب اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے، اپنی اور دوسروں کی سسکتی بلکتی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو نظموں کا موضوع بناتے، تحریک آزادی، فسادات، دنیا کے انقلاب اور قدرتی مناظر پر اشعار کہتے تو آج وہ جتنے بڑے شاعر [illegible] ہیں سے کہیں بڑے شاعر ہوتے۔"

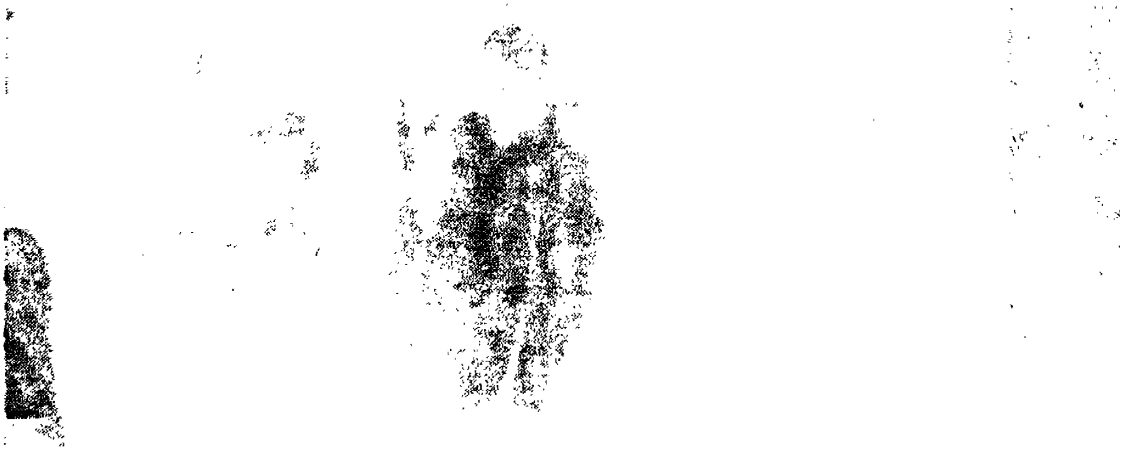
[illegible] کتابت کی غلطیاں بے [illegible] میں اکثر غلطیاں [illegible] ہو گئے ہیں۔ چھپائی صاف اور روشن ہے [illegible] ۳۸۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ تصویروں کے [illegible] کی ہے [illegible] قیمت میں رہے جو زیادہ [illegible]

ملنے کا پتہ

[illegible]

[illegible] احمد [illegible] بہادر [illegible] استید صالح [illegible] کلکتہ

(محمود سعیدی)

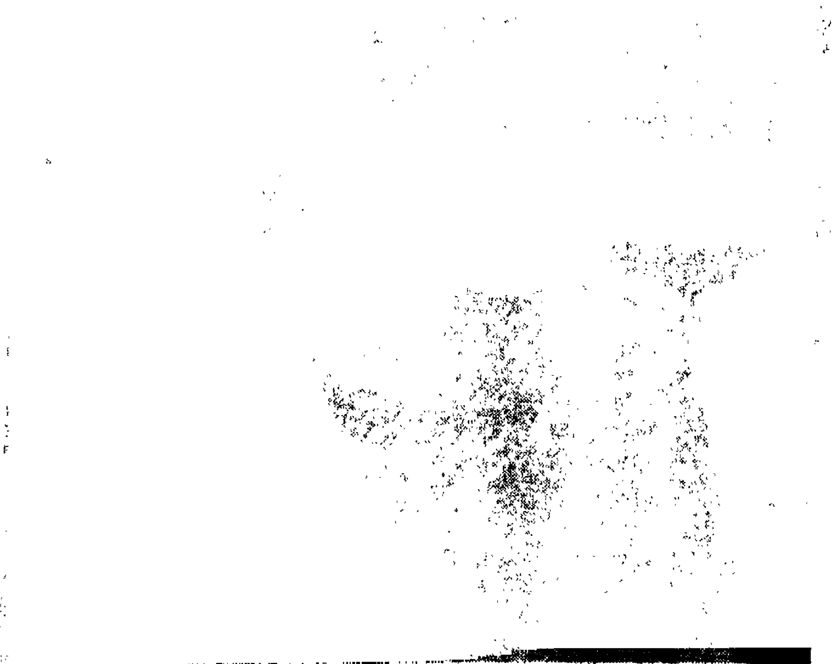


صدرِ بنگلہ دیش، کا ہند میں دورہ

بنگلہ دیش کی عوامی جمہوریہ کے صدر ہز ایکسی لینسی جسٹس ابوسعید چودھری مع اپنی بیگم صاحبہ ۲۷ نومبر ۱۹۷۲ء کو ہند کے دس دن کے دورے پر تشریف لائے۔ نئی دہلی کے ہوائی اڈے پر راشٹر پتی شری وی۔ وی۔ گری اور وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔

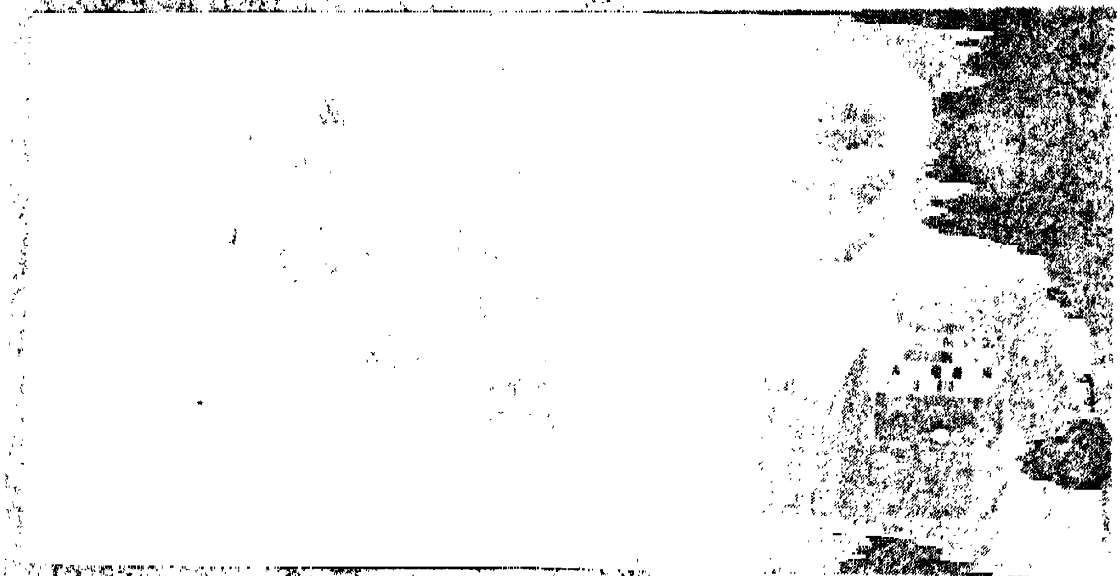


یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو صدر بنگلہ دیش و بیگم صاحبہ نے اجمیر میں درگاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی زیارت کی اور مزار شریف پر فاتحہ پڑھا۔



بنگلہ دیش کی عوامی جمہوریہ
کے صدر ہز ایکسی لینسی
جسٹس ابو سعید چودھری
اور ہند کی وزیراعظم شریمتی
اندرا گاندھی ۔
۴ دسمبر ۱۹۷۲ کو شریمتی
اندرا گاندھی نے وشوا بھارتی
یونیورسٹی کے چانسلر کی حیثیت
سے صدر بنگلہ دیش کو وشوا
بھارتی کا سب سے بڑا اعزاز
"دیشی کوتم" پیش کیا ۔

ہند کی افواج کے چیف آف
اسٹاف جنرل ایس۔ایچ۔ ایف
جے مانکشا (دائیں) اور
پاکستانی افواج کے چیف جنرل
ٹکا خان نے رزم کے مسائل کو
بزم میں سلجھانے کے لیے ۲۸
نومبر اور ۷ دسمبر ۱۹۷۲ کو
لاہور میں بات چیت کی ۔



31 NO. 4 AJKAL (MONTHLY) JANUARY 1973
PUBLISHED BY THE DIRECTOR, PUBLICATIONS DIVISION, PATIALA HOUSE, NEW DELHI-1
PRINTED BY INDIAN PRINTING WORKS, RANI JHANSI ROAD NEW DELHI-55.
REGD. NO. D 569

جولائی ۱۹۷۳ء
۶۰ پیسے

خصوصی مضامین
سیر و سیاحت





نائب صدر جمہوریہ شری گوپال سوروپ پاٹھک اور شریمتی پاٹھک نے افغانستان کے حالیہ دورے میں ۸ جون ۱۹۷۳ء کو بابر کا مقبرہ بھی دیکھا۔

گاندھی جی کے آخری ۱۴۴ دنوں سے متعلق ایک نمائش جس کا افتتاح شری بھولا پاسوان شاستری مرکزی وزیر برائے تعمیرات و مکانات نے ۸ جون ۱۹۷۳ء کو دلی میں کیا۔



اُردو کا مقبول عام مصوّر ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر
مہدی عباس حسینی
(ٹیلیفون ۳۸۷۰۹۹)

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۳۱ — شمارہ ۱۲
جولائی ۱۹۷۳ء
اساڑھ شراون شک سمت ۱۸۹۵

سالانہ چندہ
ایک سال : ۷ روپے
۲ سال : ۱۲ روپے
۳ سال : ۱۷ روپے

ترسیل زر کا پتہ
بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی-۱

ترتیب

شائع کردہ
ڈائریکٹر، پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی-۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آجکل (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی-۱

اداریہ

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

یو این آئی کے مطابق کراچی کے اردو روزنامے "جسارت" کے ایڈیٹر مسٹر صلاح الدین کو اس لئے گرفتار کر لیا گیا کیونکہ انہوں نے ایک اداریئے میں سنسنی خیز انکشافات کئے تھے۔ اخبار نے اداریے میں جماعتِ اسلامی کے قائد مسٹر طفیل محمد اور نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ خان عبدالولی خاں کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مسٹر بھٹو نے دو سال قبل بیان دیا تھا کہ پاکستان میں تین طاقتیں کارفرما ہیں۔ یعنی عوامی لیگ، پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستانی فوج۔

اداریہ نے اس بیان پر تبصرہ کیا ہے کہ مسٹر بھٹو نے عوامی لیگ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے جنرل یحییٰ خاں کو مشورہ دیا کہ وہ مشرقی بنگال میں فوجی کارروائی کریں۔ درآں حالیکہ جنرل یحییٰ خاں نے مشرقی بنگال سے واپسی پر اعلان کیا تھا کہ پاکستان کے آئندہ وزیر اعظم شیخ مجیب الرحمٰن ہوں گے۔ اداریہ میں درج ہے کہ مسٹر بھٹو نے جنرل یحییٰ خاں سے ایک لمبی خفیہ بات چیت کی تھی جس کے دوران فوجی جنرل بھی موجود تھے اور اس کے بعد جنرل یحییٰ خاں نے مشرقی بنگال کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کر دی۔

اب مشرقی بنگال کھونے کے بعد، مسٹر بھٹو پٹھانوں اور بلوچیوں، پٹھانوں اور پنجابیوں، نئے سندھیوں اور پرانے سندھیوں، فوج اور عوام کے درمیان اختلاف کی خلیجیں قائم کرنے میں مشغول ہیں۔ اگرچہ اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں لیکن حکومت نے ماری قبیلے کے لوگوں کو ڈیرا سکاؤٹس کے قتل کا ملزم گردانا ہے اور اس طرح پٹھانوں کو بلوچیوں کا مخالف کر دیا ہے۔

جریدہ لکھتا ہے کہ مسٹر بھٹو فوج کو بلوچستان کے فاقے زدہ عوام کے خلاف استعمال کر کے اسے ذلیل و رسوا کرنا چاہتے ہیں لیکن عوام کے خلاف فوج کے استعمال کی عادت ایک دن مہنگی پڑے گی۔ اگر حکام فوج کو اپنے ذاتی سیاسی اغراض کے لئے استعمال کرتے رہیں گے اور اس طرح دفاعی طاقت کو تباہ کر دیں گے تو ممکن ہے کہ عوام اور فوج ایک مشترکہ متحدہ محاذ قائم کر لیں جس سے حکومت کو خطرہ لاحق ہوگا۔ جریدے کی رائے میں دراصل یہ اتحاد پیدا ہو بھی چکا ہے۔ اور اس کا ثبوت اس تشویش سے ملتا ہے جو عوام اُن فوجی افسروں کے بارے میں محسوس کرتے ہیں جنہوں نے پچھلی دو جنگوں میں دادِ شجاعت دی لیکن جو آج یا تو بے روزگار ہیں یا جیل میں بند کئے جا رہے ہیں۔

اور سنئے پاکستان کے وزیر خزانہ، منصوبہ بندی و ترقی مسٹر مبشر حسن نے فرمایا ہے کہ پاکستان نے عالمی بنک کے پاکستانی امداد کنسورشیم کے ممبروں کو مطلع کر دیا ہے کہ اس نے جو قرضہ جات بدیسی ملکوں سے لے کر بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان) میں خرچ کئے وہ ان رقوم کی ادائیگی بند کر رہا ہے۔ موصوف نے فرمایا کہ جون کے آخر سے پاکستان پر ان رقوم کی ادائیگی کی کوئی ذمہ داری نہیں رہے گی۔ اور ڈھاکہ کی انتظامیہ کو یہ ذمہ داری اٹھانی چاہیئے۔

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ یعنی ملک کا نام بنگلہ دیش لینے لگے۔ ہمیں امید ہے کہ جیسے ہی وہ "ڈھاکہ کی انتظامیہ" کو "بنگلہ دیش کی سرکار" تسلیم کر لیں گے۔ اور بنگلہ دیش میں پاکستانی افواج نے جو تباہ کاری مچائی ہے اس کا ایک مناسب تاوان دینے پر راضی ہو جائیں گے۔ تو قرضوں کی ادائیگی کا بھی کوئی مناسب حل نکل آئے گا۔

یہ شمارہ

"آج کل" علمی و ادبی رسالہ ہونے کے ساتھ ساتھ معلوماتی رسالہ بھی ہے چنانچہ ہمارا مئی کا شمارہ سائنس کے موضوع سے مخصوص تھا۔ تو موجودہ شمارہ سیاحت کے بارے میں ہے۔ ہم نے اس شمارے کو ہر حیثیت سے دلکش بنانے کے لئے اور اس میں مفید معلومات دینے کی کوشش کی ہے لیکن ہمیں احساس ہے کہ

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

پھر بھی ہمیں قارئین کی رائے کا انتظار رہے گا۔

آئندہ شمارہ

"آج کل" کا آئندہ شمارہ اردو نمبر ہوگا۔ ہم ہر سال اگست میں دوہرے سائز کا خاص نمبر پیش کرتے ہیں کیونکہ یہ آزادی کا مہینہ بھی ہوتا ہے اور ہماری سالگرہ کا نمبر بھی۔ اس بار کا نمبر بھی حسبِ دستور ایک یادگاری اور دستاویزی اہمیت کا حامل ہوگا لیکن ہمیں افسوس ہے کہ کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے ہم اس نمبر کو اگست ستمبر ۱۹۷۳ء کا مشترکہ شمارہ بنانے پر مجبور ہیں۔ پھر بھی ہمارے قلمی معاونین نے اس نمبر کے سلسلے میں ہمارے ساتھ اتنا پُرخلوص تعاون کیا ہے کہ ہمیں یقین ہے کہ آپ اس نمبر کو حاصل کر کے ضرور خوش ہوں گے۔

قرۃ العین حیدر
آشا محل، نوروجی گماڈیا روڈ، بمبئی، ۲۶

کارِ جہاں دراز ہے

فصل دوم - باب ۳

باستان نامہ دہقان دانشور [۱]

محمد شیبانی خان اتابک جوجی خان ابن چنگیز کی نسل سے تھا - ۱۵۰۴ء میں اس نے ایک تیموری شہزادے بابر نامی کو فرغنہ سے بے دخل کیا۔ اس کے بعد ایک دن اپنے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے اس نے مغرب کی سمت نظر دوڑائی۔ اُردوگاہ کے آگے پہاڑیاں، ندیاں تھیں - نیلگوں برف پوش کوہسار، بھیڑوں کے گلے کپاس کے کھیت - سبزہ زار - دور نیلی اور سبز نقاشی کا ایک مینار کھڑا تھا جو شاید طغرل یا سنجر یا جلال الدین خوارزم شاہ نے بنوایا تھا۔ اس کے آگے تورانیوں کی پرانی جولانگاہ - ایران -

مغربی ایران میں ایک صوفی شاہ صفی الدین اردبیلی گزرے ہیں کہ امام موسیٰ کاظم کی نسل سے تھے۔ ان کے خانوادے کے معتقدین زیادہ تر شیعہ آذربائیجانی ترک تھے - یہ ترک آئمہ اثنا عشریہ کی نسبت سے بارہ کنگوروں والی سرخ بانات کی ٹوپیاں پہنتے تھے۔ اس وجہ سے قزلباش یعنی

---

۱ روایت یہ ہے کہ قدیم عجمی داستانیں انوشیروانِ عادل نے اپنے کتب خانے میں محفوظ کروالی تھیں - یزدگرد سوئم نے دہقان دانشور (مہابھارت کے ویاس کی مانند یہ ایک علامتی نام معلوم ہوتا ہے) کو حکم دیا کہ کیومرث سے لے کر خسرو پرویز تک کی تاریخ رقم کرے۔ فتح اسلام کے بعد یہ باستان نامہ فاروق اعظمؓ کی خدمت میں پیش کیا گیا جنہوں نے اس کا ترجمہ عربی میں کروایا۔ جدید فارسی میں ترجمہ آلِ سامان کے عہد میں ہوا جس کی بنیاد پر دقیقی اور بعد میں فردوسی نے شاہنامہ لکھا۔ (ق ح)

سرخ ٹوپی والے کہلاتے تھے۔ شیخ حیدر صفوی کے لڑکے اسمٰعیل نے ان قزلباش ترکوں افشار، قاچار وغیرہ قبائل اور صوفیائے قراباغ کی مدد سے حکومتِ ایران کا تختہ الٹا۔ خود تبریز میں تخت نشین ہوا۔ اس کے بزرگوں کا خیال تھا کہ شاہانِ صفویہ بنے ہوئے سید تھے۔ [۲]

اسی اثنا میں شیبانی خان کی مملکت سلطنتِ صفویہ کی سرحد تک پہنچ گئی۔ سرحدی چوکیوں پر آئے دن ازبک اور قزلباش سپاہیوں میں جھڑپیں رہتیں۔

بقول فرشتہ شاہ ایران نے شیبانی خان کو لکھا کہ سرزمینِ ایران و عراق فتح کرنے کے ارادے سے باز آئے۔ اور یہ شعر لکھا۔

نہالِ دوستی بنشاں کہ کام دل بیار آرد
درختِ دشمنی برکن کہ رنج بے شمار آرد

جواباً شیبانی خان نے تحریر کیا کہ بادشاہت کا دعویٰ کرنا اور حکمرانوں کے مقابلے پر آکر ان سے خط و کتابت کرنا اس شخص کے لئے مناسب ہے جس کے آبا و اجداد بھی حکمراں رہے ہیں۔ اق قوینلو ترکمانوں سے قرابت حاصل کر کے سلطنت کا دعویٰ ہونا نہایت لغو حرکت ہے۔ ساتھ ہی شاہ اسمعیل کو ایک عصائے فقیری اور کاسہ گدائی بھیجا۔ تمہارا آبائی ورثہ یہی ہے۔ تم بھی گدائی کا پیشہ اختیار کرلو

شاہ اسمعیل صفوی نے جواب میں لکھا کہ اے بیوقوف اگر سلطنت کسی کی میراث ہوتی تو پیش دادیوں سے کیانیوں تک اور کیانیوں سے گھر گھر پھرتی چنگیز کے ہاتھ تک نہ پہنچتی اور خود تجھ کو یہ شرف حاصل نہ ہوتا۔ ٹھہر جا بے۔ اب میں تیرا سر قلم کرنے کے لئے پہنچتا ہوں۔ ساتھ میں چرخہ اور سوت ارسال ہے کہ تیرے باپ دادا کا پیشہ تھا۔ اسے اختیار کرو۔

شاہ اسمعیل مع فوج خراسان آیا اور ازبکوں کا قلع قمع کرنا شروع کیا۔ شیبانی خان مارا گیا۔ کس قدر قہرناک رہا ہوگا کہ بابر اور اسمعیل صفوی جیسے سورما اس سے لرزتے تھے۔ بابر نے اس مہم میں اسمعیل کا ساتھ دیا تھا۔ چنانچہ جب اس کے بیٹے ہمایوں کو شیر خاں افغان نے ہندوستان سے بے دخل کیا۔ وہ سیدھا شاہ اسمعیل کے بیٹے طہماسپ کے پاس مدد حاصل کرنے کے لئے پہنچا۔

مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ شاہ طہماسپ کو اس کے بھائیوں نے

---

۲ ترکستان، ایران، ترکی وغیرہ کی مفصل تاریخ، ناچیز مصنفہ کے "در چمن سرودتی دفتر حال دگرست" میں ملاحظہ فرمائیے جس کے چند ابواب "نقوش" لاہور میں شائع ہو چکے ہیں - (ق ح)

…کایاکہ ہمایوں کو مدد نہ دے اور بلوا دلایا۔ بابر شاہ اسمٰعیل سے قزلباش
…سے مکر گیا تھا اور قزلباشوں کو ازبکوں سے قتل کروا کے بھاگ آیا
تھا۔ طہماسپ نے ارادہ بدل دیا مگر اس کی بہن سلطانہ بیگم نے ہمایوں کی
یہ رباعی شاہ کو سنائی ؎

ہستیم ز جاں بندۂ اولادِ علیؑ
ہستیم ہمیشہ شاد بادِ یادِ علیؑ
چوں سرِّ ولایت ز علیؑ ظاہر شد
کردیم ہمیشہ وردِ خود نادِ علیؑ

شاہ اسمٰعیل خوش ہوگیا۔ دس ہزار فوج قزلباش دے کر رخصت کیا۔
یہ بھی اُڑ گئی کہ ہمایوں شیعہ ہوگیا ہے۔ شیخ حمید سنبلی ایک عالم صاحبِ تفسیر تھے کابل میں جا کر ملے۔ ہمایوں سے کہا "پادشاہم۔ تمام لشکر شما رافضی دیدم۔ در ہر جا تام لشکریانِ شما دریں مرتبہ یار علیؑ، مہر علیؑ، کفش علیؑ و حیدر علیؑ یافتم و ہیچ کس را ندیدم کہ بنام یاران دیگر باشد"
غرضیکہ ہزارہا شیعہ اس لشکر کے ساتھ دیارِ ہند میں داخل ہوا۔
لیکن اصل فرقہ پرستی ہمایوں کی پوت بہو نور جہاں بیگم نے کی۔
ہمارے میاں ظہور حسین سلمہٗ جو اب ماشاء اللہ سے مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں پڑھ رہے ہیں۔ ان کے پردادا میر معصوم علی نے اپنی کتاب "انشائے معصوم"[1] میں تفصیل سے لکھا ہے کب اور کس طرح نور جہاں بیگم کی دعوت پر نہ صرف ہمارے بزرگ بلکہ او رمتعدد خاندانوں کے اجداد ایران سے یہاں پہنچے۔
ملکہ تو خیر ایرانی شیعہ تھی۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ سرملک میں سنی تورانی حکمرانوں نے بھی سادات کی ہمیشہ بے حد قدر کی۔ علمی خدمات ان کے سپرد تھیں۔ اپنی بیٹیوں سے شادیاں ان کی کیں۔ افواج کا کمانڈر انہیں بنایا۔ سپاہی دوسری نسلوں کے ہوتے تھے۔ لشکر سادات کا کہلاتا تھا۔
مگر صد حیف کہ رستم و افراسیاب کا تفرقہ نہ گیا۔ اقلیم ہند میں جب یہ ایرانی تورانی کش مکش زیادہ بڑھتی شیعہ مہم جو دکن کا رخ کرتے۔ کیونکہ وہاں سلطنتیں قائم کرلیں۔ ارے میاں پچھلے زمانوں کی عجب حالت تھی۔ جسے دیکھو سلطنت قائم کرلیتا تھا۔ خیر جی ان دکھنی شیعہ بادشاہوں نے بھی سب سے پہلے سفیر کہاں بھیجے! تبریز و اصفہان! ایران کی رسوم تعزیہ[2] اختیار کیں۔ جو دکن سے نکلیں تو سارے ہندوستان میں پھیلیں۔

[1] انشائے معصوم کا تذکرہ بعد میں کیا جائے گا۔ [2] تعزیت

شاہانِ مغلیہ تورانی تھے۔ پر متعصب نہ تھے۔ کتنیوں کی مائیں یا بیگمات شیعہ تھیں۔ نور جہاں بیگم نے راجپوت پارٹی اور تورانی پارٹی دونوں کا زور کم کیا۔
مگر ہم کہانی سناتے ہیں آپ کو دورِ شاہجہانی کی۔
لاہور آگرے دلی کی کیا پوچھو کیا شان تھی۔ یہ تو خیر عہدِ مغلیہ تھا۔ صدیوں قبل سلطان شمس الدین التمش کے دور کا تذکرہ کرتے ہوئے عصامی نے لکھا تھا "سیدانِ صحیح النسب، کاسبانِ خراسان زمین اور نقشبندانِ اقلیمِ چین اور عالمانِ بخارا نژاد اس وقت دلی میں جمع ہیں جو اس شہر کو کعبۂ ہفت اقلیم بنا چکے ہیں"[3]۔
ہمارے ایک بزرگ جو اُردوگاہِ مغلیہ کے بازار کی زبان میں سید بڑے کہلاویں تھے، قلعے میں پڑھانے لگے تھے۔ شہزاد مراد کے اتالیقوں کے زمرے میں شامل تھے۔ روز صبح عبا قبا ڈانٹ سبز عمامہ باندھ کتاب کالبستہ بغل میں دبا تسبیح عقیق انگلیوں سے لپیٹ پالکی میں سوار ہو قلعہ جایا کریں تھے۔
ایک روز شہزادے کو پڑھا کر اُٹھے ہی تھے کہ بارگاہِ شہنشاہی میں طلبی ہوئی۔ دل دھک سے رہ گیا۔ کسی تورانی حریف نے شکایت تو جڑ دی۔ نادِ علی کا ورد کرتے دیوانِ خاص میں پہنچے۔ شاہجہاں تخت پر بیٹھا تھا (اور کہاں بیٹھتا زمین پہ؟) امیر وزیر حاضر تھے۔ شاید کسی نئی مہم کا منصوبہ بن رہا تھا۔ یا جانے کیا ہو رہا تھا۔ مجالسِ ملوک سے ہمیشہ خائف اور مشتبہ رہنا چاہیے۔
سید بڑے نے بارگاہِ عالی میں پہنچ کر کہا "السلام علیکم"۔ واضح ہو کہ علماء بادشاہ کو ہمیشہ اسی طرح مخاطب کرتے تھے۔ نہ زمیں بوسی۔ نہ کورنش۔ شاہجہاں نے کہا "وعلیکم السلام مولینا۔ مابدولت آپ کو ملک کو بھیجتے ہیں"۔
مولینا کو یقین ہوگیا کہ یہ ناگہانی حکمِ جلاوطنی ہے۔ دم بخود۔
بادشاہ نے کہا "مولینا آپ تازہ وارد خراسانی دہقان زادہ ہیں۔ شوریدہ سر رعایا کو قابو میں رکھنا خوب آتا ہوگا۔"
مولینا نے جواب دیا ——— "جہاں پناہ۔ میں امام زادہ بھی ہوں۔ آج تک کسی نے میری ایک نہ سنی۔ سب شوریدہ سری کرتے رہے"۔
سنتے ہیں کہ بادشاہ زیرِ لب مسکرایا۔ بات ٹال گیا۔ ابرو سے حاجب کی طرف اشارہ کیا جس نے فرمانِ شاہی مولینا کی خدمت پیش کیا۔

[3] رودِ کوثر از شیخ محمد اکرام [4] خراسان کے جاگیردار

قصہ یہ تھا کہ سنبھل کے مغل حاکم نے کٹہیر کے سردار رائے شنکر کو حال میں مطیع کیا تھا۔ دائے سنکہ کی کچی گڑھی چوپال کہلاتی تھی۔ رام گنگا کے کنارے تھی۔ عہد اکبری میں چوپال نامی گاؤں اس پرگنے کا صدر مقام رہ چکا تھا۔ اسی جگہ پر ۱۶۳۲ء میں رستم خاں نے قلعہ تعمیر کیا۔ جامع مسجد بنوائی اور نئی بستی کا نام رستم نگر رکھا۔ سنا تھا کہ اس کے بعد رستم خاں خوش خوش پایۂ تخت آیا اور اپنی کارگزاری کی رپورٹ ظل سبحانی کی خدمت میں پیش کی۔

شاہجہاں نے غصے سے پوچھا: میرے حکم سے تجاوز کرکے تم نے چوپال کا نام رستم نگر کیوں رکھا اور مسجد کیوں بنائی؟"

رستم خاں کا رنگ فق۔ فوراً حاضر دماغی سے کام لے کر بادشاہ کو خوش کر دیا۔ بولا "جہاں پناہ غلام نے نئے شہر کا نام تو شہزادے کے نام پر مراد آباد رکھا ہے۔"

شاہان دہلی کا شروع سے دستور رہا تھا کہ مفتوحہ علاقوں پر سادات کو آباد کرکے مختلف کام ان کے سپرد کر دیتے تھے۔ القصہ سید بڑے فرمان شاہی ہاتھ میں لیے۔ شاداں فرحاں گھر لوٹے تھا تم سے کہا۔ اضلاع میں کوئی جگہ لانکڑی ہے۔ ہم وہاں کے دہقان بنا دیے گئے۔

خانم نے کہا۔ یا مظہر العجائب۔

بعد کچھ عرصے کے سید بڑے مع اہل و عیال و لشکر چوپال عرف رستم نگر عرف مراد آباد کی سرزمین پر آن کر اترے۔ سنبھل کی جگہ مراد آباد اب ضلع کا صدر مقام بن چکا تھا۔ نئی بستی میں مغل سپاہیوں کے کیمپ مغل پورے کہلا رہے تھے۔

دشت بیل اور سبزوار۔ روضۂ امام زادہ ماہ رخ بخشب بدخشاں۔ مسجد کبود۔ وادی ہری رود۔ فرحت بخش سرد ہوائیں۔ سیب کے شگوفے، سرو و صنوبر کے جھرمٹ، سنائی اور جامی اور عمر خیام کی قبریں۔ تاجیکوں کی بستیاں۔ شاہ خراساں کے روضے سے بلند ہونے والی قرأت کی سریلی لرزہ خیز آوازیں۔ دارالحفاظ میں عبا پوش طلبا کے ہجوم۔ مسجد گوہر شاد کے حوض میں ترکان خطا کے حسین چہروں کے عکس۔ ایک دنیا تھی جو نظروں سے اوجھل ہوئی۔

لانکڑی پہنچ کر سب سے پہلے مسجد اور ماتم سرائے تعمیر کروائی۔

جس رات محرم کا چاند آم کے درختوں پر طلوع ہوا۔ خراسانی خانموں نے بال بکھرائے۔ شمع کی روشنی میں نیچے فرش پر بیٹھیں اور بلک بلک کر رونا شروع کیا۔

واحسرتا — کشتہ شد حسین۔

رام گنگا کے کنارے وہ سارا علاقہ جہاں آج مراد آباد کا چوک، ریلوے اسٹیشن اور گورنمنٹ ہائی اسکول ہے، لانکڑی کی جاگیر میں شامل تھا۔ سید بڑے نے شہر آباد کرنے کی خاطر لوگوں کو یہ زمینیں مفت بانٹ دیں کہ وہ ان پر مکان بنا کر رہیں۔ باقی زمینیں سید بڑے کی اولاد نے بعد میں ایک کوڑی فی گز کے حساب سے بیچ کھائیں۔ محلہ سادات لانکڑی میں ان کے مکانات اور شہر سے باہر علاقہ لانکڑی باقی رہ گیا جو نسلاً بعد نسلاً خاندان میں تقسیم ہوتا گیا۔

سید بڑے کے بیٹے ضدی اور تند مزاج مشہور تھے۔ اردوئے شاہجہانی کی زبان میں سید اڑے کہلاتے تھے۔

زندگی بخیر آئندہ ہم آپکو سید اڑے کے بیٹے میر رمضان علی کی داستان سنا دیں گے۔ (مسلسل)

قابلِ دید مقامات — شمالی ہندوستان

دلی: جمہوریہ کی راجدھانی۔ بے شمار قدیم آثار۔ قطب مینار۔ ہمایوں کا مقبرہ۔ لال قلعہ۔ اشوک کی لاٹیں۔ جنتر منتر وغیرہ۔

آگرہ: تاج محل۔ لال قلعہ۔ اعتماد الدولہ کا مقبرہ وغیرہ۔

فتح پور سیکری: اکبر کی راجدھانی۔ شہر اجڑ گیا لیکن عمارتیں محفوظ ہیں۔

جے پور: راجپوتی آن بان کا گلابی شہر۔ ہوا محل اور جنتر منتر۔ قدیم شہر آمیر۔

کھجوراہو: یہاں کے مندروں کی حسن کاری سیاحوں میں انتہائی مقبول ہے۔

الہ آباد: پریاگ کا قدیم و مشہور تیرتھ استھان۔ جواہر لال نہرو اور اندرا گاندھی کا وطن۔

کوربٹ نیشنل پارک: اتر پردیش کی ترائی میں جنگلی جانوروں کی عدیم المثل پناہ گاہ۔

گلمرگ: کشمیر کی مشہور سیرگاہ۔ یہاں اب برف کے کھیلوں کا انتظام ہے۔

سری نگر: جموں و کشمیر کی راجدھانی۔ زعفران کے کھیت، شاہی باغات اور جھیلیں۔

پہلگام: کشمیر کی مشہور سیرگاہ، یہاں سے امرناتھ کو راستہ جاتا ہے۔

کلو: ہماچل پردیش میں حسن فطرت کا مرکز۔

منالی: ہماچل پردیش کی حسین سیرگاہ۔

نینی تال: اتر پردیش کا حسین ترین پہاڑ جس کی جھیل اور متصل میدان مشہور ہیں۔

مسوری: اتر پردیش کا ایک اور پہاڑ جو دلی سے قریب ترین ہے۔

شملہ: ہماچل پردیش کی راجدھانی۔ ہند میں سب سے بڑا پہاڑی شہر۔

چنڈی گڑھ: جدید فن تعمیر کا شاہکار شہر جسے فرانسیسی معمار کاربوسیر نے بنایا۔

متھرا: کرشن کی جنم بھومی متھرا اور ورنداون کے تاریخی مندر اور گھاٹ۔

اجمیر: حضرت معین الدین چشتی کی درگاہ۔

امرتسر: سکھوں کا قومی مرکز۔ دربار صاحب (طلائی مندر)۔

مہدی عباس حسینی

سیاحت

تفریح اور تجارت

گرمی کا موسم اپنے شباب پر ہے لُو کے تھپیڑے چل رہے ہیں۔ فضا گرد و غبار سے بھری ہے کہ بادلوں کی بن آئی ہے۔ برف عنقا ہوئی جا رہی ہے۔ پرانی وضع کے لوگ خس خانوں میں ہیں۔ نئی وضع والے، بجلی کے پنکھوں، کولر، فرج، اور ائیر کنڈیشنر کے پھیر میں ہیں۔ رات گئے تک گرم ہوائیں چلا کرتی ہیں۔ بچے کمہلا گئے ہیں۔ پھول مرجھا گئے ہیں۔ کھانے پینے سے جی اچاٹ ہو گیا ہے۔ لہٰذا اگر بڑے لوگ پہاڑ اور چھوٹے لوگ دیہات دھڑا دھڑ چلے جا رہے ہیں تو تعجب نہیں۔ ایسے میں مناسب ہے کہ ہم سیر و سیاحت کی غرض و غایت پر ایک نظر ڈالیں۔

ہما شما کا سیر سپاٹا ہو یا امراء کی سیر و تفریح دونوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے روزمرہ کے گھریلو یا کام کاج کے ماحول کو بھلا کر فطرت سے ہم آہنگ ہو جائے، مکمل سکون و آرام حاصل کرے، اپنے بیوی، بچوں، عزیزوں، دوستوں کو بھی یہ سکون و آرام مہیا کرے، انسانی رشتوں کو استوار کرے اور خود اپنے سے اور اپنے ساتھیوں سے معزز مہمانوں کا سا سلوک کرے یعنی اپنی اس شخصیت کو جو غم روزگار کی چکی میں پس کر رہ جاتی ہے، پھر سے تسکین و توقیر دے کر اور توانا کر کے از سرِ نو دنیا سے جوجھنے کے قابل بنا دے۔

ماحول کی تبدیلی بہرحال شرطِ اول ہے۔ اگر محنت کش طبقہ دفتر کی کھٹ پٹ اور کارخانوں کی گھڑگھڑاہٹ کے بعد محض درختوں کے نیچے پانی کے کنارے سبزے پر لیٹ کر لطف اٹھاتا ہے تو عیش و عشرت کے عادی لوگوں کو ایسی پکنکوں میں مزا آتا ہے جن میں خود اپنے ہاتھ سے کام کرنا پڑے۔ مثلاً پیدل چلنا۔ اپنے ہاتھ سے کھانا پکانا۔ کشتی رانی، تیرنا وغیرہ۔

اگر آپ سے پوچھا جائے کہ ۱۹۷۲ء میں عالمی تجارت میں کون سا دھندا سرِ فہرست تھا تو آپ کا دماغ شاید، تیل، کوئلے، سونے، ہیرے، موتی، ہوائی جہازوں کی صنعت کی طرف جائے گا لیکن ابتدائی اندازے یہ بتاتے ہیں کہ سیاحت آج کی سب سے بڑی تجارت ہے۔ جی ہاں پچھلے سال کوئی بیس کروڑ لوگوں نے دوسرے ملکوں کی سیاحت کی۔ اور اس سلسلہ میں انہوں نے کوئی ۲۲ ارب ڈالر یا ۱۵۷ ارب روپے خرچ کیے۔ ان کے علاوہ مزید پچاس کروڑ لوگوں نے خود اپنے ملک میں سیر و سیاحت کی۔

چنانچہ اگر ۱۹۷۲ء میں ستر کروڑ لوگوں نے سیر و سیاحت کی تو گزشتہ دس برس کے عالمی رجحانات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ امسال اس سے بھی زیادہ تعداد سیر و سیاحت میں مشغول ہے۔ ستر کروڑ آدمی یعنی ایشیاء کو چھوڑ کر کسی بھی برّاعظم کی آبادی سے زیادہ۔ پھر یہ تصور کیجیے کہ یہ لوگ نہ صرف سفر کر رہے ہیں، بلکہ سینکڑوں نئے آدمیوں سے مل رہے ہیں، ان کے رہن سہن، ان کے خیالات و عادات سے واقف ہو رہے ہیں، ان سے لین دین کر رہے اور ان سب لوگوں کی کم و بیش یہی خواہش ہے کہ یہ ستر کروڑ آدمی ایک اچھا تاثر لے کر اپنے گھروں کو واپس جائیں۔ جبھی کہا جاتا ہے کہ سیاحت بین الاقوامی امن و آشتی کو فروغ دینے کا بہت موثر طریقہ ہے کیونکہ جنگ، خوف، شبہ، لالچ، غلط فہمی جہالت اور کم علمی کی بناء پر ہوتی ہے۔ اگر ایک ملک کے عوام دوسرے ملک کے عوام سے مل چکے ہیں اور ان سے بخوبی واقف ہیں تو حاکموں کی مصلحتوں اور غلط پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہوں گے۔ آج امریکہ میں ویت نام اور کمبوڈیا کی جنگوں کی شدید ترین مخالفت وہ امریکن فوجی ہیں جو ان محاذوں پر رہ چکے ہیں۔

سیاحت کا دوسرا فائدہ قومی یکجہتی ہے۔ اگر کسی ہندوستانی نے شمال میں ہمالیہ، جنوب میں کنیاکماری، مشرق میں بنگال و آسام اور مغرب میں گجرات و مہاراشٹر کا سفر کیا ہے تو اسے بخوبی اندازہ ہوگا کہ ہمارا ملک کتنا حسین اور عظیم ہے۔ کتنا وسیع ہے۔ اس میں کتنے مختلف قسم کے لوگ رہتے ہیں۔ اور ان کی قدروں میں کتنی حیرت انگیز یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس کے دل میں اپنے ملک کی عزت اور محبت جاگزیں ہو جائے گی اور اس کا سر فخر سے بلند ہوگا۔

سیاحت کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسا دھندا ہے جس میں مال مالک کے پاس محفوظ رہتا ہے اور خریدار پیسے دے کر خوش خوش واپس چلا جاتا ہے۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے اس پر غور کرنا پڑے گا کہ سیاح کو کون سی کشش کسی مقام کی طرف کھینچتی ہے۔

اول مناظر فطرت: پہاڑ، وادی، جنگل، سبزہ، ریگستان، جھیلیں، دریا، ساحل، سمندر وغیرہ

دوسرے آب و ہوا یعنی گرمی کے ستائے ہوؤں کو پہاڑوں کی ٹھنڈک اور برفستانوں کے باشندوں کو سورج سے چمکتے گرم میدان۔

تیسرے انسان کے بنائے ہوئے شاہکار مثلاً تاج محل، کھجوراہو، کونارک، اجنتا، ایلورا، وغیرہ یا جدید صناعی کے نمونے مثلاً چنڈی گڑھ، بھاکڑہ باندھ، ایٹمی طاقت کے اسٹیشن وغیرہ۔

چوتھے مقدس مقامات مثلاً بنارس، الہ آباد، ہردوار، بدری ناتھ، امرناتھ، سوم ناتھ، پوری، مدورائی، اجمیر شریف، درگاہ نظام الدین اولیاء، سید سالار مسعود غازی کا مزار، لکھنؤ کے امام باڑے وغیرہ۔

پانچویں تقریبات اور میلے ٹھیلے مثلاً میسور، دلی اور کلو کا دسہرہ، کلکتہ کی درگا پوجا، پوری کی رتھ یاترا، کمبھ کے میلے، سون پور کا میلہ، دلی کا یوم جمہوریت وغیرہ۔

اب غور کیجئے کہ سیاح کیا ان میں سے کسی چیز کو خرید کر اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے؟ جی نہیں یہ سب جائیداد غیر منقولہ ہے اور سیاح ان سب کو نظر بھر دیکھ لینے کے لئے مٹھی بھر روپے دیتا ہے۔

دراصل اس لین دین میں کسی منقولہ شے کا نہیں بلکہ خدمت کا سودا ہوتا ہے۔ سیاح کو جس حد تک آرام و آسائش ملتی ہے اور جس چیز کی کشش اُسے کھینچ کر لائی تھی اسے دیکھ کر اسے جس حد تک تسلی و تشفی ہوتی ہے اسی کے لئے وہ روپے دیتا ہے۔ تفریح، سکون اور تسلی کی خاطر۔

یہ ضروری نہیں کہ سیاح ان سب چیزوں میں بیک وقت دلچسپی رکھے۔ چنانچہ سیاحوں کی دلچسپیوں کے لحاظ سے سیاحت کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ مثلاً سیاحت برائے تفریح، مذہبی سیاحت، سیاحت برائے صحت، علمی و کلچرل سیاحت وغیرہ۔

ان سب میں مذہبی سیاحت جسے ہم زیارت اور یاترا کہتے ہیں سب سے قدیم ہے اور ہند میں ہزاروں سال سے رائج ہے۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ ہمارے بزرگوں نے ہزاروں دھام (مقدس مقامات) میں سے سولہ دھام کی یاترا انتہائی ضروری قرار دی ہے اور یہ سولہ دھام اس طور پر واقع ہیں کہ عمر میں ایک دفعہ ہر ہندو پر سارے ہندوستان کا سفر ایک فریضہ بن جاتا ہے۔ اس سے بین طور پر قومی یکجہتی کو فروغ ملتا ہے کیونکہ جہاں اُسے ملک کے ہر کونے میں ہندو دھرم کے آثار ملتے ہیں وہاں کم و بیش ہر دھام کے آس پاس اسے دیگر اقوام کے لوگ بھی بسے ہوئے یا آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔

سیاحت میں روپے کیسے خرچ ہوتے ہیں۔ اول تو آمد و رفت کے اخراجات۔ یہ روپے ہوائی جہاز، ریل، بس، ٹیکسی کے کرایوں میں خرچ ہوتے ہیں اور ہوائی کمپنیوں، ریلوے، بس اور ٹیکسی والوں کی جیب میں جاتے ہیں۔

دوسرے رہائش پر یعنی ہوٹلوں، ہوسٹلوں یا قیام گاہوں پر خرچ ہوتے ہیں۔

تیسرے سامان خورد و نوش پر۔ اس کا بیشتر حصہ تو ہوٹلوں کو مل جاتا ہے لیکن سیاح ٹھہرے سیلانی آدمی، سیر و تفریح میں جہاں کھانے کا وقت ہوا وہیں پیٹ کی آگ بجھا لیتے ہیں لہٰذا ان سے اسٹو کا ہوٹل کو بھی فائدہ پہنچتا ہے اور ڈھابے والوں کو بھی۔

چوتھے بازاروں میں خرید و فروخت پر۔ سیاح اگر کشمیر جاتا ہے تو وہاں کی سلک، قالین، چاندی یا پیپر میشے کا سامان، دلی سے ہاتھی دانت کا سامان، میسور سے صندل کا سامان، مدورائی اور بنارس سے ساریاں وغیرہ بھی ضرور خریدتا ہے۔ اور اس طرح دیسی مصنوعات کو فروغ ملتا ہے۔

یہ مدنظر رہے کہ سیاح اگر بدیشی ہے تو ہر قدم پر اس سے بدیشی سکے حاصل ہوں گے۔ اور اس طرح ہمارے زرمبادلہ میں اضافہ ہوگا چنانچہ اندازہ ہے کہ پچھلے سال ہند کو سیاحت سے ۴۸ کروڑ روپے کی قیمت کا زرمبادلہ حاصل ہوا۔

یہ تو رہا سیاحت کا براہ راست فائدہ لیکن ترقی پذیر ملکوں کی اقتصادیات کو سیاحت کے ذریعے جو دوسرے فوائد ہوتے ہیں ان کا ذکر بھی ضروری ہے۔

فرض کیجئے کہ ہمالیہ کی ایک حسین وادی میں ایک قدیم مندر ہے جس میں مصوری اور نقاشی کے نادر نمونے موجود ہیں۔ اب اگر سرکار (یا باہمت نجی ادارہ بھی) اس مقام کو سیاحت کا مرکز بنانا چاہے تو کیا ہوگا۔

اول تو اس مقام تک پہنچنے کا راستہ درست کیا جائے گا۔ ایک ایسی پختہ سڑک بنائی جائے گی جس پر موٹروں کی آمد و رفت ہو سکے۔ سڑک بنانے میں مقامی لوگوں کو روزگار ملے گا۔ اور سڑک بننے کے بعد وہ ٹیکسی یا بسیں یا کم از کم تانگے، بیل گاڑیاں وغیرہ چلانا چاہیں گے۔

سڑک کے بعد اس مقام پر رہائش کا بندوبست ضروری ہوگا۔ ہوٹل، ہوسٹل، خیمہ گاہ وغیرہ بنائی جائے گی۔ اس تعمیراتی کام میں بھی مقامی لوگوں کو روزگار اور آمدنی ملے گی۔

ہوٹل میں کھانے کا انتظام بھی ضروری ہے چنانچہ ہوٹل کو آٹا، دال

چاول، گھی، سبزی، گوشت، انڈے، مرغی، مچھلی، پھل۔ دودھ مکھن وغیرہ کی ضروریات ضرورت ہوگی جو آس پاس کے علاقے میں دودھ کی ڈیری، مرغی انڈوں کے فارم، باغات، سبزیوں کی کاشت، مویشی پالی کو فروغ ہوگا۔ ہوٹل کو بجلی اور پانی کی بھی ضرورت ہوگی۔ اس بجلی اور پانی سے آس پاس کے علاقوں کی ضرورت بھی پوری ہو سکے گی۔

ہوٹل کی وجہ سے ڈاکٹر اور شفاخانے، نرس اور دواخانے کی بھی ضرورت ہوگی چنانچہ اس سے سبھی گاؤں والوں کا بھلا ہوگا۔

کبھی کبھی سیاح اتنی تعداد میں آسکتے ہیں کہ مقامی ہوٹل ان کے لیے ناکافی ہوسکتا ہے۔ بعض سیاح محض ہوٹل کے گرویدہ نہیں ہوتے لہٰذا وہ دیہاتیوں کے گھروں میں بھی رات گزارنا پسند کریں گے اور اس کے لیے پیسے بھی دینا چاہیں گے جس سے دیہاتیوں کا بھلا ہوسکتا ہے (گو ابھی تک ہماری مہمان نوازی کی روایات اتنی مضبوط ہیں کہ ہم کسی مسافر کو رات بھر ٹھہرانے کی خاطر اس سے پیسے لینے پر مشکل ہی سے راضی ہوں گے۔)

قصہ مختصر کسی سیاحتی مرکز کے قیام سے آس پاس کے علاقوں کی کایا پلٹ ہوسکتی ہے۔ اقتصادیات کے ماہرین ان فوائد کو افزونی اثرات M???IPLIER ??FECT کہتے ہیں اور اندازہ لگاتے ہیں کہ اگر سیاحت میں ایک روپیہ لگایا جائے گا تو ہند میں اس کے افزونی اثرات کوئی تین روپے کی سرمایہ کاری کے برابر ہوں گے۔

ترقی یافتہ علاقوں نے اس راز کو ہم سے بہت پہلے بہت اچھی طرح سمجھ لیا تھا چنانچہ آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب نہ ہوگا کہ ۱۹۷۲ء میں سیاحت سے جو آمدنی ہوئی اس کا ۹۹ فیصد حصہ یورپ اور امریکہ کے ترقی یافتہ ملکوں کو ملا۔ ترقی پذیر ملکوں کو جن میں ہند بھی شامل ہے ایک فی صد سے بھی کم حصہ ملا۔

مغربی ملکوں میں سیاحت کی تجارت کا ایک بڑا حصہ حاصل کرنے کے لیے ایک زبردست مقابلہ جاری ہے۔ اس میدان میں حکومتیں بھی کود پڑی ہیں۔ قومی ہوائی کمپنیوں کو امداد دی جاتی ہے کہ وہ اپنے کرائے کم کر کے بیرونی سیاحوں کو لائیں۔ ہوٹل بنانے والوں کو ہر طرح کی امداد اور قرضے دیئے جاتے ہیں۔ سفر ایجنسیوں کی ہر طرح سے ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ پرانے تفریحی مقامات میں نئی دلکشی پیدا کی جاتی ہے اور نئے نئے سیاحتی مراکز قائم کیے جا رہے ہیں۔

بعض سفر ایجنسیوں نے اس تجارت کے امکانات پر غور کر کے اپنا کاروبار اس طرح بڑھایا کہ وہ "ٹور آپریٹر" ہوگئے۔ ٹور آپریٹر ہوٹلوں، ہوائی کمپنیوں، ٹیکسی اور بس والوں سے پیشگی بڑی تعداد میں سیٹیں ریزرو کرا لیتے ہیں جس سے انہیں بڑی رعایت مل جاتی ہے پھر وہ اشتہار دیتے ہیں کہ وہ مسافروں کو کسی جگہ ایک ہفتہ کے قیام و طعام اور سفر یا محض قیام اور سفر کا پورا بندوبست ایک مقررہ رقم پر کر دیں گے۔ وہ یہ رقم پیشگی وصول کر لیتے ہیں۔ مسافر انتظامات کی دردسری سے بچ جاتا ہے۔ دوسرے چونکہ مسافر خود اپنے طور پر اتنے سستے میں سفر نہیں کر سکتا۔ لہٰذا وہ ان ٹور آپریٹروں کے پاس جا کر ایک پارٹی کے ساتھ سیاحت کر لیتا ہے۔

ادھر پچھلے چند سالوں سے کچھ ٹور آپریٹروں نے اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے خود اپنے ہوٹل، ہوائی جہاز، سمندری جہاز، بسیں، ٹیکسیاں وغیرہ خرید لی ہیں۔ چنانچہ یہ "چارٹر ٹور" اور بھی سستے ہوگئے ہیں اتنے سستے کہ باقاعدہ ہوائی کمپنیوں کا کاروبار ٹھپ ہونے لگا اور انہوں نے بھی اپنی چارٹر کمپنیاں قائم کر لیں۔

چنانچہ آپ نے اخباروں میں اشتہار پڑھا ہوگا کہ آج یوں تو ہند اور امریکہ کے درمیان ایک طرف کا ہوائی کرایہ کوئی چار ہزار روپے ہے لیکن ایر انڈیا آپ کو اسی رقم میں ہند سے امریکہ لے جانے اور واپس لانے کے لیے تیار ہے

بات یہ ہے کہ قدیم ہوائی کمپنیوں نے اپنی ایک بین الاقوامی انجمن IATA بنائی تھی جو کرائے طے کیا کرتی تھی۔ اب یہ راز کھلا ہے کہ یہ کرایے بہت اونچے تھے اور ہوائی سفر پر جتنا خرچ آتا ہے اس کے لحاظ سے نامناسب چونکہ چارٹر کمپنیاں ایک مناسب حد تک منافع لیتی ہیں لہٰذا اُن کو زیادہ بزنس مل رہا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ قدیم کمپنیوں نے ادھر بڑے بڑے سائز کے جہاز خرید ڈالے مثلاً بوئنگ ۷۴۷ اور ڈگلس جن میں تین سو سے لے کر پونے چار سو تک سیٹیں ہوتی ہیں اب یہ جہاز جن کی قیمت کروڑوں روپے ہوتی ہے خالی جا رہے ہیں جبکہ چارٹر کمپنیوں کے نسبتاً چھوٹے جہاز بھرے رہتے ہیں۔ لہٰذا اندازہ ہے کہ ہوائی کرائے ابھی مزید کم ہوں گے جس سے سیاحت کو اور بھی فروغ ہوگا۔

بدیسی ملکوں میں سیاحت کو فروغ دینے کے لیے پرانے طریقے آزمائے جا چکے یعنی ساحل سمندر پر یا پہاڑوں میں سیر و تفریح (اور دیگر عیاشی اور قمار بازی کے لوازمات) ساحل پر نہانا اور بادبانی کشتیاں چلانا پہاڑوں میں برف پر اسکی SKI کرنا یعنی ہاتھ میں دو چھڑیاں لے کر اور

کے نیچے لکڑی کی لمبی لمبی پٹیاں باندھ کر برف پر پھسلنا) آثار قدیمہ کی زیبائش و آرایش، روشنی اور آواز کے ذریعے ان کی کہانی کہنا (جیسا کہ لال قلعہ دہلی، شالیمار باغ سری نگر، اور سیواگرام میں ہوتا ہے)۔ اب سیاحت کو فروغ دینے کا ایک تازہ ترین طریقہ یہ ایجاد ہوا ہے کہ کانفرنسیں، سیمی نار، اور کنونیشن کسی سیاحتی مرکز پر منعقد کیے جائیں۔

ہوتا یہ ہے کہ امریکہ میں (اور اب ساری دنیا میں) خاص خاص تجارتی یا صنعتی جماعتیں یا ادارے اپنی ایک سالانہ کانفرنس کرتے ہیں۔ ان کانفرنسوں میں شرکت کا خرچ اپنی جیب سے نہیں دینا پڑتا بلکہ ادارے کی طرف سے ملتا ہے جس پر ادارے کو انکم ٹیکس کی بچت بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا تصور کیجیے کہ امریکہ کی روزی کمانے یا تیل کی تجارت کے یا لوہے کی اشیاء بیچنے والے یا گوشت یا چمڑے کے تاجر جو لاکھوں کی تعداد میں ہیں، ایک سالانہ کانفرنس کرتے ہیں۔ ان لاکھوں میں ہزاروں تو ضرور اس کانفرنس میں شریک ہوں گے اور مع بیوی بچوں کے شریک ہوں گے۔ کیونکہ یہ کنونیشن تین دن سے لے کر سات دن تک ہوتے ہیں۔ سیمنار میں شامل بیویوں بچوں کے لیے الگ تفریحی پروگرام ہوتے ہیں جس کی تان ٹوٹتی ہے "شاپنگ" یا خریداری پر۔ بعض ہوٹل یا تفریح گاہیں جہاں کنونیشن منعقد ہوتے ہیں نہ صرف گولف، شہسواری، تیرنے وغیرہ کا انتظام رکھتی ہیں۔ بلکہ کنونیشن ڈائرکٹر بھی مہیا کرتی ہیں جو کنونیشن کے انتظامات کی ساری دردسری اپنے سر لیتا ہے۔

کنونیشن کے ساتھ تجارتی ادارے ایک نمائش بھی منعقد کرتے ہیں، جہاں وہ اپنے اپنے مال کی طرف دوسروں کو توجہ دلاتے ہیں۔ اس طرح کروڑوں روپے کا بزنس بھی ہو جاتا ہے۔

کنونیشن کے لیے جو ہال یا کمرے بنائے جاتے ہیں ان میں ہر سیٹ پر ہیڈ فون نصب ہوتا ہے جس سے مقرروں کی تقریروں کا ساتھ ساتھ ترجمہ بھی سنا جا سکتا ہے۔ ہال میں ایک اسٹیج ہوتا ہے جس پر ڈرامے کھیلے جا سکتے ہیں۔ ایک سکرین ہوتا ہے جس پر فلم اور سلائیڈیں دکھائی جا سکتی ہیں۔ متصل کمرے میں اسٹینوگرافر اور ڈپلی کیٹنگ مشینیں موجود رہتی ہیں تاکہ ضروری کاغذات منٹوں میں چھپ کر تقسیم ہو سکیں۔ کنونیشن کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کسی شہر یا تفریح گاہ کے ہوٹل بیک وقت ہزاروں آدمیوں سے بھر جاتے ہیں۔ ایسے آدمی جو ہوٹل کے قیمتی سے قیمتی کمروں کو لینے میں نہیں جھجکتے۔ کیونکہ پیسے ان کو نہیں ان کی کمپنیوں کو دینے ہوتے ہیں۔ چنانچہ شہر شہر میں اب سرکاری اور نیم سرکاری یا تجارتی اداروں نے کنونیشن بیورو کھولے ہیں جن کے افسروں کا محض یہ مقصد ہے کہ وہ کنونیشنوں میں جا کر ان کے ارباب حل و عقد کو یہ ترغیب دیں کہ اگلا کنونیشن ان کے شہر میں منعقد کیا جائے۔ اس کے لیے وہ [illegible] ہوٹلوں کی تعداد، ہال، کمرے اور نمائش کی جگہ [illegible] گنجائش کے بارے میں نہ صرف اعلیٰ رنگین [illegible] ہیں بلکہ فلم بھی بنا کر دکھاتے ہیں اور ان کی [illegible] شہر والے بھی اپنی کنونیسنگ کرتے ہیں۔ اور [illegible] قبل یہ طے ہو جاتا ہے کہ کس شہر میں اگلا کنونیشن ہوگا۔ [illegible] یہاں تک وعدہ کر لیتے ہیں کہ اگر کنونیشن کرنے والوں کو کسی خاص چیز کی ضرورت ہو تو وہ مہیا کر دی جائے گی۔ جیسا موجودہ ہال میں [illegible] آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے اور کنونیشن والوں کو دو ہزار نشستوں والے ہال کی ضرورت ہو تو ایسا ہال تعمیر ہو جائے گا۔ یا اگر شہر کے ہوٹلوں میں صرف پانچ ہزار کمرے ہیں اور ساڑھے پانچ ہزار کمروں کی ضرورت ہے تو ایک نیا ہوٹل کھول کر ایک ہزار مزید کمرے مہیا کر دیے جائیں گے۔

قدیم و جدید تفریح گاہوں میں بڑا سرمایہ لگا ہوتا ہے جس کے باعث وہ مہنگی ہوتی ہیں لیکن وہاں لوگ زیادہ عرصے نہیں رہتے۔ لہٰذا ان کے مالکوں نے ان کو زیادہ دلکش بنانے کے لیے ایک نئی اسکیم نکالی ہے جسے کانڈومی نیم CONDOMINIUM کہتے ہیں یعنی وہ کئی منزلہ عمارتیں بناتے ہیں جس میں ایک بیڈ روم سے لے کر چار بیڈ روم تک کے مختلف فلیٹ ہوتے ہیں۔ ان فلیٹوں کو بیچ دیا جاتا ہے۔ فلیٹوں کے مالک اپنی سالانہ چھٹیاں ان میں گزارتے ہیں۔ لیکن باقی عرصے میں ان فلیٹوں کو کرائے پر اٹھا دیا جاتا ہے۔ ہر کانڈومی نیم میں ایک منیجر اور دیگر عملہ عمارت کے سارے فلیٹوں کی دیکھ بھال کے لیے مقرر رہتا ہے۔ لہٰذا فلیٹ کے مالک کو اس فکر سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ ہوٹلوں میں ٹھہرنے کی بہ نسبت یہ طریقہ زیادہ مقبول ہوتا جا رہا ہے کیونکہ اس سے فلیٹ کے مالکوں کو آمدنی بھی ہوتی ہے۔ کانڈومی نیم بنانے والوں کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ عمارت بنانے کا خرچہ فلیٹوں کو بیچ کر مل جاتا ہے اور چونکہ ان فلیٹوں میں ہمیشہ کرایہ داروں کی ایک معتدبہ تعداد رہتی ہے۔ لہٰذا کانڈومی نیم بنانے والوں کو رسٹورانٹ اور دکانوں کے ذریعہ ان سے معقول آمدنی ہو جاتی ہے

سطور بالا سے آپ کو یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ سیاحت اگر سیاحوں کے لیے لطف و تفریح کا ذریعہ ہے تو دوسروں کے لیے ایک انتہائی دلچسپ اور نفع بخش تجارت بھی ہے۔

ہند میں سیاحت

مہدی عباس حسینی

سیاحت کے لحاظ سے ہند انتہائی کشش کا مالک ہے اس کے مناظر فطرت حد درجہ حسین و جمیل ہیں۔ ہمالیہ کے سر بفلک پہاڑ، کشمیر جنت نظیر کی وادی، دوآبہ کے لہلہاتے کھیت، ترائی، سندربن، کازی رنگا، پیری یار اور مدو ملائی کے جنگل، کیرالہ کی تاڑ کے درختوں سے ڈھکی نہریں، گوا کا پر فضا ساحل، بلکہ سارے ملک کے ہزاروں ہزار میل کے سمندری ساحل کی مثال کم ملکوں میں مل سکتی ہے۔ گلمرگ، پہلگام، شملہ، کلو، منالی، ڈلہوزی، مسوری، رانی کھیت، نینی تال، رانچی، دارجلنگ، آبو، پنچ مڑھی، مہابلیشور، پونا، اوٹی، کوڈائی کنال کے سے پہاڑی مقامات چنڈی گڑھ، دلی، آگرہ، فتح پور سیکری، بنارس، جے پور، اودے پور، کلکتہ، مدراس، بنگلور، میسور، گوا، بمبئی کے ایسے دلفریب شہر، قطب مینار، تاج محل، کھجوراہو، کونارک، مہابلی پورم، مدورائی، تنجور، اجنتا، ایلورا، ایلی فینٹا ایسے عجوبۂ روزگار، تعمیر و نقاشی و سنگ تراشی کے نمونے، پھر دنیا کے قدیم ترین مذہبوں میں سے ہندو اور بدھ دھرم کے مقامات مقدسہ کی کثرت، جو بدیسی ملکوں سے ہندوؤں کو امرناتھ، بدری ناتھ، کدارناتھ، ہردوار، وارانسی، پریاگ، کروکشیتر، پشکر، ناسک، بھدراچلم، تیروپتی، مدورائی، تنجور، کنیا کماری، رامیشورم، سومناتھ، ناتھ دوارا وغیرہ اور بدھ دھرم کے ماننے والوں کو لمبنی، سارناتھ، گیا، نالندہ، راج گیر، سانچی، ناگارجنا ساگر، عیسائیوں کو مدراس میں سینٹ تھامس اور گوا میں سینٹ فرانسس زیویرس کے مزار و گرجا گھر، مسلمانوں کو سرہند، نظام الدین اولیا، اجمیر، پیران کلیر، شاہ مینا، دیوہ شریف، سالار مسعود غازی، بندہ نواز گیسو دراز، حاجی ملنگ بابا ایسے سیکڑوں صوفیا اور فقرا کے مزارات اور لکھنو اور حیدرآباد کے امام باڑے اور سکھوں کو امرتسر، پاونٹا، دلی، پٹنہ، نانڈیڑ وغیرہ کی کشش جوق در جوق کھینچ لاتی ہے۔ ہند کی قدیم تہذیب و تمدن بھی جو یہاں کی تقریبات اور علم و فن میں جھلکتی ہے سیاحوں کے لیے باعث کشش ہے۔ یہاں کی قدیم موسیقی، ناٹک اور رقص یعنی بھرت ناٹیم، کچی پڈی، موہنی اٹم کتھاکلی، کتھک، منی پوری اور یہاں کے لوک گیت اور لوک ناچ یہ سارے عجائب و نوادر سیاحوں کو ہندوستان آنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ع

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

چنانچہ پچھلے پانچ برسوں میں ہند میں بدیسی سیاحوں کی آمد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

سال	بدیسی سیاحوں کی تعداد	فی صد اضافہ	زرمبادلہ کی وصولی (کروڑ روپیوں میں)
۱۹۶۸ء	۱۸۸،۸۲۰	۵٫۲	۲۶٫۸
۱۹۶۹ء	۲۴۴،۷۲۴	۲۹٫۰	۳۳٫۱
۱۹۷۰ء	۲۸۰،۸۲۱	۱۴٫۸	۳۸٫۰
۱۹۷۱ء	۳۰۰،۹۹۵	۷٫۲*	۴۰٫۰
۱۹۷۲ء	۳۴۲،۹۵۰	۱۳٫۹	۴۸٫۳

(* پچھلے سال کی بہ نسبت فی صد اضافہ میں کمی پاکستانی جنگ کے باعث ہوئی)

اس میزان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم خاطر خواہ انداز میں ترقی کر رہے ہیں لیکن اگر ہم عالمی اعداد و شمار پر نظر ڈالتے ہیں تو ۱۹۷۱ء کی بیرونی سیاحت کا حسب ذیل نقشہ سامنے آتا ہے:

۱۹۷۱ء میں بیرونی سیاحوں کی تعداد

ملک	تعداد ہزاروں میں
اسپین	۲۶,۷۵۸
کناڈا	۱۴,۷۹۱
فرانس	۱۴,۷۰۰
امریکہ	۱۳,۶۶۸
اٹلی	۱۰,۴۸۵
آسٹریا	۹,۵۸۸
مغربی جرمنی	۷,۶۰۴
انگلستان	۷,۰۵۴
سوئٹزرلینڈ	۶,۹۲۰
یوگوسلاویا	۵,۲۳۸
چیکوسلواکیا	۴,۶۹۹

ہنگری	۴,۱۷۰
بلغاریہ	۲,۷۲۰
میکسیکو	۲,۵۳۰
ہالینڈ	۲,۳۲۹
یونان	۱,۹۸۱
پرتگال	۱,۹۶۲
بہاما	۱,۴۶۳
لبنان	۱,۲۴۱
ہانگ کانگ	۹۰۷
مراکش	۸۲۳
تھائی لینڈ	۶۳۸
اسرائیل	۶۱۷
تیونسیا	۶۰۸
عراق	۵۸۹
جاپان	۵۷۵
تائی وان	۵۳۹
کینیا	۴۱۱
آسٹریلیا	۳۸۸
ہندوستان	۳۰۱

یعنی ۱۹۷۱ء میں بیرونی سیاحوں کی تعداد میں ہند اقوام عالم میں تیسویں نمبر پر آتا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں بھی جس کے پورے اعداد و شمار ابھی مہیا نہیں اس پوزیشن میں کسی بڑی تبدیلی کا امکان نہیں ۔

ایک بار آپ کو پھر یاد دلایا جائے کہ ۱۹۷۲ء میں موجودہ اندازوں کے مطابق کوئی ۲۲ کروڑ لوگوں نے دوسرے ملکوں کی سیر کی اور کوئی ۱۵۷ ارب روپیہ صرف کیا جس میں ہندوستان کو صرف ۴۸ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے ملے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ کمی کے اسباب اور اضافے کی صورتوں پر غور کیا جائے۔

کمی کے اسباب

پہلا سبب تو یہ ہے کہ ہندوستان خوش حال ملکوں کے سیاحوں سے بہت دور ہے۔ چنانچہ یورپ کے سیاح زیادہ تر یورپین ممالک پھر امریکہ اور اس کے بعد مغربی ایشیا، افریقہ (لبنان، مراکش، کینیا وغیرہ) جاتے ہیں۔ اور تب جا کر وہ سیاح جو ان مقامات کی تفریح سے سیر ہو جاتے ہیں اور صاحب مقدرت ہوتے ہیں، ہندوستان آتے ہیں۔

اسی طرح امریکہ کے سیاح، پہلے خود امریکہ میں، پھر مغربی جزائر ہند یعنی بہاما وغیرہ میں، پھر یورپ میں، پھر بحر الکاہل میں ہوائی، تاہیتی فلپائن، جاپان وغیرہ جاتے ہیں۔ اور تب کہیں جا کر ہند کا رخ کرتے ہیں۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ ہند میں ابھی بین الاقوامی معیار کے ہوٹلوں کی تعداد بہت کم ہے۔ حکومت ہند کے محکمۂ سیاحت نے اس طرف بڑی توجہ دی ہے۔ ہوٹلوں کی معیار بندی کے اصول مقرر کئے گئے ہیں۔ ہر تین سال بعد ان کا معائنہ ہوتا ہے اور انہیں سہولتوں کے لحاظ سے بین الاقوامی معیار کے مطابق ستارے عطا کئے جاتے ہیں جو ایک سے پانچ تک ہوتے ہیں۔ ہند میں صرف تین سے پانچ ستاروں تک کے ہوٹل بین الاقوامی معیار کے کہلاتے ہیں۔ بقیہ بس گھریلو سیاحوں کے لئے ٹھیک ہیں۔ بہر حال سارے ملک کے ایک سے پانچ ستاروں تک کے ہوٹلوں میں صرف بارہ ہزار بیڈ روم ہیں۔ دوسرے ملکوں میں ایک ایک شہر میں اس سے زیادہ بیڈ روم ہوتے ہیں۔ نیویارک کا تو کیا ذکر جہاں ایک لاکھ سے زیادہ بیڈ روم ہیں، ایشیا میں صرف بینگ کاک میں بارہ ہزار بیڈ روم ہیں اور ٹوکیو میں اس سے کہیں زیادہ۔ اعلیٰ قسم کے ہوٹل بنانا آسان نہیں۔ موٹے طور پر یہ اندازہ لگایئے کہ موجودہ گرانی کے زمانے میں جتنے بیڈ روم کا ہوٹل بنانا ہوگا اتنے لاکھ روپے کی لاگت آئے گی۔ اس میں زمین کی قیمت، عمارت کی لاگت، پانی، بجلی، ٹیلیفون، موٹر گیراج سوئمنگ پول، کمروں کی آرائش شامل ہے۔ (اچھے ہوٹلوں میں ہر کمرے میں فرنیچر، قالین، بستر، منسلک باتھ روم کے علاوہ ٹیلی فون، ریڈیو یا ٹیپ کی موسیقی اور فرج بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں ٹی وی اسٹیشن ہے۔ وہاں ٹی وی سیٹ بھی ضروری ہے۔)

حکومت ہند نے ہوٹلوں میں اضافے کے لئے دو قسم کے اقدامات کئے ہیں۔ ایک تو انڈیا ٹورزم ڈویلپمنٹ کارپوریشن کے تحت سرکاری خرچے پر اب تک ۹ ہوٹل بنائے گئے ہیں۔ (جن میں دلی کا اشوکا، آگرا اور جے پور اور بنگلور کا اشوکا ہوٹل بہت مشہور ہیں) دوسرے محکمۂ سیاحت نے چوتھے پلان میں پانچ کروڑ روپے سے ایک فنڈ قائم کیا تھا جن کے تحت پرائیوٹ اداروں کو ہوٹل تعمیر کرنے کے لئے آسان قسطوں میں قرضے دیئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ محکمۂ سیاحت، ہوٹل بنانے والوں کو ریاستی سرکاروں اور مقامی انتظامیہ سے سستے داموں اچھی اراضیاں دلواتا ہے تاکہ اچھے ہوٹل بنائے جا سکیں۔ بجلی، پانی اور ٹیلیفون کے کنکشن میں انہیں ترجیح دلواتا ہے اور ضروری سامان کی خرید کے لئے زر مبادلہ بھی

فراہم کرتا ہے۔ حکومت ہند نے ہوٹل میں کام کرنے والے عملے کی مزید ٹریننگ کے لیے چار ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ بھی کھولے ہیں۔ محکمہ ہوٹل کے عملے کو مزید ٹریننگ کے لیے وظائف دے کر دوسرے ملکوں میں بھی بھیجتا ہے۔

محکمہ سیاحت نے سیاحت کارپوریشن (ITDC) کے ذریعے ملک میں نو ہوٹلوں کے علاوہ تین موٹل اور سولہ ٹریولرس لاج بھی کھلوائے ہیں۔ جن میں دو ستاروں اور ایک ستارے والے ہوٹلوں کی سی سہولتیں میسر ہیں۔ یہ موٹل اور ٹریولرس لاج ایسے مقامات پر بنائے گئے ہیں جہاں ان کی ضرورت تو ہے لیکن جہاں پرائیوٹ ادارے ہوٹل بنانا نفع بخش نہیں سمجھتے۔ محکمہ اور کارپوریشن کو بہرحال امید ہے کہ ہوٹل وغیرہ بنانے کے بعد آئندہ ان مقاموں تک سیاحوں کی آمدورفت میں ضرور اضافہ ہوگا۔

ان کے علاوہ محکمۂ سیاحت کم از کم ہر ریاست میں ایک یا ایک سے زاید یوتھ ہوسٹل یا نوجوانوں کا ہوسٹل بنانے کا ارادہ رکھتی ہے جہاں اقامت حد درجہ سستی ہوگی۔ غرض کہ چھوٹے بڑے ہر قسم کے ہوٹل بنانے کی اسکیمیں جاری ہیں۔ محکمہ سیاحت نے اپنے پیش نظر یہ نشانہ رکھا ہے کہ پانچویں پلان کے آخر تک ہند میں آٹھ لاکھ بیرونی سیاح ہر سال آنے لگیں گے۔ اور ۱۹۸۰ء تک یہ تعداد بڑھ کر دس لاکھ سالانہ ہو جائے گی چنانچہ یہ ساری تیاریاں انھی اندازوں کو سامنے رکھ کر کی جا رہی ہیں۔

پچھلے چند برسوں میں ہند کی ہوائی کمپنیوں یعنی ایر انڈیا اور انڈین ایرلائنز نے بہت ترقی کی ہے۔ ایر انڈیا نے صرف ایک قسم کے جہاز یعنی بوئنگ ۷۰۷ BOEING 747 رکھ کر عملے کی ٹریننگ مرمت اور دیگر کئی چیزوں میں یکسانیت اور کفایت سے کام لیا۔ پھر اس نے اپنے ہوائی جہازوں کو نہایت ہوشیاری سے ... کیا یعنی کم سے کم جہازوں سے زیادہ سے زیادہ سروس ... ہیں۔ تیسرے اس کی پبلسٹی ایسی انوکھی ہوتی ہے کہ سارے عالم کی ہوائی کمپنیاں اس پر رشک کرتی ہیں۔ اس کا ٹریڈ مارک "مہاراجہ" جو بیک وقت مہاراجہ بھی ہے اور آپ کا خادم بھی انتہائی مقبول ہے کیونکہ اس سے بدیسیوں کے انا کو تسکین ہوتی ہے اور مہاراجاؤں کی سی ضیافت کی امید بندھتی ہے پھر اس کی حسین و جمیل ایر ہوسٹس صرف دیکھنے کی چیز نہیں بلکہ واقعی مسافروں کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت خندہ پیشانی کے ساتھ پوری کرتی ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود ایر انڈیا دنیا کی دوسری ہوائی کمپنیوں کی طرح آج کل ایک مشکل دور سے گزر رہی ہے۔ ایک تو اس نے بھی چار پانچ سفید ہاتھی یعنی بوئنگ ۷۴۷ خرید لیے ہیں جو انتہائی مہنگے ہوتے ہیں اور صرف اسی صورت نفع دے سکتے ہیں جبکہ ان کی ساڑھے تین سو (۳۵۰) سیٹیں کم از کم ساٹھ (۶۰) فیصد بھری جائیں۔ یہ سیٹیں بھرنے کے لیے سخت مقابلہ ہے کیونکہ دوسری کمپنیوں نے بھی یہی دیو پیکر جہاز لے لیے ہیں۔ پھر دوسری کمپنیوں کی طرح ایر انڈیا کو بھی چارٹر جہازوں کے مقابلے کا سامنا ہے جن میں سہولتیں بھی کم ہوتی ہیں اور دام کم۔ لہٰذا متوسط طبقے کے سیاح اور خاص کر طالب علم چارٹر سے سفر کرنا پسند کرتے ہیں۔

ہماری گھریلو کمپنی یعنی انڈین ایرلائنس نے اپنے اسٹیشن بڑھا لیے ہیں۔ ان میں سے بہت سے اسٹیشن ایسے ہیں جہاں اتنے مسافر جاتے ہیں کہ ان کے لیے سروس چالو کرنے کی ضرورت نہیں لیکن انڈین ایرلائنس کو سیاسی یا دفاعی ضرورتوں سے یہ سروسیں گھاٹے میں چلانا پڑتی ہیں۔

خوش اخلاقی اور اچھی خدمات کے لیے ایر انڈیا کا ریکارڈ انڈین ایرلائنس سے زیادہ شاندار ہے۔ اکثر اس قسم کی شکایتیں ملتی ہیں کہ انڈین ایرلائنس میں ٹیلی فون پر پوچھ تاچھ سے کوئی پتہ نہیں چلتا۔ کوئی ریزرویشن کراتا ہے تو اسے ویٹنگ لسٹ پر چالیسواں درجہ ملتا ہے۔ اور جب وہ کسی نہ کسی طرح سے سیٹ حاصل کر لیتا ہے تو جہاز میں اسے چالیس خالی سیٹیں نظر آتی ہیں۔ کبھی مل جائے تو فلائیٹ لیٹ ہو جاتی ہے۔ اور کبھی لیٹ کرتے کرتے بالکل کینسل کر دی جاتی ہے۔ کبھی کبھی پائلٹ ... ہونے کے باوجود بیچ سفر میں یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ کسی خاص اڈے پر نہیں اترے گا۔ اور منتظر مسافر منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ (راقم الحروف کے ساتھ یہ سانحہ گوا میں پیش آ چکا ہے) سفر ایجنسیوں میں انڈین ایرلائنس کی شہرت اچھی نہیں۔ (حال میں دلی ہوائی اڈے پر حادثے نے اس شہرت کو نقصان پہنچایا ہے۔ گوکہ قرائن یہ کہتے ہیں کہ یہ حادثہ ہوائی اڈے پر ضروری آلات کی کمی کے باعث ہوا۔)

ان خرابیوں کے دو حل ہیں۔ ایک تو انڈین ائرلائنس کو عالمی کمپیوٹروں سے منسلک ہو جانا چاہیے۔ اس سے گڑبڑ کا امکان نہیں رہے گا۔ دوسرے سرکار کو ملک میں دوسری ہوائی سروسیں چلانے کی اجازت دینا چاہیے۔ ابھی تک انڈین ایرلائنس کی اجارہ داری ہے۔ جب اسے ائر انڈیا کی طرح دوسری کمپنیوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا، تو ضرور اس کی کارکردگی میں

اضافہ ہوگا۔

ہوائی جہازوں کے ساتھ ساتھ حکومت کو چھوٹے فاصلوں کے لئے ہیلی کاپٹروں کے استعمال پر بھی غور کرنا چاہئے۔ ہند میں بہت سے پہاڑی مقامات ہیں جہاں میدانی علاقے کے ریلوے اسٹیشن سے پہاڑی مقام تک سفر کے لئے بسیں اور ٹیکسیاں استعمال کرنی پڑتی ہیں اور چونکہ ہماری پہاڑی سڑکیں زیادہ چوڑی اور ہموار نہیں ہوتیں لہٰذا مسافروں کو خاصی جسمانی تکلیف ہوتی ہے اور اکثر کو چکر اور متلی بھی ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے مناسب داموں پر ہیلی کاپٹر سروس ایک نعمت ہوگی۔

جہاں تک ٹیکسیوں کا تعلق ہے بدیسی سیاح ہند کی بنی ہوئی گاڑیوں یعنی ایمبیسڈر، فیٹ اور سٹینڈرڈ سے خاصا گھبراتا ہے۔ یہ گھبراہٹ صرف کسی حد تک حق بجانب ہے۔ لیکن اس کی بڑی وجہ نفسیاتی ہے۔ چونکہ ان سیاحوں میں سو فیصد خود اپنی کار رکھتے اور چلاتے ہیں۔ لہٰذا اگر انہیں کوئی ایسی مشین نظر آجائے جس سے وہ مانوس ہیں تو انہیں تسلی ہو جاتی ہے کہ اب کسی گڑبڑ کا اندیشہ نہیں۔ اس کا ایک معقول حل محکمۂ سیاحت نے سوچا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر ملک میں بدیشی سفارتوں کے عملے کو اجازت ہے کہ وہ بغیر ڈیوٹی ادا کئے کاریں درآمد کر سکتے ہیں۔ لیکن حکومت ہند نے یہ پابندی لگا دی ہے کہ یہ لوگ اپنی درآمد شدہ کاریں اگر ہند میں بیچنا چاہیں تو وہ صرف اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن کو بیچیں گے۔ کارپوریشن ایسی کاروں کو دام کے دام خرید کر نیلام کر دیتا ہے۔ اور بزنس کمپنیاں انہیں پچاس ہزار روپے سے لے کر کئی لاکھ روپے دے کر بھی خرید لیتی ہیں۔ لیکن اس نیلام سے قبل محکمۂ سیاحت کو اجازت ہے کہ وہ یہ کاریں ایسی ٹیکسی کمپنیوں کو دلوا دیں جو بدیشی سیاحوں کو لاتی لے جاتی ہیں اور کسی خاص مقدار میں اس طرح سے حاصل شدہ بدیشی زرمبادلہ ریزرو بنک میں جمع کرتی ہیں۔ یہی نہیں محکمۂ سیاحت ان کاروں کے پرزے اور دوسرے ساز و سامان مثلاً ایرکنڈیشنر وغیرہ درآمد کرنے کے لئے ان مخصوص کمپنیوں کو زرمبادلہ بھی دلواتا ہے۔

اس طریقے سے یہ مسئلہ کسی حد تک حل ہو جاتا ہے لیکن یہ مدنظر رہے کہ یہ سب بدیشی کاریں پرانی ہوتی ہیں۔ اور بدیشی سیاح پرانے ماڈل کی کار میں سفر کرنا کوئی خاص پسند نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ وہ یہ کاریں خود چلانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ دوسرے ملکوں میں RENT-A-CAR یعنی کرائے پر گاڑی لوٹنے کا طریقہ رائج ہے جس کے تحت کوئی شخص کسی ایسی فرم میں جا کر اپنا ڈرائیونگ لائسنس اور پاسپورٹ دکھاتا ہے پیسے جمع کرتا ہے کار کی چابی لیتا ہے اور [illegible] ہوا جہاں جی چاہے چلا جاتا ہے اور جب [illegible] اپنی سہولت کے مطابق اسی فرم کی قریب ترین شاخ میں [illegible] چھوڑ دیتا ہے سوچئے یہ سہولت کب تک ہند کو ملتی ہے۔

اضافے کی صورتیں

مرکزی وزیر سیاحت ڈاکٹر کرن سنگھ نے اپنی ایک حالیہ تقریر میں فرمایا کہ محکمۂ سیاحت نے بدیشی سیاحوں کو پہلے سے زیادہ تعداد میں لانے کے لئے تین نئے پلان چلائے ہیں۔ پرانی کششیں یعنی مناظر فطرت اور آثار قدیمہ کے علاوہ اب سیاحوں کے لئے ساحل سمندر پر کووَلم اور مہابلی پورم میں پانی کے کھیلوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ گلمرگ میں چھوٹے پیمانے پر برف کے کھیل یعنی اسکی وغیرہ کا بندوبست ہے۔ اس کے علاوہ ہند کی ایک اور پرانی کشش یعنی شکار کی جگہ اب جنگلی جانوروں کو دیکھنے اور ان کی تصویریں اتارنے کے کاروبار کو بھی فروغ دیا جا رہا ہے۔

محکمۂ سیاحت نے بدیشی ملکوں میں ہند کی سیاحت کی ترغیب دلانے کے لئے، ایرانڈیا سے ایک سمجھوتہ کیا ہے جس کے تحت یورپ اور امریکہ کے ان شہروں میں جہاں ایرانڈیا اور محکمۂ سیاحت دونوں کے دفاتر ہیں، سیاحت کے دفاتر کا انتظام ایرانڈیا کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایرانڈیا کے سارے بدیسی دفتروں کو ہدایت دے دی گئی ہے کہ وہ مسافروں کو ساری وہ اطلاعات بہم پہنچائیں جو محکمۂ سیاحت کے دفتر کرتے ہیں۔ لیکن ان سرگرمیوں کا نتیجہ اگلے پانچ سال میں برآمد ہوگا۔

لگے ہاتھوں محکمۂ سیاحت کی تنظیم بھی سن لیجئے محکمے کا سربراہ ڈائرکٹر جنرل ہوتا ہے جس کے تحت ایک ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل، ایک جوائنٹ ڈائرکٹر جنرل اور متعدد ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل، ڈائرکٹر اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہوتے ہیں۔ محکمے کا ایک شعبہ ہوٹلوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے ذمے نئے ہوٹلوں کی اسکیم منظور کرنا، ان کے بنانے کے لئے سہولتیں بہم پہنچانا، ان کے لئے معیار بنانا، اور اس معیار کے تحت ان کی درجہ بندی کرنا، ہوٹل بنانے کے لئے قرضے وغیرہ دینا ہے۔ دوسرا شعبہ سیاحت سے متعلق تجارتی اداروں کے ساتھ تال میل رکھتا ہے۔ ان میں سفر ایجنٹ، ہوائی کمپنیاں، ٹورسٹ ٹیکسی چلانے والے شامل ہیں۔ تیسرا شعبہ پبلسٹی اور ضیافت سے متعلق ہے۔ اس کے ذمے نہ صرف سیاحت سے متعلق لٹریچر کی فراہمی اور تقسیم ہے بلکہ بدیشی سفر ایجنٹ، جرنلسٹ، کیمرامین، پبلسٹی ایجنٹ وغیرہ کو ہند میں بلاناغہ

ان کو مختلف مقامات کی سیر کرانا بھی ہے تاکہ وہ اپنے اخبارات اور رسالوں میں ہند کے بارے میں مضامین لکھ سکیں، تصویریں چھاپ سکیں اور فلم بنا سکیں۔ فلم کی ایک کاپی محکمہ کو مفت مل جاتی ہے۔

محکمے نے سارے ہند میں متعدد مقامات پر چھوٹے بڑے دفتر کھول رکھے ہیں تاکہ وہاں پہنچنے والے سیاحوں کو مدد دی جا سکے۔ یہ دفتر دلی، آگرہ، بنارس، کھجوراہو، جے پور، جموں، کلکتہ، مدراس، کوچن، بمبئی، اورنگ آباد میں واقع ہیں۔ اسی طرح بیرون ہند محکمے کے دفاتر لندن، برسلز، پیرس، فرینک فرٹ، میلان، اسٹاک ہوم، نیویارک، شکاگو، سان فرانسسکو، ٹورانٹو، میکسیکو، ٹوکیو، سنگاپور اور سڈنی میں واقع ہیں۔

لیکن اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ سیاحت میں ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک کے لوگوں سے ملتے ہیں۔ لہٰذا سیاحت اسی وقت کامیاب ہوگی جبکہ حکومت، تجارت پیشہ لوگ اور عام انسان مل جل کر اسے فروغ دیں۔ محکمہ سیاحت نے سیاحوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی مختلف اپیلیں شائع کی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف عوام اور تاجر بلکہ حکومت کے دیگر محکمے بھی سیاحت کی اہمیت سے کما حقہ واقف نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ محکمہ سیاحت کچھ اورینٹیشن ORIENTATION کورس چلائے جس میں ممبران پارلیمنٹ اور ریاستی قانون ساز اسمبلیوں کے ممبر، سرکاری حکام، تجار، اور شہروں کی میونسپلیٹوں کے چیرمین اور ضلع پریشدوں کے عہدیداروں کو بلا کر ان پر سیاحت کی اہمیت اور منفعت واضح کی جائے اور سیاحوں کے ساتھ مناسب برتاؤ کی نشاندہی کی جائے۔

اکثر اوقات سیاسی، تجارتی اور انتظامی حلقوں سے سیاحت کی مخالفت اس لئے ہوتی ہے کہ ان کے مفادات میں کشاکش ہوتی ہے۔ ایک لیڈر یہ چاہتا ہے کہ اس کے حلقہ انتخاب میں کوئی ہوٹل یا ہوسٹل ضرور بن جائے جبکہ وہاں نہ تو کوئی دیکھنے قابل چیز ہے اور نہ کوئی سیاح وہاں جاتا ہے۔ تاجر یہ چاہتے ہیں کہ سیاحوں سے جلد از جلد زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کیا جائے چاہے سیاح ایک تلخ تجربہ کے بعد دوبارہ کبھی اس علاقے کا رُخ نہ کرے۔ ایک فارسٹ آفیسر نے یہ کہہ کر محکمہ سیاحت کی حوصلہ شکنی کی کہ میں نہیں چاہتا کہ سیاح آ کر میرے جانوروں کی زندگی میں خلل ڈالیں۔ اس طرح کچھ بڑے مانس یہ بھی نہیں چاہتے کہ ہپی ٹائپ کے سیاح ان کے پڑوس میں آ کر سماجی ماحول پر کوئی بُرا اثر ڈالیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ سیاحت کو فروغ دینے سے قبل چند اصولی باتیں پیشِ نظر رہیں۔ اگر نقطۂ نظر اور اغراض و مقاصد واضح رہیں گے تو عمل بھی بامقصد ہوگا۔ یہ اصول حسب ذیل ہو سکتے ہیں:

اوّل یہ کہ کسی ملک کے وسائل پر اس کے باشندو...
لہٰذا سیاحت کو اس طرح فروغ نہ دینا چاہئے کہ کسی...
کسی چیز کے استعمال کی پابندی ہو۔

دوئم یہ کہ بدیشی سیاحوں کی خاطر تواضع مسلّم، لیکن...
ہیں اپنی اقدار اور اپنے طرزِ زندگی کی انفرادیت کو قائم رکھ...
مغرب کی بعض تفریح گاہوں میں جو عیاشی کے سامان ہ...
ان کی نقالی کی چنداں ضرورت نہیں۔ مغربی...
سے اکتا چکا ہے۔ اور ان سے کسی مختلف چیز کی تلاش...

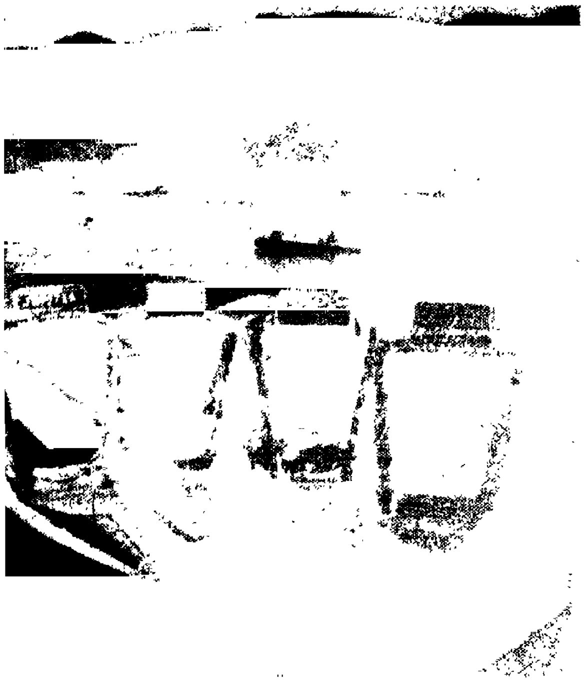
تیسرے یہ کہ تفریح گاہیں اس طرح بنائی جائیں...
تاریخ و تمدن اور فطری ماحول میں فرق نہ آنے پائے یع...
والے کو یہ احساس باقی رہے کہ وہاں ایک ایسا جنگل...
ہرن گھومتے تھے اور جہاں ایک درخت کے نیچے گوتم...

کیا تھا۔ اسی طرح تاج محل کے متصل باغ میں کوئی ایسا...
یا سینما ہال نہ ہونا چاہئے جس میں ہر وقت رقص و...
ہوتا رہے۔

چوتھے گھریلو سیاحت کو فروغ دینا چاہئے ا...
کی سہولت کو بھی مدّنظر رکھنا چاہئے۔ یہ سیاح کئی ق...
زائرین کے لئے دھرم شالے اور مسافر خانے بنا...
کے لئے ایسے ہوسٹل ہونا چاہئیں جن میں صرف رات...
مناسب دام پر مل جائے۔ اسی طرح طالب علموں...
اور کیمپ ہونے چاہئیں۔ ایسے لوگوں کی سہولت...
کار کے ذریعہ سارے ملک کا سفر کرنا چاہتے ہیں ا...
چاہئیں جہاں پینے کا پانی اور بجلی ہو۔ نہانے دھونے...
سامان ہو۔ پٹرول پمپ اور گیراج ہو۔

ابھی ہمارے ملک میں مناسب اور سستی ا...
بڑی کمی ہے۔ اگر مرکزی اور ریاستی حکومتیں ان...
مناسب توجہ کریں تو نہ صرف گھریلو سیاح بلکہ بدیسی س...
خیر مقدم کریں گے۔ کیونکہ اب سیاحت محض پیسے...
تفریح نہیں بلکہ ایک عالمگیر عوامی تحریک بن چکی ہے

راج نرائن راز



کشمیر جنت نظیر

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

جنت ارضی، وادیٔ رنگ و بو، کشمیر دل پذیر، بھارت کا انتہائی شمالی حصہ ہے۔ یہ ریاست گریٹ برٹین سے کسی قدر چھوٹی ہے۔ لداخ، جموں اور وادیٔ کشمیر پر مشتمل اس ریاست کا کل رقبہ ۲۲۲۷۹۲ مربع کیلومیٹر ہے۔ ریاست کے دو بڑے اور اہم شہر سری نگر اور جموں ہیں۔ ریاستی سرکار کا گرمیوں کا صدر مقام سری نگر اور سردیوں کا جموں ہے۔

باشندے: کشمیر کے باشندے دراز قد، وجیہہ اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ وہ فطرتاً بردبار اور مہمان نواز ہوتے ہیں۔ ان کی ذہانت بھی مشہور رہے۔ کشمیری عورتیں بڑی خوبصورت ہوتی ہیں، لیکن محنت کشی میں بھی ان کا کوئی جواب نہیں۔ دن تہواروں پر ان کے رقصوں کا آہنگ بڑا دل نواز اور گیتوں کے بول بڑے دلکش ہوتے ہیں۔ نیلے سبز "پھرن" رنگ و نور کا ایک عجیب سماں پیش کرتے ہیں۔ رنگ ترنگ کے یہ مناظر مدتوں سیاحوں کے ذہن سے محو نہیں ہو پاتے۔ گیتوں کے مدھر بول مدتوں ذہن کی وادیوں میں گونجتے رہتے ہیں۔

فنون و دستکاریاں کشمیری نقش و رنگ میں درک رکھتے ہیں تصویر کا سا خوبصورت ماحول جو انہیں میسر ہے، ان کے لئے تحریک کا سرچشمہ ثابت ہوتا ہے دستکاریاں یہاں کے اہم ذرائع معاش میں سے ہیں اور کشمیری عوام کی زندگی کا جزو ہیں۔ کشمیری دست کار کے اوزار معمولی ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی صناع ان
پارے تخلیق کرتی ہیں کہ دنیا عش عش کر اٹھتی ہے۔ ریشمی
اور قالین کشمیر کی خاص دست کاریاں ہیں۔ ان پر کشمیر کو
درحقیقت شالیں بنانا کشمیر کی قومی دست کاری ہے
لکڑی اور چاندی کے ظروف کا کام بھی یہاں بہت عمدہ

قدرتی خوبصورتی: کشمیر قدرتی حسن سے مالا مال ہے
میں پھلوں، پھولوں، آبشاروں، اور سرمست ندیوں کی سر
کی ندیوں کے حسن اور دلکشی نے جہانگیر کو اتنا متاثر کیا
کی ندیوں سے تعبیر کئے بغیر نہ رہ سکا میوہ یہاں افراط سے ہوتا
خوبانیاں، چیری، آڑو، آلوچے اور بادام یہاں کے خاص
ہے تو اس کے جلو میں رنگ و بو کا ایک قافلہ ہوتا ہے۔ ا
سنہری سرسوں، قرمزی کوکنار، آبی نرگس، کاسنی کے
سفید بنفشی شگوفے، دعوت نظارہ دیتے اور تسکین کا
سرزمین کشمیر "دامان باغبان" اور "کف گل فروش
اور دلنشین لگتی ہے، پیارے اور خوشبودار پھول وہ سماں با
نہیں آسکتا، جھاگ اگلتی ندیاں، پھل، پھول، سرو اور صنو
کے یہ عطیے، موسم بہار اور کشمیر کی سیر کیا کہنے۔

آب و ہوا اور سیر و تفریح کا موسم

سری نگر میں بارش ۶۷۰ انچ (۹۸ سینٹی میٹر) سالانہ سے شاذ و نادر ہی زیادہ پڑتی ہے اور پھر یہ کسی ایک خاص موسم میں نہیں ہوتی۔ وادی کے کسی حصے میں سیاح کو مون سون کے طول و طویل موسم کے سبب سے پریشان ہونا نہیں پڑتا۔ بہار وسط مارچ سے شروع ہوتی ہے اس موسم میں سورج کی سنہری کرنوں سے پہاڑوں پر جمی ہوئی چاندی سی برف پگھلنے لگتی ہے، سینکڑوں ندیاں گنگنا اٹھتی ہیں اور پھر اچانک وادی سر سبز جامہ پہن لیتی ہے۔ اپریل میں وادی گلپوش ہو کر یوں مہکتی ہے کہ مضمحل نظریں مارے خوشی کے چمک اٹھتی ہیں۔ تھکے ہوئے احساس کو تازگی اور مسرت ملتی ہے۔ موسم وسط جون تک بڑا خوشگوار رہتا ہے۔ اس کے بعد سیاح زیادہ جانفزا موسم کی تلاش میں گلمرگ، پہلگام اور سونا مرگ کو جا نکلتے ہیں۔ ستمبر میں خزاں کی آمد سے موسم ٹھنڈا اور سہانا ہو جاتا ہے یہی وہ موسم ہے جس میں چنار کے پُر وقار پیڑوں کی رنگت، مدھم سُرخ اور سنہری ہوتی ہے اور زعفران کے کھیتوں میں ارغوانی پھول لہلہا اٹھتے ہیں۔ بعض اوقات ماہ دسمبر ہی میں برف پڑنے لگتی ہے اور نئے سال کے ساتھ وادی نقرئی چادر اوڑھ لیتی ہے۔ بیرونی سیاح وادی کے مقابلتاً گرم علاقوں کو لوٹ جاتے ہیں۔ موسم سرما اور برف کے کھیلوں کے شائق برف پڑ چکنے کے بعد ہی کشمیر کی سیر کو آتے ہیں۔

کشمیر کا سفر: تین مختلف ذرائع سے کشمیر پہنچا جا سکتا ہے، بذریعہ ریل بذریعہ سڑک اور بذریعہ ہوائی جہاز۔

بذریعہ ہوائی جہاز: انڈین ایرلائنس کارپوریشن کے طیارے دہلی سے سری نگر کے لئے روزانہ پرواز کرتے ہیں۔ یہ طیارے چنڈی گڑھ، امرتسر اور جموں ہو کر سری نگر پہنچتے ہیں۔

بذریعہ ریل: سری نگر کے لئے بمبئی، کلکتہ اور دہلی سے جموں کو سیدھی گاڑیاں چلتی ہیں۔ جموں سے سیاح بذریعہ ہوائی جہاز یا پھر جموں و کشمیر سرکار کی ٹورسٹ بسوں نیز ناردرن ریلوے آؤٹ ایجنسی کی بسوں سے سری نگر جا سکتے ہیں۔

بذریعہ سڑک: وقت کی کمی کی فکر دامن گیر نہ ہو تو کار کا سفر بہترین رہتا ہے سڑک کی حالت اچھی اور راستہ نہایت دل کش ہے۔ دہلی سے علی الصباح بذریعہ کار روانہ ہوں تو آپ رات کو جموں جا پہنچیں گے۔ دوسرے دن جموں سے سری نگر کا درمیانی راستہ یعنی ۱۸۲ میل (۲۹۳ کیلو میٹر) کا سفر آٹھ دس گھنٹوں میں بخوبی طے کیا جا سکتا ہے۔ جموں و سری نگر کے درمیان سڑک پہاڑوں پر بل کھاتی، اوپر اٹھتی، نیچے اترتی ہوئی چلتی ہے۔ یہ سڑک سطح سمندر سے ۱۰۰۰ فٹ تا ۹۵۰۰ فٹ (۳۰۵ میٹر تا ۲۸۹۶ میٹر) اونچی ہے۔

ادھم پور، کُد، بٹوت، رام بن، بانہال، قاضی گنڈ جیسے مقامات پر سیاحوں کے لئے ڈاک بنگلے ہیں۔ ان مقامات پر چائے ڈھابے بھی ہیں۔ نیز کھانا وغیرہ بھی منگوایا جا سکتا ہے۔

دریائے جہلم کا دہانہ، ویری ناگ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ یہ شاہراہ سے ۲۰ ۳ کیلو میٹر کی دوری پر ہے۔

سری نگر اور نواحی علاقے: سری نگر ریاست جموں و کشمیر کا موسم گرما کی راجدھانی ہے۔ یہ سطح سمندر سے ۵۲۰۰ فٹ (۱۵۸۵ میٹر) کی بلندی پر واقع ہے گیارہ مربع میل کے رقبے میں پھیلا ہوا یہ شہر دو پہاڑیوں شنکر آچاریہ اور ہری پربت کے درمیان آباد ہے۔ دریائے جہلم اس کے بیچ سے گزرتا ہے۔ سری نگر کو مشرق کا وینس کہتے ہیں جہلم کی چمکتی جھلملاتی سطح پر آرام دہ ہاؤس بوٹ اور دیسی نمونوں کے شکارے اس امر کی تصدیق کرتے ہیں۔

پربت شنکر آچاریہ پر کوہ پیمائی کا لطف لیجئے یہاں کوئی ایک ہزار فٹ کی بلندی سے شہر سری نگر کا نظارہ کیجئے۔ اس پہاڑی پر شو کا ایک مندر بنا ہوا ہے۔ یہ مندر مہاراجہ اشوک کے بیٹے جالوکا نے ۲۰۰ ق م میں تعمیر کرایا تھا اور اس کی مرمت کشمیر کے عظیم حکمراں للتا دتیہ نے کروائی تھی۔ اس مندر سے سری نگر اور اس کے اطراف کے نظارے سے نظر میں بالیدگی پیدا ہو گی۔

شہر کے جدید ہوٹلوں اور ہاؤس بوٹوں میں آپ قیام کا انتظام بخوبی کر سکتے ہیں۔ ہاؤس بوٹ کیا ہیں، آرام و آسائش کے جزیرے ہیں گرد و پیش سے جی گھبرایا تو ہاؤس بوٹ کہیں اور لے گئے یہی نہیں ہاؤس بوٹوں میں آپ کو گھر کی سی خلوت میسر ہو گی۔ ان میں شب خوابی کے کمرے، نشست گاہیں اور کھلے صحن ہوتے ہیں۔ ان میں پانی اور بجلی کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ یہاں آپ کو آپ کے من چاہے کھانے مل سکتے ہیں بشمولیت کشمیری خصوصی کھانے .... پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہاں کا مشاق باورچی آپ کی فرمائش پر آپ کے دل پسند ہندوستانی اور مغربی کھانے تیار کر سکتا ہے۔

سری نگر اور اس کے نواح میں مغل بادشاہوں اور امراء کے بنوائے باغات چشمہ شاہی، نشاط باغ، شالیمار باغ، نسیم باغ، ہاس دھرتی کے جنت ارضی ہونے کا بین ثبوت ہیں۔ یہ باغات کیا ہیں۔ رنگ و بو کا ایک سیل خوش سلیقہ ہیں۔ ان کے علاوہ نہرو پارک چار چنار اور اچھابل جیسی دیدنی باغات ہیں۔ نہرو پارک فی الواقع روشنیوں کا جزیرہ ہے۔ رات میں یہ بقعۂ نور ہوتا ہے اچھابل میں باغ کے قریب ہی مچھلیوں کے شکار کی ایک بڑی عمدہ جگہ ہے۔ یہاں ٹراؤٹ و مہو مچھلیاں کثرت سے ملتی ہیں۔

جھیلیں:

ڈل: یہ کشمیر کی انتہائی خوبصورت، میٹھے پانی کی جھیل ہے۔ اوائل گرمیوں میں جھیل میں کنول کے شگفتہ و شاداب پھولوں کا منظر بڑا مسحور کن ہوتا ہے۔ ڈل گیٹ اور نہرو پارک کا درمیانی حصہ بڑا دلکش اور سحر آفریں ہے۔ ہاؤس بوٹوں کو ٹھہرانے کے لئے یہ حصہ بہترین ہے۔ اس جھیل میں تیراکی، آبی سکیٹنگ، اور کشتی رانی کی سہولتیں میسر ہیں۔

نگین: اس جھیل میں ڈل اور چنار باغ نہر کا پانی آکر ملتا ہے۔ ۲٫۳ کیلو میٹر لمبی اور ۱٫۰ کیلو میٹر چوڑی یہ جھیل نہانے اور آبی کھیلوں کے لئے ایک مرکزی جگہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں ہاؤس بوٹوں میں قیام بڑا لطف دیتا ہے۔ یہ سرینگر سے ۴ میل دور ہے۔

وُلر: ایشیا میں تازے پانی کی یہ سب سے بڑی جھیل ہے۔ اس کا رقبہ ۲۲۳٫۵ کیلو میٹر اور رنگ سبزی مائل ہے۔ سرینگر سے اس جھیل کی سیر کو جانے اور واپس آنے میں ایک دن لگتا ہے۔ موسم خزاں میں یہاں شیر کے شکار کو ماہی گیر یہاں بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ اس جھیل سے کوئی تین میل (۴٫۸ کیلو میٹر) شمال و مغرب میں گندھک کا ایک چشمہ ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں ہر لمحہ بلبلے اٹھتے رہتے ہیں۔

وُلر گہرے پانی کی جھیل ہے۔ اس جھیل کی ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس میں یک بیک طوفان اٹھنے لگتے ہیں اور جب یہ خاموش ہوتی ہے تو اس پر سکوت کا سا عالم طاری ہوتا ہے۔ یہ بذریعہ سڑک سرینگر سے ۵۶٫۲ کیلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ جھیل وُلر کی سیر براستہ گاندربل، بانڈی پور اور سوپور ایک ہی دن میں مکمل کی جا سکتی ہے۔ اس سیر پر کار سے یا ٹورسٹ بس سے جایا جا سکتا ہے۔

مانس بل: یہ سرینگر سے ۲۹ کیلو میٹر کی دوری پر ایک الگ تھلگ مقام پر واقع ہے۔ یہ جھیل چھوٹی ہے، لیکن بڑی پیاری ہے۔ سفید بلوریں پانی اور نواحی سرسبز پہاڑیوں نے اس میں ایک قیمتی پتھر کی سی خوبصورتی اور جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ بہار میں جب پیلے شگوفے اور نیلے سوتی پھول پیڑ پودوں پر آتے ہیں تو فضا دیدنی ہوتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے ایسا نظارہ ہوتا ہے جو ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔

شیش ناگ: شری امرناتھ کے راستے میں سطح سمندر سے ۱۲ ہزار فٹ (۳۶۴۶ میٹر) کی بلندی پر واقع یہ جھیل ماہ جون تک برف تلے محو خواب رہتی ہے۔ گرمیوں میں جب سورج تیز تیز چمکتا ہے تو برف سبز زمردیں جھیل میں گھل جاتی ہے۔

کوثر ناگ: یہ کشمیر کی سب سے بڑی پہاڑی جھیل ہے۔ پیر پنجال کی دلکش چوٹیاں ۱۲ ہزار فٹ (۳۶۴۶ میٹر) کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ ماہ جون میں اس تو دے بڑے پگھلنے لگتے ہیں۔ ماہ ستمبر کے آتے رنگوں پانی میں حل ہو جاتے ہیں۔ دوسری آنچار جھیل، تارسر، مارسر، گنگابل، نیل ناگ

سیاحوں کی دلچسپی کے دوسرے

پہلگام: سیر و تفریح کے لئے اس کشمیر سطح سمندر سے ۷۰۰۰ فٹ (۲۱۹۵ میٹر) مقام بذریعہ سڑک سرینگر سے ملا ہوا ہے فاصلہ ۶۰ میل (۹۶٫۵ کیلو میٹر) ہے۔ دلکش شیش ناگ، امرناتھ گپھا، تارسر، اور دل کو پہلگام ہی سے جاتے ہیں۔ دریائے لدر ملتا ہے۔ گالف کے شوقین سیاحوں کے میدان بھی بنا ہوا ہے۔

گلمرگ سرو اور صنوبر دل کی یہ وادی ا گلابوں کی وادی ہے یہ سرینگر سے صرف ۸ گالف کے میدانوں کے لئے اس کی شہرت میل لمبی گول سڑک پر سے کشمیر کی سا کی برف پوش چوٹیوں کے نظارے سے خوب قریب ہی سیر و تفریح کے دوسرے مقامات لین مرگ، بابا ریشی، کنسر ناگ اور توش مہ گلمرگ کے سبزہ زار گل نقرئی برف کی دبیز تو برف کے کھیلوں کے شوقین یہاں جو

لولاب وادی: ایشیا کی سب سے بڑی اسی وادی کا حصہ ہے۔ یہاں صنوبر اور دیو اخروٹ، سیب اور ناشپاتیاں یہاں خوب آنکھوں کو تراوٹ پہنچتی ہے۔ ۳۲ کیلو میٹر لمبے چوڑے خطے میں پھیلی ہوئی یہ وادی سرینگر دوری پر ہے اور سرینگر سے بذریعہ سڑک ملی یہاں قیام کا انتظام بھی ہے۔

سونامرگ: یہ طلائی مرغزار بذریعہ سڑک کے فاصلے پر واقع ہے سرینگر سے سونامرگ کو موڑ اپنے بے مثل حسن، شکوہ اور دلکش فضا و

ہم پلہ ہے۔ یہاں سرو اور صنوبر کے درخت بہ افراط ہوتے ہیں۔ یہاں کی ڈھلانیں اور مرغزار رنگ برنگ پھولوں سے سجے ہوئے ہیں۔ سیاحوں کے لئے ایک ریسٹ ہاؤس ہے۔ ٹورسٹ ہٹس بھی بنی ہوئی ہیں۔

گاندربل: سندھ نالے کے کنارے آباد یہ مقام مچھلی کے شکار کے لئے بڑی عمدہ جگہ ہے۔ یہ سرینگر سے ۲۲٫۵ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے یہاں ہاؤس بوٹوں میں قیام بڑا لطف دیتا ہے۔

ککر ناگ: اپنے صحت بخش پانی کے لئے یہ جگہ بڑی مشہور ہے۔ برنگی وادی میں آباد یہ مقام اچھابل سے ۱۱ کیلومیٹر دور ہے مچھلی کے شکار کے شوقینوں کے لئے ککر ناگ کسی جنت سے کم نہیں یہاں مچھلی کی نو شکارگاہیں ہیں اننت ناگ سے بذریعہ موٹر گاڑی ان تک پہنچا جا سکتا ہے ککر ناگ کے لئے سرینگر، اننت ناگ اور پہلگام سے باقاعدہ بسیں چلتی ہیں یوس مرگ اور تھاجہ واس میں قیام اور سیر بھی اپنا لطف رکھتی ہے۔

کھیل اور تفریح: کشمیر کھلاڑیوں اور کھیلوں کے شائقین کی جنت ہے۔ جنوری اور فروری میں سیاح موسم سرما کے کھیلوں سے لطف لے سکتے ہیں۔ شکار اور بالخصوص دریائی پرندوں کا شکار کھیل سکتے ہیں۔ موسم سرما کے کھیلوں کی سہولت ماہ مارچ میں بھی حاصل رہتی ہے۔ اسی مہینے شگوفے پھوٹتے ہیں۔ پیادہ سیاحت بڑا مزا دیتی ہے۔ ماہ اپریل میں کھیل تفریح کی سہولتیں بڑھ جاتی ہیں۔ سرینگر میں بھی گاف کھیلا جا سکتا ہے۔ مچھلی کے شکار کے لئے یہ مہینہ بڑا موزوں ہے۔ پندرہ اپریل تک دریائی پرندوں کا شکار میسر آتا ہے کشتی رانی بھی کی جا سکتی ہے۔ مئی میں گاف کے کھیل (سرینگر) کشتی رانی اور ریچھ کے شکار کے علاوہ ٹٹوؤں پر سیر بھی ایک خاص تفریح ہے ٹینس، تیراکی اور پانی پر کھیلے کے کھیلوں سے حظ اٹھایا جا سکتا ہے ٹینس اور تیراکی ماہ جون، جولائی اور اگست میں بھی ممکن ہے اس کے علاوہ مچھلی کا شکار کھیل سکتے ہیں کشتی رانی وکوہ پیمائی کر سکتے ہیں۔ گلمرگ اور سرینگر میں گاف کا کھیل بھی کھیلا جا سکتا ہے۔ جولائی میں نچلے میدانوں میں ریچھ کا شکار ملتا ہے ستمبر میں کوہ پیمائی کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ مچھلی اور چیتے کا شکار ملتا ہے۔ اس مہینے میں سیر و تفریح کے دیگر سامان گرمیوں کے مہینوں جیسے بہم رہتے ہیں۔ ماہ اکتوبر شکار کے لئے بڑا موزوں ہے۔ جنگلی جانوروں اور مچھلی کا شکار عام ہوتا ہے۔ کھیل و تفریح کے لئے، نومبر اور دسمبر میں جنوری اور فروری کی سی سہولتیں دستیاب رہتی ہیں۔

خطۂ جموں

یہ تنومند ڈوگروں کا دیس ہے۔ جموں کے کوہستانی علاقے میں بے شمار قلعے ہیں ان میں سے بیشتر اب کھنڈرات کی صورت میں ہیں۔ قلعہ باہو جو ایک پہاڑی پر واقع ہے، کبھی ریاست باہو کا صدر دفتر ہوا کرتا تھا۔ یہ قلعہ توی کے بائیں کنارے آباد شہر جموں کے بالمقابل پہاڑی پر ہے۔ جموں سے بارہ میل شمال مشرق میں راجہ کپور دیو کا بنوایا ہوا کپور گڑھ قلعہ ہے جو ماضی قریب تک سلاح خانہ کے طور پر استعمال ہوتا آیا ہے۔ چناب کے دائیں کنارے پر بنا ہوا اکھنور کا قلعہ وہ مقام ہے جہاں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے گلاب سنگھ کو راجہ کا خطاب دیا تھا۔ جموں و پونچھ کے علاقوں میں واقع قلعوں میں سے بعض اہم قلعے، گلاب گڑھ، ریاسی، دوہلل گڑھی، راج محل، رنبیر گڑھ اور تھنہ ہیں۔

جموں: پٹھانکوٹ سے براستہ سڑک ۶۵ میل کی دوری پر واقع یہ شہر ریاست کا موسم سرما کا صدر مقام ہے۔ مندروں کا یہ شہر اہم تجارتی مرکز ہے۔ اس کی حیثیت ایک منڈی کی سی ہے۔

جموں کے علاقے میں سیاحوں کی دلچسپی کے مقامات

شری ویشنو دیوی: جموں سے براستہ کٹڑہ، شری ویشنو دیوی کی گپھا ۸۰ کیلومیٹر کی دوری پر ہے۔ یہ سطح سمندر سے ۵۳۰۰ فٹ (۱۶۱۵ میٹر) اونچی ہے۔ قریباً ایک سو فٹ لمبی اس مقدس گپھا کا دہانہ بڑا تنگ ہے اس کی زیارت کے لئے ہزارہا یاتری ہر سال آتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی ندی چرن گنگا گپھا میں مورتی کے نیچے سے بہتی ہے۔ ویشنو دیوی کے عقیدت مند اس ندی سے گزر کر دیوی کے مندر میں جاتے ہیں۔ یاتریوں کے لئے یہاں سرائیں بنی ہوئی ہیں۔ شری ویشنو دیوی کی یاترا ہندو رسم کے مطابق پہلے نوراترے سے شروع ہوتی ہے اور کوئی اڑھائی مہینے تک جاری رہتی ہے۔

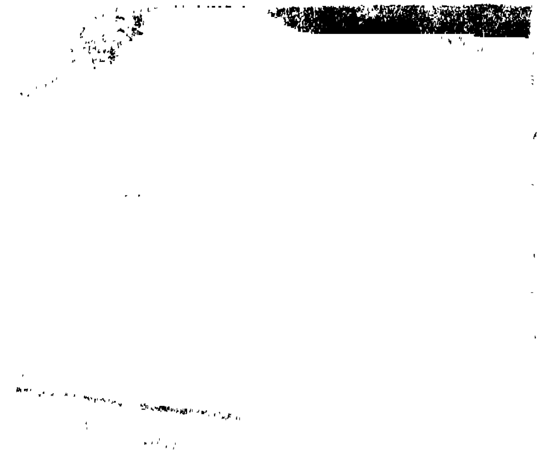
مانسر: سبزی مائل نیلے گہرے پانی کی یہ جھیل پہاڑیوں میں گھری ہوئی ہے۔ ان پہاڑیوں پر صنوبر کے جنگل ہیں اس خوبصورت جھیل کا گھیرا ۲٫۲ کیلومیٹر ہے۔ یہ مقام پرسکون فضاؤں میں چھٹیاں گزارنے کے خواہشمند سیاحوں کی خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ سیاحوں کے لئے ایک ریسٹ ہاؤس بنا ہوا ہے۔ ایک دھرم شالہ بھی ہے۔

جموں کے علاقے میں دوسرے دیدنی مقام اکھنور، جیتو، بسوہلی، بہادیو اور کشتواڑ ہیں۔

نظامت سیر و سیاحت: ریاستی حکومت نے سیر و سیاحت سے متعلق ایک الگ شعبہ قائم کر رکھا ہے۔ اس کے دفتر بھارت کے اہم شہروں اور ریاست میں سیاحوں کی دلچسپی کے مقامات پر ہیں۔ یہ شعبہ سیاحوں کو رہائش، ذرائع آمد و رفت اور سفر وغیرہ کے انتظامات میں مدد دیتا ہے۔

(تلخیص و ترجمہ)

سپنوں کی دھرتی ہندوستان



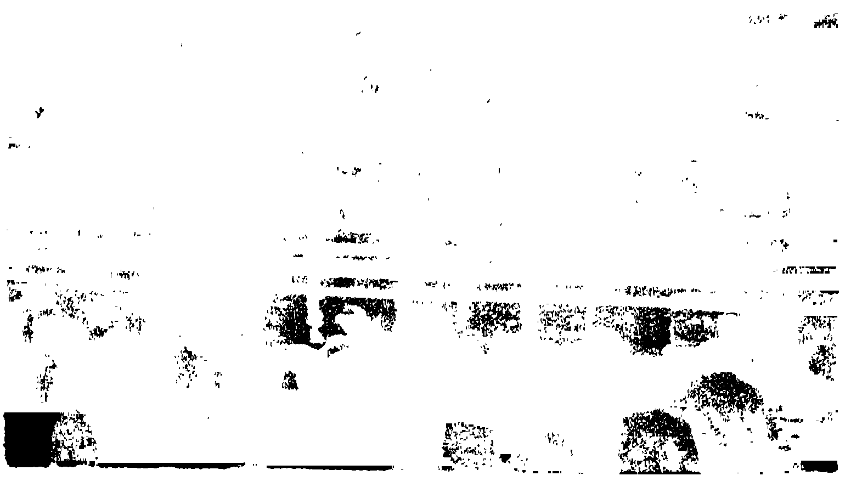
ارجن کا کفارہ۔ مہابلی پور

عجائب روزگار

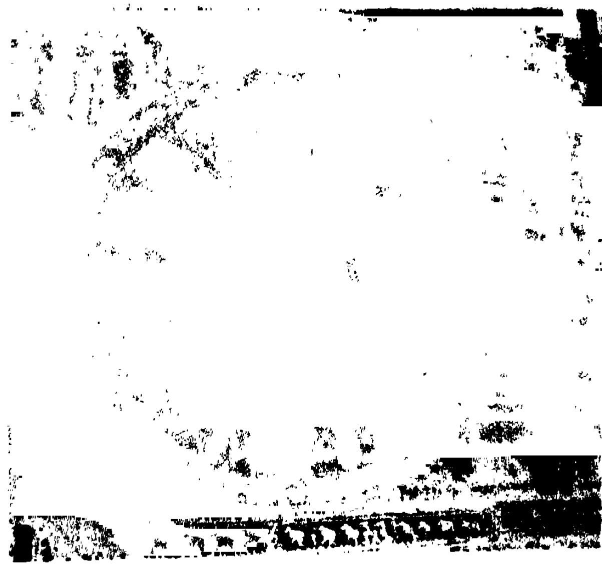


احمد آباد کے قریب اڈالج واؤ یا باؤلی (بشکریہ آئی۔ٹی۔ڈی۔سی)

سنگتراشی کا کمال۔ کھجوراہو۔ (بشکریہ آئی۔ٹی۔ڈی۔سی)



فتح مینار۔ چتوڑ



کونارک مندر کا ایک حصہ (بشکریہ آئی۔ٹی۔ڈی۔سی)

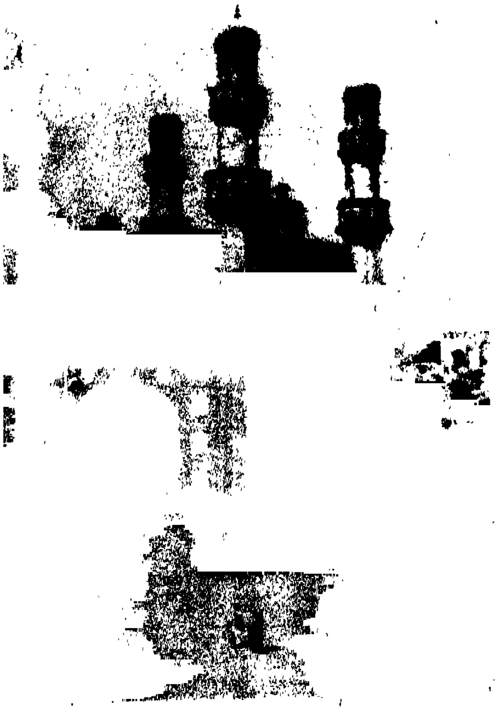


گول گنبد۔ بیجاپور (بشکریہ آئی۔ٹی۔ڈی۔سی)

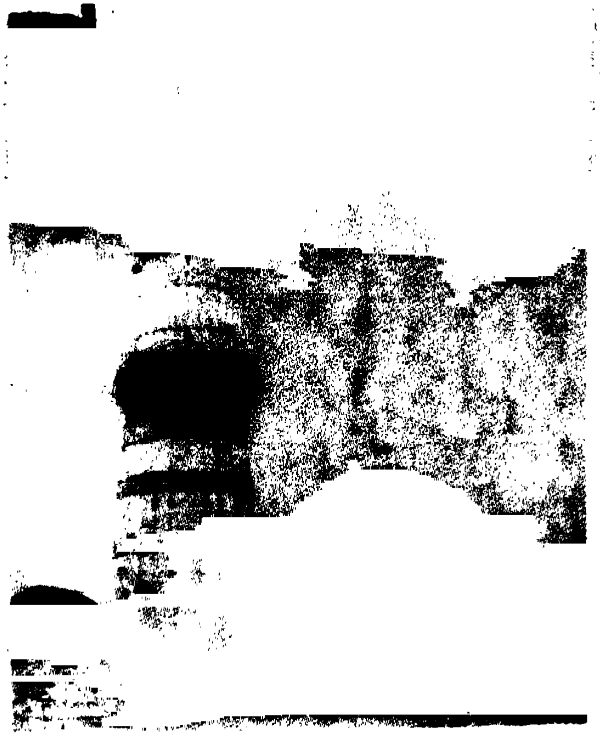
(عجائبِ روزگار)



تاج محل (بشکریہ آئی۔ٹی۔ڈی۔سی)



چارمینار حید



قطب مینار دلی (بشکریہ آئی ٹی ڈی سی)

ہمایوں کا مقبرہ ۔ دہلی (بشکریہ آئی۔ٹی۔ڈی۔سی)



اکبر کا مقبرہ ۔ سکندرا (بشکریہ آئی۔ٹی۔ڈی۔سی)





کوڈائی کنال - تامل ناڈو

کشمیر میں مچھلی کا شکار (بشکریہ آئی ٹی ڈی سی)





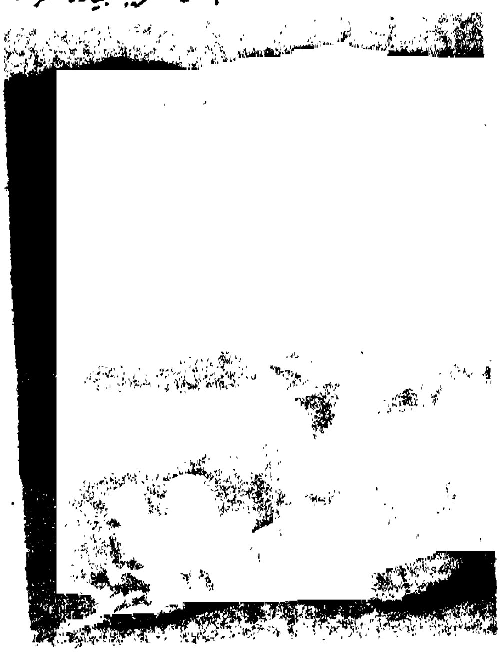
کورٹلم آبشار - تامل ناڈو



جنگلی ہاتھی - پیریار جنگل میں (بشکریہ آئی ٹی ڈی سی)



ڈلہوزی کے قریب کھجیار کا منظر

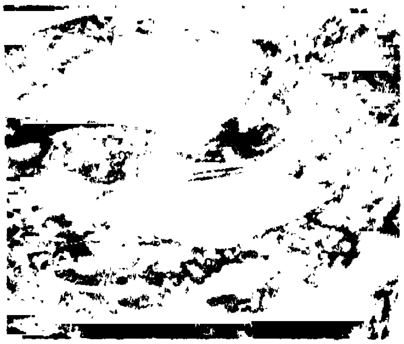


مناظرِ فطرت



جھیل سے نینی تال کا منظر

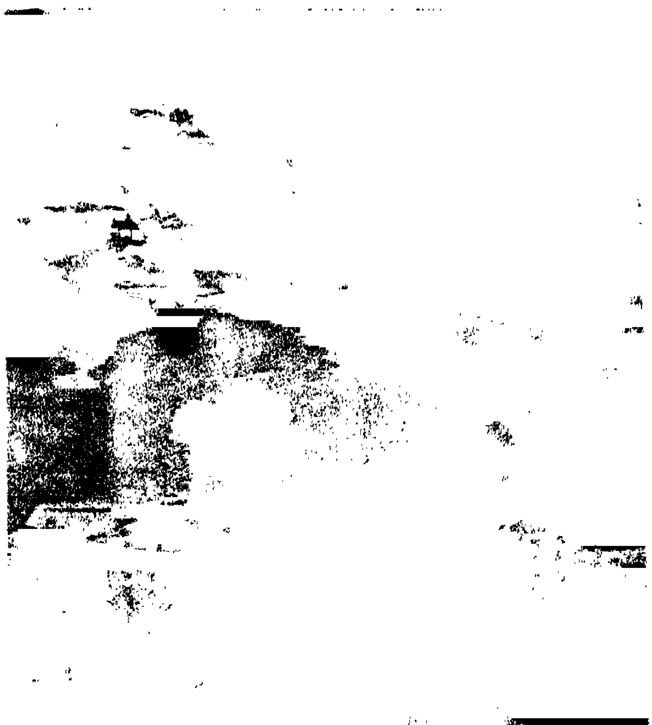
نینی تال سے کھرپا تال کا سین

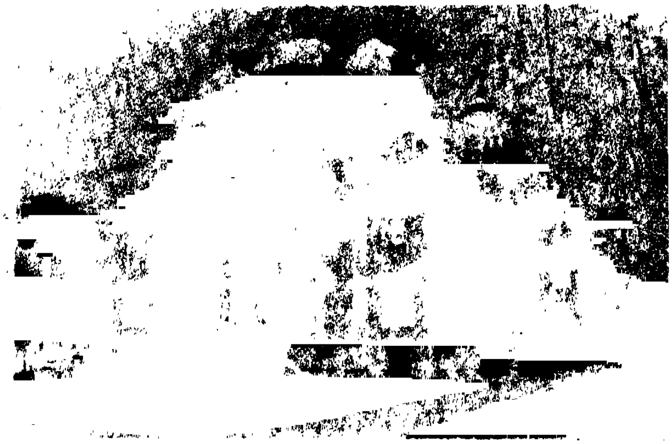


سلطان پور چڑیوں کی پناہ گاہ



آبو پہاڑی کا نظارا





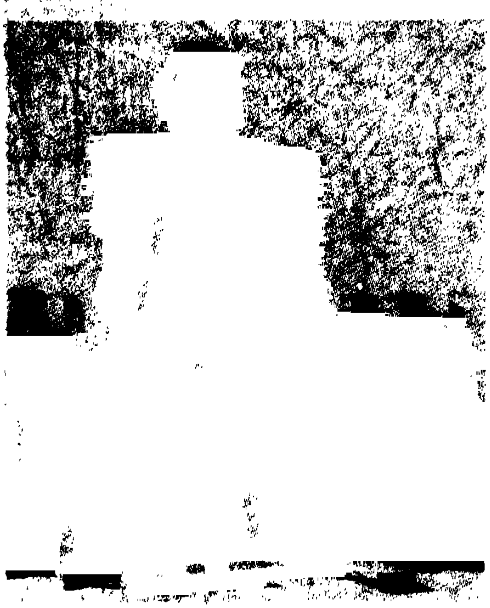
بیلور مٹھ۔ کلکتہ (بشکریہ آئی۔ٹی۔ڈی۔سی)

مینا کشی مندر۔ مدورائی (تامل ناڈو)

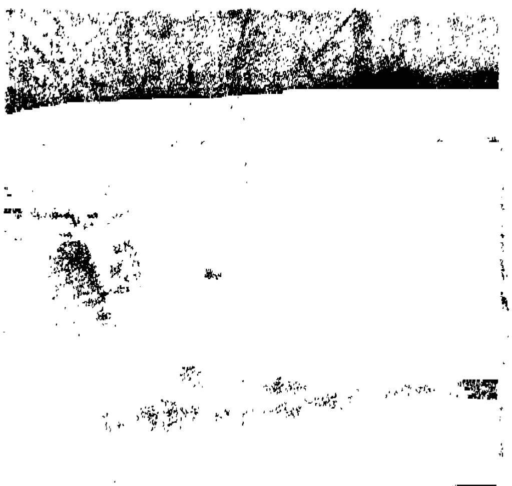


کیلاش مندر ایلورا (مہاراشٹر) (بشکریہ آئی۔ٹی۔ڈی۔سی)

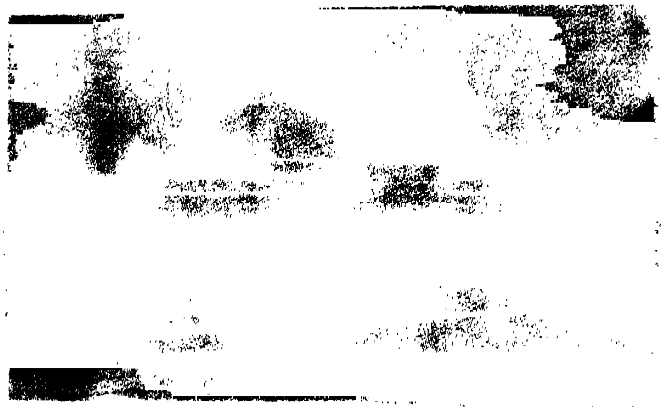




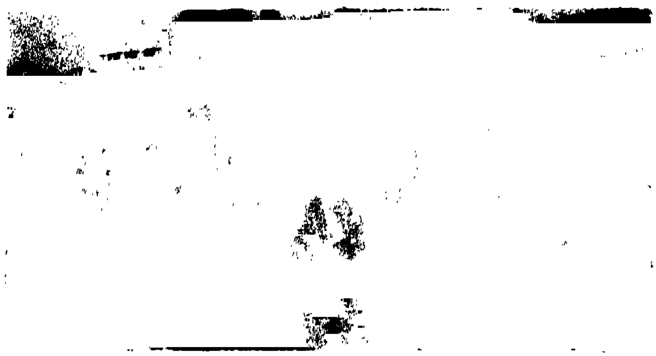
جین مندر۔ سراونابیل گولا میسور (بشکریہ آئی۔ٹی۔ڈی۔سی)



کمبھ میلہ۔ ہردوار (اترپردیش) (بشکریہ آئی۔ٹی۔ڈی۔سی)

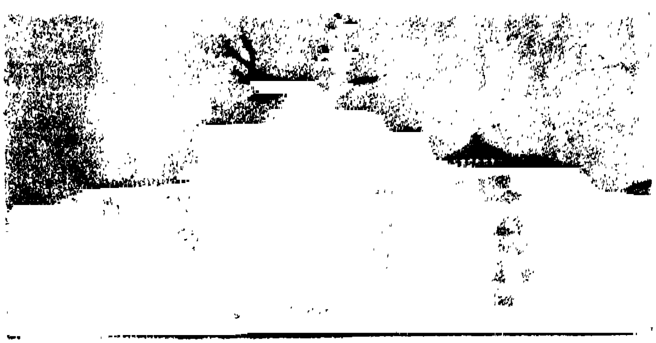


مزار شیخ سلیم چشتی - فتح پور سیکری (بشکریہ آئی-ٹی-ڈی-سی)



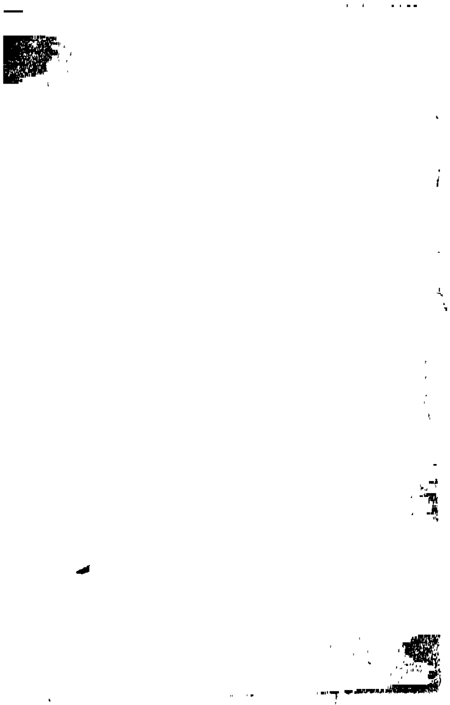
جامع مسجد احمد آباد (بشکریہ آئی-ٹی-ڈی-سی)

بنارس گھاٹ



وویکانند میموریل - کنیا کماری





درگاہ معین الدین چشتی - اجمیر

زیارت گاہیں

دربار صاحب (طلائی مندر) ام

طرزِ زندگی

قالین بافی

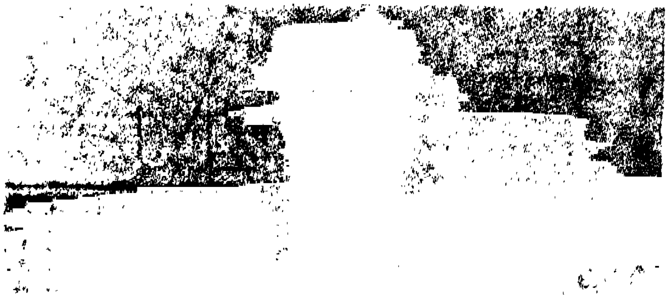
محرم کا تعزیہ (بشکریہ آئی۔ ٹی۔ ڈی۔ سی)

پوری کی رتھ یاترا (بشکریہ آئی۔ ٹی۔ ڈی۔ سی)

دیوالی (بشکریہ آئی۔ ٹی۔ ڈی۔ سی)

راشٹرپتی بھون میں جشنِ جمہوریہ کا چراغاں (بشکریہ آئی۔ ٹی۔ ڈی۔ سی)

اشوکا ہوٹل (بشکریہ آئی۔ ٹی۔ ڈی۔ سی)



ٹھاکر پونچھی ریڈیو کشمیر جموں

بند کھڑکی کی روشنی

شکنتلا اب کھڑکی کے آئینے میں اپنی محبت کا انتظار نہیں کر رہی ہے اور ٹوٹا پھوٹا چاند اب اور دور ہو گیا ہے۔ سوچوں کے سپنوں سے بھی دور۔ اب صرف کھڑکیوں کی آنکھیں ہیں۔ انتظار کی تحرائیاں ہیں۔ اور بے رس کہانیوں کی اُداسیاں۔ اور یہ یادوں کے کبھی نہ ختم ہونے والے فاصلے۔ روح، جسم اور بے رس سانسیں اور چاروں طرف دُھند، کبھی چاندنی راتوں کے اندھیروں کی۔ کبھی یادوں کی کسماہٹ کی۔ کبھی تنہائیوں کی سرگوشیوں کی۔ اور یہ دُھند کاش کہ شکنتلا کے پیار کا دامن بن جاتی۔ اس کی ملن کی امید بن جاتی۔ اس کی تھکی ہاری دھڑکنوں کی رات بن جاتی۔ اس کی بھٹکی ہوئی روح کا سکون بن جاتی اور وہ آج ایک اجڑے ویران دور اہے پر کھڑی اپنے جیون کی شانتی کی بھیک نہ مانگتی۔ پہلے جیون کے ہنگاموں کی تلاش۔

بعد میں جیون کی شانتی کی جستجو!

لیکن شکنتلا، اب جیون کی شانتی تمہاری جھولی میں کیسے ڈالی جائے تمہارے خوبصورت انگ کی کون سی تھرک سے سوچ کی ابتدا کی جائے۔ من کی کونسی کھڑکی کھولی جائے۔ ہاں اتنی سی بات ضرور ہے کہ تمہاری حسین ترین جوانی میرے سامنے جاگی۔ بنی سنوری بھی میری نگاہوں کے سامنے ہی۔ یہ بھی سچ ہے کہ جب تم نے عمر کے آئینے میں پہلی بار انگڑائی لیتا ہوا اپنا بھرپور گداز جسم دیکھا تھا تب بھی میری آنکھیں تمہیں جھانک رہی تھیں۔ اور میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تم سے التجا کی تھی میں نے معصوم پھولوں کی خوشبو کو مرتے دیکھا ہے تم نے مرنے دیا اور تم نے آنکھوں آنکھوں میں جواب دیا تھا یہ تمہاری ادھیڑ عمر کی سوچ ہے جو اپنا ہر چیز سمیٹ بھرتی ہے میری عمر کی سوچ نہیں جو ہر چیز لٹانے کی قائل ہوتی ہے اور میری تمہاری دوری میں بھی کتنا قرب تھا۔

جب بھی بیچ کا فاصلہ ہٹ جاتا میں اپنے دل کی آواز تم تک پہنچاتا۔ لیکن تم سُنی اَن سُنی کر دیتیں ایک ایسے ہی لمحے میں میں نے کہا جوانی کا آنچل اپنے ہاتھوں میں لہرانا بند کر دو کہ تمہار ے نازک ہاتھ اب کانپنے لگے ہیں۔ اور جذبات کی آندھی منہ زور ہو رہی ہے۔ کہیں یہ آنچل نہیں اڑا کر کسی انجانی فضا میں نہ لے جائے تمہارا جواب دہی تھا —— یہ عمر کے دل کا لرزہ نہیں۔ کنواری ہوا سرسراتا ہے۔ جو جانی پہچانی فضاؤں کی دین ہوتی ہے۔

ایک عمر کا ٹکراؤ۔ ایک وقت کا تقاضہ۔ نہیں ایک خام کی دھڑکنوں کے حادثے کون روک سکا۔ اور پھر ان لمحاتی جذباتی حا کی تکمیل، ایک عام سی گلی کوچوں کی کہانی جس کی ابتدا تو بڑی حسین اور ہوتی ہے۔ لیکن اختتام بڑا گھناؤنا —— اب یہی کہنا پڑے گا۔ مانا کہ طرف جھوٹ تھا۔ ہوس تھی۔ لیکن دماغ کا پیار تھا۔ جس میں اچھی سوچ کا دخل ہوتا ہے اور دوسری طرف مجبوری تھی۔ معصومیت اور صرف دل کا بے سمجھ پیار تھا۔ دل کو تنہا چھوڑ دیں گے۔ اسے م کا لبادہ نہ پہنائیں گے تو دھڑکنوں کے مدوجزر تو لازمی ہیں۔ کہ بات نہیں۔ بس جذبات کے آنگن میں بجلی چمکی۔ احساس کی حرارت پیدا تنے ہوئے جسم نے ایک جھرجھری لی اور اس کے بعد جذبات کی بار نم ناک دُھند چھا گئی۔ پہلے بھی تو ایک ایک میں ایک معصوم پیاری شکنتلا ایسی ہی نمناک دُھند کی لپیٹ میں آگئی تھی۔ ٹھیک ہے لیکن جنگلوں اور دریائی بیلوں کا مقدس ابدی پیار تھا۔ ہوسناک ہوٹلوں آوارہ بہکی ہوئی ادھ جلی سڑکوں کی محبت نہیں۔ اس جگ کا شرا تو وقتی تھا۔ آنسوؤں کے درد سے دُھل گیا۔ لیکن یہ شراب جو شا تم اپنے کوٹھے کی چھت پر لئے لئے پھر رہی ہو۔ اسے درد کی کس یا سے دھویا جائے؟

اور پھر اس بارے میں کیا سوچا جائے۔ سماج کو کوسا جائے ما کو کوسا جائے۔ گھر کی چار دیواری کو کوسا جائے یا پھر اُن گنگناتی ہوئی جذباتی راہوں کو جو کوئی منزل نہیں دکھاتیں۔ کوئی زندگی بخش مسرت نہیں لاتیں صرف کچی معصوم سی ادھوری دھڑکنوں کو اکسا کر انہیں آلودہ بنا دیتی ہیں۔ اور پھر کیا صرف ماں باپ کا قرض رہ گیا اور ا کے قرض کا بوجھ بھی کمزور بوڑھے کندھوں پر۔ آخری سانس تک۔ اپنی جوان جھولی میں اور دُکھ بوڑھی گود میں۔ حقیقتوں کے اژدہے سامنے آکر پھنکاریں گے ہی۔ لاکھ گھوڑے کی آنکھ موند لو۔

اب تو میری بات مانو —— جوانی کے جس آنچل کو شکنتلا تم سہاگ کا دوپٹہ بنانا چاہتی تھیں نا۔ اسے اب اپنی موت کا کفن تلخ بات ہے۔ لیکن اب اسی میں تمہارے جیون کی شانتی ہے۔

شہر تک پہنچتے چاندنی رات بھی ادھیڑ ادھ مری سی ہو جاتی ہے۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں، شہر میں ہر چیز مری مری سی کیوں دکھائی دیتی ہے۔ کیا اب ان پہاڑوں اور میدانوں کے بیچ کا فاصلہ اتنا طویل ہے کہ زندگی سفر کی موت بن جاتی ہے۔ ان پہاڑوں کے چیڑ اور دیودار کے درختوں پر چاندنی رات کی بھرپور جوانی کیسے اتر رہی ہے شرماتی لجاتی۔ کسی ان بیاہتا پہاڑی دوشیزہ کی طرح کتنی تقدس ہے ماحول میں۔ کتنی حسین خاموشی ہے اردگرد۔ اپنی سانسیں بھی شور محسوس ہوتی ہیں۔ کتنی مدھم سی سرگوشی تھی ڈاک بنگلے کی مہترانی کی — بڑے بھاگیہ وان ہیں آپ۔ قدم پڑتے ہی نیا مہمان آ گیا۔ چھٹا مہمان اور وہ خطرے کا نشان۔ راستہ کی لال تکون ایک دھواں دار دھماکہ بن کے رہ گئی۔ اب صرف ایک خلا ہے اور ایک مہیب سوالیہ نشان۔ اور سامنے درشنی کی آنکھیں، نئے مہمان کی حیات پرور رمق لیے ہوئے اس معصومیت کی روایتی مہمان نوازی کو سنبھالا دیا جائے یا اس لال تکون کے بے آواز خطرے کے گھڑیال کی صدا سنی جائے صبح شام کی بڑھتی ہوئی مہنگائی اور نت نئی پریشانیوں کے اس دور میں نئے مہمان تو خطرے کی صلیب ہو گئے ہیں۔ ہر غریب کی مسرتیں محدود ہوتی ہیں۔ ان حدود کو اور کیوں کم کیا جائے۔ کون توڑے اس کی خوشیوں کے دھاگوں کو۔ کس بھاشا میں سمجھایا جائے کہ ان مہمانوں کی برات کتنی اذیت ناک اور بھیانک ہو جاتی ہے۔ اپنے بیگانوں کی دنیا کے لیے۔ اور پھر بھگوان کی دین کا زمانہ، اپنی تقدیریں ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ لانے کا وقت تو اب رہا نہیں۔ گھور کلجگ ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کا زمانہ ہے۔ سوچنا پڑے گا۔ اپنے ہاتھوں کو دیکھنا پڑے گا کہ لینے والے ہاتھ کتنے ہیں اور دینے والے کتنے۔ عمر کے نہ سہی لیکن ضروریات کے تقاضوں کا پیٹ بھرنا ہی پڑے گا اور اپنے نکتہ چیں دن دینا ناستھ ورتمانی کا گلہ شکوہ کہاں تک درست ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی جسے وہ ہندی کا شاعر ہونے کے ناتے پریوار نیوجن کا نام دیتا ہے۔ کا ہنگامہ اب شروع ہوا۔ ورنہ آدمی درجن نئے پرانے مہمانوں کو کندھوں پر نہ اٹھائے اٹھائے پھرنا پڑتا۔ کس کو بیاہیں۔ کس کو پڑھائیں۔ کس کو کھلائیں۔ دو ہاتھ سمیٹنے والے بارہ ہاتھ لوٹنے والے۔ لال تکون تو نئی ایجاد سہی۔ لیکن اکنامکس کے پروفیسر سے یہ توقع تو نہیں کی جا سکتی کہ وہ سپلائی اور ڈیمانڈ کا تناسب بھول جائے اور اپنے سارے جسم کو شاعر بنا دے اور ان لاکھوں ہاتھوں کو بھول جائے۔ جو صبح سے شام اور شام سے رات تک خلاؤں میں سوالی بن کر لٹکے رہتے ہیں اپنے سارے وجود کو پیٹ بنا کر۔ اور کوئی بند کھڑکی نہیں کھلتی۔ اندر کی روشنی اندر ہی دبکی بیٹھی رہتی ہے۔ بھوک کے کوڑھ زدہ اندھیرے کیسے اجلے ہوں گے اور پھر لالہ کرم چند تو اپنے کرموں کا پھل کھا رہا ہے۔ وہ تو اپنے کواڑ کھولنے سے رہا۔ غلے کے انبار۔ نوٹوں کے ڈھیر۔ ایک مکمل آراستہ حویلی۔ اولاد کوئی نہیں۔ جہاں مہمان خانے ہوتے ہیں وہاں مہمان کیوں نہیں آتے۔ جہاں روٹی ہے۔ وہاں بھوک کیوں نہیں لگتی۔ لکشمی نام کی سنگ مرمر کی مورتی کو بچے پیارے نہیں۔ کیا روتی نہیں چاہتی۔ کوئی میری بھوک ہے۔ لیکن لالہ کرم چند کی پچاس سالہ عمر خوش ہے کہ ان کی دولت کا، ان کی روٹی کا، اور ان کی جائداد کا کوئی حصے دار نہیں۔ کسی عمر میں ایک حصے دار بنے آیا تھا۔ اپنی موت مر گیا۔ لالہ کرم چند کو کوئی تردد نہیں کرنا پڑا۔ شانتی جی کا تو پتہ نہیں لیکن لالہ جی کو اپنے مہمان کی موت پر کم ہی دکھ ہوا۔ وہ سب کچھ اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ لاکھوں سوالی ہاتھ جو خلاؤں میں لٹک رہے ہیں ان کی چھاتی پر گرنے ہی والے ہیں۔ قبر میں خالی ہاتھ ہی اترنا پڑے گا۔ شانتی جی بھی ساتھ نہ دیں گی۔ لالہ جی شاید جانتے ہیں اس لیے وہ شانتی جی سے زیادہ اپنی نوٹوں بھری تجوری کو اپنی بیوی سمجھتے ہیں۔ اسے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے

اب چاند بھی لالہ جی کی تجوری بن گیا ہے۔ قدرت کی ساری ضیائیں سمیٹ کر کسی چور کی طرح اندھیروں کی طرف بھاگ رہا ہے۔ سارا ماحول اداس ہو گیا ہے۔ کائنات نے چاندنی کا جو مرمریں لباس پہن رکھا تھا۔ وہ اب تار تار ہو گیا ہے۔ شاید اسی لیے ہر بے جان اور جاندار چیز نے اپنی آنکھیں موند لی ہیں۔

ہر چیز اپنے لباس سے پہچانی جاتی ہے۔ بھاشا ہو۔ چرند پرند ہوں پھول پتے ہوں۔ پیڑ پودے ہوں یا پتھر چٹانیں۔ تین گھنٹے کی جستجو مجھے نہ بتا سکی۔ ساتھ کا کمرہ پاس ہے۔ اندر کی روشنی بھی کوئی کم نہیں۔ لیکن پہچان کی آنکھ اندھی ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ جاننا مشکل ہو گیا ہے کہ اس نوجوان جوڑے میں لڑکا کون ہے اور لڑکی کون۔ لباس ایک جیسا ہو سکتا ہے۔ لیکن انداز ادائیں تو مختلف ہوں۔ سب کچھ گھل مل گیا۔ ہر چیز ایک دوسرے میں مدغم ہو گئی۔ اب ڈھونڈتے پھرو کون کہاں ہے۔ کیا ہے وقت کی دھارا تو ہر دور میں تیز رفتار رہی لیکن تہذیب و تمدن کے بھی تو اپنے مضبوط پاؤں ہوتے ہیں۔ پہچان کی آنکھ کا اندھا پن کب تک ننگے پن کی مشعلیں جلائے رکھے گا۔ زندگی جتنی مختصر ہے اتنی طویل بھی۔ ایک دن یا ایک رات کے لیے جینے کی سوچ سے عمر تو نہیں کٹ سکتی۔ لمحہ لمحہ مرنا اور بوند بوند جینا اذیت ناک ہو گا ہی۔ بڑی عجیب بات ہے پیار کے رشتے ابدی ہوا کرتے تھے۔ جنم جنم کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ اب وقتی ہو گئے اور شرح وقتی تھی

اندھی ہو گئی ۔ اسی لئے ذات کی پابندیوں اور دل کی خود ساختہ اداسیوں اور مجبوریوں کی گھور گھٹائیں چھٹنے میں نہیں آتیں، سگرٹ کا بدبودار دھواں اڑاتے ہوئے اس پر بھی ذرا بھر سوچو ۔ یہ فیشن کی کون سی کروٹ ہے کون سی ادا ہے ؟ آس پاس کی ڈوبتی ہوئی خاموشیاں اور گہری ہو گئیں لیکن بند کھڑکی کی روشنی ابھی تک قائم ہے جھوٹے دعدوں جھوٹے قول و قرار جھوٹے پیار کی لمبی رات ہوتی ہے۔ شاید روشنی بجھے ہی نا ۔ پہاڑوں کی شام کا ٹھہراؤ بدستور قائم ہے ۔ شہروں کی شام کا ٹھہراؤ اب کہاں گیا ۔ کیوں شام کو بھی دن کی سی حرارت تیزی اور تندی ہوتی ہے ۔ کیا بات ہے ۔ اپنے مہمان نواز شہر کی شام بھک منگی کیوں ہو گئی ۔ ہر کوئی اپنی ذات کی صلیب اٹھائے ایک دوسرے کے آگے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے ۔ شام کے بے عیب دھندلکے اتنے نشہ آلود کیسے ہو گئے ۔ دیر کی عادتیں چھوڑی بھی تو جا سکتی ہیں ۔ ہمیشہ اپنے دل کی ذات کا ساتھ دینے والا وقت کے قدم تو نہیں ناپ سکتا ۔ پھر یہ بھاگ دوڑ چند عادی مجرم لمحوں کو سلانے کے لئے ہی تو ہے ۔ لیکن جسم تو نہیں سوتا ۔ وہ حقائق کے مردے سنبھالے جاگتا ہی رہتا ہے ۔ اور پھر عزت صرف اپنی ذات کی ہی نہیں ہوتی ۔ بیوی بچوں اور ماں باپ کی بھی ہوتی ہے ۔ پہلے گھر کا چولہا دیکھا جاتے اس کے بعد اپنے محلے کا دھواں دکھائی دے تو اپنے اندر کے عادی مجرم کی آگ بجھا لیجئے ۔ یوں تو کوئی تنگ نہیں کہ محلہ پیٹ بھر سوتے ۔ اپنا آنگن بھوکا جاگے ۔ زندگی کا غم تو مشقت کے بل بوتے پر ہی اٹھایا جا سکتا ہے ۔ گنگا سنگھ نام لینے سے گنگا جل کا احساس تو نہیں ہو سکتا ۔ پانی کا بھی اپنا رنگ ہے اس میں اپنا بوند بوند خون نچوڑ کر رنگ دار بنانے کی کیا ضرورت ۔ اپنے من میں جھانکو اچھے بھلے دھندلکوں کو کریدنے سے کچھ نہیں ملے گا ۔

میرے ملازم کی حیرانی جائز ہے کہ نسوار والے شاہ کی بیوی بھاگ گئی ہے ۔ کیونکہ بھاگتی تو جوانی ہی ہے اکثر لیکن شاہ جی کو خوشی ہے کہ بند کھڑکی کی روشنی معطر ہی نہیں ہوئی ان کی نئی محبوبہ کی رسیلی سانسوں سے بھی مہور ہے ۔ بلا اعتراض دوسری شادی ۔ دولت کی کوئی عمر نہیں ہوتی ۔ اور شاہ جی کا بڑا کہنا ہے کہ عورت بھاگ جائے یا بھگا دی جائے بات ایک ہی ہے ۔ اور لوگ تو آج کل کاغذی نوٹ کھاتے ہیں ۔ روٹی نہیں ۔ اور بلیک کا دھندہ قائم ۔ دوسری طرف ننھی تانگے والا مغموم بیٹھا ہے ۔ اس کی پیاری رادھا شام سے غائب ہے اور شاید اسے کوئی بھگا کر لے گیا ہے ۔ لیکن بھروسے پر ہی دنیا کی سڑک چلتی ہے ۔ رادھا ضرور لوٹ آئے گی ۔ ننھی تانگے والے کو یقین ہے ۔ سوچ کا دھاگا کھولو ۔ انسان اور حیوان کی بات ہے ۔ بیوی بھاگ جانے پر کیوں خوشی ہوئی اور تانگے کی گھوڑی رادھا کو کوئی بھگا لے جائے تو دکھ کیوں ؟

یہ کیسا سماج ہے ۔ کھانے کی خواہش مر جاتی ہے ۔ ہضم ہونے نہیں رہتی ۔ روٹی بخشی جاتی ہے ۔ دل میں وسوسوں کی عمر مٹ جاتا خوبصورت سا گھر گریست ملتا ہے ۔ ہاتھوں میں کام کرنے کی سکت ہو جاتی ہے ۔ کام ملتا ہے ۔ جب ہم گندی نالی کے کیڑے بن جاتے کھلی فضا میں دی جاتی ہیں ۔ اسی لئے شاید ہم سب عادی مجرم ہیں دو وقت روزی کی بھی عمر ہوتی ہے ۔ بھوک کی بھی عمر ہوتی ہے جیسے گھر کی بھی ایک عمر ہوتی ہے ۔ اب شام لال کو ہی دیکھ لو ۔ چالیس سال سے اوپر عمر اور ایک کم سن سی بیوی ۔ جوانی کی عمر تو دو سو روپے تنخواہ ، ماسٹری بزرگوں کی عیال داری کو سنبھالتے نکل گئی ۔ بھوک کے جنجال میں کون اپنی سپنکیا ۔ ڈگریاں ، شرافت ۔ دیانتداری اور لگن ریاض تو اب تو کہانیوں کی بات رہ گئی ۔ بات دولت اور رتبے کی ہے ۔ عمر کون ہے ، سوکھا سڑا چالیس سالہ جسم کون دیکھتا ہے ۔ ایک ہزار تنخواہ ہوئی کچھ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ۔ سماج کی ریت روایت ہی یہی ہے ۔ اب کون ہے ۔ سماج یا شام لال جناب ایک بڑا افسر ہونے کے باوجود شام لال ماسٹر پکارا جاتا ہے ۔ کبھی کبھی پیشہ بھی ذات کے ساتھ چپک سا جاتا ہے !

اب میرے قریب کی بند کھڑکی کی روشنی بجھ گئی ۔ لمبی باتیں ۔ لمبی باتیں لمبے عشق ۔ لمبی باتیں جھوٹی ہوتی ہیں ۔ پیار کی کوئی تشریح نہیں ۔ من سچا ہو ۔ تو آدھی بات سے پوری بات کا پتہ چل جاتا ہے ۔ کچی سوچوں کی گرفت بڑی ڈھیلی ہوتی ہے اور ادھوری کہانیوں کے نام بڑے خوبصورت دفنی خوشی سے زمانے کی عمر تک دھارا تو نہیں بدلی جا سکتی ۔ بند کھڑکی کی روشنی کا دائرہ تو تنگ ہو گا ہی ، وہ چاندنی رات کی وسعت تو نہیں بن سکتی ۔ سوچا اور اپنی ذات کے بند کواڑوں کے اندھیروں میں جھانکو ۔ شاید کہیں مسرت کا لمحہ جاگتا ہوا مل جائے اور بند کھڑکی کی روشنی باہر بھاگ آئے !



پی بسی ٹھاکریا
ڈائرکٹر، محکمہ سیاحت، آسام، گوہاٹی

سیاحوں کی جنت
آسام

آسام کی مثال شمال مشرقی خطے میں بھارت کے پاسبان جیسی ہے۔ اس کی محاذی حیثیت نے اسے جدید ہندوستان کی تاریخ میں انتہائی اہم مقام کا حامل بنا دیا ہے۔ یہ ریاست ایک تنگ راستے سے جو شمالی بنگال سے ہو کر جاتا ہے، باقی ملک سے ملی ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے یہ خاصی الگ تھلگ ہے لیکن جداگانہ نہیں۔

اس دھرتی پر قدرت نے اپنے حسن کی جلوہ گری میں بڑی فیاضی سے کام لیا ہے۔ زمانہ دراز سے یہ دھرتی سبھی مذہبوں اور مسلکوں کے لوگوں کا مسکن رہی ہے۔ ان کی ثقافت ملی جلی، منفرد اور شاندار ہے۔ یہاں کے لوگ بڑے خلیق اور ملنسار ہیں۔ اُن کے آداب و اطوار ایک دلکشی رکھتے ہیں جو دامن توجہ کھینچتی ہے۔

دور افتادہ اور الگ تھلگ ہونے کے باوجود اس ریاست تک رسائی دشوار نہیں۔ کلکتے سے جیٹ ہوائی جہاز بمشکل ۵۴ منٹوں میں پورے علم (گوہاٹی) کے سرسبز و شاداب ماحول میں پہنچ جاتا ہے۔ یہاں سے، گوہاٹی جسے باب آسام اور فی الواقع سارے شمال ہندوستان کا باب کہنا چاہئے محض بائیس کیلومیٹر کی دوری پر ہے۔ گوہاٹی ایک بڑا قدیم شہر ہے۔ اس کا پرانا نام پراگ جیوتش پور ہے۔ علم و صنعت کے اس مرکز کی اہمیت آئے دن بڑھتی جا رہی ہے۔ دریائے برہم پتر کے کنارے آباد شہر گوہاٹی میں گوہاٹی یونی ورسٹی کے علاوہ علم و دانش کے اور بھی بے شمار ادارے ہیں۔ یہاں ہائی کورٹ ہے، چڑیا گھر اور عجائب گھر ہیں۔ گاندھی منڈپ ہے تیل صاف کرنے کا کارخانہ ہے اس کے اطراف میں سیر و تفریح اور پکنک کے کئی مثالی مقام ہیں۔ مثلاً کاماکھیہ، بھوبنیشوری، اُمانند، چندرپور، چنڈبی وغیرہ۔

اگر آپ کے پاس وقت ہو تو آپ گوہاٹی سے شوال ک... ہیں۔ یہ مقام اپنے ریشمی پارچات کے لئے بڑا مشہور ہے۔ ... کو لوٹتے ہوئے آپ ہاجو اور پوا مکہ بھی جا سکتے ہیں۔ ان مق... کی زیارت کے لئے ہندو مسلمان اور بودھی سبھی ملکوں کے ... تعداد میں آتے ہیں مغرب کی طرف مزید آگے ایک چھوٹا ... باڑی ہے یہاں سے بنے کاسنے کے خوبصورت برتنوں ... دور دور تک ہے۔

آسام میں سیاحت کی سہولت کا ایک سبب قومی شا... یہ لگ بھگ آسام کے سبھی قصبوں سے ہو کر گزرتی ہے۔ ... ماحول میں اس قومی شاہراہ پر سفر ذہن پر انمٹ نقوش چھ... احساس میں ایک نئی لہر پیدا کرتا ہے۔

گوہاٹی سے چلیں تو ۶۵ کیلومیٹر کی دوری پر جگی روڈ ریشم کا کارخانہ دیدنی ہے۔ مزید ایک سو بیس میل آگے تو گو... سے پہلے، جنگل یا لاہو میں مچھلیوں کی سرکاری پرورش گا... ہیں۔ نوگانگ سے مزید ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد آ... جائیں گے۔ کازی رنگا اپنی جنگلی جانوروں کی پناہ گاہ کے ... توجہ کا طالب ہے۔ جنگلی جانوروں کی یہ پناہ گاہ، جسے ... کا درجہ دیدیا گیا ہے، دریائے برہم پتر کے کن رے ایک ... میل علاقے کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ شمالی مشرقی ہند... جنگلی جانوروں کے نظارے کے لئے اس سے بہتر کوئ... اس پناہ گاہ میں ۱۳ قسم کے جانور ۱۸۸ قسموں کے ... قسموں کے سانپ وغیرہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان ... دالا گینڈا، ہاتھی، ارنا، بھینسا، ہرن وغیرہ شامل ہ... جانوروں کا نظارہ ہاتھی پر سے کیا جاتا ہے۔ سواری ... نظارے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ طرح طرح ... آسام کی دوسری پناہ گاہوں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں ... جو گوہاٹی کے شمال مغرب میں ۱۷۶ کیلومیٹر کے فاص... بعض کمیاب نسلوں کے جانور دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان ... سنہرے لنگور، ارنا بھینسا، گینڈا وغیرہ بالخصوص ... ہاٹے کوہ۔ بھوٹان سے نکلنے والا دریا مناس ... تین شاخوں مناس، باکو آ اور بیکی میں منقسم ہو جا... میں مچھلی کے شکار کے بڑے امکانات ہیں۔ ممکن ... شکار کھیلتے ہوئے ۳۵ پونڈ کی مہاشیر مچھلی آپ ... سوچئے تو ایسے میں آپ کی خوشی کا کیا عالم ہوگا۔

اب کازی رنگا سے آگے چلے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد آپ جورہٹ پہنچ جائیں گے۔ یہاں ٹوکلائی تجرباتی مرکز، زراعتی کالج اور ریجنل ریسرچ لیباریٹری دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ ممکن ہے یہاں تک پہنچتے پہنچتے آپ کار یا منی بس کے سفر سے اوب جائیں تو کشتی کے سفر کا لطف لیں۔ نیماتی گھاٹ مجولی جائیں۔ مجولی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا دریائی جزیرہ ہے۔ یہاں کے مذہبی مرکز اس اعتبار سے خصوصی کشش رکھتے ہیں کہ یہ آسام کے فن و ثقافت کے اہم مرکز بھی ہیں۔ یہاں کے رقص کتھاکلی کی طرح ایک اپنا جداگانہ رنگ و آہنگ رکھتے ہیں۔ وہ پُرسکون ماحول بھی اپنے اندر بے پناہ جاذبیت رکھتا ہے، جس میں یہ رقص پیش کیے جاتے ہیں۔

آگے چلیں تو سب ساگر جا پہنچیں گے۔ آہوم راجاؤں کی راجدھانی سب ساگر عہدِ رفتہ کی عظمتوں کا آئینہ ہے سب ساگر، بے ساگر کی جھیلیں۔ شوڈول مندر، تالاتال گھر، زمین دوز قلعہ، جس کی سب سے نچلی منزل دیکھو دریا کے کنارے سے متعلق ہے، رون گھر، کرن گھر اور دوسرے بے شمار کھنڈرات و آثار سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ مقام ماضی میں شاندار ثقافت رکھنے والے ترقی یافتہ لوگوں کا مسکن تھا۔

آپ کا اگلا پڑاؤ ڈبروگڑھ ہے۔ یہ قصبہ چائے کے لیے مشہور ہے۔ یہاں آپ دیکھیں گے کہ انسان برہم پتر کی تباہی لانے والی موجوں سے جدوجہد آزما ہے اور اپنی بقا کے لیے کس طرح کوشاں ہے۔ قومی شاہ راہ برہم پتر کے شمالی کنارے کے ساتھ ساتھ بھی چلتی ہے۔ اور بعض اہم قصبوں کو ملاتی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر قصبہ تیج پور ہے۔ یہ خوبصورت شہر دریائے برہم پتر کے کنارے آباد ہے۔ یہ بڑا قدیم شہر ہے۔ تیج پور اور اس کے نواح میں عہدِ ماضی کے آثار اور یادگاریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن آسام محض یادگاروں اور آثاروں کی دھرتی نہیں۔ یہاں صنعت کاری کا عمل دخل بتدریج بڑھتا جا رہا ہے۔ ڈگ بوئی میں تیل صاف کرنے کا کارخانہ ہے۔ آزادی کے بعد تیل کے نئے کنویں کھوج نکالے گئے ہیں۔ تیل صاف کرنے کا دوسرا کارخانہ ۱۹۶۱ء میں گوہاٹی میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا سرکاری کارخانہ ہے۔ نامروپ میں کھاد کا کارخانہ بہتر کھیتی باڑی کی سمت میں ایک اہم اقدام ہے۔ چگی رو ڈ میں ریشم، سلہٹ میں پٹ سن، دیرگاؤں میں شکر اور بوکاجان میں سمنٹ بنانے کے کارخانے ہیں۔ بالائی آسام میں پلائی ووڈ تیار کرنے کے متعدد کارخانے ہیں۔ یہ نہ صرف آسام کی معیشت کی اہم کڑیاں ہیں بلکہ ملک کے لیے شدت سے مطلوب زرِ مبادلہ حاصل کرنے کے ذریعے بھی ہیں۔

اب اپنی سیاحت کی سہولتوں کی بات گوہاٹی، شیلانگ (میگھالیہ) کازی رنگا، ہفلانگ اور سب ساگر میں معقول معیار کے ٹورسٹ لاج ہیں۔ بعض دوسرے مقامات پر ریسٹ ہاؤس بھی ہیں۔ آمد و رفت کی سہولتیں گوہاٹی اور کازی رنگا میں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ سیر و سیاحت کے لیے بسیں، آرام دہ اور باکفایت رہتی ہیں۔ سیر و سیاحت کی معلومات فراہم کرنے والے دفتر گوہاٹی، شیلانگ، کازی رنگا، جورہٹ اور کلکتہ میں ہیں۔ سیاح ان سرکاری دفتروں کی خدمات سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

قابلِ دید مقامات —

مشرقی ہند

سارناتھ: وارانسی سے متصل۔ یہاں گوتم بدھ نے پہلا وعظ کیا تھا۔ استوپا میں مہاتما بدھ کے تبرکات محفوظ ہیں۔

وارانسی: ہند کے آباد شہروں میں قدیم ترین اور شیومت کے ماننے والوں کا مقدس ترین شہر۔

بودھ گیا: یہاں مہاتما گوتم بدھ کو ایک پیپل تلے نروان حاصل ہوا تھا۔

بہار کے دیگر مقدس بودھی استھان: گیا، ویشالی۔ نالندہ۔ راج گیر

پوری: پورا شہر جگن ناتھ جی کے مندر کی توسیع ہے۔

شیلانگ: میگھالیہ اور آسام کی راجدھانی۔ پُرفضا پہاڑی مقام۔

دارجلنگ: ہندوستان کا حسین ترین پہاڑی شہر۔

پٹنہ: بہار کی راجدھانی جہاں موریہ اور گپتا عہد کے پاٹلی پتر کے آثار بھی موجود ہیں۔

کلکتہ: مغربی بنگال کی راجدھانی۔ بنگال علم و فن کا مرکز۔ ملک کا سب سے بڑا شہر

شانتی نکیتن: جہاں شاعرِ اعظم رابندر ناتھ ٹیگور نے وشوا بھارتی یونیورسٹی قائم کی

بھوبنیشور: پوری سے متصل اڑیسہ کی راجدھانی۔ یہاں کے مندروں کی فن کاری عدیم المثال ہے۔

رانچی: بہار کا پُرفضا پہاڑی مقام

کونارک: سورج دیوتا کا مشہور مندر جو ایک رتھ کی شکل کا ہے۔ پہیوں کی نقاشی قابلِ دید ہے

محمد عبدالقادر ادیب
اسسٹنٹ کمشنر، مزراعی لینڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ بلڈنگ کمپے گوڈا روڈ بنگلور



حسن بنگلور غزل ہے کہ رباعی کا جلال
جس کے ہر مصرعۂ موزوں سے جھلکتا ہے جمال
جس کے ہر لفظ میں پوشیدہ ہے حافظ کا خیال
جس کے ہر حرف میں غالب کے تخیل کا کمال
کسی شاعر کا ترنم ہے کہ رعنائی ہے
استعارے ہیں کہ تشبیہ کی گیرائی ہے

باغ حیدر[1] میں ہے سمٹی ہوئی یاد بہار
حیدر ٹیپو[2] میں رہا آکے ہر اک گل پہ نکھار
سر مرزا[3] میں نکھرا اور بھی حسن گلزار
ہیں عزیز[4] اور علی[5] بھی تری عظمت پہ نثار
تری تعمیر میں کینگل[6] کی توجہ کے نشاں
اے سودھا[7] تو مرے بنگلور کی ہے روح رواں

ترا پیکر ہے کھنکتا ہوا خیام کا جام
ترے نام آتے ہیں ہر روز اجنتا کے سلام
ترے ہر نقش میں بیلور[8] کا ہے نقش دوام
ترے ہر زاویۂ خط میں ہے مانی کا پیام
رنگ ہے نور ہے نکہت کی فراوانی ہے
ساری دنیا ترے اس حسن کی دیوانی ہے

تری آنکھوں میں ہے ہمپی[9] کی دل آویز چمک
بیل گولا[10] کی ضیا، بولتی گنبد[11] کی جھلک
برندابن[12] ہے ترے روپ کی مسکاتی دھنک
تاج کی طرح دمکتے ہیں ترے نوک پلک
تو سراپا ہے مہکتے ہوئے گلشن کی طرح
بلکہ اُبٹن سے نہائی کسی دلہن کی طرح

ترے انفاس میں گلہائے ہنر کی ہے پھبن
فن مغرب کی بھی ہے تجھ میں ضیا پاش کرن
جدت عقل جواں سال بھی ہے سایہ فگن
اور ہنستا ہوا ملتا ہے یہیں طرز کہن
ترے پیکر میں ہر اک رنگ کی رعنائی ہے
ایک اک نقش میں فردوس کی برنائی ہے

تجھ سے چلتا ہے بصد شان حکومت کا نظام
ترے ہاتھوں میں ہیں دستور و قوانین کے جام
تری باہوں میں لپکتے ہوئے آتے ہیں عوام
عدل و انصاف کا پیغام ہے تو نام بنام
ترا مداح ہوں کب سے مرے بنگلور کے تن
نذر کرتا ہوں ترے نام یہ منظوم خراج

---

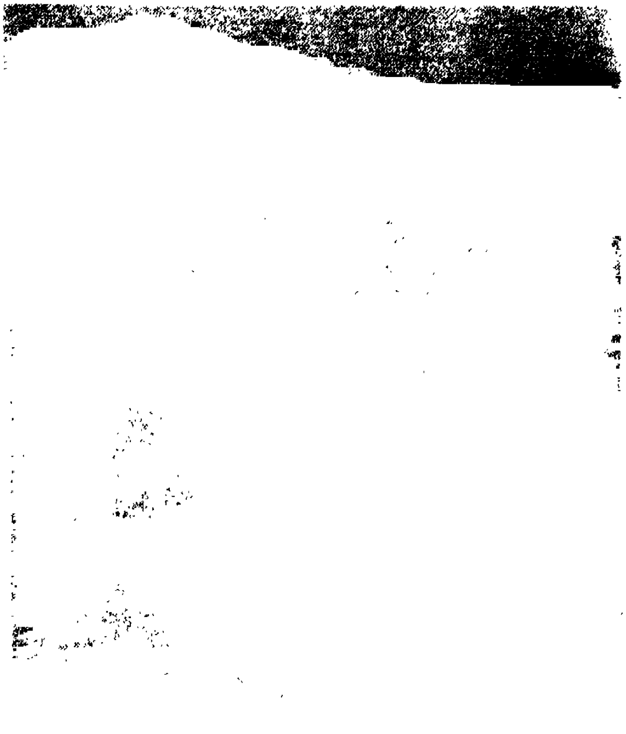
۱ حیدر علی خاں والیٔ ریاست میسور ۲ ٹیپو سلطان شہید ۳ سر مرزا اسمٰعیل، سابق دیوان ریاست میسور ۴ عزیز سیٹھ وزیر لیبر، مواصلات و اوقاف ریاست میسور ۵ محمد علی ایم۔ ایل۔ اے سابق وزیر مواصلات ریاست میسور ۶ لینگل ہنمنتیا ایم پی سابق چیف منسٹر ریاست میسور جنہوں نے ودھان سودھا کی عمارت بنوائی ۷ ودھان سودھا۔ عمارت کا نام ہے جس میں بابِ حکومت کے علاوہ اسمبلی ہال اور لیجسلیٹو اسمبلی ہال بھی ہے۔ جہاں اسمبلی اور لیجسلیٹو کے اجلاس ہوتے ہیں۔ ۸ بیلور جہاں کے منادر جنوب کی اجنتا سمجھے جاتے ہیں۔ اور فن سنگ تراشی کے اعلیٰ نمونے پیش کرتے ہیں ۹ ویجانگر کی راجدھانی، جہاں راجاؤں کے قدیم محلات کے

۱۰ گومٹیشور جہاں مہاویر کا ۵۷ فٹ بلند تہ بالا مجسمہ ہے جو جین مت کے ماننے والوں کی زیارت گاہ ہے ۱۱ گول گنبد جو ہفت عجائبات میں شمار ہوتا ہے، اسی ریاست کے ایک ضلع بیجاپور میں ہے۔ ۱۲ شہر میسور سے چند میل دور پر ایک باغ ہے جو خوبصورتی کی وجہ سے جنت ارضی سمجھا جاتا ہے۔

حیدر نایاب
سپرنٹنڈنگ انجینئر پبلک ہیلتھ سرکل ڈاکخانہ سنبل پور اڑیسہ

کوراپٹ

(اڑیسہ کا ایک شہر جو سطحِ سمندر سے ۳۲۰۰ فٹ اونچائی پر واقع ہے)

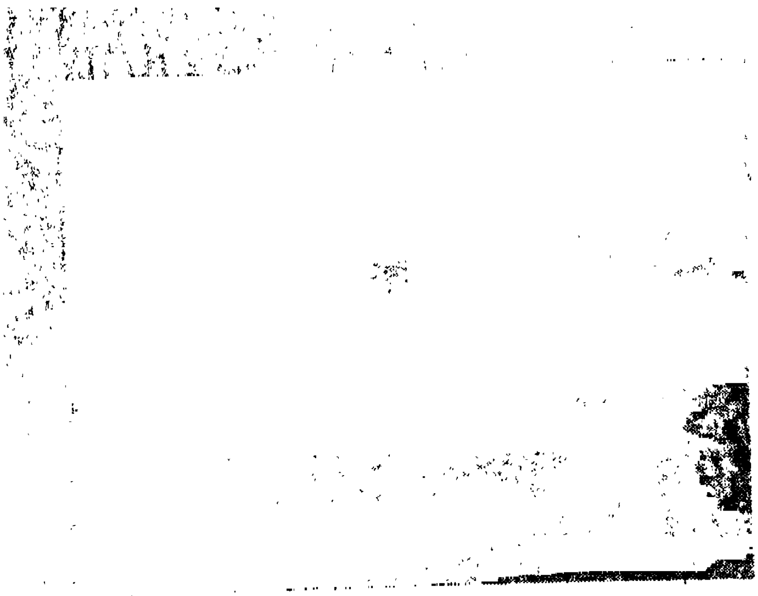


کوراپٹ کے قریب ایک آبشار

اے کوراپٹ!
اے اڑیسہ کے حسین و دلکش و جاں آفریں شہرِ عروج
تو مجسم حسنِ فطرت اور قدرت کا کمال
موسموں کا مرکزِ جشن و سرود
لالہ و گل، سنبل و ریحاں کا گلزارِ حسیں
رنگ و بو کی جگمگاتی انجمن
گنگناتی، جھومتی، گاتی فضاؤں کی خنک آماجگاہ!
برف باری ترے آنگن میں کبھی ہوتی نہیں
پھر بھی فطرت نے کیا ہے کس قدر آب و ہوا کو دلنشیں و پُر بہار
تیرے آگے پیچھے بل کھاتے پہاڑی راستوں کے پیچ و خم
جیسے کوئی رینگتی لہرا تی ناگن
دیکھ کر جس کو دہل جائے کسی ناآشنا رہ گیر کا معصوم دل،
سبز اور شاداب ٹیلوں کا نظارہ
پردۂ تخئیل پر کرتا ہے ثبت
سحر آگیں اور بے پایاں نقوش
اور جس جانب بھی اٹھتی ہے نظر
اک نہ اک پہلوئے حسنِ یار کی پاکر جھلک
دل کی ننھی سی کلی ہوتی ہے بے خود سرنگوں
تیری آغوشِ جواں پر
کتنا دلکش دھوپ کا ہوتا ہے عکس
چودھویں کی چاندنی خود کر رہی ہو جیسے رقص،
لہلہاتے کھیت تا حدِ نگاہ
گوشِ فطرت میں لٹکتی دھان کی وہ بالیاں
جن پہ ساون کی پھواریں زمزمہ خواں
اور پانی سے چھلکتی چھوٹی چھوٹی خستہ قیں
سبز چادر پر بچھے ہوں جیسے موتی بے شمار
اپنے افسوں سازِ نظاروں کی جاں
جیسے سونے پر سہاگا
بیٹیاں فطرت کی چہروں پہ لیے، وہ بے بہا معصومیت
جو عطا کرتی ہے ان کو اک مقامِ پُر وقار
کھیت میں باندھے قطار
آبیاریٔ نخلِ ارماں کی کہیں کرتی ہوئی
ایسی لگتی ہیں کہ جیسے
وادیٔ دل میں تمناؤں کا نقشِ پُر فریب!
الغرض، اے ارضِ کوراپٹ
تو اڑیسہ کی ہے زینت، حسن کی تصویر ہے۔
تو مرا شملہ ہے، نینی تال ہے، کشمیر ہے!

نہ آدی باسی دوشیزائیں۔

رم بکھرولوی
پل گورنمنٹ ہوسٹ آفس ریلوے کیمپس، پٹھان کوٹ



شملہ، کُلو اور منالی

ہماچل پردیش جمہوریہ ہند کا نیا اور اٹھارہواں صوبہ ہے۔ اسے
اور بر بھارت کا مکٹ کہا گیا ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے بھارت متضاد
یں اور دلفریب مناظر کا گھر ہے۔ لاتنا اس کے مکٹ یعنی تاج کی شان
اہی ہوگی تاہم بہت کم لوگوں کو پُرسکون قدرتی نظاروں، حسین و جمیل
یوں، گہری نیلی جھیلوں، شور مچاتے گرتے جھرنوں، گھنے جنگلات،
بلتی ندیوں اور برفانی پوشاک پہنے کھڑی فلک بوس چوٹیوں کو
سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

پردیش کے مشہور اور خوبصورت مقامات کی فہرست کافی طویل بن
تی ہے۔ مگر اس مضمون میں ہم صرف تین خوبصورت ترین جگہوں کا
ذکر کریں گے۔ دراصل یہ وہی اہم مقامات ہیں جنہوں نے پچھلے چند سالوں
سیر و سیاحت کے شوقین طبقہ کو خوب تیزی کے ساتھ اپنی طرف کھینچا ہے
ان سب میں مقدم ہے شملہ۔ ویسے تو شملہ پردیش کا ایک ضلع ہے مگر
برتری کا بڑا سبب یہ ہے کہ شملہ ہماچل پردیش کی راجدھانی
ہے پچھلی دو صدیوں سے یہ شہر ہندوستان بھر کا صحت افزا مقام
آرہا ہے۔ کوہ ہمالیہ کے ابھرے گداز سینے پر "اندر پوری" کی مانند
ہے شملہ۔ اس کی کھوج اور آبادی کا سہرہ بلاشبہ انگریزوں کے
ہے۔ ایک لمبے عرصے تک یہ جگہ فرنگی حاکموں کی موسم گرما کی راجدھانی
ہے۔

شملہ بھارت تبت قومی شاہراہ پر سطح سمندر سے ساڑھے سات
ٹ کی بلندی پر بسا ہوا ہے۔ دلی سے یہ مقام صرف ۳۴۰ کلو میٹر دور
سفر کے لیے ریل اور سڑک دونوں ذرائع دستیاب ہیں۔ پردیش

نئی دہلی

شملہ

کے تقریباً تمام مشہور مقامات اور تمام تر ضلعوں کے صدر مقامات شملہ
سے بذریعہ سڑک ملحق ہیں۔ دلی سے کالکا تک ریل کی بڑی پٹری کی
لائن ہے۔ آگے چھوٹی پٹری کی ریل جاتی ہے۔

کالکا سے شملہ تک چھوٹی پٹری کی ریل بچھانے کا کام انتہائی جوکھم
کا کام تھا کیونکہ یہ لائن ایک سو سات سرنگوں میں سے گزر کر شملہ پہنچتی ہے۔
سڑک کی نسبت ریل کے ذریعے سفر کرنے میں زیادہ وقت لگتا ہے مگر
ریل کے سفر کے اپنے ہی فوائد ہیں۔ قدرت نے پہاڑوں پر کیا کیا دلآویزیاں
اور بخششیں عطا فرمائی ہیں یہ دیکھنے اور محسوس کرنے کے لیے ہمیں کالکا
سے شملہ تک ریل یاترا کرنی ہی چاہیے۔

شروع شروع میں جب شملہ آباد ہونے لگا تو برٹش سرکار کے اعلیٰ
حاکموں کے دفاتر اور قیام گاہیں یہاں بننا شروع ہوئیں۔ ان سب میں
قدیم عمارت شاید کنیڈی ہاؤس ہی ہے جہاں آج کل ہماچل سرکار کے
چند محکمہ جات کام کر رہے ہیں۔ دوسری مشہور عمارت ہے ہنگلک کیل جسے
آج کل گرانڈ ہوٹل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ "آک لینڈ ہاؤس" میں لیڈی کیپ
کا اسکول بن گیا ہے اور سٹرابیری ہل اور بارنس کورٹ میں اب ہماچل
بھون واقع ہے۔ "پیٹر ہاف" اور "رٹریٹ" جیسی شاندار عمارتیں اپنی داستان
آپ بیان کرتی ہیں۔ ان محلات سے وابستہ ہے لارڈ امہرسٹ سے
لے کر ہندوستان کے آخری وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن تک
کا شملہ میں یادآفریں قیام۔ "رٹریٹ" یعنی موجودہ راشٹرپتی بھون کی شان
نرالی ہے۔ اس کے چاروں طرف مخملی گھاس کے میدان ہیں اور بھانت
بھانت کے پھولوں کی دلآویز کیاریاں ہیں۔ دور سامنے کھڑی ہیں برف

[illegible] پاس چوٹیاں۔ جب پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی ہماچل کو مکمل صوبہ قرار دینے کے سلسلہ میں شملہ میں آئیں [illegible] میں تقریب فرما ہوئی تھیں۔ جن لوگوں کو فن مصوری اور فوٹوگرافی کا شوق ہے ان کے لئے [illegible]۔ بلاشبہ ایک نایاب جگہ ثابت ہوگی۔ عمارت کی بالائی منزل پر کھڑے ہو کر اگر آپ ڈوبتے سورج کا ملاحظہ کریں گے تو شفق کی شام بھی اس کے آگے پھیکی پڑ جائے گی

مال روڈ کے بائیں طرف نیچے اناڈیل کا خوبصورت میدان ہے۔ جہاں کسی زمانہ میں فوجی افسران پریڈ کیا کرتے تھے اور کھیل کود کا انتظام تھا آج کل وہاں ہیلی کاپٹر اترتے ہیں۔ اسی راستے میں "چلمن" نام کا ایک مشہور چشمہ بھی ہے۔ بڑی سڑک کے دائیں طرف پہلے ودھان سبھا کی عمارت ہے۔ پھر آل انڈیا ریڈیو کی شملہ برانچ کا دفتر۔ اور ذرا آگے چل کر گھنٹری ہے شملہ کی ایک اور عظیم ترین بلڈنگ "گارڈن کاسل" جہاں ہماچل پردیش، پنجاب، ہریانہ کے اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفاتر کام کر رہے ہیں۔ تھوڑی دور آگے چلنے پر یہ سڑک دو حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک شاخ اس میدان کی طرف بڑھ جاتی ہے جہاں عموماً پبلک اجلاس وغیرہ منعقد کئے جاتے ہیں جہاں پردیش کے مکھیہ منتری اور راجیہ پال سال میں ایک ایک مرتبہ بالترتیب عوام سے خطاب کرتے ہیں۔ اسے گرجا کا میدان کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے ایک کونے پر گرجا گھر کی پرانی عمارت میدان کی نشان دہی کر رہی کھڑی ہے جہاں سے سڑک دو حصوں میں بٹتی ہے اس جگہ کو اسکینڈل پوائنٹ کہا جاتا ہے۔ اس نام کی اپنی ہی ایک کہانی ہے ایک عجیب سی وجہ تسمیہ ہے جس کا مذکور یہاں مقصود نہیں تاہم اس جگہ پر لالہ لاجپت رائے جی کا ایک قد آور بت نصب کیا گیا ہے۔ جو ہمیں لالہ جی کی قوم اور ملک کی آزادی کے تئیں قربانیوں کی یاد دلاتا ہے۔

شملہ کے دوسرے کونے پر ڈینس فولی اور رٹریٹ جیسی خوبصورت جگہیں ہیں جہاں خاص خاص پایہ کے مہمان V.I.P. اور سیلانی ٹھہر سکتے ہیں یہاں سے چھ میل کے فاصلے پر ایک اور شاندار بلڈنگ "وائلڈ فلاور ہال" ہے یہاں پر تمام سیلانیوں کے قیام اور کھانے پینے کا خاطر خواہ بندوبست رہتا ہے۔ اس مقام سے تھوڑے فاصلے پر کفری نام کی جگہ ہے۔ جہاں موسم سرما میں اسکیٹنگ کا پروگرام رہتا ہے اور بہت سے شائق شہری اور دیگر سیلانی اس موسمی کھیل میں شرکت کے لئے وہاں پہنچتے ہیں۔

جب آپ شملہ میں قیام پذیر ہوں تو آسانی سے چند اور گرد و نواح کے خوبصورت مقامات کی سیر کر سکتے ہیں۔ ان میں مشہور یہ ہیں۔ پھاگو، مشوبرا، تتا پانی، نارکنڈہ، چیل، سولن، کسولی، سباتھو اور ڈگشائی۔

شملہ کی دستکاریوں میں خاص چیز یہاں کے "لکڑی کے کھلونے" ہیں یا پھر خوبصورت چھڑیاں۔ یہ کھلونے صنوبر کی دیر یا لکڑی کو استعمال کر کے بنائے جاتے ہیں اور کاریگر جنگل سے بڑھیا اور پختہ شاخوں کو کاٹ تراش کر انہیں کھلونوں یا چھڑیوں کی شکل میں ڈھال لیتے ہیں باہر سے آنے والے سیلانی انہیں بڑی تعداد میں خرید کر کے سوغات لے جاتے ہیں۔

شملہ کے بعد دوسرا مقام میری نظر میں کلو کا ہے۔ کلو کو مقامی آدمیوں نے دیوتاؤں کی وادی کہا ہے۔ اس میں مبالغہ نہیں ہو سکتا۔ کلو کی خوبصورتی لاثانی ہے۔ یہاں کے ذرے ذرے میں حسن ہے۔ یہاں کے باغات میں سال بھر بہار رہتی ہے اور تمام وادی میں جگہ جگہ میلوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ یہاں کے سادہ لوح باشندے ناچنے گانے کے بعد رسیا ہیں۔ عورتیں اور مرد دونوں ناچتے گاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ان کے کے ہر قول میں تغزل ہر فعل میں ترنم چھپا رہتا ہے۔ دور حاضرہ کے جدید ترین لوازمات زندگی یہاں کی پُرسکون فضا کو ابھی پراگندہ نہیں کر پائے ہیں۔ قدرت کی گود اور سرسبز وادی میں بسے دیہات اگرچہ کئی لحاظ سے پسماندہ ضرور ہیں مگر لوگوں کے چہروں پر ایک انوکھا سکون ہے۔

چند صدیاں گزریں کہ کلو ایک مشہور پہاڑی ریاست تھی۔ اس کی پرانی راجدھانی نگر تھی۔ جو کہ کلو منالی سڑک پر واقع کٹرائن قصبے کوئی تین کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے بیاس کے بائیں کنارے پر آباد ہے۔ نگر ایک خوبصورت پہاڑی گاؤں ہے۔ یہاں پرانے وقتوں کے بنے دو مشہور مندر ہیں۔ ایک ہے دیوی ترپوری سندری کا اور دوسرا شیو جی کا۔ ٹھہرنے کے لئے ڈاک بنگلے ہیں۔ دیودار کے گھنے جنگلات کے بیچوں بیچ مقامی سیرگاہیں بھی ہیں۔ اور شکار کھیلنے والوں کے لئے تھوڑے فاصلے پر شکارگاہیں بھی موجود ہیں۔ جو لوگ مچھلی پکڑنے کے شوقین ہیں وہ نگر نہ جا کر کٹرائن ہی ٹھہر جاتے ہیں۔ کٹرائن دریائے بیاس کے دائیں کنارے پر ایک خوبصورت قصبہ ہے۔ ندی کے اس حصہ میں ٹراؤٹ TROUT مچھلی بکثرت دستیاب ہوتی ہے۔ قیام کے لئے ایک عمدہ ڈاک بنگلہ اور شاندار ریسٹ ہاؤس ہیں۔

جی ہاں یہ نگر وہی مقام ہے، جہاں ایک صوفی منش روسی فنکار ملک بدر ہو کر کوہ ہمالیہ کی پُرسکون فضاؤں میں آ کر رہ گیا کیونکہ اس نے سمجھ لیا کہ دھرتی پر واقعی اگر کہیں جنت ہے تو یہیں ہے اور یہیں ہے ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد کاؤنٹ رورک بھارت آیا تھا اور تب وہ در بدری کے اس مقام تک آ پہنچا اور پھر بس گیا اپنا سب کچھ۔ اپنا دیش اپنی قوم اس کے ہاتھ میں وہ جادوئی قلم رہ گیا تھا جس کے ذریعہ سے اس ماہر فن نے کوہ ہمالیہ کی عظیم خوبصورتی کو کینوس پر اتار دیا۔ اپنے اس

ریاض کو وہ قدرت کی پرستش کرنا گردانتا تھا۔ بعد ازاں اس کے بیٹے شری سویتوسلاؤ رُورک نے بھی وراثت میں ملے اس فن کو کمزور نہیں ہونے دیا۔ آگے چل کر مشہور فلم اسٹار شریمتی دیویکا رانی نے انہیں رُورک صاحب سے شادی کی اور نگر میں اپنے سسر اور خاوند کی چیدہ چیدہ پینٹنگز کی ایک بڑھیا گیلری تعمیر کروائی جسے یہاں "رورک کا ہال" کہہ کر پکارا جاتا ہے یہی وہ اعلیٰ شان عمارت تھی ہے۔ جہاں کبھی یہ لوگ باقاعدگی سے قیام پذیر تھے مگر اب تو یادیں ہی باقی ہیں۔ اور دیویکا رانی جی اپنے خاوند کے ساتھ بنگلور میں رہائش پذیر ہیں۔ تاہم سیلانی لوگوں کے لیے نگر کا یہ "پینٹنگز ہال" ہمیشہ کھلا ملتا ہے۔ جونہی آپ ہال سے باہر آتے ہیں۔ تو شمال کی جانب والے دروازے کے سامنے ایک چبوترا نما چٹان پر نگاہ ٹھہرتی ہے۔ مگر چبوترے کو ہرگز تراش کر نسب نہیں کیا گیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے بالکل قدرتی طور پہ بنا ہوا ہے۔ اصل میں یہ رورک مرحوم کا مقبرہ ہے۔ مگر اس کا علم تبھی ہوتا ہے جب آپ وہاں دیوناگری لپی میں موجود تحریر کو پڑھتے ہیں۔ وگرنہ تو یہ بھی فن کا ایک بڑھیا نمونہ ہے۔ سمادھی کے اس فن کو کوئی کلاکار یا ادیب ہی سمجھ سکتا ہے۔

کلو وادی کا ایک اور خوبصورت مقام منالی ہے۔ منالی اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے بلاشبہ "پہاڑوں کی ملکہ" مانی جاتی ہے۔ پرانوں کے لحاظ سے یہ وہ مقام ہے جہاں منو مہاراج نے مشہور و معروف سمرتی کی تخلیق کی تھی۔ ایک دیگر روایت کے مطابق یہ بھی مشہور ہے کہ ... یا مانشیہ (انسان) نے پہلے پہل یہیں پر جنم لیا تھا۔ روایتوں کی سچائی سے یہاں بحث نہیں تاہم منالی کی خوبصورتی سے کسے انکار ہوگا بس یوں سمجھیں کہ قدرت نے بے حد فیاضی سے کام لیا ہے حسن کو بکھیرنے میں۔

چاروں طرف برف سے ڈھکے پرسکون پہاڑ، دامن میں بہتی بیاس ندی، پیشانی کو چومتا روہتانگ کا درّہ اور بیاس کنڈ کے مچلتے جھرنے ... سینے پر ابھرے دیودار کے گھنے جنگلات ... بغل میں وششٹھ کے گرم پانی کے چشمے ... اس کے قدم کٹرائن کے سینے میں پیوست ہیں اور اس کی کمر پر یا دیگر درمیانی حصہ پر سرسبز و شاداب باغات ہیں جن کے میٹھے پھلوں کو کھا کر اور مدھر ہواؤں کو دیکھ دیکھ یہاں کے عورت مرد ایک منفرد خوبصورتی اور خوش مزاجی کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ سیبوں کی مانند سرخی مائل بھرے بھرے چہرے اور گلابی ہونٹ اجنبی نگاہوں کا مرکز بنے بغیر نہیں رہتے۔ یہاں کے گبھرو (نوجوان) خوب چھیل چھبیلے اور ناچنے گانے کے شائق ہیں تو دوشیزائیں گنگا جل کے سمان پاکیزہ اور پوتر۔ کئی بار باہر سے آئے سیلانی غلط فہمی کا شکار ہو کر کوئی ناقابلِ برداشت حرکت کر گزرتے ہیں، تو زندگی بھر ملال رہتا ہے۔

منالی میں پانچ پانڈو پدھارے تھے، ایسا مانا جاتا ہے۔ اس کا تواریخی ثبوت ہے یہاں پر بنا پگوڈا ڈیزائن کا وہ قدیم مندر جسے ڈھونگری کا مندر کہتے ہیں۔ ایک اور قدیم مندر یہاں سے آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر جگت سکھ کے گاؤں میں واقع ہے جو سندھیا گایتری کے نام سے موسوم ہے۔ اسے بھی پانڈووں کے عہد کا بنا بتایا جاتا ہے۔

وادی کلو میں تقریباً بارہوں مہینے میلوں ٹھیلوں کی بھرمار رہتی ہے۔ ٹھیٹھ سردیوں میں بھی جب یہاں کی سرزمین نیا پیرہن دھارن کرتی ہے اور پہاڑ بھی پوشاک بدلتے ہیں۔ کلو میں بھاگل کے میلے شروع ہو جاتے ہیں۔ تبھی آ جاتا ہے موسم بہار اور بسنت پنچمی کے میلے لگتے ہیں۔ منالی میں بیساکھی کے بعد ماہ مئی میں ایک بھاری میلہ لگتا ہے جو یہاں عرفِ عام میں "بسنت کا میلہ" کہلاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ جاڑے کی شدید جکڑ کے بعد اپریل مئی میں جا کر ہی یہاں سورج کی تپش محسوس ہوتی ہے اور انہی دنوں ربیع کی فصل بھی اندر آ جاتی ہے لہٰذا لوگ فارغ البالی کے موڈ میں ہوتے ہیں اور موج منانے ... شرکت کرتے ہیں۔

منالی کو جدید ترین ہل اسٹیشن بنانے میں انگریزوں ... کی اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ سب سے پہلے بینن نامی ایک ... فوجی انگریز افسر نے منالی میں باغبانی کی شروعات کی۔ بعد ازاں ... لوگ بھی اس صحت افزا مقام کی طرف راغب ہوئے مگر منالی کو دنیا بھر کے سیاحت کے نقشہ پر درخشاں کرنے کا سہرا ہمارے محبوب ترین نیتا اور سابق پردھان منتری شری جواہر لعل جی نہرو کے سر ہے۔ ابھی بمشکل بارہ پندرہ سال گزرے ہوں گے کہ منالی کے قدرتی مناظر پہ نہرو جی فریفتہ ہو گئے۔ اور جب بھی انہیں چنداں فراغت ملتی وہ چھٹی کو منالی آ پہنچتے۔ نہرو پردھان منتری ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ ... بھی تھے۔ انکی آخری تصنیف "کچھ پرانے خط" A BUNCH OF OLD LETTERS کو انہوں نے یہیں بیٹھ کر تکمیل دی تھی۔ منالی ... محکمہ جنگلات کا ریسٹ ہاؤس انہیں بے حد پسند تھا لہٰذا وہ جب بھی وادی میں تشریف لاتے تو اسی بنگلے میں قیام کرتے تھے ... بعد ازاں ... پردیش سرکار نے اس بنگلہ کا نام نہرو بنگلہ رکھ دیا ... کی طرف سے اب یہاں بہت سے بڑھیا ... جہاں پر یہاں سیلانی بھاری تعداد میں ... منالی فلم کمپنیوں کی بھی آماجگاہ بنتی جا رہی ہے۔

نند کشور وکرم

تاریخی یادگاروں کی دھرتی

گجرات

سیاسی اکائی کی حیثیت سے ریاست گجرات کی تشکیل یکم مئی ۱۹۶۰ء کو ہوئی۔ ریاست میں سیر و سیاحت اور سیلانیوں کی دلچسپی کے مرکزوں کی ترقی اور فروغ کا کام بنیادی طور پر ریاست کی تشکیل کے بعد ہی شروع ہوا۔

جہاں تک سیلانیوں کی دلچسپی کے مراکز کا تعلق ہے، ریاست گجرات گوناگوں دلچسپیوں کی حامل ہے جنگلی جانوروں کی پناہ گاہ، گیر کے جنگلات، دوارکا اور سوم ناتھ کے منادر، جین مندروں کا شہر پالی تانا، اڈواڑہ میں بنا پارسیوں کا قدیم ترین مندر، نال سرور میں آبی پرندوں کی پناہ گاہ، ہڑپائی تہذیب کا پانچ ہزار برس پرانا مرکز لوتھل، احمد آباد میں ہند اسلامی اسلوب کی تاریخی عمارتیں، سابر متی آشرم، مڈھیرا کا سوریہ مندر اور رسال سمندر پر صحت افزا مقام اپنے اعتبار سے اپنا جواب آپ ہیں، اور سیاحوں کے لئے خصوصی دلکشی کا باعث ہیں۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ یہی مقامات عوام کے بعض خاص طبقوں کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ مثلاً ماضی میں گیر کے جنگلات بھارت میں آنے والے غیر ملکی اکابرین کے لئے ایک شکارگاہ تھے۔ دوارکا اور سوم ناتھ کے مندروں کی زیارت کے لئے ہندو بڑی تعداد میں جاتے تھے۔ دوارکا ہندوؤں کے سات متبرک مقامات میں سے ایک ہے۔ پالی تانا جینیوں کی زیارت گاہ تھا۔ بہرحال ریاست کی تشکیل کے بعد سے اب اس ضمن میں ریاستی سرکار خاصی توجہ صرف کر رہی ہے۔

آئیے اب ایک اجمالی نظر ریاست گجرات میں واقع سیاحوں کی دلچسپی کے مراکز پر ڈالیں۔ شروعات گیر جنگلات سے کریں۔

گیر جنگلات، جنگلی جانوروں کی پناہ گاہیں اور اس اعتبار سے خاص طور پر لائق اعتنا ہیں کہ یہ ایشیائی ببر شیر کا گھر ہیں۔ تیرہ سو مربع کیلومیٹر میں پھیلے ہوئے گیر جنگلات میں کبھی تین سو ببر شیر تھے۔ ۱۹۶۸ء کی جانور شماری کے مطابق ان کی تعداد گھٹ کر ۱۷۷ رہ گئی تھی۔ ریاستی سرکار ببر شیروں کی نسل کی حفاظت کے لئے خاص اقدامات کر رہی ہے۔ گیر جنگلات میں ببر شیروں کے نظارے کے لئے آنے والے سیاحوں کے واسطے ساسن میں ایک ٹورسٹ بنگلہ ہے، جہاں جدید آسائشیں حاصل ہیں۔ سیاح ساسن تک پہنچنے کے لئے بمبئی سے ہوائی جہاز میں کیشود آ سکتے ہیں۔ وہاں سے ساسن تک کا نوے کیلو میٹر کا فاصلہ موٹر گاڑی سے طے کرنا پڑتا ہے۔

واپسی پر سیاح سوم ناتھ کا مشہور تاریخی مندر اور اس کے قرب و جوار میں واقع بھگوان کرشن کی زندگی سے متعلق مقامات کی یاترا کر سکتے ہیں۔ یاترا کا ایک دوسرا مقام پالی تانا ہے۔ پالی تانا جانے کے لئے بھاؤ نگر جانا پڑتا ہے۔ جو ساسن سے ۲۵۰ کیلو میٹر کی دوری پر ہے۔ پالی تانا فی الواقع جین مندروں کا شہر ہے جن کی تعداد ۹۰۰ ہے۔ یہ مندر فن تعمیر کے عجائبات میں سے ہیں اور عظمت اور شکوہ میں تاج محل کا جواب رکھتے ہیں۔ بمبئی سے ہوائی جہاز میں بھاؤ نگر ایک گھنٹہ اور پندرہ منٹ میں پہنچا جا سکتا ہے۔ پالی تانا کے بعض مندر گیارہویں صدی عیسوی کے ہیں۔ شترنجے پہاڑ پر پتھر اور مرمر کے بنے یہ مندر ان معماروں کے فن و ہنر کا نمونہ ہیں جن کے آبا و اجداد نے ماؤنٹ آبو کے قریب اور دلواڑہ مندر تعمیر کئے تھے۔ ان کا انداز تعمیر مخصوص ہندو فن تعمیر سے مختلف ہے۔

ہند اسلامی طرز تعمیر کے نمونے دیکھنا ہوں تو احمد آباد آپ کی اولین توجہ چاہتا ہے۔ احمد آباد کا شمار بھارت میں سوتی کپڑوں کے بڑے مراکز میں ہوتا ہے آرام و آسائش کی ہے۔ سبھی سہولتیں یہاں حاصل ہیں۔

احمد آباد کے لرزاں مینار عہد وسطیٰ کے فن تعمیر کے حیران کن نمونے ہیں۔ یہ پندرھویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوئے تھے۔ جب آپ ایک مینار کو ہاتھ سے جنبش دیں، تو ارتعاش دوسرے مینار میں پیدا ہوتا ہے۔ ایسا پتھر کی اس سِل کی بدولت ہوتا ہے جو ان میناروں کو ملائے ہوئے ہے۔

رانی روپ متی اور رانی سیپری کی مسجدیں بھی ہند اسلامی فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس سلسلے میں احمد آباد کی سیدی سید مسجد بھی خاص طور پر لائق توجہ ہے۔ اس مسجد کو ایک افریقی شریف زادے نے سلطان مظفر سوم کے عہد حکومت میں ۱۵۱۵ء میں بنوایا تھا۔

بہاں اپنی صناعی کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ احمد آباد کی جامع مسجد اپنی نوعیت کی سب سے بڑی مسجد جامع ہے۔

احمد آباد نے ملک کی آزادی میں جو اہم حصہ ادا کیا ہے وہ یادگار ہے۔ مہاتما گاندھی نے یہیں سیوا گرام میں تعمیری کام کرنے والوں اور ہریجنوں کے لئے ایک آشرم تعمیر کروایا تھا۔ احمد آباد اب قومی اہمیت کا حامل شہر ہے۔ یہاں سیاح بڑی تعداد میں آتے ہیں

احمد آباد سے ۱۸ کیلومیٹر کے فاصلے پر آبو روڈ پر گاؤں اڈلج کے قریب "واؤ" یا باؤلی دیکھنے کی چیز ہے۔ واؤ یعنی زینہ دار کنواں گجرات کی خصوصیات میں سے ہے۔ اڈلج واؤ کو ل کے سردار ویر سنہا کی اہلیہ رودا دیوی نے ۱۴۹۰ء میں بنوایا تھا۔ دو سو پچاس فٹ گہرے اور چالیس فٹ چوڑے اس ہشت پہلو کنویں کی تین منزلیں ہیں اس کی زمین دوز گیلریاں ہندو دستکاروں کی بے مثل کاریگری کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔

اڈلج واؤ گجرات کے زینہ دار کنوؤں میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

احمد آباد سے ۱۲۰ کیلو میٹر کے فاصلے پر مڈھیرا ہے جو اپنے سوریہ مندر کے لئے دور دور شہرت رکھتا ہے۔ کونارک کے سوریہ مندر کی طرز کا بنا یہ یادگاری مندر سولنکی راجہ بھیم دیو اول کے عہد حکومت میں تعمیر ہوا تھا۔ اس مندر کے تقدس اور روحانی وقار کا راز، صناعی فن تعمیر اور عقیدت گزاری میں مضمر ہے اس مندر کی دیواریں، کھڑکیاں ستون، محرابیں، شاندار مورتیوں اور مجسموں سے مزین ہیں وقت کے بے رحم ہاتھوں اس مندر کو گو نقصان پہنچا ہے۔ تاہم یہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

گجرات میں سیر و سیاحت اور تبدیلی آب و ہوا کے لئے ساپوتارا سے بہتر کوئی دوسرا مقام نہیں، سلسلہ ہائے کوہ سہیادری میں سب سے اونچے میدان مرتفع پر واقع اس پہاڑی صحت افزا مقام کی آب و ہوا ٹھنڈی اور بڑی جانفزا ہے۔ ساپوتارا سطح سمندر سے ایک ہزار میٹر اونچا ہے۔ یہاں سیاحوں کے قیام و طعام کا بڑا معقول انتظام ہے۔

سیاحوں کی دلچسپی کا ایک دوسرا اہم مرکز لوتھل ہے اول تا آخر یہ ہڑپائی عہد کا واحد قصبہ ہے جو ہندوستان کی حدود کے اندر دریافت ہوا ہے۔ ۱۹۵۴ء میں دریافت ہونے اس ہڑپائی قصبہ سے ہندوستان کی تاریخ میں ۱۵۰۰ ق م اور ۶۰۰ ق م کے درمیانی خلاء کو پر کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

ایاز رسول

زیارت گاہ
تیروپتی

مشہور زیارت گاہ تیروپتی آندھرا پردیش کے چندرگری علاقے میں واقع ہے۔ چندرگری کا علاقہ چتوڑ ضلع کا حصہ ہے، تیروپتی دراصل تیروپتی قصبے اور پہاڑوں پر واقع مرکزی زیارت گاہ کا ملا جلا نام ہے، اور اس مرکزی زیارت گاہ کے علاقے کو تیرومالا بھی کہا جاتا ہے۔ تیروپتی ایک میونسپل قصبہ ہے جو تقریباً ڈیڑھ میل مربع کے علاقے پر پھیلا ہوا ہے اور اس کی آبادی لگ بھگ پچاس ہزار ہے۔ تیروپتی کا قصبہ مشرقی گھاٹ کے پہاڑی سلسلے کے "سیشا چلا" یا "ونکٹا چلا" نامی حصے کے دامن میں واقع ہے۔ قصبہ تقریباً ہر طرف سے مشرقی گھاٹ کے پہاڑی سلسلوں سے گھرا ہوا ہے۔ تیرومالا کی پہاڑیاں تقریباً ڈیڑھ مربع میل کے علاقے پر پھیلی ہوئی ہیں اور یہ "ونکٹا چلا" سلسلے سے ملی ہوئی ہیں۔ ان پہاڑیوں کی جانب مغرب "کڑپہ" ڈسٹرکٹ ہے۔ اور اس پہاڑی سلسلے کا "نلی مالائی" نامی مشرقی حصہ "نیلور" ڈسٹرکٹ کی طرف ہے۔ "نگری" پہاڑیاں بھی اسی "ونکٹا چلا" سلسلے کا ایک حصہ ہیں۔ ان سب پہاڑیوں کو مشرقی گھاٹ کا سلسلہ کہا جاتا ہے۔ ان پہاڑیوں کی ترتیب کچھ ایسی ہے کہ اوپر سے دیکھنے پر سانپ کے جسم کے سے پیچ و خم دکھائی دیتے ہیں۔ اور عام عقیدہ یہ ہے کہ یہ پہاڑوں کا سلسلہ دراصل مقدس ناگ "روی شیشا" کا جسم ہے۔ جس پر بھگوان وشنو تشریف فرما ہیں۔

تیرومالا سطح سمندر سے ۲۸۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں کا موسم سال بھر خوش گوار رہتا ہے جس سے زائرین کو یہاں رہنے میں بڑی سہولت ملتی ہے۔ تیرومالا کی مستقل آبادی تقریباً آٹھ نو ہزار ہے۔ عام دنوں میں جو زائر یہاں آتے ہیں۔ ان کی تعداد لگ بھگ چھ ہزار ہے اور تہواروں اور خاص دنوں پر یہ تعداد دو لاکھ روزانہ سے بھی تجاوز کر جاتی ہے۔

تیرومالا جانے کے لئے تیروپتی قصبے سے گزرنا پڑتا ہے۔ تیروپتی قصبے میں بھی بہت سی مشہور زیارت گاہیں ہیں اور ان میں بھی زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔ تیروپتی مدراس سے تقریباً ۹۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ اور یہ مدراس سے ریل اور سڑک سے ملا ہوا ہے۔

تیروپتی سے تیرومالا جانے کے لئے دو راستے ہیں۔ ایک پرانا جس پر لوگ پیدل جاتے ہیں اور دوسرا نیا جو تیرومالا تیروپتی دیوستھانم ٹرسٹ نے ۱۹۴۴ء میں بنوایا ہے۔ یہ پُرپیچ پہاڑی راستہ ہے۔ اور بہت ہی خوبصورت ہے۔ یہ بارہ میل کا راستہ ہے اور بس میں ایک گھنٹے کا سفر ہے۔ پیدل جانے کا راستہ کوئی سات میل ہے اور تین گھنٹے کا سفر ہے۔ تیروپتی میں جو زیارت گاہیں ہیں۔ ان میں سری گووندا راجا سوامی کا عظیم مندر بھی ہے۔ اس مندر کے ملحق ایک عظیم "تیرتھم" (تالاب) بھی ہے۔ اس تیرتھم کا نام "کپیلا تیرتھم" یا "الور تیرتھم" ہے اور زائرین تیرومالا جانے سے پہلے اس تالاب میں اپنے گناہوں کو دھو ڈالنے کے لئے نہاتے ہیں۔ تیروپتی سے تیرومالا جانے کے لئے جو راستہ ہے۔ اس پر بھی کئی مندر ہیں۔ سب سے پہلا مندر "نرسمہا سوامی" کا ہے اور یہ تیروپتی قصبے سے چار میل کے فاصلے پر ہے۔ دوسرا مندر شری رام ناجو کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شری رام ناجو تیرومالا جاتے ہوئے جس مقام پر تھوڑی دیر سستانے ٹھہرے تھے یہ مندر اسی جگہ پر تعمیر کیا گیا تھا۔

راستے میں دو اونچے گنبد بھی ہیں جو دراصل راستے کا داخلہ ہیں۔ ایک پہاڑوں کے دامن میں ہے اور اسے "علی پیری گوپورم" کہا جاتا ہے۔ دوسرا پہلی پہاڑی کی چوٹی پر ہے اور اسے "گلی گوپورم" کہا جاتا ہے۔

تیروپتی اور تیرومالا دونوں جگہوں پر زائرین کے ٹھہرنے کا خاصا بندوبست ہے۔ ٹرسٹ نے کئی مسافر خانے کھولے ہیں۔ ان کے علاوہ تیرومالا میں ایک خوبصورت کالونی بھی بنوائی گئی ہے جس میں زائرین کی سہولت کے تمام سامان میسر ہیں۔ پرائیوٹ ہوٹلوں کی ایک کثیر تعداد بھی زائرین کے ٹھہرنے کا بندوبست کرتی ہے۔

تیروپتی زیارت گاہوں کے اعتبار سے ایک اہم جگہ ہے۔ یہاں ہر روز ہندوستان کے کونے کونے سے آئے ہوئے ہزاروں زائرین عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ تیرومالا کی پہاڑیاں ایک زمانے میں "میرو کوہ" کا ایک حصہ تھیں (میرو سورگ میں واقع ہے۔) کہا جاتا ہے کہ ایک بار ناگ ادی سیشا

اور "وایو" (ہوا) کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی جس کے نتیجے میں عظیم کوہ ٹوٹ گیا اور اس کا ایک حصہ نیچے دھرتی پر آگرا اور اسی حصے کو تیرومالا کا نام دیا گیا۔ "پورانوں میں کہا گیا ہے کہ تیرومالا کی پہاڑیاں شری وشنو کو بہت پیاری ہیں اور اس علاقے کی زیارت کرنے والے ہر زائر کی تمنا پوری ہو جائے گی۔" "الور" "وشنو اچاریا" اور دوسروں نے ونکٹا چلام کے بھگوان کی تعریف میں گیت گائے۔ ان میں سے بیشتر اس زیارت گاہ پر حاضری دینے آتے۔ سب الوروں نے شری ونکٹیشورا کو بھگوان وشنو کا سب سے عظیم روپ قرار دیا ہے۔ عظیم اچاریہ بھی اس عظیم زیارت گاہ پر حاضری دینے آتے اور اس کی خدمت اور عبادت کرتے رہے،

"تیرومالا نمبی" ایک بہت بڑے اور مشہور رشی "ناتھ منی" کے خاندان سے تھے۔ اور انہوں نے اپنی ساری عمر شری ونکٹیشورا کی خدمت و عبادت میں گزار دی تھی۔ انہیں کے ایک رشتہ دار "رامنو جاچاریہ" تھے جنہوں نے اس زیارت گاہ کی زیارت کی۔ اور عبادت کے طریقے اور دیگر رسومات کی اصلاح کی تھی۔ اور انہی کے بنائے ہوئے طریقوں پر آج بھی اس عبادت گاہ میں عبادت ہوتی ہے۔ انہوں نے ہی تیروپتی قصبے میں سری گووندا راجا سوامی کی مورتی نصب کی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تیروپتی کا قصبہ انہی کا بسایا ہوا ہے۔

تیرومالا میں جو مرکزی زیارت گاہ ہے۔ وہ شری ونکٹیشورا کا مندر ہے اور یہاں ان کی مورتی نصب ہے۔ اس مندر کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مندر وہاں زمانۂ قدیم سے موجود ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بھگوان ونکٹیشورا کا ذکر اولین ویدوں میں بھی تھا۔

"پورانوں میں ذکر ہے کہ" پرے کال (عظیم تباہی) کے بعد جو تخلیق نو ہوئی اس میں "مہا وشنو" نے اپنے آپ کو ایک سفید سور کی شکل میں ظاہر کیا۔ انہوں نے دھرتی کو پھر سے تخلیق کیا اور کائنات کو پھر سے منظم۔ اس کے بعد انہوں نے کچھ عرصے کے لئے دھرتی پر رہنے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ وہ حق و صداقت کی نگہبانی کریں اور برائی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر ڈالیں۔ اور اس طرح شری وشنو تیرومالا میں "سوامی پوشکارنی" نامی تالاب کے کنارے پر جا بسر ہو گئے۔ سفید سور کے روپ کی مورتی آج بھی سوامی پوشکارنی "تالاب کے مغربی کنارے پر "آدی ورہا سوامی" نامی مندر میں موجود ہے اور زائرین پہلے اس مورتی کی عبادت کرتے ہیں کیونکہ یہ شری وشنو کا پہلا روپ ہے۔

اس کے بعد شری وشنو کئی اور روپ لے کر دھرتی پر رہے جن میں سے سب سے عظیم روپ شری ونکٹیشورا کا روپ کہلاتا ہے۔

تیرومالا کی زیارت کرنے کے فائدے "پورانوں" میں درج ہیں اور "پورانوں" میں ونکٹیشورا کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ حاجت مندوں کی حاجت روا کرنے میں عظیم درجہ رکھتے ہیں۔ مندر کا ذکر سنگم زمانے کی تامل شاعری میں بھی ملتا ہے۔ اور اس دور کے مختلف شاعروں نے بھی شری ونکٹیشورا کی تعریف میں گیت گائے ہیں۔

جنوبی علاقے کے زمانۂ قدیم کے راجے مہاراجے اس قدیم زیارت گاہ کے معتقد تھے "کانچی پورم" کے "پلو" راجے تقریباً نویں صدی عیسوی میں حکومت کرتے تھے۔ انہوں نے اس زیارت گاہ پر کئی بار حاضری دی ہے۔ اور اس کی تعمیر و ترقی میں شاندار کام کیا ہے "تنجور" کے "چولا" راجاؤں نے دسویں صدی عیسوی میں اس زیارت گاہ کی خدمت و عبادت کی ہے۔ ان کے علاوہ مدورائی کے پانڈیا راجے، اور وجیانگر کے راجے اور سردار (۱۴ ویں اور ۱۵ ویں صدی عیسوی) اس زیارت گاہ کے زبردست معتقد رہے ہیں۔ ان میں سے بہت سے راجے زیارت گاہ پر عطیات دینے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے وجیانگر راجاؤں کے دور میں ہی کرشنا دیو رایا اور ان کی بیویوں کی مورتیاں اس عبادت گاہ میں نصب کی گئیں۔ وجیانگر کے راجاؤں کے زوال کے بعد بھی ملک کے ہر حصے کے راجے مہاراجے اور سردار یہاں آکر اپنی عقیدت کے پھول چڑھاتے رہے۔ ان میں مرہٹہ سردار "راگھوجی بھونسلے" اور گڑاموال کے راجے قابل ذکر ہیں۔

ہندو بادشاہت کے زوال کے بعد کرناٹک کے مسلمان اور بعد میں انگریز حکمرانوں نے اس زیارت گاہ کو اپنی حفاظتی کنٹرول میں لے لیا لیکن ۱۸۴۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے تمام غیر عیسائی زیارت گاہوں کا براہ راست نظم و نسق چھوڑ دیا اور اس زیارت گاہ کو تیرومالا میں "ہیتی رام جی مٹھ" کے سربراہ کے سپرد کر دیا گیا۔ تقریباً ایک سو سال تک یہ زیارت گاہ اسی مٹھ کے مہنت کے کنٹرول میں رہی۔ ۱۹۳۳ء میں ایک اسپیشل ذیلی کی رو سے مدراس اسمبلی نے "تیرومالا تیروپتی دیوستھانمز" کمیٹی کا تقرر کیا اور مندر کے تمام اختیارات اس کمیٹی کو سونپ دیئے۔ ۱۹۵۱ء میں دوسری دفعہ

THE HINDU RELIGIOUS AND CHARITABLE ENDOWMENTS ACT.

کے تحت اس زیارت گاہ اور اس علاقے کی دوسری زیارت گاہوں کا سارا انتظام ایک ٹرسٹ کے سپرد کیا گیا۔ اس ٹرسٹ میں ایک "بورڈ آف ٹرسٹیز" کے علاوہ حکومت کی طرف سے نامزد کیا ہوا ایک ایگزیکیٹو آفیسر ہوتا ہے۔ ۱۹۵۱ء سے یہ زیارت گاہ اسی

ٹرسٹ کے کنٹرول میں ہے۔

زیارت گاہ تین حصوں پر مشتمل ہے، بیرونی حصے میں بیرونی دروازے کے قریب "کرشنا دیورایا" "ونکٹا پتی رایا" "اچیتا رایا" اور اکبر اعظم کے ایک وزیر ٹوڈرمل اور اس کی بیوی کے مجسمے نصب ہیں۔ دوسرے حصے میں مندر کے مہنتوں اور پجاریوں کے رہنے کے لیے بہت سے کمرے ہیں۔ اس حصے میں بھی کئی مورتیاں نصب ہیں۔ سب کے اندرونی حصے کو "ونکٹ پرادکشنم" کہتے ہیں اور یہ حصہ عموماً بند رہتا ہے، صرف "ایکادشی" کے دن اسے کھولا جاتا ہے۔ شری ونکٹیشورا کی مورتی کے حصے کی جانب جو دروازہ کھلتا ہے وہ سب سونے سے بنا ہوا ہے۔ اور اسے سنہری دروازہ کہتے ہیں۔ اس دروازے کے قریب ہی "ہنڈی" رکھی ہوئی ہے۔ جس میں زائرین اپنے عطیات ڈال دیتے ہیں۔

سنہری دروازے کے اندر داخل ہونے کے بعد شری ونکٹیشورا کی مورتی کے درشن ہو جاتے ہیں۔ اس مورتی کے ساتھ ہی کئی اور مورتیاں بھی ہیں۔ اور یہ سب مورتیاں شری وشنو کے مختلف روپ ہیں۔

ٹرسٹ کی آمدنی صرف عقیدت مندوں کے عطیات پر مشتمل ہے۔ ماہ مئی ۱۹۷۲ء میں مندر کی آمدنی تقریباً ۴۸ لاکھ روپے تھی۔ یہ کثیر رقم مندروں کے انتظام اور دیگر فلاح عام کے کاموں پر خرچ ہوتی ہے۔ ٹرسٹ بہت سے تعلیمی اداروں کا انتظام چلاتا ہے۔ ان تعلیمی اداروں میں کچھ قابلِ ذکر ادارے یہ ہیں۔

۱۔ ایس۔ وی۔ یونیورسٹی تیروپتی
۲۔ ایس۔ وی ڈگری کالج تیروپتی
۳۔ ایس۔ وی انجینئرنگ کالج تیروپتی
۴۔ ایس۔ وی ڈانس اینڈ میوزک کالج تیروپتی
۵۔ سری پدماوتی گرلز کالج۔ تیروپتی
۶۔ ایس وی اورینٹل کالج تیروپتی

ان کے علاوہ ٹرسٹ کئی یتیم خانوں، مدرسوں اور ہسپتالوں کا انتظام بھی چلاتا ہے۔

تیروملا تیروپتی دیوستھانم ٹرسٹ بورڈ کے تخمینے کے مطابق سال (۷۳-۱۹۷۲ء) کے بجٹ میں آمدنی ۹،۱۸،۴۴،۳۰۰ روپے اور خرچ ۸،۸۷،۸۲،۶۰ روپے ہے۔ صرف عطیات کی قیمت لگ بھگ ۳،۵۷ کروڑ روپے ہے۔ یہ عطیے صرف وہ ہیں جو جنس میں دیئے گئے

قابل دید مقامات

جنوبی ہند

حیدرآباد:۔ چارمینار۔ مکہ مسجد۔ عثمانیہ یونیورسٹی۔ اور متعدد جھیلوں کے
تری چورا پلی: پرانے مندروں چٹانی قلعے اور سری رنگم کے مندر کے لیے مشہور
تنجاوور:۔ برہیادیشورا مندر اور قلعہ قابل دید ہیں۔
کانچی پورم:۔ ہند کے سات مقدس ترین شہروں میں ایک پرانے مندر اور (کنجی ورم) بہت مشہور ہیں۔
مہابلی پورم:۔ پلو راجاؤں کی بندرگاہ۔ پہاڑ سے تراشے مندروں کے لئے
مدراس:۔ جنوبی ہند کا ثقافتی مرکز۔ بھرت ناٹیم اور کرناٹک سنگیت کے لئے
مدورائی:۔ میناکشی مندر۔ ہزار کھمبوں کا ہال۔ تیرو ملائی نایک کا محل قابل
میسور:۔ مہاراجہ کے محل اور دسہرے کے جشن کے لئے مشہور۔
گوا:۔ حسین بندرگاہ۔ کلنگوٹ۔ کولوا اور گیسپر ڈائس۔ بیچوں کے لئے
پیری یار تھیکیڈی۔ بنڈی پور۔ مدو ملائی: جانوروں کی مشہور پناہ گاہ
کوڈائی کنال اور اوٹاکمنڈ:۔ جنوبی ہند کی حسین ترین پہاڑی سیرگاہ

مغربی ہند

سانچی:۔ استوپ میں گوتم بدھ کے تبرکات دفن ہیں۔ سنگتراشی لاجواب
مانڈو:۔ باز بہادر اور روپ متی کا اجڑا شہر۔
اودے پور:۔ جھیل میں واقع محل اب ہوٹل بنا دیا گیا ہے۔
ایلی فینٹا:۔ بمبئی سے متصل غار۔ شیو کا تین سروں کا مجسمہ مشہور عام ہے۔
ایلورا:۔ غاروں میں بنے مندر۔ فن سنگتراشی کا کمال۔
اجنتا:۔ غاروں میں بنے مندر۔ دیواروں پر نقاشی اور تصویرکشی کی معراج
پالی ٹانا:۔ گجرات کی پہاڑی جس پر ۹۰۰ جین مندر ہیں۔
گیر جنگل:۔ ایشیائی ببر شیر کا مسکن (گجرات)
کوہ آبو:۔ راجستھان کی واحد پہاڑی تفریح گاہ۔ دل واڑہ مندر قابل
بمبئی:۔ ہند کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر اور بندرگاہ۔
احمد آباد:۔ ہند اسلامی تعمیرات۔ مہاتما گاندھی اور سردار پٹیل کی آماجگاہ

اور دایو " (ہوا) کے درمیان
ٹوٹ گیا اور اس کا ایک حصہ نیچے
دیا گیا۔" پورانوں میں کہا گیا
بہت پیاری ہیں اور اس
پوری ہو جائے گی۔" اور
چلا کے بھگتوں کی تعریف میں
گاہ پر حاضری دینے آتے۔
بھگوان وشنو کا سب سے
اس عظیم زیارت گاہ پر حا
کرتے رہے۔

" یتیرو مالا ئمبی " ایک
خاندان سے تھے۔ اور انہو
خدمت و عبادت میں گزار د
تھے جنہوں نے اس زیارت
رسومات کی اصلاح کی تھی
بھی اس عبادت گاہ میں
میں سری گووندا راجا سو
تیرو پتی کا قصبہ انہی کا بسایا
یتیرو مالا میں جو م
کا مندر ہے اور یہاں ا
پرانی ہے۔ کہا جاتا
بھی کہا جاتا ہے کہ بھگوا
" پورانوں میں ذکر
ہوئی اس میں " مہا ود
ظاہر کیا۔ انہوں نے
منظم سا اس کے بعد انہ
کیا۔ تاکہ وہ حق وصد
کر ڈالیں۔ اور اس
نامی تالاب کے
آج بھی سوامی پوشکر
سوامی " نامی مند
کرتے ہیں کیونکہ
اس کے لیے
جن میں سے سب
ہے۔
آج کل نئی دہلی

فیروز اشرف
۵۷، زینت بلڈنگ، فلیٹ نمبر ۳، اپل جیت روڈ، ماہم، بمبئی ۱۶

حاجی ملنگ بابا

"کیا شان ہے تمہاری، حاجی ملنگ دولہا" اسمٰعیل آزاد مرحوم قوال کی گائی ہوئی یہ قوالی آج بھی ہمارے کانوں میں گونج اٹھتی ہے۔ پندرہ سولہ سال پہلے ہم نے حاجی ملنگ کی شان کے قصے سنے تھے۔ بمبئی میں ان کے بے شمار معجزے و کرشمے سننے کو ملے۔ ان کے مزار مبارک پر جانے کا شرف حاصل ہوا تو حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ ایک مسلم بزرگ کے مزار کا مجاور دھوتی اور تلک میں دکھائی دیا تجسس بڑھا تو پتہ چلا کہ سالہا سال سے ایک برہمن خاندان مزار کی دیکھ بھال کرتا چلا آ رہا ہے۔ شاید سارے ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کا واحد حادثہ ہے۔ ہم اسے حادثہ ہی کہیں گے۔ یا شاید پھر یہ حادثہ حاجی ملنگ بابا کی کرامات ہی ہو۔ گزشتہ سال ایسا ہی ایک اور کرشمہ سننے کو ملا جب بھیونڈی کلیان اور آس پاس کے گاؤں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ میں جل رہے تھے۔ اس وقت بھی حاجی ملنگ بابا غریب ہندوؤں اور مسلمانوں کے محافظ تھے۔ بہت سارے ہندو مسلمان خاندان مزار کے ارد گرد دنگوں کے وقت پناہ لے رہے تھے۔ ادھر فساد ہو رہے تھے ادھر کلیان ریلوے اسٹیشن سے نو دس میل دور بندھن واڑی گاؤں سے ملحق دو ہزار فیٹ کی اونچائی پر بابا حاجی ملنگ کا مزار امن و سکون کے پھول برسا رہا تھا۔ دو ہزار فیٹ اونچائی کا دشوار ترین راستہ اپنے سینے پر سینکڑوں عقیدت مندوں کو روزانہ باباکے مزار پر ہنسی خوشی لے جاتا ہے۔ ان عقیدت مندوں کو جو مختلف فرقے اور مذاہب کے ہوتے ہوئے بھی بابا کی بزرگی کے سامنے یکجا ہو کر سر جھکاتے ہیں۔ ہر سال فروری کے دوسرے ہفتہ میں حاجی ملنگ کا عرس بہت شان و شوکت سے منایا جاتا ہے۔ بھارت کے کونے کونے سے لوگ اس عرس میں شریک ہوتے ہیں۔

بابا حاجی ملنگ کی زندگی کا بیان بمبئی گزٹ (سن ۱۸۵۷-۵۸ء)

میں شائع گزٹ کے مطابق ... عرب ... کے سفر کے بعد ... اپنے ... جو ... زیر تھے۔ بعد میں وہ حاجی ملنگ کے نام سے ... جاتا ہے کہ جس وقت ان کی شادی ہونے والی ... ہندوستان ہجرت کر گئے۔ شاید اسی لیے آپ کو ... منسوب کیا جاتا ہے۔ آپ کے ہمراہ ... بھی تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے مزار حاجی ملنگ ... ملتے ہیں۔ باباکے مزار سے لگا ایک اور مزار ہے جو اس وقت کے راجہ نل کی بیٹی چاند بی بی ... بیٹی بنا لیا تھا اس کے بعد کے حالات کے بارے ... سے اس وقت یہ سارا علاقہ دلکش ہرے جنگلوں ... گھرا تھا۔

بابا کے مزار کا برہمن خاندان سے تعلق ... کے مطابق سن ۵۸ء عیسوی میں کلیان اور اس ... سلطنت تھی جسے انہوں نے پیشواؤں سے حاصل کیا ... مزار پر منت مانگی۔ اس کے دو سال بعد یعنی سن ۸۲ء ... سے اپنی سلطنت واپس چھین لی۔ اس لئے انہوں ... شکرانے اور بھینٹ کلیان کے ایک برہمن بزرگ جنا... کیتکر کو سونے کے گھنگرو لگے ہوئے مخمل کی چادر ... مبارک پر بھیجا۔ باجے گاجے کے ساتھ جناب کیتکر ... پر مزار تک پا پیادہ گئے۔ اس طرح بابا کی شہرت ... کے بعد ہر سال کیتکر خاندان کے لوگ مزار پر جانے ... نے مزار اور آس پاس کے علاقے کی دیکھ بھا... لیکن کلیان کے باباکے مسلم عقیدت مندوں کو ... میں معاملہ کلیان کے انگریز کلکٹر کے سامنے پیش ہوا۔ ... پر ہی چھوڑ دیا۔ دونوں طرفین کے نام کی تین مرتبہ ... مرتبہ کیتکر خاندان کا ہی نام آیا۔ اس وقت سے یہ ... خاندان ہی مزار اور اس کے آس پاس کے علاقے کی د... ہے۔ آزاد بھارت میں جب مذہبی مقامات کی دیکھ ... کمشنروں اور ٹرسٹوں کی۔ ... ہونے لگیں تو حاجی ... ٹرسٹ (وقف) کی بنیا دپڑی کیتکر خاندان کے ... کیتکر منیجنگ ٹرسٹی اور بمبئی کے جناب محمد خورشید ... چیر...

کلیان ریلوے اسٹیشن سے حاجی ملنگ پہاڑ ... لیے سرکاری بسیں ملتی ہیں۔ اوسطاً تین ہزار زائرین ...

حاضری دیتیں زائرین کی تعداد کو دیکھتے ہوئے بسوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ اس کا نظارہ بس اسٹینڈ پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ پرائیوٹ گاڑیاں بھی ملتی ہیں۔ ہم نے پیدل اور بیل گاڑیوں پر بھی لوگوں کو آتے جاتے دیکھا۔ برسات میں بارش کے باعث بسیں بند ہو جاتی ہیں۔ اس وقت بھی بابا کے عقیدت مند ٹیکسی والوں کو بس کے پچاس پیسے کے بدلے دس روپئے دے کر جاتے ہیں۔

ایک گھنٹے کا بس کا سفر حاجی ملنگ پہاڑی کے دامن میں پہنچا دیتا ہے۔ یہاں سے چائے خانے، ہوٹل اور بھٹیار خانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو اوپر مزار تک ختم ہوتا ہے۔ دو ہزار فیٹ کے اوپر مزار تک جانے کے لیے شروع میں گنتی کی چند پکی سیڑھیاں ہیں۔ آگے راستہ پُرخطر ہے۔ لیکن اونچائی پر چڑھنے کے لیے راستے ہیں۔ رنگ برنگ کی چھڑیاں ملتی ہیں ٹیک لیتے جائیے اور اوپر چڑھتے جائیے۔ جگہ جگہ چائے خانے ہیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کا یہ سفر اپنے اندر ایک عجیب کشش رکھتا ہے۔ راستے میں دھونی رمائے سادھو بھی ملیں گے اور ملنگ کی صدا لگاتے ہوئے فقیر بھی۔

نصف سفر کے بعد آدھی منزل آتی ہے جہاں بابا بختاور شاہ اور بابا سلطان شاہ کے مزارات ہیں۔ بابا کے مزار پر جانے سے پہلے دونوں بزرگوں کے مزار پر حاضری دینی ہوتی ہے۔ یہاں سلامی دے کر ہی عقیدتمند آگے کوچ کرتے ہیں۔ اس کے بعد کی چڑھائی کچھ آسان بھی ہے۔ پہاڑی لگ بھگ ہموار ہوتی جاتی ہے۔ آخر میں پہاڑی کا اوپری سطحی حصہ ہے۔ یہاں بابا کا مزار شریف ہے۔ ایک چھوٹا سا مزار جس کے اوپر سبز رنگ کا ایک گنبد۔ سامنے دربار حاجی عبدالرحمن ملنگ شاہ نام کھدا ہوا ہے مزار کے سامنے ایک چھوٹا آنگن ہے جس کے بائیں جانب مجاور اور ٹرسٹ کے منتظم ٹرسٹی شری گوپال کرشن کیتکر جی کا آفس اور اسٹور روم ہے۔ یہاں سے منت مانگنے والوں کو برتن وغیرہ بھی دیئے جاتے ہیں۔

اندر مزار شریف رنگ برنگے کپڑوں سے ڈھکا رہتا ہے۔ پھولوں کی بے شمار چادریں ماحول کو پاک بناتی ہیں۔ بائیں جانب فاطمہ بی کا مزار ہے۔ عقیدت مندوں اور حاجت مندوں کی بھیڑ ادب سے مرادیں مانگتی ہے۔ کچھ عورتیں اور مرد قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہیں۔

مزار کے چاروں طرف ایک چھوٹا سا بازار بسا ہوا ہے۔ کھانے پینے اور رین بسیرے کو ہوٹل بھی ہیں۔ پکانے کو ہری سبزیاں بھی ملتی ہیں۔ پھولوں کے چادروں کی بے شمار دکانیں ہیں۔ مدتوں سے لوگوں نے یہاں ہندوستان کے کونے کونے سے آ کر مختلف اقسام کی دکانیں سجا



مزار حاجی ملنگ بابا

رکھی ہیں۔

مزار سے دور پہاڑیوں کا ایک دوسرا سلسلہ شروع ہوتا ان کی اونچائی بھی لگ بھگ دو ہزار فیٹ ہے۔ یہاں دو تین بڑی چٹانیں قابل ذکر ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ دونوں چڑیلیں ہیں جو بابا کی بددعا سے پتھروں میں تبدیل ہو گئے ہیں ایک الائچی کا بھی درخت ہے۔ کہتے ہیں بابا نے الائچی کھا کر اس پر چھلکا پھینکا تھا۔

ہمارے ملک کی بہت سارے زیارت گاہیں اور تیرتھ پُرخطر راستوں سے بھری پڑی ہیں۔ حاجی ملنگ بابا کے مزار کا راستہ اگر خطرناک نہیں ہے تو بہت اچھا بھی نہیں ہے۔ کوئی ہے کہ وہاں پکی سڑک نہ بنائی جا سکتی ہو۔ ویسے ہم مزار والی آمدنی کا اندازہ نہیں کر سکتے ہیں مگر عقیدت مندوں بڑی تعداد ایک اچھی آمدنی کی نشاندہی کرتی ہے جگہ جگہ بہت دوسرے فلاح کے کام بھی کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً بیٹھنے بنچ، پینے کو ٹھنڈے پانی کا انتظام، سستے مسافر خانے کی سخت ضرورت ہے۔ ممکن ہے شری گوپال کرشن جی کیتکر اتنا سب کچھ کرنا ممکن نہ ہو۔ اب جب ٹرسٹ میں اور بھی ا ہیں تو امید ہے کہ اوپر لکھی گئی باتوں پر دھیان دیا جائے گا

نظامت سیاحت

اتر پردیش

آپ کو بدری، کیدار، گنگوتری۔ یمنوتری کی یاترا اور مسوری، نینی تال، رانی کھیت، الموڑہ، کوسانی اور کاربٹ نیشنل پارک میں جنگلی جانوروں کی دنیا کی سیر و نظارے کی دعوت دیتا ہے۔

مفید امداد کے لئے

مندرجہ ذیل دفتروں سے رابطہ قائم کیجیے

۱ ریجنل ٹورسٹ بیورو
نینی تال

۲ ٹورسٹ بیورو
رانی کھیت (الموڑہ)

۳ ٹورسٹ بیورو
کاٹھ گودام (نینی تال)

۴ ٹورسٹ بیورو
الموڑہ

۵ ریجنل ٹورسٹ بیورو
پوڑی (گڑھوال)

۶ ٹورسٹ بیورو
سری نگر (گڑھوال)

۷ ریجنل ٹورسٹ بیورو
ہردوار

۸ ٹورسٹ بیورو
مسوری

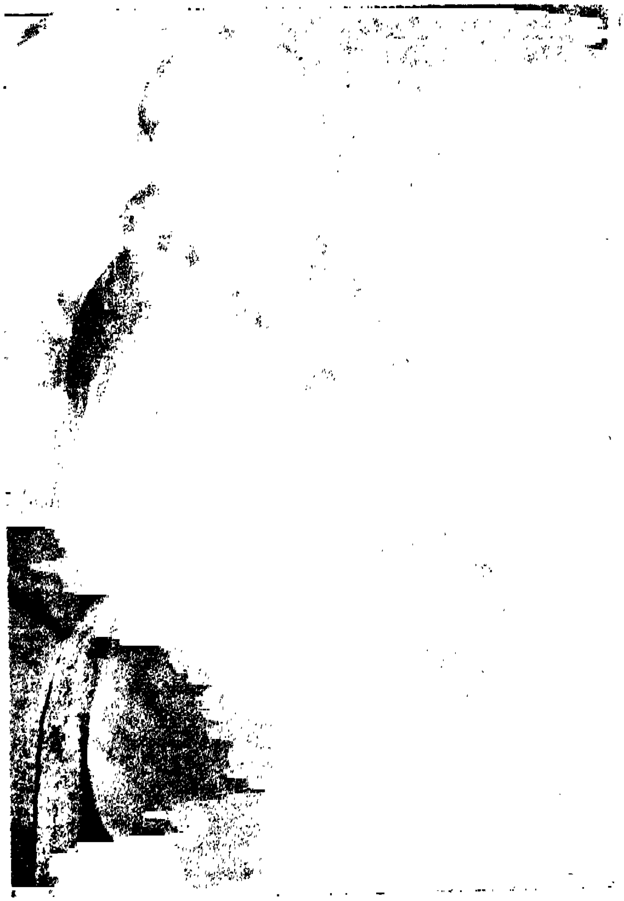
۹ ٹورسٹ بیورو
رشی کیش

۱۰ ٹورسٹ بیورو
دہرہ دون

جاری کردہ: **نظامت سیاحت۔ اتر پردیش**

شری ایس موہن کمار منگلم، مرکزی وزیر برائے فولاد
معدنیات کا انتقال ۳۱ رمئی ۱۹۷۳ء کو ایک حادثے
میں ہوا۔ دوسرے دن جنازے کے جلوس کا
ایک منظر۔





ہز ایکسی لینسی مسٹر ایڈورڈ گف وہٹلم، وزیر اعظم آسٹریلیا
مع اپنی اہلیہ ۳ رجون ۱۹۷۳ء کو ہند کے چار روزہ دورے
پر تشریف لائے۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے
بات چیت کے بعد ایک مشترکہ اعلان میں کہا گیا۔ کہ بحر ہند
کو پُرامن خطہ رکھنا ضروری ہے ۔

'OL. 31 NO. 12 AJKAL (MONTHLY) JULY 1973
PUBLISHED BY THE DIRECTOR, PUBLICATIONS DIVISION, PATIALA HOUSE, NEW DELHI-1
PRINTED BY INDIAN PRINTING WORKS, RANI JHANSI ROAD NEW DELHI-55.

آج کل نئی دہلی